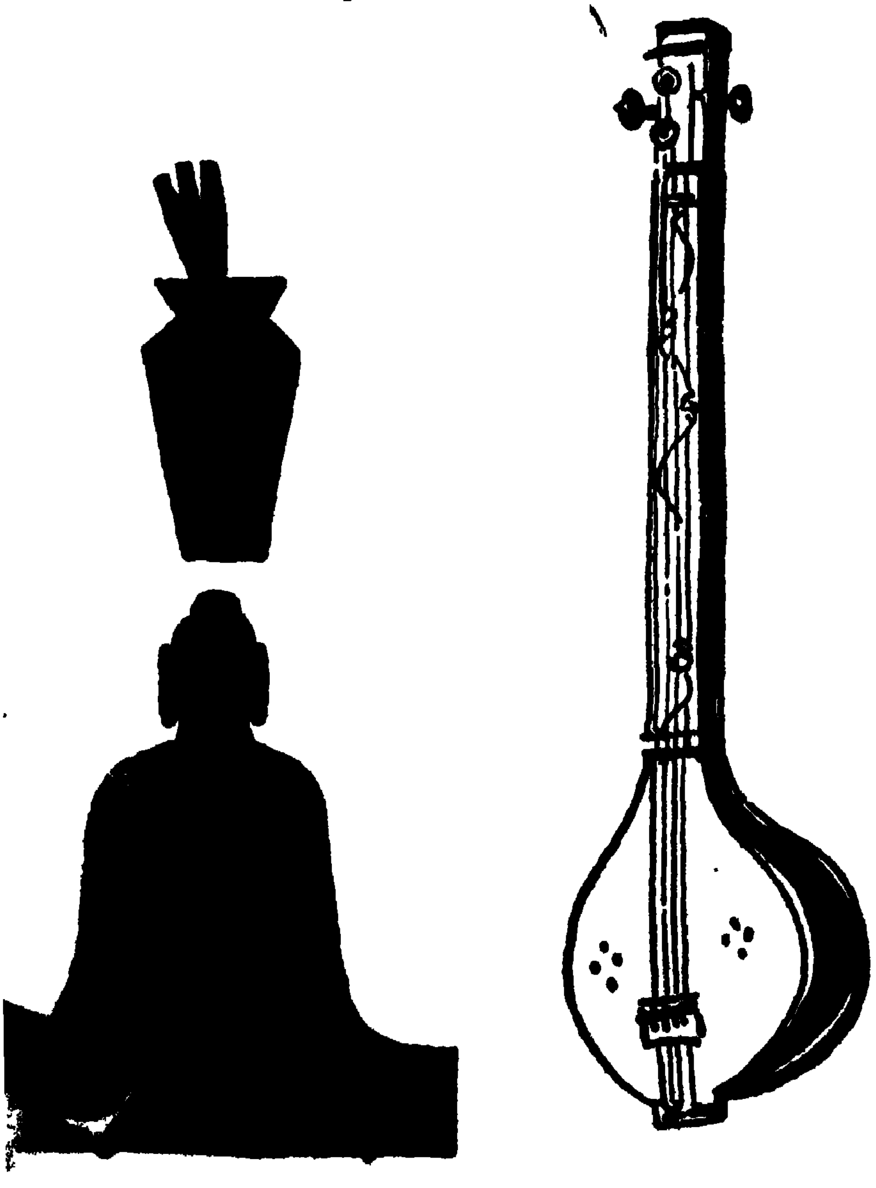
لکھنؤ

ماہنامہ

فنون لطیفہ نمبر



قیمت 1/ روپیہ

ماہنامہ "ترنم" لکھنؤ

مدیرہ -
نجمہ اخلاق

جلد (۲) — شمارہ (۲)

چندہ سالانہ
دس روپے
ششماہی
چھ روپے
فی پرچہ
ایک روپیہ

دفتر اشاعت
۱۵ بارود خانہ لکھنؤ
۲۲۶۰۰۱

عنوانات

خوش نویس :- سید [illegible] نقوی [illegible] منڈی لکھنؤ

اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ اس طرح علاج معالجے کا ایک نیا نظام جسے نیوکلیر میڈیسین کا نام دیا گیا ہے ترتیب دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں بھی دلی اور بمبئی کی یونیورسٹیوں نے میڈیکل گریجویٹوں کے لئے نیوکلیر میڈیسین میں پوسٹ گریجویٹ کے ڈپلومہ کو تسلیم کر لیا ہے۔

عام طور پر کلنیک میں استعمال کی جانے والی ریڈیو فارمیٹیوکل دوائیں مقامی طور پر بھابھا اٹامک ریسرچ سنٹر میں ہی تیار کی جا رہی ہیں اور اسی ادارے کے ذریعے دستیاب ہوتی ہیں۔ انسانی جسم میں ریڈیو ایکٹیوٹی کا پتہ لگانے کے لئے الیکٹرانک آلات بھی ہم اپنے ملک میں تیار کر سکتے ہیں۔ اس وقت ملک میں ۷۰ ریڈیو آئسو ٹوپ سے متعلق تقریباً، لیبارٹریاں موجود ہیں۔ اس طرح کی سب سے بڑی لیبارٹری ریڈی ایشن میڈیسین سنٹر ہے جو بھابھا اٹامک ریسرچ سنٹر کی زیر نگرانی سرگرم کار ہے اور گذشتہ دس برسوں سے بمبئی کے مریضوں کی مفت خدمت انجام دے رہا ہے اس وقت تک پندرہ ہزار سے زائد مریض اس ادارے سے مستفید ہو چکے ہیں۔ یہ ادارہ ہر سال ڈاکٹروں کے لئے قلیل المدت تربیتی نصابات کا بندوبست کرتا ہے تاکہ انھیں ریڈیو آئسو ٹوپ کے طریق علاج سے واقفیت اور دلچسپی پیدا ہو جائے۔ حال ہی میں صحت کے عالمی ادارے (ڈبلیو۔ ایچ۔ او) نے انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کے تعاون سے اس سنٹر کو جنوب مشرقی ایشیاء میں نیوکلیر میڈیسین کے ریجنل ریفرنس سنٹر کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔

مجمہ اخلاق ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے الواعظ صفدر پریس گولہ گنج اسٹریٹ لکھنؤ سے چھپوا کر ۱۵ بارود خانہ لکھنؤ سے شائع کیا

آمیزش ہے انداز بیان شگفتہ ہے نئی ہوش مندی اور جدید شعری رویوں کی تلاش میں جہاں انھوں نے اپنی فکر کو عصری حیات سے ہم آہنگ کر لیا ہے وہاں ان کے بیاں ایک خاص تیور اور بانکپن پیدا ہو گیا ہے؟

نعمان ہاشمی کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کے افسانے زندگی معاشرہ اور نفسیات انسانی کی کشمکش اور اس کے رد عمل کی بہترین تصویر پیش کرتے ہیں اپنے افسانوں میں انھوں نے زندگی کے کرب و حوادث اور سماجی و تہذیبی مسائل کا جس فنی بصیرت اور فنکارانہ دردمندی سے تجزیہ کیا ہے وہ ان کے گہرے مشاہدہ کی دلیل ہے؟

(بقیہ صفحہ ۲۰ پر)

غزل

طارق سبزواری بدایونی

میرے لب پر جو فغاں ہے یارو
یہ بھی اک طرز بیاں ہے یارو
فصل گل میں بھی نہ جائے شاید
یہ جو ذہنوں میں خزاں ہے یارو
لاکھ انسان مگر سب تنہا
کیا قیامت کا سماں ہے یارو
میرے افکار نہیں مر سکتے
میرا احساس جواں ہے یارو
ترک امید ہمیں راس آ جائے
یہ بھی امید کہاں ہے یارو
راز کس طرح رہے حال چمن
پتہ پتہ کے زباں ہے یارو
گھر میں کیا تھا جو بیاباں میں نہیں
جو وہاں تھا وہ یہاں ہے یارو
کیوں نہ طارق کو علیگڑھ ہو عزیز تر
جس کے خوابوں کا جہاں ہے یارو

نئی افسانہ

قیصر رضا

جلنے کے لئے

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ شانتی اپنی کوٹھری کے دروازے پر بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا، شاید اُسے کسی کا انتظار ہو کہ کوئی آئے اور وہ اس کی بانہوں میں پھسل جائے، خود کو اس کے حوالے کر دے اور وہ اس کے جسم سے ایک بلی کی مانند کھیلے جیسے بلّی چوہے کو ادھ موا کر کے کھیلتی ہے۔ اچانک ہی کہیں دور کسی گھنٹہ گھر نے بارہ بجایا، اس کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"ابھی تک کوئی نہیں آیا۔ لگتا ہے آج بھی سب گاہک مر گئے۔"

اور پھر وہ کچھ سوچنے لگی۔ خیالات کا تسلسل ابھی طویل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ دور کوئی شرابی لڑکھڑاتے قدموں سے آتا دکھائی دیا۔ وہ ٹھیک سے بیٹھ گئی۔ اسی طرح جیسے بلّی چوہے کو پکڑنے کے قبل بیٹھتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ شرابی اس کے قریب تھا۔ جسم کی قیمت لگائی جانے لگی۔ اور جب سودا طے ہو گیا تو دونوں کوٹھری میں داخل ہو گئے۔

ساری دنیا نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ مانو مُردے قبرستان میں پڑے سو رہے ہوں مگر زندگی صرف شانتی کے کمرے میں تھی۔ جہاں ایک پچپن سالہ بوڑھا اس کے جسم کو کوٹے ڈال رہا تھا اور وہ ایک مردہ کی مانند پڑی تھی جیسے اس میں زندگی ہی نہ ہو۔ پانچ دن کی فاقہ زدہ عورت روٹی کے چند ناکارہ ٹکڑوں کی خاطر اپنے پیٹ کی آگ میں ایندھن دینے کے لئے اس وقت بھی محنت کر رہی تھی۔ بھوک اس کی انتڑیوں کو اینٹھے ڈال رہی تھی مگر وہ خاموش پڑی تھی۔ چند لمحے بعد اس کی آنکھ آہستہ آہستہ بند ہونے لگی۔ اس پر غشی طاری ہونے لگی۔ وہ سو گئی، شاید ہمیشہ کے لئے۔ ایسا لگتا تھا بوڑھا اپنی ہوسناکی کو آج ہی کی رات ختم کر ڈالنا چاہتا ہو۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتا ہو۔

صبح کے اُجالے پھیلنے لگے تاریکی دور ہونے لگی، بوڑھا تھکاوٹ کی وجہ سے گر کر سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی دن بہت زیادہ ہو چکا تھا۔ شانتی اس وقت بھی رات ہی کی حالت میں پڑی تھی۔ اس کی روح نے اُسے شانتی دے دی تھی، ہمیشہ کے لئے اس کی پانچ روزہ بھوک بھی شانت ہو چکی تھی۔

بوڑھا اٹھا ہاتھ میں پیسے لے کر بیا۔ پھر ایک نظر اس نے شانتی پر ڈالی۔ چہرہ پر نظر پڑتے ہی ایک گھٹی گھٹی سی چیخ اس کے حلق سے نکل گئی "میری شبنم" اور بوڑھا شانتی کے جوان مردہ جسم پر گر گیا۔ شاید اس کی کے لئے شانتی ہو چکی تھی۔

صبحِ جمہور

—— بشیر فاروقی

پھر سحر آئی خیالات نے انگڑائی لی
حریت کے لئے جذبات نے انگڑائی لی

فصلِ گل آئی تو زخموں کے دہن یاد آئے
عہدِ حاضر کے شہیدانِ وطن یاد آئے

ہم پہ غیروں کی حکومت تھی ہمیں یاد آیا
یہ بھی اک تلخ حقیقت تھی ہمیں یاد آیا

ہم کہ معتوب ہوئے اپنے وطن کی خاطر
ظلم کیا کیا نہ سہے گنگ و جمن کی خاطر

ہم اندھیروں سے لڑے جشنِ چراغاں کیلئے
خونِ دل ہم نے دیا صبحِ بہاراں کیلئے

حوصلے دیکھے تو حالات نے دم توڑ دیا
تھرتھرا کر شبِ ظلمات نے دم توڑ دیا

ہم وطن کے لئے پیغامِ بقا لے آئے
یعنی اک امن و اخوت کی فضا لے آئے

ہر طرف رقص میں ہے زندگیِ نو کی بہار
قابلِ دید ہے اب نانک و چشتی کا دیار

لمحے آئے ہیں تمناؤں کی سوغات لئے
وادیِ عصر سے خوابوں کے طلسمات لئے

صبحِ جمہور بصد ناز حسیں لگتی ہے
زندگی آج تو اک ماہ جبیں لگتی ہے

لے کے آئی ہے صبا عیش و مسرت کے پیام
نظمِ عالم کے لئے مہر و محبت کے پیام

دشت و در جشنِ چراغاں سے چمک اٹھے ہیں
کس قدر صبحِ درخشاں سے چمک اٹھے ہیں

کیف پرور ہے سماں سروِ لبِ جو کی طرح
مہکی مہکی ہے فضا زلف کی خوشبو کی طرح

حسنِ یکجہتی سے چہروں پہ نکھار آیا ہے
جذبۂ امن پسندی کو قرار آیا ہے

ہم کو تقریر کی تحریر کی آزادی ہے
رقص میں امن و مساوات کی شہزادی ہے

کون روکے گا ہمیں ہم تو جدھر جائیں گے
روشنی بن کے اندھیروں پہ بکھر جائیں گے

چیچک سے بچیئے

اس خطرناک بیماری سے اگر آپ کا بچہ مرنے سے بچ گیا تو وہ اندھا، گونگا، لنگڑا اور بدشکل نہ ہو جائے۔

بچاؤ کے لئے

۱۔ چیچک کا ٹیکہ لگوا لیئے۔ یہ ٹیکہ پیدا ہونے کے ایک ہفتہ کے اندر لگوانا بہتر ہے

۲۔ اگر آڑوس پڑوس میں ایک بھی چیچک کا مریض ہے تو فوراً قریب ترین ادارہ صحت اور ضلع یا شہر کے صحت آفیسر کو مریض کے پورے پتہ سے مطلع کیجئے تاکہ مرض کے پھیلاؤ کو روکا جا سکے۔

ـ ڈپٹی ڈائرکٹر سواستھ سیوا۔ قومی چیچک انسداد مہم اترپردیش کے ذریعہ جاری کیا گیا

ایک نفسیاتی کہانی

پیاسی آتما = پیاسی روح

ڈی۔ کے۔ کنول

میناکی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ میں بڑا آدمی بنوں میرے پاس کار ہو۔ بنگلہ ہو۔ نوکر چاکر ہوں۔ ہزاروں میرے ماتحت ہوں چپے کار ہو۔ اس نے زندگی میں کبھی بھی اپنے لئے کچھ نہ مانگا۔ جب بھی بھگوان سے کچھ مانگا تو وہ صرف میرے لئے مانگا۔ وہ مجھے تم سے آپ بنتے دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے "تم" جیسے ذلت آمیز لفظ سے نفرت تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ لفظ چھوٹے پن کی سلامت ہے۔ وہ چونکہ میرے بڑے پن کی متمنی تھی اسی لئے وہ تم کے تخاطب پر ہمیشہ برافروختہ ہو اٹھتی تھی۔ اس نے آج تک مجھے ایک بار بھی تم کہہ کر مخاطب نہ کیا تھا ہمیشہ مجھے آپ کہہ کر بلایا کرتی تھی اور میرے نام کے ساتھ "جی" کا لفظ استعمال کیا کرتی تھی۔ اس جی کے لفظ میں عزت تھی۔ بڑا پن تھا، احترام تھا اور پیار بھی تھا۔

مینا بڑی پُراسرار لڑکی تھی۔ اس کی ہر ادا اور ہر انداز، ہر بات نرالی تھی۔ وہ ہمیشہ میرے لئے ایک معمہ بنی رہی۔ وہ برسوں مجھ سے ملتی رہی۔ مجھے پوجتی رہی۔ مجھے چاہتی رہی لیکن اس سے متواتر مل کر بھی میں اسے سمجھ نہ سکا۔ میں نے جتنا اسے سمجھنے کی کوشش کی وہ زیادہ ہی پُراسرار بنتی گئی۔ میں نے اس کے دل کو بار ہا ٹٹولنے کی کوشش کی مگر میں اس کی دل کی گہرائیوں میں جھانک کر بھی اسے سمجھ نہ پایا۔ بس اس کی شخصیت کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ گیا۔

مینا میرے فن کی پرستار تھی۔ اور میں اپنے اس فن کی بدولت ہی اس کا قرب پا گیا۔ مینا زیادہ خوبصورت تو نہ تھی خدو خال معمولی تھے۔ آرائش جمال کا فن اسے آتا نہ تھا۔ اپنے رکھ رکھاؤ کی اسے کوئی فکر نہ تھی۔ رجھانے کا سلیقہ اس میں نہ تھا۔ اس میں ایک ہی خوبی تھی۔ اس کے باتیں کرنے کا انداز بڑا ہی دلکش اور دلنشین تھا۔ وہ بڑی میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتی تھی۔ ہر لفظ شہد آگیں ہوتا۔ بس اس کے باتوں کا انداز مجھے اس کا دیوانہ بنا چکا تھا۔ جب بھی وہ مجھ سے ملنے چلی آتی باتوں کا ایک ذخیرہ لے کر آتی۔ وہ سناتی میں سنتا۔ نہ ختم ہونے والے فسانے۔ نہ ختم ہونے والی باتیں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ہمیشہ اسی طرح بولتی رہے سدا اسی طرح چہکتی رہے۔

میناکے کئی روپ تھے۔ وہ ماں بھی تھی، بہن بھی تھی، محبوبہ بھی تھی اس نے مجھے ماں کی ممتا، بہن کی شفقت اور محبوبہ کا پیار بھی دیا۔ وہ جب پل بھر کے لئے میری دنیا میں چلی آتی تھی۔ تو یوں لگتا تھا جیسے میری زندگی کے ویرانے چہک اٹھے ہوں۔ خوشیوں سے میرا کمرہ بھر جاتا تھا۔ اس کی آتما کی ضیا سے میری زندگی میں اجالا ہی اجالا ہو جاتا تھا۔ میرے ہونٹوں کی منجمد مسکراہٹ پگھل جاتی۔ میرا روم روم خوشی سے جھوم اٹھتا۔ پھر نہ کوئی خلش ہوتی، نہ کوئی غم ہوتا۔ اور نہ کوئی تڑپ ہوتی۔ اس ایک پل کے ملن میں میں شرابور ہو جاتا تھا۔

میں اسے الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر لوگوں کے سامنے

پیش کرتا رہا۔ وہ جب بھی میری کوئی کہانی پڑھتی تو گھنٹوں اس کے اثر میں کھوئی رہتی۔ کتنی ہی بار میں نے اُسے چپکے سے آنسو بہاتے بھی دیکھا۔ وہ میرے فن کی پرستار تھی۔ اُسے میری کہانیاں اچھی لگتی تھیں اس لئے نہیں کہ میری کہانیوں میں ہمیشہ اُسے مرکزیت حاصل رہتی۔ بلکہ اس لئے کہ میرے اندر چھپے ہوئے فنکار کے ساتھ اُسے والہانہ محبت تھی مگر مجھ سے۔ میں جو ایک فنکار بھی تھا اور ایک انسان بھی تھا اور میرے دل کے کچھ تقاضے بھی تھے وہ انہیں نظر انداز کیوں کرتی تھی۔ میری کہانیاں پڑھ کر وہ بےچین اور گھائل ہو اٹھتی تھی لیکن میری حالت دیکھ کر وہ انجان کیوں بن جاتی تھی۔ یہ سوالات میرے لئے پریشان کن تھے اور ان کا جواب مجھے مینا سے بھی مل نہ سکا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میرے لئے پُراسرار تھی۔

مینا نے مجھے گمنامی کے تاریک غار سے نکال کر لوگوں کے سامنے پیش کیا ——— مجھے عزت ——— مجھے نام ملا یہ سب اُسی کی دین تھی۔ عزت اور نام سے بھی بڑھ کر مجھے جس چیز کی تلاش تھی وہ مجھے مل نہ سکی۔ زندگی بھر کی خوشی اور راحت۔ مینا کی دائمی قربت اور محبت۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مجھے پوجتی رہی، مجھے چاہتی رہی لیکن اُس نے کبھی زبان سے اس کا اظہار نہ کیا۔ اُس نے کبھی مجھ سے میرا ہاتھ نہ مانگا۔ مجھے اپنے غم بانٹنے کے لئے نہ کہا۔ میرے زخموں پر پیار بھرے پھائے رکھنے کی کوشش نہ کی۔ اُس کے پیار میں شدت تھی نہ گرمی تھی۔

انسان کے اپنے جذبات بڑے خودغرض ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے جذبات کی تسکین کے لئے دوسروں کے جذبوں کو روند ڈالتا ہے۔ میں بھی انسان تھا اور میرے سینے میں بھی ایک دل دھڑک رہا تھا۔ میں مینا کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے جیون کی ڈور سے کس کر باندھ کے رکھنا چاہتا تھا۔ میں ہمیشہ کے لئے اُس کے پر کتر کر اُسے اپنی نگاہوں کی قید میں رکھنا چاہتا تھا۔ اُس کی دلنشین باتوں پر، اُس کی دلآویز مسکراہٹوں پر اور اُس کی دلفریب اداؤں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا اجارہ قائم رکھنا چاہتا تھا۔ ایک روز میں نے دبی زبان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا۔

"مینا میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

مینا پہلے چونکی لیکن پھر ایک دم سنبھل کر ہنستے ہوئے بولی۔

"ابھی تک تو آپ اچھے بھلے تھے۔ یہ اچانک اپنے آپ کو روگ لگانے کا خیال کیوں کر پیدا ہوا؟"

"یہ مت بھولو کہ میں ایک انسان ہوں۔ میرے بھی کچھ تقاضے ہیں کچھ خواہشیں ہیں۔ میں بھی دوسروں کی طرح چاہتا ہوں کہ میری شادی ہو۔ میرے بچے ہوں ——— یہ کب تک میں اپنے آپ کو مارتا رہوں گا۔ کب تک میں اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹتا رہوں گا اپنے دل کے تقاضوں کو پامال کرتا رہوں گا ——— شادی کرنا کوئی گناہ نہیں یہ سلسلہ تو ازل سے چلا آرہا ہے اور ابد تک چلتا رہے گا ——— یہ دستور ہے قدرت کا اسے تم توڑ سکتی ہو اور نہ میں ———"

مینا تھوڑے توقف کے لئے خاموش رہی لیکن جب اُس کے لب ہلے میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ مینا کے ہاں یا نا پر میری زندگی کا دار و مدار تھا۔

"مرد فرشتہ بھی ہو آخر کار اپنے اصلی روپ میں آجاتا ہے ——— میں نے سوچا تھا کہ آپ ہی ایک واحد شخصیت ہیں جو جسمانی بندھنوں میں یقین نہیں رکھتے مگر آج آپ اپنی خواہشات کے آگے جھک گئے۔"

مینا کی بات میرے کلیجے میں تیر کی طرح لگی لیکن میں نے مینا کے سامنے اس بات کو ہنسی میں ٹال دیا۔ جب وہ چلی گئی تو سینے میں پڑی ہوئی کرچیں میرے دل و جگر کو لہو رلانے لگیں۔ میں اُس کی باتوں کی چبھن سے کئی روز تک اندر ہی اندر تڑپتا رہا۔ تلملاتا رہا ——— میں نے آنکھوں سے اتنے بے حساب آنسو بہا دیئے کہ اشکوں کے سرچشمے بھی سوکھ گئے۔

ایک روز جب وہ ملی تو میری صورت دیکھ کر اُس کے منہ سے ہنسی کا فوارہ اُبل پڑا۔ وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔

"یہ آپ نے کس کی یاد میں اپنا گریبان چاک کر دیا ہے کنول جی ———؟"

میں کچھ نہ بولا بس اپنے آنسو پی کر رہ گیا۔ میں لاکھ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنی دل کی کیفیت سے آشنا نہ کر سکا۔ میری زبان پر جیسے تالے پڑ گئے۔ الفاظ نے میرا ساتھ نہ دیا۔ دل کی جو بات تھی وہ دل

میں رہی اور اسی کشمکش میں لیل و نہار گزرتے رہے۔

ایک روز میں مینا سے ملنے اُس کے گھر چلا گیا وہ گھر میں نہیں تھی۔ سبزی خریدنے کے لئے بازار گئی ہوئی تھی۔ گھر میں اُس کی ماں تھی۔ اُس کا باپ کئی سال پہلے مر چکا تھا۔ اور کوئی بھائی بہن نہ تھا۔ ماں بھی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اُس کی ماں مجھے جانتی تھی۔ اور میری بیحد عزّت کرتی تھی اُس نے جب مجھے دیکھا تو وہ میری اچانک آمد پر اپنی دلی مسرت چھپا نہ سکی۔ مجھے بٹھاتے ہوئے بولی۔

"کب سے تمھارے پاس آنے کی سوچ رہی تھی پر کیا کروں بیٹا۔ ایک طرف یہ موا بڑھاپا اور دوسری طرف مینا کی ذمہ داری"

"کیا کوئی خاص کام تھا مجھ سے۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"بیٹا مینا کو تو تم جانتے ہی ہو۔ ضد تو اُس کی جبلت میں شامل ہے۔ تم سے کیا چھپاؤں بیٹا۔ مینا کے لئے کئی جگہوں سے رشتے آرہے ہیں مگر اُسے کوئی لڑکا پسند [illegible] نہیں [illegible] ہے کہ شادی ہی نہیں کروں گی۔"

"شادی نہ کرنے کی کوئی خاص [illegible] ہوگی؟" میں نے تجاہلِ عارفانہ سے پوچھا۔

"وجہ کچھ نہیں۔۔۔ بس یونہی اُسے ماں کو ستانے میں مزہ آرہا ہے۔ تم اگر چاہو تو مینا شادی کے لئے آمادہ ہو سکتی ہے۔"

"میں۔۔۔؟" میری آواز حلق میں اٹکنے لگی۔ سارا سرور، ساری شوخی ہوا ہو گئی۔ ہمت کر کے میں نے پوچھا۔ "کیا میرے کہنے سے وہ مان جائے گی۔۔۔؟"

"تمھارے ایک اشارہ پر وہ آگ میں کود سکتی ہے۔"

اسی اثنا میں مینا بھی آگئی۔۔۔ مجھے دیکھ کر وہ بند کلی کی طرح کھِل اُٹھی۔ سبزیوں کا تھیلہ ایک طرف پھینک کر وہ کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ماں چائے بنانے کے بہانے رسوئی میں چلی گئی۔

"آج اس گھر کا رخ کیسے کیا۔۔؟" اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مینا۔ تم۔۔۔ تم شادی کیوں نہیں کرتیں۔۔۔؟"

"اچھا یہی کہنے آئے ہیں آپ۔۔۔؟" مینا میری طرف عجیب نظروں سے دیکھ کر بولی لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اپنے آپ کو سنبھالا دے کر گمبھیر لہجے میں بولی۔ "آپ ماں جی کو [illegible] [illegible]

پسند [illegible]"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میری امیدوں کا شیش محل ایک چھناکے کے ساتھ چور چور ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ یہ کیا کیا میں نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے خوابوں کے گھروندے کو مسمار کر دیا۔ خود ہی اپنے ارمانوں کا خون کر ڈالا میں نے۔ اپنی زندگی کے سفینے کو کسی اور ناخدا کے سپرد کر دینے کا سامان بھی کر لیا میں نے۔

میں زبردستی چائے کے چند گھونٹ حلق سے نیچے اُتار کر وہاں سے چلا آیا۔

چند روز کے اندر اندر مینا کی شادی ہو گئی۔ میں دُور کھڑا اپنا گھر پھونک کر تماشہ دیکھتا رہا۔ اپنی بربادی کا نظارہ کرتا رہا۔ مینا میرے ارمانوں کی ڈولی میں سوار ہو کر مجھ سے رخصت ہوئی۔ جُدا ہوتے وقت وہ بے حد خوش تھی۔ اُسے مجھ سے بچھڑنے کا کوئی غم نہ تھا۔

مینا کی جُدائی کے غم نے میرے وجود پر تاریکیاں بکھیر دیں۔ خوشی و مسرت میرے لئے عنقا ہو گئی۔ مسکراہٹ ہونٹوں پر منجمد ہو گئی۔ بس رونا اور تڑپنا میرا مقدر بن گیا۔ اب نہ جینے کی کوئی اُمنگ تھی اور نہ مرنے کا کوئی ڈر تھا۔ زندگی میرے لئے اب ایک بوجھ بن چکی تھی۔ میں اپنے ارمانوں کے لاشے کو اپنے کندھوں پر اُٹھائے بے نیل و مرام بھٹکتا رہا۔ اب نہ کسی منزل کی تلاش تھی۔ نہ کوئی مقام اپنا تھا۔

مینا خاوند کے ساتھ نبھاہ نہ کر پائی۔ مینا کے سوچنے کا ڈھنگ الگ تھا اور اُس کے خاوند کا الگ۔ دونوں میں کوئی ہم آہنگی نہ تھی کوئی بات مشترک نہ تھی۔ دونوں ریل کی متوازن پٹریاں تھیں۔ شروع شروع میں دونوں میں نوک جھونک ہوتی رہی۔ نوبت مار پیٹ، پھر پٹ پٹ گئی۔ مینا بڑی خود دار اور خود سر لڑکی تھی۔ وہ محکوم بن کر جینا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے ڈنگروں کی طرح جینا کسی بھی قیمت پر گوارہ نہ تھا۔ وہ اپنے خاوند کو ٹھکرا کر چلی آئی۔

میں جب اُس سے ملنے اُس کے گھر پہونچا تو میری آواز سن کر وہ دوڑتی ہوئی دوسرے کمرے سے نکل آئی اور میرے قدموں پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے مینا کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔

"آپ کہاں تھے کنول جی ——؟" وہ سسکیوں کے بیچ بار بار مجھ سے پوچھتی رہی تھی۔ میں بُت بنا کھڑا رہا۔ سوچ رہا تھا کہ مینا کو کیا جواب دوں۔ کیسے اُسے اپنی بربادی اور تباہی کی داستان سنا دوں ——

کس طرح اُس کے سامنے اپنے دکھڑے روؤں جب کہ وہ خود اپنے دکھڑے رونے کے لئے میرے قدموں سے لپٹ چکی تھی۔

میں نے اُسے بانہوں کا سہارا دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کی ماں ایک کونے میں بیٹھی چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ اپنے آنسو پونچھ کر اُس نے مینا کو رسوئی میں بھیج دیا اور میرے قریب آ کر مجھ سے پوچھ اُٹھی ——

"بیٹا تم کہاں چلے گئے تھے ——؟"

"میں ایک ضروری کام سے بمبئی چلا گیا تھا۔" میں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا —— قدرے توقف کے بعد میں نے پوچھا "سنا ہے مینا ——؟"

"ہاں بیٹا تم نے ٹھیک سنا ہے —— مینا کو تو تم جانتے ہی ہو —— کتنی ضدی ہے یہ سہر تھی تو وہ سوا سیر نکلا —— دونوں نباہ نہ کر پائے۔ یوں سمجھو کہ لوہا لوہے سے ٹکرا گیا۔

اب یہ وہاں جانے کے لئے کسی طرح بھی آمادہ نہیں ہو رہی ہے۔ میں کیا کروں میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے؟"

"غصہ ٹھنڈا ہونے دیجئے۔ خود ہی چلی جائے گی ——"

میں بہت دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ مینا کھانا بنانے کا بہانہ کر کے بہت دیر تک نہیں لوٹی۔ میں بادلِ نخواستہ وہاں سے چلا آیا۔

ایک روز میں یونہی اُس سے ملنے چلا گیا۔ وہ صحن میں بیٹھی سوئٹر بن رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ فوراً کھڑی ہو گئی اور کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"بیٹھ جائیے ——!"

میں بغیر کسی حجت کے بیٹھ گیا۔ میں نے سوئٹر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "یہ کس کے لئے سوئٹر تیار کیا جا رہا ہے ——؟"

جواب میں اُس نے خاموشی اختیار کی مگر اس کی خاموشی میں ہی میرے سوال کا جواب پنہاں تھا۔ وہ بچے کی ماں بننے والی تھی۔

"میں اب وہاں ہرگز نہیں جاؤں گی جہاں انسان کی کوئی قدر نہیں۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں۔ مجھے اپنے لئے ایسی موت منظور نہ تھی اس لئے میں بھی بندھن توڑ کر چلی آئی ہوں۔ مرتے دم تک اُن لوگوں کا منہ نہیں دیکھوں گی ——"

میں نے کچھ نہیں کہا بس خاموشی سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔

جب میں جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی فوراً کھڑی ہو گئی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر بولی ——

"میں دو چار روز کے بعد ہسپتال میں داخل ہو رہی ہوں۔ آپ مجھے دیکھنے آیا کریں گے نا ——؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور تیزی کے ساتھ وہاں سے نکل پڑا۔

پھر ایک روز میں نے ایسی روح فرسا خبر سنی جس نے میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ مینا ایک بچے کو جنم دے کر جانبر نہ ہو سکی۔ میری چھاتی پھٹ گئی۔ میرا دل و جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس غیر متوقع سانحے نے میرے دل و دماغ کو ماؤف کر دیا۔ میں کتنا بدقسمت ہوں کہ میں مینا کی موت کا نوحہ بھی نہ کر سکا۔ میں رو بھی نہ سکا۔ اس گہرے اور جانکاہ صدمے سے میرے آنسو بھی خشک ہو چلے۔

مینا مر گئی لیکن اس کی موت نے اس راز پر سے پردہ اُٹھا دیا۔

میں نے ہمیشہ اُسے غلط سمجھا لیکن اُس نے مجھے غلط نہ سمجھا۔ وہ مجھے جی و جان سے چاہتی تھی جس کا اعتراف اُس نے اپنی ڈائری میں کیا تھا۔ وہ مجھ سے شادی کرنا بھی چاہتی تھی لیکن اُس کی آتما نے اُسے ایسا کرنے کی اجازت نہ دی۔ وہ مجھے بڑا آدمی بنتے دیکھنا چاہتی تھی۔ اُس نے میرے اندر ایک مہان کلاکار کو چھپا ہوا پایا تھا۔ وہ میرے اندر کے فنکار کو محبت کی سولی پر چڑھا کر اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مار ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے مجھ سے کہیں میرا فن زیادہ پیارا تھا۔

آج اُس کے خواب حقیقت بن چکے ہیں۔ اُس کی آرزو پوری ہو چکی ہے۔ آج میں سچ مچ بڑا آدمی بن گیا ہوں۔ فن کی بدولت اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ یہ اسی کی دین ہے۔

غزل

ایس-این سنہا

میں تو جب بھی کوئی چشم تر نظر آئی
دل ملا ہے کہ اپنی بھی آنکھ بھر آئی

بیاد ساقیٔ مہوش بفیض بادہ و جام
جو شام آئی بہ تابانیٔ سحر آئی

ہمیں نے اشک بہائے ہوں ایسی بات نہیں
یہ واقعہ ہے کہ اُن کی بھی آنکھ بھر آئی

شوق گئی تھی نگاہ ناز کی سمت
اب دشعر کی موجوں میں ڈوب کر آئی

اُسی کے دم سے تھی دنیائے آرزو شاداب
وہ ایک یاد جو رہ رہ کے عمر بھر آئی

بیان کر نہ سکیں، نام دے سکیں نہ جسے
نگاہ ناز میں وہ کیفیت نظر آئی

ں میں کس کو قرار و ثبات حاصل ہے
ت عشق ہی کچھ معتبر نظر آئی

دل اک سرائے ہے بوسیدہ سی کہ جس میں کبھی
اُمید آئی تو آمادۂ سفر آئی

نظر کی بات ہے تاریکیوں کے پردے میں
ہمیں تو روشنی ہی روشنی نظر آئی

نشاطِ عشق کے تیور کچھ اور تھے لیکن
غموں کی آنچ ملی زندگی نکھر آئی

سکونِ دل کی تمنا میں زندگی سنہا
اس انجمن سے نکل کر نہ راہ پر آئی

उत्तर प्रदेश में स्वर्ण नियंत्रण से प्रभावित व्यक्तियों के पुनर्वासन हेतु शासन द्वारा प्रदत्त सुविधाएँ

१. पुनर्वासन ऋण सम्बन्धी विशेष सुविधाएँ और सहायता।

२. उद्योग हेतु बिजली, कच्चा माल आदि।

३. कक्षा ७ से १० तक की छात्रवृत्तियां।

४. तकनीकी प्रशिक्षण सम्बन्धी सुविधाएं।

५. वर्ग ३ व ४ की नौकरियों में विस्थापितों को प्राथमिकता व अन्य सुविधाएं।

६. बस, टैक्सी तथा टैम्पो: स्कूटर रिक्शा: के परमिट हेतु प्राथमिकता व अन्य सुविधाएं।

७. सस्ते गल्ले, शक्कर, कोयला डिपो, मिट्टी के तेल आदि की दुकान संबंधी सहायता।

८. दीन, दुखी, रोगी व असहाय व विस्थापित स्वर्णकारों को अनुदान सहायता।

९. ऋण प्राप्त व्यक्तियों को स्वर्णकारी का कार्य हेतु प्रमाणपत्र संबंधी सुविधाएं।

उपरोक्त तथा अन्य किसी भी प्रकार की कठिनाई या समस्या के निराकरण व अन्य जानकारी के लिये निम्न पते पर लिखें।

जगदीश प्रसाद सिंह
स्वर्ण नियंत्रण अधिकारी, उत्तर प्रदेश
एवं अनुसचिव, उत्तर प्रदेश शासन, उद्योग व आबकारी
विभाग एवं सचिव, राज्य परामर्शदात्री समिति
उत्तर प्रदेश, लखनऊ

افسانہ

ننگی دیوی

حسن جعفری

کالی رات نے نیم روشن شام کے چہرے پر تاریکی کی نقاب الدی. ماحول پر وحشت کا جال پھیل گیا۔ دور ـــــ اونچی چوٹی سے ایک سایہ لڑھکتا ہوا زمین پر آیا اور وقت کی اندھیری کھائی ں بیٹھ کر مفکرانہ انداز میں زندگی کی پرپیچ گلیوں کا معائنہ کرنے ا. دورِ حاضر کی تیزابی ہوائیں اس کے اخلاص سے بھیگے م کو جلا کر خشک کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ وہ احساس کرب سے کراہ اٹھا اور بے چین ہو کر ٹہلنے لگا۔

یکایک اس کے ذہن کے وجود کو عہد حاضر کے ہریلے ناگ نے ڈس لیا. اور پھر ـــــ وہ چکرا کر پڑا اور نہ جانے کب تک بے ہوشی کے گہرے ساگر ں ہچکولے کھاتا رہا.

ہوش آتے ہی خود کو ایک خوبصورت پارک میں ا. چاروں طرف برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ وہ حیرت زدہ ہوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا ـــــ یکایک ں کی نظریں ایک لڑکی پر جم گئیں۔ وہ لڑکی حسن و جمال دلآویز زندہ مورت سے کم نہ تھی.

اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا ـــــ "کہیں دوسری دنیا میں تو نہیں ـــــ؟"

اس کی نظریں ٹھہر نہ سکیں، کیونکہ وہ لڑکی برہنہ تھی. بڑے ہی دلفریب انداز سے اٹھی اور شوخی سے اٹھلاتی قریب آ کر بولی ـــــ "تم سو چکے۔ چلو! ـ گھر چلیں"!! ... اختیار کر چکا تھا اس نے اعتراض کرنا

چاہا، لیکن وہ لڑکی اس کے گلے میں باہیں ڈالکر اس سے لپٹ گئی. اس کے جسم میں برقی رو دوڑتی محسوس ہوئی اور اس نے محسوس کیا کہ وہ بھی ننگا ہے. وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

اس نے ندامت آمیز لہجہ میں پوچھا ـــــ "میرے کپڑے .... کہاں ہیں ـــــ ؟"!

لڑکی کے منہ سے قہقہوں کا آبشار ابل پڑا اور اس نے مسکراتے ہوئے طنز بھرے لہجے میں کہا ـــــ "فکر نہ کرو پیارے! یہ دنیا ہی ننگوں کی ہے. یہاں سے شرم و حیا کی ارتھی میرے پیدا ہوتے ہی اٹھ گئی۔ یہاں جوانی ایک بہتے ہوئے ساگر کے مثل ہے. اس دنیا سے شرافت اور انسانیت ہمیشہ کے لئے اپنا منہ کالا کر چکیں. یہ وہ دنیا ہے جہاں مائیں، بہنیں اور بیٹیاں ـــــ سبھی اپنے جسم پر کپڑے کے وجود سے کانپ اٹھتی ہیں. ـــــ اسطرف دیکھو! وہ ہوس کا حمام ہے، جہاں انسان کے احساسات، خواہشات جذبات، تصورات، امنگیں، عقیدے، اخلاص اور تہذیب و تمدن سبھی ایک ساتھ ننگے ہیں ـــــ اور آج ـــــ تم بھی ننگے ہو گئے ـــــ"!

"نہیں، نہیں ـــــ میں ننگا رہ کر جی نہیں سکتا۔ خدا کے لئے مجھے ننگا نہ رکھو اور میرے کپڑے واپس کر دو ـــــ"!

.... لیکن اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی.

اور اس نے دیکھا. بیسویں صدی کی ننگی دیوی قہقہے لگا رہی تھی ـــــ !!!

ناولٹ

پیار کا بندھن ٹوٹے نا —!

عطیہ پروین

(تیسری قسط)

نے ہنس کر دیبا کو دیکھا دیبا کے خوف زدہ چہرہ پر مسکراہٹ نہ پھیل سکی۔ اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا پر چھوٹے میاں کی گرفت مضبوط تھی۔

"شبراتن بوا، چلو روٹی پکاؤ آج میں کھانا جلدی کھاؤں گا"

"ایں میاں! وہ کہاں گئیں؟" شبراتن نے بات ادھوری چھوڑ کر پوچھا ساتھ ہی ان کی نظر دیبا پر پڑی اور حیرت کی زیادتی نے ان کو گنگ کر دیا؛

"وہ کون؟ تمھاری ملازمہ..... ؟؟؟" چھوٹے میاں نے پوچھا اور سختی سے جبڑے بھینچ لیے۔

"اے نہیں میاں۔ اللہ یہ روزی نہ کرے.... میرا تو مطلب تھا....."

"ندیم..... کیا بات ہے؟" چچی کی کڑک معاذ اللہ! دیبا کا چہرہ سفید ہو گیا۔ فریادی نگاہوں سے اس نے چھوٹے میاں کو دیکھا۔

"میرے حال پر رحم کیجئے چھوٹے بھائی....."

چھوٹے میاں کو ڈر ہوا کہیں دہشت سے اس کے ننھے سے دل کی دھڑکن نہ رک جائے۔ انھوں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور بے حد اطمینان کے ساتھ چچی کی طرف مڑے۔ چچی اپنے بڑھے ہوئے پیٹ پہ پائجامہ چڑھاتی دوسرے ہاتھ سے پائنچے سنبھالتی دونوں کے نزدیک آ گئی تھیں۔ تیز و تند نگاہیں دیبا کو

"ندیم! تم ہر وقت یہ ناٹک سا کیا کھیلنے لگے ہو۔ سارا وقت تمھارا اب گھر کے اندر گزرتا ہے وہ بھی باورچی خانے کے طواف میں۔ ان کی آواز بتدریج سخت اور اونچی ہوتی جا رہی تھی یہ سب کیا ہے آخر؟ میں اس کو برداشت نہیں کر سکتی! او نیا ہاتھ پکڑے دیکھ کر کیا کچھ نہ سوچ لے گی۔ اور اس بدنصیب نے تو حیا شرم گھول کر پی لی ہے۔ کیا مزے سے ہاتھ میں ہاتھ دیئے کھڑی تھی۔ موئی مکارہ! یاد رکھ میرے جیتے جی میرے لڑکے کے ساتھ تو کھل نہیں کھیل سکتی....."

چھوٹے میاں نے ماں کی بات کاٹ لی۔

"اماں! شریفوں کی طرح بولنا سیکھیے! دیبا کا ہاتھ جل گیا ہے میں نے دوا لگائی تھی....."

"تم ہی رہ گئے تھے دوا لگانے کے لئے....." چچی کا بس نہ چل رہا تھا کہ دیبا کو مچھلی کی طرح زمین پر رگڑ ڈالیں۔

"اور کس کو ہمدردی ہے اس غریب سے..... دیبا اپنا ہاتھ دکھاؤ....."

"دور ہو میں نہیں دیکھتی ہاتھ واتھ۔ دیدے پھاڑ پھاڑ کر میرے لڑکے کو تک رہی ہو گی بھون لیا ہاتھ، چولھے میں جائے..... چلو باورچی خانے میں جاؤ....."

"نہیں! شبراتن کھانا تیار کرے گی....."

"ندیم! میں کہتی ہوں قیامت ڈھا دوں گی، حلق کے بل چیخنے میں چچی کو کھانسی آ گئی۔

Department of Tourism, Uttar Pradesh

Invites you

To visit Religious, Historical, Archeological, Places of Budhist interest, and Hill Resorts.

For Assistance and guidance,

Contact

Uttar Pradesh Government Tourist Bureaux:

1. Tourist Bureau, Parade Kothi, Varanasi.
2. Tourist Bureau, Stadium building The Mall Agra.
3. Tourist Bureau, Laltarao Bridge, Hardwar.
4. Tourist Bureau, Gandhi Road, Dehra Dun
5. Tourist Bureau, Near Bus Station, Kotdwar, (Pauri Garhwal)
6. Tourist Bureau, Opposite Rly. Station, Ayodhya.
7. Tourist Bureau, Rishikesh, Dehra Dun.
8. Tourist Bureau, Rly Station, Kathgodam.
9. Tourist Bureau, 6, Sapru Marg, Lucknow.
10. Tourist Bureau The Mall Naini Tal.
11. U P. Government Tourist Bureau. Chandralok Building 36 Janpath, New Delhi
12. Tourist Bureau, Pilgrim Shed, Sri Nagar. (Pauri Garhwal
13. Tourist Bureau, Bus Station, Ranikhet.
14. Tourist Bureau, Mall Road Mussoorie
15. Tourist Bureau, Bus Station, Almora.

*****Issued by the Director of Tourism, U P.*****

قیامت تو ایک نہ ایک دن آنا ہی ہے اماں……
شبراتن۔ وہ گرج کر بولے۔ اٹھو چولھے کے پاس جاؤ۔
بہت دن آرام کیا اب اپنا کام سنبھالو، کل سے میں نے تمھیں
پلنگ پر بیٹھے گاتے دیکھا تو اچھا نہ ہوگا …… دیبا اب
باورچی خانے میں قدم نہیں رکھے گی……۔
ان کا جلال دیکھ کر چند لمحوں کے لئے چچی بھی دم بخود رہ گئیں۔
میاں نے عقب سے آکر بیوی کا ہاتھ پکڑ کر دبایا اور برآمدے
کی طرف لئے چلے گئے۔ چچی ان کے ساتھ گھسٹ تو رہی تھیں
مگر یوں جیسے کوئی ادھ کچلی ناگن!

---

(۷)

کلوتا لاڈلا لڑکا!
ماں نے ہمیشہ اس کے نخرے اُٹھائے۔ ہر خواہش پوری کی۔
جس بات کے لئے مچلا بارہ بجے رات میں بھی پوری کر کے دی۔
چچی کی کور اگر دبتی تھی تو چھوٹے میاں سے۔ چیخ چلا لیتیں۔
جھڑک لیتیں خفا ہو جاتیں لیکن چھوٹے میاں کی بات ٹل جائے
یہ محال تھا۔
اب تک انھوں نے دیبا کو جس طرح چاہا رکھا تھا۔ میاں کو سر اٹھانے
کی مجال نہ تھی گھر میں اور کوئی ایسا تھا نہیں۔ بیٹی ماں سے دو قدم
آگے تھی سسرال سے چند روز کے لیے آتی لیکن دیبا کا کچومر نکال
کر جاتی۔ گوشت پوست کی اس مشین کو بے تکان کام کے ساتھ
ساتھ اٹھتے بیٹھتے بات بے بات پر وہ کچوکے دیئے جانے کہ
روح تک لرز اٹھتی۔ داماد اگر نظر اٹھا کر اس ڈرے سہمے پیکر
کو دیکھ لیتے تو ساس انگاروں پر لوٹنے لگتیں اور بیوی کئی بار
جتانے کر بھی کھڑی ہو گئی تھی۔
ماں بیٹی دن بھر میٹھی باتیں کرتیں، آنے والوں سے ہنستیں اٹھلاتیں
دیبا فرح کے بچوں کو سنبھالتی نہلاتی دھلاتی کھلاتی پلاتی وقت
پر کھانا بھی تیار کرتی بستر وغیرہ بچھانے بھی پہونچاتی فرح کے سر
[illegible]

بسا ہوا ابٹن بھی ملتی……!
محلے والیوں کو ترس آجاتا نہ آتا تو ان ماں بیٹیوں کو!
لیکن جب سے چھوٹے میاں آئے تھے، دیبا کے دن پھرتے
جا رہے تھے۔ خطرے کا گھنٹہ چچی کی عین چاند پر بجنے لگا تھا۔ لاکھ
مٹنے اور خاک ہونے پر بھی دیبا میں وہ کشش تھی کہ دلوں کو
کھینچ لیتی۔ چچی نے فرح کو تار دیا فوراً آؤ!
فرح ماں کے خطوط سے چھنک چکی تھی سمجھ گئی کوئی خطرناک بات
ہے اٹھی اور چل دی۔ میاں مولوی ٹائپ آدمی تھے چھل فریب
کیا جانتے بس چلتا تو ہر وقت مصلے پر بیٹھے رہتے۔ بچوں اور
بیوی کی وجہ سے ان کی مشغولیات میں خلل آتا تھا، بخوشی اجازت
دے دی۔ تار جانے کے تیسرے ہی دن فرح مع ۵ عدد بچوں
کے دھم سے میدان جنگ میں کود پڑی! دیبا کی رہی سہی جان
بھی نکل گئی چچی کے ظلم و ستم میں کچھ کمی بھی رہ جاتی لیکن فرح کا
دل پتھر تھا پتھر! اس کو رحم نہ آتا۔ دونوں ماں بیٹی نے
بڑی دیر تک سر جوڑ کر کانا پھوسی کی پھر فرح نے ایک لمبی ہوں
کے ساتھ سر سے پیر تک دیبا کو دیکھا۔ یہ نظر تھی یا خنجر! دیبا کے
ٹکڑے اڑنے لگے
"ایک مرد کو کھا کر نیت نہیں بھری…… اب میرے بھائی کو شیشے
میں اتار رہی ہو؟ یاد رکھو دیبا بیگم! کچا چبا جاؤں گی!"
"تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے فرح۔ خدا کی قسم میں نے آج تک سوچا
بھی نہیں"
دیبا غیرت اور ذلت کے بوجھ سے پسینہ پسینہ ہو گئی — !
چھوٹے میاں اس کے سارے احساس بیدار کیے دے رہے
تھے اس کا دیبا کو اعتراف تھا ورنہ وہ اپنے آپ کو گونگا بہرا بے حس
سب ہی کچھ بنا چکی تھی۔
"غلط فہمی نہیں ہوئی ہے۔ تمھارے کاٹے کا کوئی منتر نہیں ہے
مکار عورت" فرح کے لہجے میں نفرت اور حقارت کا ایک دریا چھپا
ہوا تھا۔ "مگر میں نے کہا نا میں کچا چبا سکتی ہوں"
"معاف کرو [illegible] …… اس زندگی سے میں خود عاجز ہوں"

"دیکھتی ہو فرح! اب یہ سوالی جواب بھی کرنے لگی ہے...؟"
چچی نے جھلا کر کہا۔ فرح نے چھوٹے بچے کو دیبا کی طرف بڑھاتے ہوئے حاکمانہ انداز میں کہا۔
"لو گڈو کو پیشاب کروا لاؤ، کہیں جھٹ وہ وٹ نہ لگنے پائے"
پھر ماں سے بولی۔ "ارے اماں اب دیکھیے آگے کیا کرتی ہے مگر میرا نام بھی فرح نہیں اس کو مچھلی کی طرح اُدھیڑ نہ پھینکوں......"
ہر بار کی طرح فرح نے بھائی کا کلر نہیں بڑھانہ تڑپ کے ساتھ ملا۔ کھنچی کھنچی اینٹھی اینٹھی! چھوٹے میاں نے دیبا کی طرف سے اپنے برتاؤ کو اس پر بھی نہ بدلا۔ وہ فرح کو دیبا پر حکم چلاتے دیکھتے تو پیچ و تاب کھانے لگتے مگر آل بہن سے سختی تو نہ کر پاتے پھر بھی سمجھاتے اور پردے پردے میں نصیحت کرتے رہتے۔!
گھر میں عجیب سی کھینچا تانی ہونے لگی تھی۔ اور اس کشمکش میں دیبا کا اچار نکلا جا رہا تھا۔ چھوٹے میاں آفس چلے جاتے تو فرح بالکل ہی آزاد ہو جاتی۔ وہ وہ باتیں کرتی کہ دیبا کا خون کھول کھول کر خشک ہونے لگتا۔ بندلیوں کے عقب میں غم و غصہ کا ایک طوفان ٹکرانے لگتا۔ خشک آنکھوں کے پیچھے آنسوؤں کا ایک دریا ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔
چھوٹے میاں کی ہمدردی اس کو کس قدر مہنگی پڑی تھی۔
پہلے دیگچی کی پونچھن ہی مل جاتی تھی اب اکثر اس کو نمک کے ساتھ روٹی کے چند لقمے پیٹ کے دوزخ میں اُتارنا ہوتے۔ پہلے چائے کے نام سے کیتلی کا دھوون مل جاتا تھا اب باقی بچنے والی چائے کو نالی میں انڈیل دیا جاتا۔! ایک روز فرح نے سب کی جھوٹی پیالیوں میں بچے ایک ایک دو دو گھونٹوں کو ایک پیالی میں بھر کر بڑے طمطراق کے ساتھ دیبا کو چائے دی تھی۔ دیبا نے ایک نظر پیالیوں پر ڈالی جن کے پیندے صاف تھے دوسری بھری ہوئی پیالی پر......! اس کا چہرہ سرخ ہو گیا...... مگر اس کو صبر کی انتہا دکھانا تھی، اپنے آپ پر قابو پا کر جھوٹے برتن سمیٹنے لگی۔ فرح کا منجھلا لڑکا اور چائے اور چائے کی رٹ لگائے تھا۔ بڑے نے دیبا کو دی گئی پیالی اٹھا کر بھائی کے ہاتھ میں تھما دی۔ ابھی وہ ہونٹوں تک لے بھی نہ گیا تھا کہ فرح چیل کی طرح جھپٹی اور پیالی اس کے ہاتھ سے چھین کر میز پر پٹک دی۔
"خدا سمجھے تجھے پپو، جھوٹی چائے دے دی اس کو....."
"تو کیا ہوا ممی! آپ ان کو دے رہی تھیں، خراب ہوتی تو ان کو کیوں دیتیں....." پپو ٹائیں سے بولا۔
"اللہ نہ کرے کوئی اس جیسا لاوارث اور بے غیرت ہو۔ جھوٹی نہیں تو کیا دم کر کے دی جائے گی......" فرح خواہ مخواہ چلا کر بولی۔ موئی ٹکڑ گدی...؟
دیبا کی اداس نظریں اس کی سمت اٹھیں، لب کانپے اور ٹھرے ہاتھوں میں کپکپانے لگی۔
"سنبھال کے! سنبھال کے، حرام کا تو ہے نہیں جو ٹوٹے تو اور آ جائے...... جیسے تم اب تحفے تحائف لینے لگی ہو...... اس سے تو اچھا ہے کوٹھے پر جا بیٹھو......"
"فرح!!!" دیبا کے منہ سے ایک چیخ نکلی جس نے یقیناً عرش الٰہی کو ہلا دیا ہوگا ساتھ ہی اسکے ہاتھ سے ٹرے چھوٹ کر زمین پر گری۔ ایک قیامت خیز جھنکار ہوتی پیالیاں، پرچیں، چمچے دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ ٹکڑے اچھل کر ہر سمت بکھر گئے۔
"موئی نامراد...... خدا کرے بجلی گرے تیرے اوپر... پورا سیٹ چکنا چور کر دیا......" چچی چلائیں۔
فرح و فورِ غیظ و غضب میں دیبا کی طرف یوں جھپٹی جیسے دھجیاں اڑا کر رکھ دے گی۔
اور دیبا...... وہ بالکل ساکت تھی کسی سنگ مرمر کے مجسمے کی مانند۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے فرح کو تک رہی تھی۔ ہاتھ جس طرح نیچے ڈھلکے تھے اسی طرح بے جان لکڑی کی طرح لٹکے تھے۔
"بڑا برا لگا مہارانی کو...... ارے کمبخت تیرے ہی وجہ سے
[illegible]

کے ساتھ مزے اڑا رہی ہوگی کہ آسمان پھٹ پڑا....."
دیبا کے جسم میں پھر بھی حرکت نہ ہوئی۔
چچی نے اس کے قریب آکر زور سے اس کا کندھا نوچ لیا۔
"سانپ سونگھ گیا کیا مکار عورت....."
دیبا کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر آ گری۔
"یہ دیکھو۔ نخرے! بھائی جان کے آنے کا وقت آگیا ہے نا..." فرح نے دانت پیس کر کہا۔
شبراتن بلائی گئیں۔ بری طرح ہانپ رہی تھیں آٹے میں ہاتھ سنے تھے دو برس سے چولہے کے پاس کی عادت چھوٹ چکی تھی آرام چھن جانے سے دیبا پر سخت غصہ تھا بڑبڑاہٹ کے عالم میں ادھر اُدھر سے کھسوٹ کر بولیں۔
"اب یہ تو اللہ جانے مکر ہے یا چکر ظاہر میں بے ہوش ہیں" پھر ٹیپ کا بند انھوں نے بھی اٹھایا۔
"چھوٹے میاں کے آنے کا وقت ہو... بی!!"
"ہٹاؤ یہاں سے!" فرح غرائی۔
شبراتن نے بے دردی سے کھینچ کر صحن میں پڑے پلنگ پر ڈال دیا۔

---

(۸)

چھوٹے میاں بڑے اچھے موڈ میں آئے تھے۔
ایک نیلے رنگ کا مخملی ڈبہ انھوں نے فرح کی طرف بڑھایا اور چہکے۔
"دیکھو فرح! میں تمھارے لیے کیا لایا ہوں"
فرح نے ناک بھوں چڑھا کر کچھ کہنا چاہا لیکن چچی نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ طوعاً کرہاً فرح مسکرائی ڈبہ لے کر کھولا تو ایک جگمگاتے خوبصورت لاکٹ نے آنکھیں چکا چوند کر دیں۔
"یہ کس خوشی میں لائے ہیں بھائی جان!" وہ ہنسی روک نہ سکی۔
"اپنی شادی کی خوشی میں!" چھوٹے میاں بھی ہنسے
[illegible]

کھٹا کھٹ سروتہ چلائے جا رہی تھیں۔
"ہائے ہے آپ کے منہ میں گھی شکر! کب کر رہے ہیں۔ شادی؟"
"جب تم کہو!"
"سچ" فرح مسرور ہو کر چیخ اٹھی
"بالکل!"
"آج ہی کر دوں؟"
"آج ہی سہی! لڑکی کہاں ہے؟"
"ماموں جان اور یہ کس کی ڈبیہ ہے میری!" فرح کے بڑے لڑکے نے چھوٹے میاں کی جیب سے ایک لال رنگ کی ڈبیہ اچک لی۔ چھوٹے میاں اطمینان سے مسکراتے رہے۔
"دیکھ لوں؟" فرح نے پوچھا۔
"دیکھ لو" وہ اسی اطمینان سے بولے۔ تمھارے لئے لاکٹ خریدا تو خیال آیا دیبا کو احساس ہوگا۔ میرا خیال کسی کو نہ آیا، ایک انگوٹھی لے لی بلا کر دیکھو پسند کرتی ہے..."
فرح ڈبیہ کھول چکی تھی۔ نیلے مخمل پر جگر جگر کرتی انگوٹھی ایسی پیاری تھی کہ نظریں صدقہ ہوئی جا رہی تھیں، دل کی صورت کا نگ خیرہ کن تھا۔ فرح کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ چچی کا سروتہ رک گیا۔
"ارے یہ سناٹا کیوں چھا گیا۔ اس کا بھی تو کچھ حق ہے ہم لوگوں پر"
چھوٹے میاں بھانجے کو پیٹھ پر لاد کر ٹہلنے لگے۔
بیٹی نے ماں کو دیکھا ماں نے بیٹے کو دیکھا۔
"انگوٹھی پہنانے کی ساعت کب آئے گی؟" فرح کے لہجے میں تلوار کی کاٹ تھی۔ چھوٹے میاں جانے اتنا اطمینان کہاں سے بٹور لائے تھے ٹہلتے رہے"
"جب تم لگ جاؤ....."

"ندیم...... " ایک بجلی چمکی۔ میرے جیتے جی یہ ناممکن ہے......"

"کوڑا کچرا سمیٹنے کو آپ ہی رہ گئے ہیں بھائی جان؟"

"کوڑا کچرا نہیں، کوڑے میں پڑا نگینہ......"

دونوں ماں بیٹی جلے تکان بولنے لگیں۔ چھوٹے میاں نے بڑھ کر ریڈیو آن کر دیا۔ اس ریڈیو کے ساتھ ہی پپو اپنے ماموں جان کو اپنا ریڈیو سنانے لگا۔ دن بھر کی مکمل رپورٹ۔ اس رپورٹ میں دیبا پر بیتی ہوئی مصیبت کا ذکر بھی تھا۔

"کیا؟" چھوٹے میاں ٹہلتے ٹہلتے رک گئے۔

"جی...... وہ کیا پڑی ہیں بے چاری....."

پپو کے اشارے پر ان کی نظر آنگن کے اس کونے پر پڑی جہاں ایک جھلنگے پلنگ پر ایک بے حس و حرکت جسم پڑا تھا۔ سردیوں کی ٹھٹھری ہوئی چاندنی میں پورے طور پر نمایاں اپنی بے کسی کی کہانی سناتا ہوا۔

پپو کو اتار کر وہ لپکے۔

دیبا اب بھی بے ہوش تھی۔ ہاتھ پاؤں بے جان! ٹھنڈے برف۔

پہلی نظر میں زندگی سے محروم ہونے کا احساس ہوتا۔

"دیبا! دیبا! دیبا! انھوں نے اس کو جھنجھوڑا۔

معاذاللہ! اس قدر سرد جسم!

"ظلم اور بے دردی کی انتہا ختم ہو گئی اماں! فرح! آپ لوگ انسان ہیں؟ اس پر مجھے آج شک ہو رہا ہے......"

انھوں نے دیبا کو ہاتھوں پر اٹھالیا۔

اپنے کمرے میں آکر انھوں نے اس کو نرم و گداز بستر پر لٹا کر گلے تک کمبل اڑھا دیا۔ سر پر اپنا مفلر لپیٹ دیا۔ ہیٹر ہن بیگ لگا کر انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ گرم [illegible] ان کی نظر اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ دل لرز رہا تھا۔

اگر اس مظلوم کو کچھ ہو گیا تو؟ تو؟ تو؟

کتنی معصومیت تھی اس چہرہ پر! کتنی کشش تھی کس قدر بے بسی تھی۔ ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

فرح اسی طرح ٹرا رہی تھی۔ چچی دو ہتڑ مار مار کر غالباً اب رونے لگی تھیں۔

"ندیم بیٹے!" ابا کا چہرہ عقبی کھڑکی سے دکھائی دیا۔ دیبا کیسی ہے؟"

"دیکھ لیجئے ابا..... دیکھ لیجئے......" چھوٹے میاں نے نچلا لب دانتوں میں جکڑ لیا۔

ایک ٹھنڈی سانس ابھری ایک گلوگیر کراہ!

"ابا بے چارے بھی مجبور ہیں.... اللہ نے شریف دل عطا کر کے کم ہمت بنا دیا تھا۔ مرنجاں مرنج قسم کے ابا مجبور تھے غریب!

دیبا کے جسم کو گرمی پہونچی تو پپوٹوں میں لرزش ہونے لگی۔

"دیبا!" چھوٹے میاں نے جھک کر میٹھے لہجہ میں پکارا۔

آہ! یہ کس کی آواز تھی! یہ کس کا شیریں لہجہ تھا۔ یہ کون تھا؟

دیبا نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔

دو نیلی آنکھیں، اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔!

کیا تھا ان آنکھوں میں؟

کیا نہ تھا ان آنکھوں؟

دیبا نے کانپ کر پپوٹوں کا پردہ پھر گرا لیا۔

"نہیں! نہیں!

"پاگل ہو گئی ہو! چھوٹے میاں نے اس کے گرم ہوتے ہوئے ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبا لیا۔ ان کے ہاتھوں کی لطیف گرمی دیبا کو اپنے اندر اترتے ہوئے

محسوس ہوئی۔ کانپتا ہوا سہما ہوا دل عجیب سی قوت کے ساتھ تیز تیز دھڑکنے لگا۔

"مجھے جانے دیجئے...." اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹی رہو...." چھوٹے میاں نے کسی سرکش بچے کی طرح اس کو بستر پر ڈھکیل دیا۔ "نمونیہ کا ارادہ ہے شائد؟"

"کاش ہو جائے..... کاش نمونیہ ہو جائے.... اس جہنم سے تو......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

آنسوؤں کا سیلاب ساری بندشیں توڑ کر بہ نکلا ——

چھوٹے میاں اس کا سر سہلاتے ہوئے چپ اس کو روتے دیکھتے رہے۔ غموں کا بوجھ شائد ہلکا ہو جائے۔ وہ سوچ رہے تھے۔

پہلے فرح نے جھانکا پھر چچی نے اور کمرے میں بادل گرجا۔

"ندیم! ماں کا بھی کچھ لحاظ نہیں ہے...."

"کیوں نہیں اماں! آئیے بیٹھئے... دیبا کو بخار ہو آیا ہے"

"بخار بن کر ہی وہ تیرے سر پر چڑھی ہے....."

چچی کا گراموفون پھر سے لگا۔ چھوٹے میاں نے یوں سر ہلایا جیسے مکھی اڑائی ہو۔ دیبا کا زرد ستا ہوا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ انھوں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا!

خدا کی پناہ!

آگ کی مانند تپ رہی تھی وہ! اچانک اتنا تیز بخار۔ وہ گھبرا گئے اور تند لہجہ میں بولے۔

"خاموش رہیئے اماں! دیبا کو بہت تیز بخار ہے... ... اگر اسے کچھ ہو گیا تو یہ سمجھ لیجئے میں یہاں کا [illegible] گا۔"

"ہائے! ہائے! اتنا زہر چڑھ گیا ناگن کا!...."

فرح بولتی ہوئی دروازے تک آئی تھی لیکن بھائی کو دیکھ کر سٹپٹا گئی۔

چھوٹے میاں نے قہر آلود نگاہوں سے اس کو دیکھا۔ زبان سے کچھ نہ کہا لیکن یہ نگاہ ہی بہت کچھ تھی۔!

دونوں کے وجود سے قطعی بے نیاز ہو کر وہ دیبا کی تیمار داری میں تندہی سے مصروف ہو گئے۔

---

(۹)

کھسیانی بلی کھمبا نوچ کر رہ جاتی۔

چھوٹے میاں آج کل ہر وقت دیبا کے پاس رہتے موقعہ ہی نہ مل پاتا کہ فرح اپنے دل کی بھڑاس اس پر نکالتی۔

چھوٹے میاں پر کسی کا بس نہ چل پاتا۔ چچی دو راتیں، دو دن مستقل چلا چلا کر اور گود پھیلا کر دیبا کے لئے دعائے موت مانگ کر تھک چکی تھیں ان کے پاس اب آنسوؤں کا ہتھیار باقی رہ گیا تھا!

اور چھوٹے میاں! مونگے کی چٹان بنے ہوئے تھے۔

شبراتن الگ مری جا رہی تھیں۔ ہر وقت بڑبڑاتی رہتیں، چچی کے پلنگ کی پٹی کے نیچے بیٹھ کر سفید بالوں میں انگلیوں سے جوئیں ٹٹولتے ہوئے وہ دیبا کی بلا ٹالنے کے لئے کسی پیر فقیر کی مدد لینے کے مشورے دیا کرتیں۔ کھانے میں مزہ رہ گیا تھا نہ گھر کی کوئی چیز ٹھکانے نظر آتی۔

دیبا جب سے آئی تھی گھر کو چمکا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے پکائے ہوئے کھانے لوگ معدہ سے اوپر کھا لیتے اور پھر بھی ہوس کرتے۔

فرح کو بچوں کی ریوڑ سنبھالنا پڑتی لینے کپڑے دھونا پڑتا تو اف نہ کرتی [illegible] کے کام تھے جو دنیا کرتی۔

وہ طیش میں آکر مٹھیاں بھینچ لیتی۔

گھر میں کوئی غیر جانبدار تھا تو چچا ابا!

دیبا چھوٹے میاں کی خوشامدیں کر کر کے تھک گئی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"جو فیصلہ کر لیا سو کر لیا"

"کیسا فیصلہ؟"

"وہ تم جانتی ہو" چھوٹے میاں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شوخی سے مسکرائے۔ وہ کانپ کر آنکھیں بند کر لیتی۔

"بند کر لو آنکھیں۔ پھر بھی میرا عکس موجود رہے گا۔۔۔"

اور ان کا عکس سچ مچ موجود رہتا۔ پپوٹوں کی چلمن پر لرزتا ہوا دل کی سطح پر جگمگاتا ہوا۔ وہ اپنے آپ پر جھنجھلاتی مگر کچھ بس نہ چل پاتا۔ چھوٹے میاں اپنی ساری ہمدردی نرم دلی میٹھی میٹھی مسکان اور دھیمے دھیمے لہجے کے ساتھ اس کے دل میں اتر گئے تھے۔ دھیرے دھیرے! خاموشی کے ساتھ!

وہ رحمٰن کے نام کے سوا کوئی نام لینا نہ چاہتی تھی، دل کی پلیٹ پر وہ مٹی میں مل جانے والی صورت کا نقش باقی رکھنا چاہتی تھی!

لیکن، رحمان سراب بن چکا تھا اور چھوٹے میاں ایک ٹھوس حقیقت تھے۔ ماضی دفن ہو چکا تھا مستقبل مسکراتا ہوا اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔

کیا کروں میں! آہ میں کیا کروں؟

وہ اپنے آپ سے پوچھتی۔

گھر کی فضا اس قدر گھٹی ہوئی تھی کہ اس کو سانس لینا بھی دشوار معلوم ہوتا۔

بخار نارمل ہو جاتا لیکن فرح کے نشتر اور چچی کی ٹھنڈی آہیں اس کا سینہ چھلنی کرتیں اور شدت احساس سے وہ پھر بستر پر گر جاتی۔

[illegible]

اور ٹانکوں کا انبار لگا رکھا تھا، الماری میں فروٹ کے لفافے بھرے تھے۔ دونوں وقت گلاس بھر بھر کر اپنے ہاتھ سے دودھ پلاتے۔۔۔۔۔ دیبا کی حلق میں پھندے لگ جاتے لیکن چھوٹے میاں کی ضد کے آگے ایک نہ چلتی۔

وہ جانتی تھی کہ چچی کے سینہ میں پکتا ہوا لاوا جس روز بہہ نکلا اس روز قیامت کا سماں نظر آئے گا۔

"آپ کو بہت لڑکیاں مل جائیں۔۔۔۔"

اس نے چھوٹے میاں کی تمنا کو لبوں کے اوپر مچلتے دیکھ کر عاجزی سے کہا۔

"اپنی ماں اور بہن کا دل نہ توڑیئے۔۔۔۔۔"

"تم بھی میرا دل نہ توڑ دینا دیبا۔۔۔۔ شیشہ ٹوٹتا ہے تو شور مچا دیتا ہے لیکن دل ٹوٹنے کی آواز نہیں آتی دیبا۔۔۔۔ میرے اس دل نے ۲۰ برس کے بعد آج ایک بھیک تم سے مانگی ہے۔۔۔۔ ڈال دو اس کی جھولی میں گوہر مقصود۔۔۔۔"

چھوٹے میاں کے والہانہ انداز کے آگے وہ سہم کر رہ گئی۔ ان کی نیلی آنکھوں سے پیار کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

"میں آپ کو کچھ نہ دے سکوں گی۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ دامن ہوں"

"مجھے صرف تم درکار ہو۔۔۔ تم۔۔۔۔ میں تم کو چاہتا ہوں۔۔۔۔ اور تمہارا حصول میری زندگی کی سب سے بڑی جدوجہد ہوگی۔ بس تم ہتھیار نہ ڈالو۔۔۔ تم اپنا دل مضبوط کر لو۔ تمہارے اوپر کوئی آنچ نہ آسکے گی۔ میری باہیں تمہارا حصار ہیں دیبا۔ تاریکی کا دور ختم ہو چکا ہے مستقبل کا سورج تمہارا منتظر ہے۔۔۔۔"

[illegible]

س کو دیکھتے رہے اس طرح جیسے دل کی گہرائیوں میں
تار لیں گے۔

"دیبو !!!" بڑی دیر بعد انھوں نے بڑے پیار
سے پکارا۔

"جی !!!"

"چھوڑو یہ سوچ و بچار...... میں نے بہت کچھ سوچ
سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے ہاں دیبا..... تمھاری دنیا میں
انے کے لئے تمھیں مسرتیں دینے کے لئے...... یہ انگوٹھی
دیکھی ہے تم نے ؟"

انھوں نے ڈبیہ اس کے سامنے کھول دی۔ وہ چونکی گھبرائی
اور پھر ان کا منھ تکنے لگی۔

"یہ میں تمھارے لئے لایا ہوں! اس کو سب نے
میرے ہاتھ میں دیکھا ہے اب تمھاری انگلی میں دیکھیں
گے اور میرے کہنے یا .... سنانے سے قبل ہماری نئی
زندگی کے معاہدے سے واقف ہوجائیں گے"

انھوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا لیکن دیبا ان کی گرفت سے
پرے ہٹ گئی۔

"نہیں نہیں!"

"نہیں ... یعنی تمھیں انکار ہے.. .."

"نہیں !"

"پھر ..... ؟ ؟"

دیبا کے منھ سے کچھ نہ نکلا بلک بلک کر رونے لگی۔

"بزدل کہیں کی..... " چھوٹے میاں بجلی کی طرح
بڑھے، دوسرے لمحے دیبا ان کے بازوؤں کے حصار میں
تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی۔

آنسو کا آخری قطرہ بھی گرا دو دیبا تاکہ ان آنکھوں
میں اب زندگی کی چمک مسکراتی رہے...... " انھوں
نے اس گڑیا سے وجود کو اپنے سینہ سے بھینچ لیا۔
دیبا کی مزاحمت کے باوجود انھوں نے اپنی گرفت ڈھیلی

نہیں کی مانو ذرا بھی چوک ہوئی اور یہ موتی پھیل
تھک ہار کر دیبا نے سر چھوٹے میاں کے سینہ پر ٹیک کر دو اکا
ان کے دل کی ہر دھڑکن دیبا کی دھڑکنوں میں مدغم ہوتے ہوئے
تھی۔ ایک عجیب سی تسکین کا احساس ہو رہا تھا۔ پیا ل طرح تڑپا۔
کو عجیب سی شگفتگی مل رہی تھی۔ ل !

اس کی سپردگی نے چھوٹے میاں کے لبوں پر ایک تک بڑھ چکا
مسکراہٹ بکھیر دی۔ ایک ہاتھ دیبا کے گرد ہا ہانے سے بھی
دوسرے ہاتھ سے انھوں نے ڈبیہ سے انگو ب لاکر انھوں
دیبا کا ہاتھ سرد اور بے جان سا تھا۔ انگوٹھی ت ہو رہا تھا۔
میں ٹھیک اتری، انھوں نے اس کا ہاتھ اٹھی سب ہی
نگینہ کی چھوٹ سے آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ کتنا ڈبہ پر کوئی سفید
ہو رہی تھی وہ انگوٹھی دیبا کی نازک پتلی ہاتھ سے انجانے
انھوں نے اس دست نازک کو چوم لیا۔ دیبا
کی طرح سمٹ گئی ہاتھ چھڑا کر اس نے چھوٹ دیتے لیکن اس
کندھے پر رکھ دیا۔ مضبوط چوڑا شانہ! جس سے بھی بچاتا تھا۔
ٹکیہ پر ٹیک کر ہتھیلی
اب زندگی کی نئی راہ طے کرنا تھی۔ رہی تھی۔
اس وقت اس کو کوئی خوف نہ تھا۔ کوئی کپکپی
راک دوا گلاس میں
چھوٹے میاں کی آغوش اس کے لئے ایک م
ہے۔ دیبا ہنس دی۔
فرح کسی محلے والی سے بھائی اور دیبا کے خلاف ں کی جھنکار تھی جو
"ارے یہ ڈائن ہے ڈائن، خالہ ایک مرد کو کھا
اکیلے بھائی پر ہاتھ ڈالا ہے۔ وہ کیا جانیں اس حمق گلاس اس کے ہاتھ
کھا کر گریں گے تب ہوش آئے گا۔ اماں کی آہ لو کر ایک ذرا سی
بھلا بتاؤ آنکھوں کے سامنے بغل میں لے کر
بلیسوا....."
جھناہٹ تالو تک اتر گئی۔
چھوٹے میاں دیبا سے الگ ہو کر دروازے ن پونچھ کر انھوں نے
لیکن اس نے بڑھ کر راستہ روک لیا۔
وہ مسکرا رہی تھی اور آنکھوں میں موتی میرا مطلب ہے کڑوی
چھوٹے میاں اس مسکراہٹ میں کھو کر (آئندہ)

(١٠)

گھڑی نے چیخ کر رات کے ٢ بجائے۔

فرح گود کے بچے سے دودھ چھڑا کر دھیرے سے پلنگ پر سے اتری۔۔۔!

گھر بھر نیند کی آغوش میں دبا ہوا تھا۔ تیز تیز سانسیں کھینچے اور بلند خراٹے تھے۔ خنک ہوا کی سائیں سائیں تھی یا اب فرح کے دل کی تیز دھک!

دیبا اپنی کوٹھری سے اب چھوٹے میاں کے کمرے میں منتقل ہو گئی تھی چھوٹے میاں برابر کے کمرے میں سونے لگے تھے۔ رات میں کئی بار وہ اٹھ اٹھ کر دیبا کو دیکھنے آتے، وقت ہو جاتا تو دوا پلاتے کھلی پڑی ہوتی تو لحاف سے ڈھانک دیتے۔ یہ سب کام وہ کس لگن سے کرتے تھے کتنی راحت ہوتی تھی ان کو! ابھی ذرا ہی دیر پہلے وہ دیبا کو لحاف اڑھا کر گئے تھے۔ ٹمپریچر بھی لیا تھا۔ بخار پوری طرح پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا پھر بھی اب وہ خطرے سے باہر تھی۔ نمونیہ کے حملے کے بعد زندگی کی طرف لوٹتی ہوئی۔ اور یہ دوبارہ زندگی اس کو چھوٹے میاں کی کوششوں ہی سے ملی تھی!

کوٹھری کا سیلا فرش سرد دیواریں اور جگہ جگہ سے پھٹی روئی نکلی ہلکی سی رضائی اب تک اس کو قبر کی تاریک آغوش میں پہونچا چکی ہوتی۔ لیکن چھوٹے میاں نے اس یخ بستہ مورتی کو اپنی گرم بانہوں میں چھپا کر اپنے گرم آرام دہ بستر پر لا ڈالا تھا۔ کتنے انجکشن لگے تھے کتنی دوائیاں پہونچی تھیں کیا کچھ نہ ہوا تھا اس کو بچانے کے لئے۔

اور اس وقت وہ نرم گدے پر مخملیں سرخ لحاف کے اندر ملائم تکیہ پر سر رکھے نیند کی دیوی سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ بخار کی کمزوری کے باوجود چہرے پر ایک نئی تازگی اور چمک تھی۔ سیاہ گھنے بال تکیہ پر بکھرے ہوئے تھے۔

داہنا ہاتھ لحاف کے اندر سے نکلا ہوا سینہ پر دھرا تھا۔ خوابی بلب کی روشنی میں دل کی شکل کا یاقوت جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔

فرح چوروں کی طرح اس کے قریب آئی۔۔۔!

انگوٹھی پر نظر پڑی تو اس کے جبڑے سختی سے بھنچ گئے۔ آنکھوں سے نفرت اور غصہ کی چنگاریاں سی برسنے لگیں۔ نتھنے ابھر نے اور پھڑکنے لگے۔

یہ روتا چہرہ پھول بنا جا رہا ہے۔ فرش پر گھسنے والی اب عرش پر چڑھے گی۔ اس بیوہ خصیم کہانی کو پھر ایک شہزادہ مل جائے گا۔ پھر ایک گھر کی مالک ہو جائے گی پھر دل پر راج کرے گی .... اس کو زندہ رہنے دیا گیا تو.......

دیبا نے ایک لمبی سانس لی اور کروٹ بدلی۔ فرح جلدی سے دواؤں کی میز کے پاس پہونچی۔ بار بار وہ مڑ کر دروازے کی طرف بھی دیکھ لیتی۔۔

کانپتے ہاتھوں سے اس نے پینے والی دوا کی بوتل کا کارک کھولا، گریبان میں اڑسی ایک پڑیا نکالی اور تیزی سے اس کو کھول کر بوتل کے اندر جھاڑ دیا پر سکون سطح پر ایک ہلچل سی ہوئی۔ جھاگ ابھرا سفوف کے ذرات بوتل کے پیندے میں بیٹھتے نظر آئے۔ فرح نے بوتل اٹھا کر خوب ہلائی کارک لگایا اور میز پر رکھ کر دبے پاؤں دروازہ کی سمت بڑھی۔

اسی وقت پردے کے پیچھے سے دو مردانہ پاؤں دکھائی دیئے فرح دھک سے رہ گئی۔ چھپنے کی کوئی جگہ بھی نہ تھی۔

"فرح! تم؟" چھوٹے میاں ششدر تھے۔

"ہاں...... وہ.... منا میری چپل یہاں ڈال گیا تھا.... لینے آئی تھی"

فرح نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ حلق کو تھوک سے گیلا کیا اور بولی۔

"کیا اب میں آپ کے کمرے میں بھی نہیں آسکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں۔ کمرے ہی کیا میرے سر پر بیٹھو ......
لیکن یوں ..... بے وقت منّا تو آج اس کمرے میں آیا بھی نہیں"

"نہ سہی! میں تو آپ کی منظور نظر کی زیارت کو آئی تھی........"

فرح تنک کر چلی گئی۔ چھوٹے میاں نے متفکر نظروں سے اس کو جاتے ہوئے دیکھا پھر دیبا کے پلنگ کے پاس آکھڑے ہوئے۔ وہ اب بھی بے خبر سو رہی تھی۔

دوا کا وقت ہو گیا تھا۔ چھوٹے میاں نے دھیرے سے پکارا۔

"دیبا! دیبا! اٹھو دوا پی لو....."

دیبا کسمائی بچوں کی طرح منھ بسورا اور پھر سو گئی۔

"دیبو! چھوٹے میاں اس کے اوپر جھک گئے۔ اس کے بکھرے بالوں کو سمیٹتے اور سونگھتے ہوئے بولے۔ اٹھو دوا پی لو پھر سو جانا"

دیبا نے لحاف لپیٹے اوپر کھینچتے اور سیدھے لیٹتے ہوئے آنکھیں کھول کر ان کو دیکھا۔ سورج کی طرح جگمگاتا ہوا وہ چہرہ اور سمندر کی طرح گہری، نیلی وہ آنکھیں اس کے بےحد تک نزدیک تھیں۔ دونوں کی سانسیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ دیبا شرما گئی۔ منھ ایک طرف پھیر کر اٹھنے لگی۔

"لیٹی رہو! لیٹی رہو، میں ایسے ہی پلا دوں گا" چھوٹے میاں نے یہ کہتے ہوئے اچانک اس کے کلی سے لب چوم لیتے۔

"دیکھئے......" دیبا کانپ گئی۔

"یہ بہت ضروری تھا۔ محبت کے معاہدہ پر مہر نہیں لگی تھی نا۔

وہ شرارت سے ہنسے اور میز کے پاس پہونچ کر دوا کا ننھا سا بلوریں گلاس اٹھایا۔ بوتل کا کارک کھولتے ہوئے ایک دم ان کے دماغ میں کوئی شک بجلی کی طرح تڑپا۔

فرح! یہاں خالی از علت تو نہ آئی ہوگی!

اس کی نفرت اور حسد دیبا سے اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ موقعہ مل جانے پر وہ دیبا کا گلا دبانے سے بھی باز نہ آئے گی۔ بوتل آنکھوں کے قریب لاکر انھوں نے دیکھا۔ ہلکی گلابی دوا کا رنگ کچھ کثیف ہو رہا تھا۔

بوتل میز پر رکھ کر انھوں نے میز پر رکھی سب ہی چیزوں کو غور سے دیکھا۔ گلوکوز کے ڈبّہ پر کوئی سفید سی شئے یوں گر پڑی تھی جیسے کسی کے ہاتھ سے انجانے میں بکھر گئی ہو۔ کیا چیز تھی یہ؟

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس کو اہمیت دیتے لیکن اس وقت تو دیبا کو بال جیسی چیز کی دھار سے بھی بچانا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟" دیبا کہنی تکیہ پر ٹیک کر ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے چھوٹے میاں کو دیکھ رہی تھی۔

"کچھ نہیں۔ چھوٹے میاں نے ایک خوراک دوا گلاس میں ڈالی اور ناک کے پاس لاکر سونگھنے لگے۔ دیبا ہنس دی۔ اس طرح کھل کر۔ پہلی بار۔ گھنگھروؤں کی جھنکار تھی جو چھوٹے میاں کے دل میں اتر گئی ـــ!

وہ دیبا کے قریب آئے تو لیکن دوا کا گلاس اس کے ہاتھ میں نہیں دیا۔ کمر کی انگلی دوا میں ڈبو کر ایک ذرا سی زبان کی نوک پر لگائی۔

ایک چنگاری سی زبان پر پہنچ گئی۔ جھنجھناہٹ تالو تک اتر گئی۔ گلاس میز پر رکھ کر رومال سے زبان پونچھ کر انھوں نے پوچھا۔

"اس دوا کا ذائقہ کیا ہے دیبا؟ میرا مطلب ہے کڑوی تو نہیں ہے؟"

(باقی آئندہ)

ادعائے شاعر

مظہر ششوانی

مجھ پہ آئینہ زمین و آسماں کا راز ہے
پاک ہے آلودگیٔ دہر سے میرا ضمیر
امتحاں ہوتا ہے میرا سخت سے بھی سخت تر
ہاں مگر ہموار ہر جادے کو کر دیتا ہوں میں
خود پرستی سے جدا ہے میری آئینہ گری
ریگزاروں کو سجایا چشمۂ شاداب سے
آب دریا کو کیا ہے میں نے شعلہ آشنا
ایسا آئینہ جسے حسن بصیرت کہہ سکیں
خشک پھولوں کو بھی رنگ و بو عطا کرتا ہوں میں
بے پروں کو آشنا کرتا ہوں میں پرواز سے
میری ضو سے سرد ہو جاتا ہے ہر آتشکدہ
رنگ پر آتی ہیں جب میری جہاں آرائیاں
تارے بن جاتے ہیں شبنم اور شبنم آفتاب
مہر و ماہ و نجم سے لیکر بہار زندگی
بوئے گل سے خاطر باد صبا کرتا ہوں میں
چاند تاروں کے عرق سے سینچتا ہوں فرش کو
اس طرح چمکاتا ہوں بے مایہ شبنم کا نصیب
دیکھکر پروردۂ دامان گل کو ضو فشاں
کرتا ہے اُن کی حفاظت شعلۂ خورشید سے
رات کی ظلمت سے جب گھبراتے ہیں اہل نظر
دیکھتا ہوں غور سے جب دہر کی املاک کو
نغموں سے لبریز ہو جاتی ہے عالم کی فضا
دیپ جل جاتے ہیں شب میں پھیلتی ہے روشنی
دشمن امن و اماں ہیں جو دہل جاتے ہیں وہ
رہ گزار عشق کا سرمایہ ہے میرا شعور
میری منزل سے بھلا وہ آشنا کیا ہو سکے
جس کی آنکھیں نور کی تابش سے گھبراتی رہیں

کاشف اسرار ہستی میری ہر آواز ہے
میری آب و گل میں شامل ہے محبت کا خمیر
خارزار کو سے مشکل ہے میری رہ گذر
روند کر کانٹوں کو اُن میں پھول بھر دیتا ہوں میں
میں نے ذرّوں کو بھی بخشی روشنی خورشید کی
سوتے ذرّوں کو جگایا بے حسی کے خواب سے
تیرہ و تاریک مٹی کو بنایا آئینا
جس کے دامن میں مناظر سارے عالم کے ملیں
کانٹوں کو حفظ چمن کی خو عطا کرتا ہوں میں
باخبر ہوں انجم و مہتاب کے ہر راز سے
میں مصیبت کے زمانے میں ہوں سب کا آسرا
فاصلہ رہتا نہیں عرش و زمیں کے درمیاں
رونما ہوتا ہے بزم دہر میں اک انقلاب
پھولوں سے بھر دیتا ہوں ہر رہگذار زندگی
پر نہیں لیکن فضاؤں میں اڑا کرتا ہوں میں
گوہر شبنم دکھاتا ہوں پھر اہل عرش کو
بال و پر دیکر بلا لیتا ہے چرخ اپنے قریب
ناز سے اُس کو بنا لیتا ہے جزو کہکشاں
رکھتا ہے محروم دن میں سب کو انکی دید سے
پیش کر دیتا ہے تاروں میں ملا کر یہ گہر
شان گویائی عطا کرتا ہوں بیجاں خاک کو
مضطرب موجوں کو بھی آجاتا ہے آرام سا
میری ہر آواز ہوتی ہے پیام زندگی
جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں اک سکوں پاتے ہیں وہ
سنگریزوں کو بھی بخشا میں نے حسن کوہ طور
جذبۂ بیداری فطرت نہیں حاصل جنہیں
اپنی ناداری پہ مظہر آپ شرماتی رہیں

زیرِ لب

تسنیم فاروقی

لال سورج کی آخری کرنیں
جب درختوں پہ گنگناتی ہیں
عکس جھیلوں میں ڈوب جاتا ہے
آگ لہروں میں پھیل جاتی ہے
شام کی سیڑھیوں پہ دل کی آس
زینہ زینہ قدم بڑھاتی ہے

بوڑھا پیپل کنوئیں کے پنگھٹ پر
کتنے رازوں کا زہر پیتا ہے
کتنے رومان کتنے ہی وعدے
سو گئے اس کی سبز شاخوں میں
دھانی پتّے ہتھیلیوں کی طرح
رات دن، تالیاں بجاتے ہیں
جانے کیوں اس کی چھاؤں میں اکثر
بے طرح آپ یاد آتے ہیں

بھیگے ساحل کے ریگزاروں سے
اُگ رہے ہیں وصال کے نغمے
کشتیاں کچھ ندی کی موجوں کو
ہولے ہولے جو گدگداتی ہیں
جگنوؤں کی طرح حسیں یادیں
دامنِ شب میں جگمگاتی ہیں

چاندنی نے گھنیری شاخوں سے
برگ و گل کے حسین جھروکوں سے
باغوں کی سبز و صاف دھرتی پر
نور اور تیرگی کے داغوں سے
ایک شطرنج سی بچھا دی ہے
جانے کیوں مجھ کو ایسا لگتا ہے
مجھ کو پھر آپ نے صدا دی ہے

رات کے بادباں سے ٹیک لگائے
ایک مانجھی کسی خیال میں گم
بانسری کے سیاہ زخموں کو
بے خیالی میں چھیڑے جاتا ہے
سونے پن کے سلگتے نغموں میں
کتنی مہکی ہوئی جواں راتیں
بیت جاتی ہیں آنکھوں آنکھوں میں

ڈگمگاتا ہوا رُپہلا چاند
نیل منڈھ میں کسی رشی کی طرح
یوں ستاروں میں قید ہے جیسے
دیوتا کا پجاریوں میں گھراؤ
نقرئیں پائلیں کھنکتی ہیں
رقص کرتا ہے رُوپ کا بکھراؤ
اپنی شاخوں کے نرم مرکز سے
ٹوٹ کر پھول کرتے ہیں پتھراؤ
سونپ کر مجھ کو اپنی تنہائی آؤ ان موسموں میں کھو جاؤ

آوارہ

شمس فرخ آبادی

کاش مل جائے کبھی اتنی سی مہلت مجھ کو
کون ہوں کیا ہوں اس بات پہ کچھ سوچ سکوں
بعد ازیں کرسکوں پھر تندگئی داماں کا رفو
اور پھر سی سکوں صد چاک گریباں اپنا
انگلیاں خوں میں ڈبو کر کے میں کچھ لکھ بھی سکوں
وہ نوشتہ کہ جو ہر دل کا ایک آئینہ بنے
یوں ہی پوشیدہ رہے خونِ حنا خونِ جگر
اور دنیا یہی سمجھے کہ فسانہ ہے کوئی
جس سے تنہائی یا پھر وقت سفر کٹ جائے
درد و غم اپنا اسی طور سے کچھ بٹ جائے
ہاں مگر ٹھہرے گی کیوں وقت کی خونی رفتار
اب تو ہر سلسلۂ وقت سے دل ڈرتا ہے
لاش اٹھتی ہے کوئی یا کہ گجر بجتا ہے
کاش مل جائے کبھی اتنی سی مہلت مجھکو

کیوں بھلا اشکوں کو وہ رنگ ملے گا کہ جو میں
کینوس جیب و گریباں کی بنا کر اس پر
مونو لیزا کو پھر اکبار منقش کرتا
میں کہ مزدور ہوں حالاں کہ ملا کیا ان سے
آبلے ہاتھ میں اور کاسۂ محنت کے سوا
جس میں دو وقت کی بس نان جویں ہے کہ جو میں
اپنے دوزخ کی فقط آگ بجھا لیتا ہوں
ذہن کے شہر خموشاں میں یہ فن کا تابوت
کرچکا دفن اسے دیر ہوئی دن بیتے
ہاں مگر جب بھی شکم سیر ہوا کرتا ہوں
دل میں چوروں کی طرح آتا ہے بس اک ہی خیال
کاش مل جائے کبھی اتنی سی مہلت مجھکو
کون ہوں کیا ہوں اس بات پہ کچھ سوچ سکوں

حضرت گنج میں کچھ دیر

رضیہ سجاد ظہیر

جس پُل پر سے ہماری بس گزر رہی ہے یہ کاٹھ کا پُل کہلاتا ہے، انگریزوں کی فوجیں اسی طرف سے لکھنؤ میں داخل ہوئی تھیں ــــ لیجئے یہ داہنی طرف کو سکندر باغ ہے جہاں بیگم حضرت محل کی فوجوں نے انگریزوں کو للکارا تھا اور اب اگلا اسٹاپ ہے حضرت گنج ــــ

جی ہاں، ہم لوگ اُسی کافی ہاؤس پر اتریں گے جس کا آپ نے اتنا شہرہ سُنا ہے..... ذرا سنبھل کے....

جلدی کیا ہے، یہ لکھنؤ ہے، یہاں کسی کام میں بھاگم بھاگ نہیں ہوتی، مزے مزے چلیں گے ــــ آیئے ایک پیالہ کافی پیتے چلیں۔ سارے ہال میں کیسی اچھی سوندھی خوشبو ہے۔ کافی کے تازے تازے دانے بھُن رہے ہیں، اب یہیں پسیں گے اور یہیں ان کی کافی بناکر آپ کو پیش کی جائے گی۔ اس ویٹر کو دیکھا آپ نے؟ یہ مجاز کا ویٹر کہلاتا ہے کیونکہ اس نے برسوں اُس آوارۂ کوے بتاں کی خدمت کی ہے، مجاز چاہے جس میز پر بیٹھتے تھے، اُن کے سامنے کافی یہی ویٹر رکھتا تھا۔

یہ کافی ہاؤس حضرت گنج کی شام کا ایک حصہ ہے، یہاں یونیورسٹی کے اُستاد، ادیب، شاعر، دانشور، صحافی، انقلابی، بے روزگار نوجوان سب آتے ہیں۔ ایک دوسرے کو کافی پلاتے ہیں اور ایک ایک پیالہ کافی سامنے رکھ کر دنیا بھر کی بحث ہو رہی ہے۔ اس جوش و خروش سے کہ گویا ملک اور قوم کی قسمت کا فیصلہ بس ہوا ہی چاہتا ہے ــــ

ختم ہوگئی کافی؟ تو اُٹھیے، سڑک پار کرنا ہے۔ اب ہم بینبوز کے سامنے کھڑے ہیں، کیک بسکٹ وغیرہ کی یہ سب سے پرانی دوکان ہے اور اس نے ابھی تک اپنے اُس معیار کو قائم رکھا ہے جو انگریزوں کے زمانے میں تھا، اس سے آگے بڑھیئے تو مٹھائیوں کی سب سے مشہور دوکان ہے، چودھری سویٹ ہاؤس۔ جاڑے ہوں تو یہاں کا حلوا سوہن اور خستہ بھُربھُری امرتیاں ضرور لیجئے گا، گرمیاں ہوں تو لوکی کا حلوہ، اور اگر آپ کے پاس دو چار منٹ فالتو ہوں تو ایک قلفی فالودہ کھا لیجئے گا ــــ جگہ تو ذرا کم ہی ہے مگر اتفاق سے بھی اگر دھکا لگ گیا تو آپ سے معافی مانگ لی جائے گی ــــ یہ لکھنؤ ہے، زندگی جہاں کی اخلاق سے عبارت ہے۔

چودھری کے سامنے، فٹ پاتھ پر موسم کے حساب سے پھل، کیلے سیب انگور اور سنترے یا ککڑیاں کھرنی فالسے کروندے کرکھ، نیبو، گلاب میں بسی گنڈیریاں۔ سرکار شربت کے لئے نیبو لیتی جائیے، غریب پرور ککڑیاں بڑی پتلی کراری، اسے دیکھئے تو حضور، نظر ڈالنے کے تو کوئی دام نہیں۔

دس پندرہ قدم آگے چل کر بائیں کو کاظم اینڈ کمپنی، حضرت گنج کی بہت پرانی دوکانوں میں سے ایک، زیورات اور چاندی اور گھڑیوں کی جھل جھل کرتی دوکان، اس کے سامنے دو ننھے ننھے بچے، غبارے، کھلونے اور کاغذ کے رنگ برنگے پھول بیچتے ہوئے صدائیں لگا رہے ہیں ــــ دل کو لبھانے کے، بچوں کو بہلانے کے، بیوی کو منانے کے، گھر کو سجانے کے.....

آئیے، یہاں سے پھر اُدھر کی طرف سڑک پار کرتے ہیں، لیجئے ہم تو گاندھی آشرم کے چوکھٹ پر کھڑے ہوگئے۔ یو پی کے سارے دیہات اور قصبوں ضلعوں سے ہاتھ کاکتا، ہاتھ کا بنا کپڑا، ریشم، دریاں، کمبل اور کھدر کے سلے بسلائے کپڑے یہاں آتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ بکتے ہیں، ایک کونٹر پر کئی گاہک کھڑے ہیں مگر سیلز مین نظر نہیں آرہا ہے، پاس کے کونٹر پر ایک دُبلے پتلے ادھیڑ عمر لمبے قد کے صاحب، کھدر میں ملبوس، گال میں بڑی سی گلوری دبائے ذرا جھنجھلا کے چیخ رہے ہیں " ارے بھئی وہ کہاں ہیں رام کھلاون جی؟ گاہک کھڑے ہیں، کونٹر خالی پڑا ہے اور وہ ندارد ــــ ایں؟"

ایک نوکر لڑکا جواب دیتا "ہم جانت ہیں چائے پیئے کہوں گئے ہوئیں" "اماں، تو چائے پینے کیا دارجلنگ روانہ ہوگئے ہیں؟ کمال ہے یعنی ایک پہر تو گذر گیا ہوگا کم سے کم ــــ فرمائیے سرکار کیا حاضر کیا جائے؟ آپ پسند تو کیجئے تب سے میں انھیں بلوا بھیجتا ہوں، لپک جا بے لونڈے، ذرا دیکھ تو بھبوتی کی دوکان پر تو نہیں بیٹھے ہیں"۔

ہم آگے بڑھتے ہیں ــــ دہنے کو کچھ خاص بڑی بڑی دوکانیں ہیں اور کچھ اُن ہی کی طرف منہ اور سڑک کی طرف پہلو کئے چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہیں اور ان کے درمیان ایک تنگ سی راہداری ــــ آپ کو اس میں سے نکلنا ہے کہ جس میں واقعی کھوے سے کھوا چھلتا ہے ــ بہت سال گذرے، اس گیلری کے بیچوں بیچ ایک لمبے قد اور دوہرے بدن کا نابینا، اینگلو انڈین آدمی، گھسا ہوا سوٹ پہنے، اپنی شام کی ہیٹ کو الٹا کر کے ہاتھ میں لئے، ہر آنے جانے والے سے بس ایک ہی فقرہ کہتا تھا "گڈ مارننگ، گڈ مارننگ" ــ اور شام کو وہ نہ جانے کب آتا تھا، کب تک کھڑا رہتا تھا اور کب جاتا تھا ــــ اب وہ تو نہیں ہے مگر ایک اور آدمی ہے، مجذوب قسم کا، گونگا، میلے کپڑے، گندی ٹوپی پھٹیچر جوتے، ــــ چھوٹا سا قد، دُبلا پتلا جسم، خشخشی داڑھی، ہر ایک کی خدمت کو تیار ــــ آپ موٹر سے پہونچیں گے تو لپک کے دروازے کھولے گا، کوئی دوکان پوچھیں گے تو بتائے گا، سامان بہت ہو جائے گا تو دوڑ کر سواری میں رکھ دے گا، آپ کچھ دیں گے تو ہتھیلی پر آپ کے دیئے پیسے رکھ کر گنے گا، غور سے ان کو دیکھتا جائے گا، مسکراتا جائے گا ــــ اگر کچھ نہ دیجئے تو کہے گا تو کچھ نہیں مگر جیسے ہی آپ روانہ ہوں گے، اس زور کا قہقہہ لگائے گا کہ آپ کھسیا جائیں۔

اِدھر والی دوکانوں میں آپ کو لکھنؤ کی خاص سوغاتیں ملیں گی، عورتوں اور بچیوں کے لئے رنگ برنگی ساریاں اور کرتے، لڑکوں مردوں کے لئے سفید کرتے اور ان سب پر چکن کی نازک بیلیں بوٹیاں، کلیاں، سب ہاتھ کا کام، لکھنؤ کے بنے مٹی کے کھلونے، بے حد چھوٹے کھلونوں میں بھی وہ تفصیلات کہ آپ دنگ رہ جائیں اور کسی مشین یا اوزار کا کام نہیں، سب انگلیوں کی کرامات ــــ ریوڑیاں جنھیں لکھنؤ والے کھٹیاں کہتے ہیں، گلاب کیوڑے میں بسی ــــ قسم قسم کے عطر، جن میں مٹی کا عطر خاصے کی چیز، طرح طرح کے خوشبودار تمباکو اور قوام اور گولیاں ــ چاہے حقے میں پیجئے چاہے گلوری میں نوش فرمائیے ــــ لیجئے یہ سامنے سے مسرا صاحب چلے آرہے ہیں

ہیں، لکھنؤ کے جانے مانے ادیب اور افسانہ نگار ہمیشہ سے چوک میں رہتے ہیں اور اکثر سیدھی بس لی اور حضرت گنج آ گئے۔ برف سے سفید کھدر کے کپڑے، ہاتھ میں تیل پلایا ہوا چھوٹا سا ڈنڈا، منہ سے خوشبودار پان کی مہک ـــــ "آداب بجا لاتا ہوں، آپ کب تشریف لائیں؟ واللہ آپ نے تو لکھنؤ کو بالکل بھلا دیا، شہر سونا کر گئیں آپ" ـــــ "اے نہیں مسرا صاحب، کیا فرماتے ہیں آپ بھلا لکھنؤ کہیں چھٹتا ہے، ہوک اٹھتی ہے، سر کے بل چلے ہی آتے ہیں"۔

ناممکن کہ آپ گھنٹے آدھ گھنٹے کو حضرت گنج جائیں اور دو چار دس جاننے والے نہ مل جائیں، چاہے جتنے دن بعد لیجئے، بالکل ویسے کے ویسے ہی دکھائی دیں گے اور وضعداری، وہی محبت وہی گھلاوٹ!

پاس سے آواز آتی ہے "ذرا دب جائیے گا حضور"۔ نظر اٹھا کر دیکھتی ہوں تو وہ بڑے میاں جن سے ہم لوگ تکونے خریدا کرتے تھے، بھلا اب تو صدی پوری کر رہے ہوں گے مگر ٹھاٹھ ایسے کہ بائسکل پر وزیر حسن روڈ اور رائے پراگ نرائن روڈ کے دھاوے اب تک مارتے ہیں ـــــ پہچان کر کھل پڑتے ہیں "کچھ تکونے تو ہم ضرور ساتھ کریں گے ـــــ بالکل جل بھے ہیں سرکار، گھر پہنچتے بھی ٹھنڈے نہ ہوں گے"۔

حضرت گنج کی ایک خاص بات یہ ہے کہ بڑی بڑی، دو چار دوکانوں کے بیچ میں ایک چھوٹی سی دوکان ضرور ہوگی، دبی، سمٹی، لجائی، شرمائی، جیسے اُس کی موجودگی ہم وجودیت کے اصول کو ثابت کر رہی ہو، ـــــ یہ ہے چوڑیوں کی دوکان ـــــ یہ ہمیشہ سے اتنی ہی منی سی تھی، ـــــ بیگم صاحب، ایک فالسائی رنگ بڑا پیارا ہے، چاہے کامدار لیجئے، چاہے سادی، اغل بغل کے لئے یہ سبک سنہری کڑے نکالے دیتا ہوں،.... آپ کو تو معلوم ہے میری دوکان میں بوجھل مال ہوتا ہی نہیں۔

اچھا اب ہم لوگ ذرا جلدی کریں.......

مگر ان سے ضرور مل لیجئے ـــــ تقسیم کے بعد لکھنؤ آئے اور لکھنؤ کے ہی ہو رہے، پنجابی ہیں مگر وضعداری اور بات کی شائستگی میں لکھنؤ والوں سے لگا کھاتے ہیں ـــــ کیا بڑی دوکان ہے جس میں دنیا بھر کا سامان تو خیر ہے ہی مگر لکھنؤ کے مضافات، چنہٹ کے مٹی کے بنے کٹ پھرے برتن تو خاص چیز ہیں۔

اور دہنے کو حضرت گنج کی سب سے بڑی ریکارڈوں کی دوکان، بنگالیوں کی ہے مگر لکھنؤ جیسے ہر ایک کو بڑے پیار سے اپنے میں سموتا ہے، ان کو بھی سمو لیا ہے ـــــ بیچ میں آرام کرسی پر اوپر پیر سمیٹے، جو یہ پھوس بڑے میاں بیٹھے ہیں یہ اصلی مالک ہیں، کئی عدد بیٹوں کے باپ جو دوکان میں مستقل لگے رہتے ہیں۔ اور بڑے میاں بیچ بیچ میں اپنی رائے دیتے رہتے ہیں۔ اے حضور، اب یہ کیا آپ بھی فلمی ریکارڈ لینے لگیں؟ بھلا کوئی دادرا، ٹھمری، کجری کہئے تو ایک بات کوئی، اماں، نریندر، وہ لاؤ، اختری بیگم کی جو نئی ٹھمری آئی ہے کم از کم غزل لیجئے، اگر آپ لوگ بھی یہ فلمی۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیجئے وہ مل گئیں میری ایک پرانی شاگرد، نزہت قدوائی، سراپا نزہت اور نزاکت، ہلکے فیروزی رنگ کا ریشمی غرارہ جسے بھیڑ کی وجہ سے پیچھے سے سمیٹ کر ایک ہاتھ سے پکڑے ہیں، چکن کے کام کی گلابی ململ کی قمیص اور گلابی چنا ہوا دوپٹہ ـــــ آداب بجا لاتی ہوں، اللہ ہمارے غریب خانہ پر ذرا ہو لیجئے، دو ہی قدم پر تو ہے ـــــ اب اس وقت تو معاف کر دیجئے باجی، قیصر باغ میں کسی کے یہاں کھانا ہے۔

اب تو ہم ہلواسیہ مارکیٹ پر آ گئے ہیں اور ادھر ہی سے قیصر باغ نکل لیں گے۔ ہلواسیہ مارکیٹ کے سامنے بہت چوڑا فٹ پاتھ ہے اور اس پر چھوٹے چھوٹے خوانچے اور چھابڑیاں۔ اندھیرا بڑھ رہا ہے تو ان لوگوں نے ڈھبریاں جلائی ہیں، ہنڈیوں میں دبی آگ کو چنوں مونگ پھلیوں پر رکھتے جاتے ہیں اور آواز لگاتے جاتے ہیں "مزے ہیں بابا" ـــــ "کا جو چار نہیں، تین نہیں، دو روپے ہو گیا سرکار" ـــــ پھر بسکٹوں والے، امرود والے، بھنا پیٹھا اور تل کی گجک

والے ـــــ یو پی کے دیہات کی کچی بولی آپ کو حضرت گنج کی انگریزی اور نستعلیق اردو ہندی کے درمیان رچی ہوئی ملے گی ـــــ

اب ذرا نظر اٹھا کے دیکھئے، چھتر منزل کے پیچھے سورج گومتی کی گود میں چھپ گیا ہے مگر ایک آدھ نارنجی کرنیں اندھیرے سے جھانکتی دکھائی دیتی ہیں، اب ہم حضرت گنج کے اس سرے پر آ گئے ہیں، مڑ کر دیکھئے تو گنج کی چہل پہل، روشنی رنگ، آوازیں، آمد و رفت ـــــ دور سے ایسی لگتی ہیں جیسے کوئی خواب ـــــ اور ہم لوگوں کو پھر ادھر مڑنا ہے اور آگے چلنا ہے قیصر باغ کی طرف!

غزل ـــ ظہیر غازیپوری

نہ پوچھئے کہ گئے کتنے دلنشیں چہرے
حیا کی آنچ میں دہکے ہوئے حسیں چہرے

صلیبِ گیسو و قد کی ہے آبرو ہم سے
سجے ہیں ذہن میں کتنے ہی نازنیں چہرے

ستم کی دھوپ میں اقدارِ زندگی نہ تپیں
بہت لطیف ہیں یارو یہ ریشمیں چہرے

مری روایتِ فکر و نظر کی داد ملے!
ابھی تراش رہی ہے حسین حسین چہرے

بدن کی آنچ سے روشن ہے سادہ پیراہن
بکھیرے دیتے ہیں کرنیں یہ آتشیں چہرے

جنھیں وفا کی سلامت روی پہ شک گزرے
ہمارے ساتھ نہ آئیں وہ بے یقیں چہرے

شعورِ نو پہ ہے "تجرید" کا ستم حاوی
شکست و ریخت کے پابند تو نہیں چہرے

بھرم بھی ٹوٹ گیا تھک گئی نظر بھی ظہیر
کہیں ملے نہ ہمیں "چاند کے مکیں" چہرے

غزل

جلیس حمیدی

خلوص و مہر خطا ہے تو یہ خطا نہ کرو
جو بدگمان ہے اُس سے کبھی وفا نہ کرو

بہت سے سینوں میں حساس دل بھی ہوتے ہیں
ہر ایک بات کو یوں برملا کہا نہ کرو

وفا کرو نہ کرو اختیار ہے تم کو
ابھی سے ترکِ محبت کا فیصلہ نہ کرو

ہے تم سے شوقِ ملاقات ایک شرط کے ساتھ
ملو تو دل سے ملو ورنہ پھر ملا نہ کرو

تمھارے جلوے چرا لے نہ کوئی اور حسیں
سمجھ سے کام لو بے پردہ یوں رہا نہ کرو

نباہنا ہے اگر دوستی کسی سے تمھیں
فریب کھاتے رہو دوستو گلا نہ کرو

نہ انتقام کوئی بڑھ کے لے لے دیوانہ
کسی پہ جور و ستم کی یوں انتہا نہ کرو

یہ دردِ دل کہیں دردِ جہاں نہ بن جائے
زمانے والو مرے حال پر ہنسا نہ کرو

جلیس جام جو ساقی نہ دے خوشی سے تمھیں
تو جام توڑ دو پینے کا حوصلہ نہ کرو

فیض احمد فیض — جدید غزل کا رہنما

ڈاکٹر سیّد محمود الحسن

اپنی داخلی زندگی یا انفرادیت کے خول کے اندر رہنے والے شعرا و فنکار شعر و ادب کی تخلیقی صلاحیت جس شدت سے بھی ظاہر کریں لیکن اس حقیقت سے انکار کرنا آسان نہ ہوگا کہ تخلیق کا سرچشمہ موضوعات کی تلاش یا اسلوب کی جدت کے لئے جس چیز سے سب سے زیادہ مدد مل سکتی ہے وہ مسائل حیات کا عرفان ہے۔ اس کے بغیر نہ تو شاعر اپنی تخلیقی صلاحیت کو تاثیر بخش سکتا ہے نہ اسے قدر و منزلت کا وہ درجہ مل سکتا ہے جس کے لئے اس کی فطرت بےچین رہتی ہے ان خیالات کی توجیہہ کے لئے موجودہ دور کے جس شاعر کے کلام کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے وہ فیض احمد فیض ہے۔ یہ مقصد نہیں ہے کہ جوش یا فراق کے کلام میں ان عناصر کی کمی ہے یا فیض کا مرتبہ مجموعی طور پر ان سے بلند ہے البتہ فیض کو اس حیثیت سے انفرادیت حاصل رہے گی کہ اپنے دور کی کشمکش اور کرب و بےچینی کے اظہار میں ان کا سیاسی شعور اور قید و بند کی زندگی کے تلخ تجربات محض الفاظ کے ذریعہ رگوں میں دوڑنے پھرنے والا لہو نہیں بنتے بلکہ تاثیر کے اعتبار سے وہ ان کی آنکھوں سے ٹپکنے بھی لگتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہیئت اور انداز بیان میں جدت اختیار کر کے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ وہ زمانہ کے ہر رجحان، ہر تقاضہ اور ادبی ارتقا کی ہر منزل سے قدم ملا کر چلنا چاہتے ہیں۔ اس طرح فیض نے جب اپنی آواز کو زمانے کے اتار چڑھاؤ میں جذب کر دیا تو ان کی شاعری ہر فرد کے دل کی آواز بن گئی۔ یہ آواز تنہائی و بیچارگی کا احساس بھی دلاتی ہے اور قوت عظمت کا بھی لیکن اس پر یہ الزام عاید نہیں کیا جا سکتا کہ ترسیل الفاظ نے قاری کو محظوظ ہونے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کی ہے۔ فیض مغرب و مشرق کی ادبی تحریکوں سے بخوبی واقف ہیں، شعور و لاشعور کے زیر اثر ابھرنے والے رجحانات کا پورا علم رکھتے ہیں ساتھ ہی ساتھ اپنی ذاتی زندگی میں کتنے پیچ و خم آتے رہے، انھیں چین و سکون اور ناکامیوں و مایوسیوں کی متضاد کیفیات کا سامنا کرنا پڑا۔ قوم، سماج نظریات رسم و رواج اسی طرح کی نہ معلوم کتنی انفرادی و اجتماعی طاقتوں کا مقابلہ کرنا لیکن کہیں ان کی بےبسی و بیکسی حاوی نہ ہو سکی کہ عوام کے دکھ درد کو بھول کر اپنے ہی درد و غم اور کرب و الم کے اظہار کو سب کچھ سمجھ بیٹھیں اور داخلی زندگی کے مسائل میں الجھ کر انسانیت کی آواز سننے کے لئے کانوں کو بند کر لیں۔ موجودہ دور میں کسی شاعر و ادیب کی ذہنی عظمت کے تجزیہ کے لیے محض اس کے تخلیقی کارناموں کے مطالعہ پر اکتفا نہیں کی جا سکتی بلکہ فنکار کی شخصیت کے ہر موڑ کا جائزہ لینا ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ اس کی تخلیقی زندگی کو جب عوامل و محرکات نے متاثر کیا، جن جن تاریخی اور تہذیبی قوتوں سے وابستگی رہی، بیرونی دنیا کے جتنے ہنگاموں نے اسکو ذہنی وسعت بخشی اور جتنے مراحل سے گذر کر اس کی تخلیقی قوت آگے بڑھی اس پس منظر کو جانے بغیر کسی مطالعہ کو باقاعدہ نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے یہاں علم النفس یا تحلیل نفسی کے نظریات کی روشنی میں یہ جاننا بھی مفید ہو کہ وہ کون سی لاشعوری گتھیاں ہیں جن سے متاثر ہو کر فیض کا ذہن نئے مسائل کی طرف متوجہ ہوا لیکن تاریخی شعور، ماحول کے اثرات اور ادب اور زندگی کے باہمی تعامل کا سمجھنا اس سے بھی زیادہ اہم ہے جن کے مظاہر ان کے شعری سرمایہ کے ہر حصہ میں گہرے طور پر شامل ہیں۔ انھیں چیزوں

غزلیں

ہزار لکھنوی

وطن میں ہم کو غریب الوطن سمجھتے ہیں
ہم اپنے دوستوں کا حسن ظن سمجھتے ہیں
عجب معمہ ہے اس وقت رہبروں کا خلوص
یہ راز وہ ہے جسے راہزن سمجھتے ہیں
انھیں کو پایا ہے احساس کمتری کا شکار
مرے مزاج کا جو بانکپن سمجھتے ہیں
مٹے مٹے سے نقوش قدم ملیں گے بہت
ہم اپنی منزل فکر سخن سمجھتے ہیں
جو کر رہے ہیں بظاہر دوار سے باتیں
ہم ان کی نیت روے سخن سمجھتے ہیں
ہمارا راز جنوں کیف غیر فانی ہے
ہم احترام خرد سو ظن سمجھتے ہیں
مبارک آپ کو تحسین ناشناس ہزار
ہم اپنے واسطے توہین فن سمجھتے ہیں

---

۱ جس طرح میر تقی میر نے دیوانہ کے بجائے "دوانہ" جائز سمجھا ہے اسی طرح میں بھی دیوار کے بجائے "دوار" کو جائز سمجھتا ہوں (ہزار)

سکندر قریشی

کوئی چہرے سے نقاب اپنے ہٹا دے نہ کہیں
لذت حسرتِ دیدار مٹا دے نہ کہیں
میری آنکھوں کے سلگتے ہوئے غم سے مت کھیل
میرا آنسو ترے دامن کو جلا دے نہ کہیں
دیکھ کر برق کے انگڑائیاں لیتے شعلے
خود نشیمن میں کوئی آگ لگا دے نہ کہیں
مجھ کو ڈر ہے کہ ترے حسن کے شعلوں کی تپش
تیری یادوں کے تجھے دیپ جلا دے نہ کہیں
اشک بہتے ہیں تو مٹ جاتی ہے یادوں کی جلن
میرا یہ رونا تجھے دل سے بھلا دے نہ کہیں

کا اثر تھا کہ فیض کی شاعری میں زندگی کی توانائی اور اس کا حسن بھی ہے اور حرکت و جوش و قوت و عمل کا احساس بھی۔

فیض کو تعلیم سے فراغت حاصل کر لینے کے بعد تلاش روزگار کے سلسلہ میں زیادہ پریشان ہونا نہ پڑا۔ وہ ۱۹۳۵ء میں ایم۔ اے۔ او کالج میں لکچرر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ اس زمانے میں ان کے بڑے بھائی طفیل احمد بھی ایم۔ ایس۔ سی۔ اور وکالت کا امتحان پاس کر لینے کے بعد جج بن چکے تھے۔ اب فیض کے دل کی اس تڑپ نے زیادہ بے چینی پیدا کی جس کے ذریعہ وہ اپنی زندگی کو عوام کی خواہشات ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کے لئے وقف کر دینا چاہتے تھے۔ ان کی ایک ابتدائی نظم "اقبال" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے دوران تعلیم ہی میں جن مقاصد کے حصول کو جگہ دی تھی ان میں انسانیت کا کرب دور کر کے عوام کی بے حسی، بے عملی اور قنوطیت کے خلاف نئی زندگی پیدا کرنے کا جذبہ موجزن نظر آتا ہے۔ ان کے دل میں اقبال کی قدر و منزلت اس لئے نہیں تھی کہ اس کی شاعری اسلوب و زبان و بیان کا مرقع تھی بلکہ اس لئے کہ جب کشمکش حیات سے تنگ آ کر ہر فرد موت کا انتظار کر رہا تھا جب بازوئے انسانی میں عمل کی آرزو ناپید ہو چکی تھی مشرقی زندگی کی رگوں کا خون تھم تھم کر چل رہا تھا ایسی حالت میں اس کے نغموں نے خاموشی کا سحر توڑ کر مشرق کی مردہ رگوں میں زندگی کا خون دوڑایا" بود و نبود کے راز پھر سے ظاہر ہو کے قطرے کو وسعت دے کر دریا کر دیا ہر ذرہ کو ثریا کا مقابل بنا دیا، فروغ آرزو کی بستیاں آباد کر دیں اور یہاں تک کہ ان کا نغمہ ان کیفیات کا حامل تھا کہ۔

طلسم کن سے تیرا نغمۂ جاں سوز کیا کم ہے
کہ تو نے صد ہزار افسونوں کو مردہ کر ڈالا

ایک طرف زندگی کا یہ شعور دوسری طرف مارکس، اینگلس، فرائیڈ، گوئٹے اور غالب وغیرہ کا مطالعہ کر کے فیض اپنے لئے وہ راستہ تلاش کرنے میں لگے رہے جو ان کے ذوق اور فطری میلان سے مطابقت رکھے۔ خوش قسمتی سے جب سجاد ظہیر نے متاثر کر کے ان کو ترقی پسند تحریک میں شامل کر لیا تو جیسے اب انھیں وہ سب کچھ مل گیا جس کے لئے بے چین تھے۔ یہ تحریک وقت کی آواز تھی اور اس میں شامل ہو کر فیض ایسا محسوس کرنے لگے جیسے وہ اب اکیلے نہیں ہیں، جیسے اس کی آواز صدا بہ صحرا بن کر نہ رہ جائے گی بلکہ اس کے ساتھ نوجوانوں کا ایک گروہ آگے بڑھ رہا تھا جس کی جدوجہد سے انسانیت کی چیخ و پکار کو پرکیف نغموں میں بدلا جا سکتا ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک اس جذبہ کے تحت آگے بڑھی اور ہندوستان کی اس نسل کے ہر فنکار نے اسی احساس کو سامنے رکھ کر اپنے موضوعات اپنے مسائل اور اپنے افکار کا انتخاب کیا۔ اس گروہ میں سردار جعفری، مجاز، ساحر، جذبی اور مخدوم ایسے شعرا تھے۔ عصمت، رضیہ سجاد ظہیر، ڈاکٹر رشید جہاں، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر ایسے افسانہ نگار اور سجاد ظہیر، احتشام حسین ایسے نقاد بھی شریک تھے جو ترقی پسندی کے نظریات اور اصولوں کی وضاحت کر کے حقیقت پسندانہ ادب کی تخلیق کے لئے زندگی کے مسائل کو بنیاد بنانے پر متوجہ کرتے رہے۔ ان سب کی ادبی تخلیقات کا ایک مشترک نصب العین تھا کہ زندگی کسی منزل پر جامد و ساکت نہ رہے بلکہ ہر اس تحریک کو آگے بڑھانا چاہئے جو تنقید حیات اور ارتقا کا ذریعہ بن سکے۔ فیض اسی باشعور گروہ سے وابستہ ہو گئے اور آج تک اسی مقصد کے تحت اپنے فن کو بڑھاتے رہے البتہ وہ اپنے فنی نقطۂ نظر میں کبھی انتہا پسند نہیں ہوئے بلکہ قدیم و جدید کے امتزاج سے ایسی قدروں کو آگے بڑھانے میں لگے رہے جن سے عوام کے ہر طبقہ میں مقبولیت حاصل رہے اور شعر و فن کے تقاضے بھی مجروح نہ ہوں۔ فیض کا پہلا شعری مجموعہ "نقش فریادی" ۱۹۴۱ء میں شائع ہو چکا تھا اس میں ان کی زندگی کے رومان اور عشق و محبت کی داستان بھی پوشیدہ ہے اور اس دور کی سیاسی و سماجی زندگی کا وہ ہیجان بھی جس میں گھٹن، بیزاری، کرب ناکی اور غلامانہ زندگی سے نجات حاصل کرنے کا شدید جذبہ ابھر رہا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک

غزلیں

ترا حسن روحِ جمال بھی ترا حسن برق و شرر بھی ہے
مگر اے تجلّی معتبر کوئی چیز میری نظر بھی ہے

وہی خامشی وہی دردِ سر وہی اضطراب نظر بھی ہے
مرے جذبِ دل تجھے مرحبا جو ادھر تھا غم وہ ادھر بھی ہے

مری نگہ ہی پہ ہے نظر یہ مگر کسی کو نہیں خبر
جسے ڈھونڈتا ہوں میں دربدر وہی خود زمینِ سفر بھی ہے

جو سنوارتی ہیں حیاتِ غم تو یہ نعمتیں بھی ہیں مغتنم
ابھی جوشِ دیدۂ تر بھی ہے ابھی خاکِ دل میں شرر بھی ہے

مجھے گردشوں کا ہو خوف کیوں میں طلسم سے چاہوں گزر کے چلوں
مری زندگی میں ہے شام بھی مری زندگی میں سحر بھی ہے

قمر مرادآبادی

ہم سکھا دیں گے ہر اک قطرے کو طوفاں ہونا
بے ادب ہم سے نہ اے گردشِ دوراں ہونا

مستقل طنز ہے آئینِ چمن بندی پر
اپنے ماحول سے خوشبو کا پریشاں ہونا

میں بہارِ گل و لالہ میں سما جاؤں گا
تم جمالِ مہ و انجم سے نمایاں ہونا

عقل و ادراک سے گذرے تو جنوں تک پہونچے
کوئی آساں تو نہ تھا چاکِ گریباں ہونا

زندگی میں مجھے محرومِ کرم رہنے دو
تم مرے بعد مرے غم کے نگہباں ہونا

کچھ تو ہر موج میں ہوتا ہے تلاطم خود بھی
اور کچھ وقت سکھا دیتا ہے طوفاں ہونا

ہائے آغازِ محبت کی وہ پیہم الجھن
کچھ نہ ہونا تو خیالوں سے پریشاں ہونا

وہی موجیں لئے جاتی ہیں بہا کر ہم کو
اے قمر ہم نے سکھایا جنھیں طوفاں ہونا

کی سیاست نے کروٹ بدلی ملک آزاد ہوا۔ پاکستان کا قیام عمل میں آیا لیکن آرزوؤں کا جو محل تیار کیا تھا وہ چکنا چور ہو گیا اور بےقرار ہو کر چیخ پڑا کہ "وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں" لیکن اس امتحان کی گھڑی میں بھی فیض کے قدم نے لغزش نہیں کی بلکہ قیام پاکستان کے بعد ہی سے اس ملک کے اہم ترین انگریزی اور اردو اخبارات پاکستان ٹائمز، لیل و نہار اور امروز کی ادارت قبول کرکے نہ صرف ایک نئے ملک کی صحافت کو بلند کرنے پر توجہ دی بلکہ عملی سیاست میں شریک ہو کر اس مقصد کی تکمیل میں بھی لگ گئے کہ شعر و ادب اور صحافت ترقی پسند راستے اختیار کریں۔

فیض جو شاعری میں رمز و کنایہ کے سہارے سیاستدانوں کی چالوں، سرمایہ دارانہ طاقتوں کے مظالم اور حکمرانوں کے جبر و استبداد کا اظہار کرتے تھے اب کھل کر بے باکی سے اخباری کالموں میں ان سازشوں کو بے نقاب کرنے لگے نتیجہ وہی ہوا جیسا اکثر ہوا ہے یعنی ظالم اور غلامانہ فطرت کے پرستار ... کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتے رہے فیض کے ساتھ بھی یہی ہوا اور وہ حاکموں کی سازش کا شکار ہو کر "راولپنڈی سازش کیس" میں ملوث کر لیے گئے۔ ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو گرفتار ہوئے اور ۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء تک قید کی سختیاں برداشت کرتے رہے جیل کی زندگی ان کے لئے آزمائشوں اور مصائب و آلام کا شدید تجربہ ضرور رہا ہوگا لیکن اس مدت میں جب ان کا دوسرا مجموعہ کلام "دست صبا" شائع ہوا تو اس سے یہ اندازہ ہوا کہ ظلم و جبر کی طاقتیں حق کی آواز دبانے میں کامیاب نہ ہو سکیں اور عوام کا دکھ درد اس مجموعہ میں زیادہ پر اثر شکل میں ابھر آیا ان کی ذاتی مصروفیات زمانے کے حوادث اور گرد و پیش کے حالات نے شعری تخلیق میں جو سستی پیدا کر دی تھی وہ اس زمانے میں دور ہو گئی۔ ان کا تیسرا مجموعہ "زنداں نامہ" جس کی اشاعت ان کی رہائی کے بعد ۱۹۵۶ء میں ہوئی اس کا تخلیقی زمانہ بھی جیل کے اندر کا ہی ہے۔ رہائی کے بعد فیض محض شاعر کی حیثیت سے قبول نہیں رہے بلکہ بےکس و مجبور انسانوں کے رہنما اور جابر طاقتوں کا مقابلہ کرنے والے ہر فرد کے نمائندہ بن کر آگے بڑھے۔ ان کی یہ

مقبولیت حاکم وقت کے لئے پھر تشویش کا باعث بن گئی نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۵۸ء میں ان کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور اپریل ۱۹۵۹ء تک قید میں رہے۔ البتہ ابکی رہائی کے بعد پاکستانی عوامی طاقتیں مضبوط ہو چکی تھیں، جمہوری آواز تیز تر ہو چکی تھی اور حکومت نے اعتراف شکست کے طور پر ان نمائندوں کے تعاون کا سہارا لیا جو عوام کے دکھ درد کے جذبات کے ہمنوا تھے۔ اس کی ایک بڑی مثال یہ تھی کہ ۱۹۵۹ء میں فیض کو پاکستان آرٹ کونسل کا سکریٹری منتخب کیا گیا ۱۹۶۲ء میں انھیں اس کی اجازت دی گئی کہ وہ روس جا کر دنیا کا اہم اعزاز و امتیاز "لینن امن انعام" حاصل کریں ۱۹۶۴ء سے وہ کراچی کے بہت اہم علمی ادارہ عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل کی ذمہ داری نبھا رہے ہیں دوسری طرف اب سرکاری حلقوں میں بھی ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ملک کے اندر و بیرونی ممالک میں وہ سرکاری نمائندہ کی حیثیت سے بھی شرکت کر رہے ہیں، ان ذمہ داریوں کے باوجود ان کا تخلیقی ذہن اب بھی اسی طرح بلند صلاحیتوں کا احساس دلاتا ہے چنانچہ اس مدت میں ان کے دو مجموعے "دست تہ سنگ" ۱۹۶۵ء اور "سر وادی سینا" شائع ہوئے اس طرح ان کے پانچ شعری مجموعے نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، دست تہ سنگ اور سر وادی سینا ان کی تخلیقی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ دراصل ان مجموعوں کے نام ہی سے ذہن پر یہ کیفیت چھا جاتی ہے کہ ان کے اندر کتنی بیچارگی، بےبسی، مظلومیت و مجبوری اور کرب و بےچینی کے احساس بھرے ہوں گے۔ یہ سارا کلام محض شاعر کے احساسات کے ترجمان نہیں ہیں بلکہ ان میں صدیوں کے بہیمانہ مصائب و آلام اور ساری ذہنی کشمکش کو سمیٹ لیا گیا ہے۔

"نقش فریادی" سے "سر وادی سینا" تک فیض کا سفر جن دشوار گزار راستوں سے ہو کر گزرا ان کے مطالعہ کے بغیر جذباتی و ذہنی تغیرات اور داخلی و خارجی محرکات کی ہم آہنگی کو سمجھنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ ان میں غم جاناں اور غم دوراں کا جو گہرا امتزاج ملتا ہے وہ زندگی کے نشیب و فراز کے تجربات کا نتیجہ ہیں یہی تجربات تھے جن کا بیان

غزلیں

کرنل
ایس پی سنگھ
سوز

جن سے اُمید نوازش تھی ستم ڈھانے لگے
ہائے وہ منزل جہاں اپنے بھی بیگانے لگے
کیوں نہ مجھ کو میکدے کی شام یاد آنے لگے
آج پھر گیسو کسی کے رُخ پہ لہرانے لگے
یاد کے سائے دِل مغموم پر چھانے لگے
میرے پہلو سے خفا ہو کر وہ جب جانے لگے
مجھ پہ اقرار محبت کا بھرم بھی کھل گیا
جب وہ میرے پیار کی جھوٹی قسم کھانے لگے
اس سے محکم اور کیا ہوگا محبت کا ثبوت
دیکھ کر مجھ کو بھری محفل میں شرمانے لگے
جب فضائے میکدہ پر چھا چلی افسردگی
نیم باز آنکھوں کے پیمانے وہ چھلکانے لگے

ہو گیا تھا سوز اپنے حال پر شاکر مگر
اُن کی یاد آئی تو پھر ارمان بہکانے لگے

پھر نگاہ ناز سے وہ تیر برسانے لگے
نشتر مژگاں سے میرے دل کو تڑپانے لگے
اللہ اللہ میکدے میں چشم ساقی کا فسوں
پینے والے اپنے پیمانوں کو ٹھکرانے لگے
رشک کا جذبہ دِرِ جاناں پہ جا کر مٹ گیا
ہم کو بیگانے بھی اپنے جانے پہچانے لگے
جب کسی کے لب پہ آیا اُس پری پیکر کا نام
خود فراموشانِ اُلفت ہوش میں آنے لگے
دیکھنے والے جو محفل میں تھے پروانوں کی خاک
اپنی اپنی داستانِ غم کو دہرانے لگے
وہ بہت نازاں تھے سوز اپنی جفاؤں پر مگر
روزِ محشر سامنے آئے تو شرمانے لگے

بے بسی نمناک آنکھوں سے عیاں ہونے لگی
داستانِ غم نگاہوں سے بیاں ہونے لگی
دِلکشی پھولوں کی پامال خزاں ہونے لگی
بلبل شوریدہ سر نذرِ فغاں ہونے لگی
گردشِ ایام نے کچھ اس طرح بدلا مزاج
زندگی کی ہر خوشی بارِ گراں ہونے لگی
بجھتے بجھتے آرزوؤں کے دئے پھر جل اٹھے
وہ نگاہ ناز شاید مہرباں ہونے لگی
ذہن میں آتے ہی تعمیر نشیمن کا خیال
گلستاں میں آمد برقِ تپاں ہونے لگی
میکدے میں اللہ اللہ صحبت ساقی کا فیض
مے پرستی حاصلِ عمرِ رواں ہونے لگی
آپ کا طرزِ تغافل اپنے کام آ ہی گیا
کوششِ تسکین خاطر رائیگاں ہونے لگی

ضبط غم کا جب سہارا ہاتھ سے جاتا رہا
اشکباری سوز کی سیلِ رواں ہونے لگی

ذوق و شعور میں اختلاف رکھنے کے باوجود ہر طبقہ اور ہر قسم کے قاری کی تسکین کا باعث ہو سکتا ہے۔ اگر کسی کو حسن و رومان، عشق و محبت نغمہ و کیف سے رغبت ہو تو فیض کے ابتدائی دور کے کلام سے ہی اس کی جمالیاتی تشنگی بجھ سکتی ہے اس دور میں انھوں نے ہجوم شوق کی بےچینی و بیقراری کو دور کرنے کے لئے محبوب کے حسن کا وہ لطیف و رنگین تصور پیش کیا جس کے رنگ پیراہن سے ضیائے ماہ دمکنے لگتی ہے حسن سراپا انتظار بنا رہتا ہے۔ وہ شب ملاقات کی دلکشی میں فسانہائے الم یا فکر فردا کا وہ ساز نہیں چھیڑتے جس سے درد کا نغمہ ابھرے۔ وہ انتظار کی تیرہ و طویل راتوں۔ مٹی ہوئی امیدوں اور کھوئی ہوئی کہانیوں کو یاد کر کے جب شدت کرب الم کا اظہار کرتے ہیں وہ قاری کے دل و دماغ میں بھی کچھ کسک پیدا کرنے لگتی ہے۔ انہیں کیفیات سے متاثر ہو کر جعفر علی خاں اثر نے لکھا تھا کہ " فیض نے معصوم جذبات کو حسین پیکر بخشا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریوں کا ایک غول ایک طلسمی فضا میں مست پرواز ہے " لیکن "حدیث دل" بالذت ہوش و گوش کی دلفریبی بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ جیسے ہی غم روزگار نے زندگی کے حقائق سے قریب کیا اسی وقت سے محبوب کی یاد سے بیگانہ بنا گئے۔ وہ شاعر جو دل کی دھڑکن کو محبوب کی آواز پا تصور کرتا ہے اسی کو یہ کہنا پڑا کہ :-

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اور یہیں سے فیض کی شاعری کا وہ دور شروع ہو گیا جس نے محض حسن دلآرا کی سج دھج پر توجہ نہ دی بلکہ اپنے زمانے کے دکھ درد عوام کے مصائب و آلام اور صدیوں کے بیپایاں ظلم و ستم شامل کر کے نئی زندگی کی وہ کشمکش پیش کر دی جس میں جگر کے زخم اور خون دل میں غم جاناں اور غم دوراں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے ہیں۔ رومان اور حقیقت کو ایسا امتزاج بخشا ہے کہ جب "نقش فریادی" کے دوسرے حصہ سے یہ آمیزش ابھری تو اس دور کے ہر دل کے جذبات میں فیض کی آواز شامل ہو گئی۔ "دست صبا" اور "زنداں نامہ" یہ دونوں مجموعے ایک ہی دور اور شاعر کی ایک ہی ذہنی و خیالی کیفیت سے تعلق رکھتے ہیں اس منزل تک آتے آتے گرد و پیش کی زندگی کے مشاہدے کے لئے فیض کی بینائی زیادہ تیز ہو گئی تھی ان کے شوق کی بلندی اور لہو کی حرارت سے تصورات میں پختگی اور بصیرت میں تازگی پیدا ہو چکی تھی مگر شعور کی تیزی نے فنی صلاحیتوں میں غیر معمولی قدرت دیدی تھی لیکن ان کے دل میں جو کسک۔ دکھ درد۔ انسانیت کی بےبسی بیقرار کئے ہوئے تھے اس کا تصور اور زیادہ بےچین کرنے لگا۔ البتہ ان کی ذاتی زندگی میں جو پابندیاں حائل تھیں ان میں وہ تشدد و تلخیوں کے حقائق کھل کر پیش نہیں کر سکتے تھے اسی لئے اب فیض نے غزل کی اس ایمائیت سے کام لینے پر زیادہ توجہ دی جس کے ذریعہ بادہ و ساغر کا ذکر کر کے مشاہدۂ حق کی گفتگو مقصود ہوتی ہے۔

فیض ایک نظم گو کی حیثیت سے نمایاں ہوئے تھے لیکن موضوع و مواد میں جدت و ندرت کے باوجود ان کی فطرت میں حسن و جمال کے اظہار کا جو جذبہ موجزن تھا' ان کو نکہت و رنگ سے جو رغبت تھی ذوق وصل و یاد یار کا جو احساس بیقرار کئے رہتا تھا شاعری کی قدیم روایات کا جو احترام تھا۔ اور سب سے بڑھکر نغمہ و موسیقی کے لہجہ میں دل کے داغوں کی بہار' لاکھوں خوش گشتہ آرزوؤں کو زبان خموشی ظاہر کرنے کی جو صلاحیت تھی اس نے ان کا مرتبہ غزل گو کی حیثیت سے زیادہ بلند کر دیا چنانچہ دست صبا اور زنداں نامہ کی غزلوں نے قاری کے ذہن کو جو آسودگی اور احساس لذت بخشا وہ جدید دور کے کسی غزل گو سے حاصل نہ ہو سکا کہا جاتا ہے کہ فیض نے "پرانی علامتوں کو نئے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ پرانے رموز کو نئی زبان نئی جہتیں اور نئے اشارے دئے ؛ یعنی رنگ بہاراں' قفس، چمن، بادصبا، زلف و رخسار' مئے لالہ فام، کف گلچیں، شام غم۔ دست فلک' بخیہ گری ان باتوں کا ذکر کر کے انھوں نے اس سے مختلف معنی پیدا کئے ہیں جو اردو کے قدیم غزل گویوں نے مراد لئے تھے لیکن شاعری کی مقبولیت کے لئے محض اتنا ہی کافی نہیں تھا کہ رمزیت کا سہارا لے کر اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کر دے او

غزلیں

ڈاکٹر نریش

دھوپ کڑی جیون کی لیکن کیسے بیٹھوں چھاؤں میں
سانسوں کی زنجیر پڑی ہے اب تک میرے پاؤں میں

کچھ دن پہلے تو وہ گاؤں اس بستی سے ملحق تھا
اب تو فاصلہ ہے میلوں کا اس بستی اس گاؤں میں

تب تو اک لڑکی کی خاطر ماں کو چھوڑ دیا لیکن
ماں کے بعد یہ جانا کتنا سکھ ہے ماں کی چھاؤں میں

میں تو کمرے میں بیٹھا ہوں لیکن ذہن مرا اس وقت
صحرا صحرا بھٹک رہا ہے طوفانی جھنجاؤں میں

شاید حوّا کی بیٹی پھر رکھی گئی نیلامی پر
دیکھ رہا ہوں ہوڑ لگی ہے آدم کے آقاؤں میں

دیوانے نے اپنی دھن میں جانے کیا کہہ ڈالا ہے
کب سے بحث چھڑی ہے اس پر بیچارے داناؤں میں

کچھ دن پہلے تو نریش ان سے رس برسا کرتا تھا
اب تو جیسے ڈنک بھرے ہیں ان پروائی ہواؤں میں

پرکاش ناتھ پرویز

ہجر کی شب، فضا اُداس اُداس
چل رہی ہے ہوا اُداس اُداس

اے خدا! خیر ہو سفینے کی
آج ہے ناخدا اُداس اُداس

ہم کو جب یاد آ گیا ہے کوئی
ہو گئی ہر فضا اُداس اُداس

ہیں عجب چیز تیرے دیوانے
زندگی سے خفا، اُداس اُداس

خیر ہم تو اُداس ہیں لیکن
دل ہے کیوں، آپ کا اُداس اُداس

دیکھ کر جورِ اہلِ دنیا کے
ہو گئی ہے وفا اُداس اُداس

راس آئے گی آتے آتے ہی
زندگی کی فضا اُداس اُداس

تھک گیا ہے خرامِ ہستی کا
ہیں ترے نقشِ پا اُداس اُداس

دل کو پرویز کیا خبر اس کی
ہے کوئی خوش ادا اُداس اُداس

اپنے دل کی بھڑاس نکال لے لئے اس کی عظمت کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ ان علامات کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کے بجائے ہر فرد کے احساسات کا ترجمان بنا دیا۔

اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

قفس ہے بس میں تمہارے تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتش گل کے نکھار کا موسم

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

دست صیاد بھی عاجز ہے کف گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

دل نا امید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

اسی طرح زیادہ تر اشعار سے یہی احساس ہوتا ہے کہ انہیں تاثر کی شدت انداز بیان کی ندرت اور تغزل کی لطافت کے ساتھ ایک دبی دبی سی کراہ، دھیمی آنچ اور درد مند دل کی پکار سنائی دیتی ہے انہیں کیفیت نے فیضؔ کی غزل کو نکھار کر ان میں غیر معمولی حسن، دلکشی بھر دی یہاں یہ بحث نہیں ہے کہ فنی پابندیوں کے معیار کو سامنے رکھ کر فیضؔ نے کہاں تک قدیم روایات سے اپنا رشتہ قائم رکھا لیکن ان کی تشبیہوں میں جو انوکھا پن ہے ان کے الفاظ میں جو لطافت و نرمی اور ان کی طرز ادا میں جو نغمگی ہے اس نے بھی غزل میں بہت وسعت بخشی اور فیضؔ کی انفرادیت میں اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

نہ معلوم کیوں یہ احساس ہوتا ہے کہ جب فیضؔ کے دل کا زخم مندمل ہو جاتا ہے تو ان کی شاعری میں ایک قسم کا ٹھہراؤ یا ایسی بے کیفی پیدا ہو جاتی ہے جس سے جذبات میں ابال پیدا کر کے پڑھنے والوں کے دلوں میں جگہ بنا لینے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے چنانچہ ان کے چوتھے مجموعہ "دست تہ سنگ" کی نظموں اور غزلوں میں اسی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس مجموعہ کی شعری تخلیق اس دور کی ہے کہی جا سکتی ہے جب فیضؔ جیل سے باہر آ چکے تھے دوسری طرف ملک کی سماجی و سیاسی زندگی اور عوام کی ذہنی کیفیت میں کسی ہیجان و انتشار کے بجائے ایک قسم کا سکون پایا جاتا تھا اب نہ وہ زنجیر بکف تھے نہ بند بہ پا۔ محض زندان رہ یاد کی پابندی رہ گئی تھی۔ جسے چاہے جمودی کیفیت سے تعبیر کیا جائے لیکن غالباً فیضؔ کے لئے جذبات میں ابال پیدا کرنے کا وہ مواد موجود نہ تھا جس سے ان کے تخلیقی عمل میں گرمی یا جوش پیدا ہوتا ممکن ہے بعض ناقدین اس کمی کے لیے یہ جواز پیش کریں کہ "دست تہ سنگ" تک پہونچتے پہونچتے فیضؔ کی آواز میں کچھ تھکن کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ لیکن حقیقتاً اس دور کی نظمیں یا تو شاعر کے ذاتی تاثرات اور وقتی احساسات تک محدود ہیں یا ترسیل کا وہ حق ادا نہیں ہوتا قاری کا ذہن جن کا متمنی تھا۔ البتہ غزل کی علامات کو چونکہ بقدر احساس ہر قسم کا قاری اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے ڈھال لیتا ہے اسی لئے اس مجموعہ کے بعض اشعار کی لطافت، دلکشی اور تاثراتی بلندی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

نہ سوال وصل نہ عرض غم نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دل زار کے سبھی اختیار چلے گئے

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی

یہ جامہ صد چاک بدل لینے میں کیا تھا
فرصت ہی نہ دی فیضؔ مگر بخیہ گری نے

اس طرح بہت سے اشعار جمالیاتی احساس کو آسودگی بخشتے ہیں لیکن مجموعی طور پر نظموں یا غزلوں میں کسی ایسے دل کی ٹیس نہیں محسوس ہوتی جو آج کے انسانی زخموں کے تپش سے ہم آہنگی کا احساس دلائے۔ پیکنگ۔ سنکیانگ کے سفر نامہ یا اسی طرح کی دوسری نظمیں ہنگامی تاثرات کی تخلیق ہیں اسی لئے ان عناصر کا فقدان نظر آتا ہے جو انہیں آفاقیت بخش سکیں اور یہی تشنگی اظہار ایک طرح کے ٹھہراؤ کا احساس دلاتی ہے۔

فیضؔ نے اردو شاعری میں ایک نئی طرح کا طرز احساس پیدا

غزلیں

حبیب ہاشمی

دل میں خیالِ حسنِ شگفتہ لئے ہوئے
ہم پھر رہے ہیں یادِ گذشتہ لئے ہوئے

ہم جی رہے ہیں شہرِ نگاراں میں اس طرح
شامِ ستم نصیب شکستہ لئے ہوئے

تہذیبِ نو کی قدریں فلک تک پہنچ گئیں
ہم اونگھتے ہیں عہدِ گذشتہ لئے ہوئے

جلوؤں کی چاہ میں تری گلیوں سے بارہا
گزرا کئے ہیں شیشۂ خستہ لئے ہوئے

دشوار ہے تحفظِ تقدیسِ گل مگر
اہلِ ہوس ہیں ذکرِ فرشتہ لئے ہوئے

اُن کو مسرتوں کا خزینہ ملا حبیبؔ
ہم رہ گئے ہیں درد کا رشتہ لئے ہوئے

اقبال ردولوی

اے دل کوئی خلوص میں سچا دکھائی دے
ہر شخص یوں تو ہاتھ ملاتا دکھائی دے

ڈالے ہوئے ہر ایک سیاست کا ہے نقاب
اصلی کسی کا ہم کو نہ چہرہ دکھائی دے

وہ تلخیاں بٹی ہیں غمِ روزگار سے
عالم تمام زہر اُگلتا دکھائی دے

راہوں کی تیز دھوپ میں جلنے لگا بدن
للہ اب کہیں کوئی سایہ دکھائی دے

"عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"
غالبؔ کا قول آج بھی سچا دکھائی دے

دن آ گئے قریب یقیناً بہار کے
چہرے کا اُس کے رنگ نکھرتا دکھائی دے

کرکے جس طرح وجدانی شعور کو تابناکی بخشی تھی زندگی میں عزم و استقلال کا جو جذبہ موجزن کر دیا تھا، انبساط کی لے سے ابھاری تھی وہ ساری شعری فضا پر اتنی تیزی سے چھا گئی کہ ہر نغمہ میں یہی آواز سنائی دینے لگی "سر وادیِ سینا" کی منزل تک پہونچنے کے بعد خود فیض کو اپنے فن پر اتنا اعتماد ہو چکا تھا کہ یہ کہہ پائے کہ ؎

اک سخن اور کہ پھر رنگ تکلم تیرا
حرف سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

اعجاز کا رنگ پیدا کرنے میں انھوں نے روایات کی پابندی علامات کے استعمال یا موضوعات و انداز بیان سے کسی کی بغاوت کا احساس نہیں ہونے دیا بلکہ ان کی تخلیقی صلاحیت میں وہ توانائی فنی قدروں کے اظہار میں وہ پختگی اور زندگی کے تجربات سے اتنی گہری وابستگی پیدا ہو چکی تھی کہ ان کی ہر آواز میں رچے ہوئے شعور تفکر و بلند نگاہی کا احساس ہوتا ہے۔

البتہ مجموعی طور پہ یہ احساس ہوتا ہے کہ اب فیض کی نظموں میں گذشتہ دس سال سے زنداں نامہ کی اشاعت کے بعد ان کی بہت سی نظمیں زندگی کی اس کشمکش سے دور معلوم ہوتی ہیں جو روح میں تڑپ اور زخموں میں ابال پیدا کر دے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی علامتوں میں وہ وسعت اور جان باقی نہیں رہ گئی جو قاری کے جذبات سے ہم آہنگ ہو کر معاشرہ اور شاعر کے رشتہ کو ایک بنا دے۔ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے اپنی ہی ذات کو سب کچھ سمجھکر لاشعوری کیفیات کی ترجمانی کے زیر اثر بعید از قیاس یا مبہم علامتوں سے کام لینا شروع کر دیا ہے جس سے سماجی رشتے منقطع ہو چکے ہیں نہ تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ جدت پسندی کی شدت میں انھوں نے موضوعات و ہیئت سے کسی قسم کی ایسی بغاوت شروع کر دی ہے جس سے قاری کا ذہن ناآشنا ہو اور وہ اسے پوری طرح قبول کرنے کو تیار نہ ہو۔ نہیں یہ سب کچھ نہیں ہے قدیم روایات کا احترام غم دوراں اور غم جاناں کی ہم آہنگی کا التزام کائنات کے مسائل کا اظہار ان عناصر کی کمی فن میں ایک قسم کے ٹھہراؤ کی ذمہ دار نہیں بن سکتی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج کے بنیادی مسائل یا عام انسانوں کی ذہنی کشمکش سے انکی ذات کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے قاری کو انہیں ان تمام آرزوؤں اور تمناؤں سے قربت نہیں رہ گئی ہے وہ شاعر کے کلام میں جنھیں دیکھنے کا متمنی تھا یعنی شاعر اور قاری کی اندرونی دنیا میں پہلے جو ہم آہنگی تھی اس کا تسلسل ختم ہو رہا ہے اس کمی کے وجوہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا دامن گلہائے رنگا رنگ سے خالی ہو چکا ہے۔ اب بھی ان کی شاعرانہ فکر اپنی چمک دکھا جاتی ہے اور خاصکر سر وادیِ سینا کی غزلوں نے ان کے امتیاز کو باقی رکھا ہے۔

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا ترے ہمراز کا رنگ
چنگ و نے رنگ پہ تھے اپنے لہو کے دم سے
دل نے لے بدلی تو مدھم ہوا ہر ساز کا رنگ

شرح بیدارئ حالات نہ ہونے پائی
اب کے بھی دل کی مدارات نہ ہونے پائی
پھر وہی وعدہ جو اقرار نہ بننے پایا
پھر وہی بات جو اثبات نہ ہونے پائی

یک جان نہ ہو سکے کہ انجان نہ بن سکئے
یوں ٹوٹ گئی دل میں شمشیر شناسائی

اس طرح شورِ انا لحق، قلقل مے، کاسۂ سر، دست و کشکول چنگ و نے ان ترکیبوں سے تشبیہ کا سہارا لے کر فیض کا تغزل اب بھی جس فضا کو پیش کرتا ہے اس کی صلاحیت بہت کم شعراء کو نصیب ہو سکی غالباً خود فیض کو یہ احساس ہے کہ غزل کے رمز و کنایہ کی مدد سے قاری کے جمالیاتی ذوق کو وہ جس طرح آسودگی بخش سکتے ہیں اس طرح نظموں کے ذریعہ ممکن نہیں اسی لئے انھوں نے ایک شہر آشوب یا بعض دوسری نظموں کے لئے غزل ہی کا فارم اختیار کرنا زیادہ مفید سمجھا اس نظم میں کہتے ہیں۔

افضل اجملی

سوختگی

پیار
اک ایش ٹرے ہے
اور پھر پیار مجھ میں
نیم سوختہ سے سیگریٹ کی طرح
دھیرے دھیرے سلگتا رہا
آج پھر
ایسا محسوس ہوتا ہے مجھکو
جیسے
سوکھے درختوں کی ٹہنی کی صورت
میں بھی
اس پیار میں جل رہا ہوں

غزل

نہ پوچھو زندگی کا راز کیا ہوں
میں اپنے دل کی گم گشتہ صدا ہوں
گلہ ہے اپنی تنہائی کا مجھکو
میں اپنی راہ میں تنہا کھڑا ہوں
جہاں تک میری آنکھیں دوڑتی ہیں
میں خود اپنا ہی سایہ دیکھتا ہوں
کسے الزام دوں اس تشنگی کا
سمندر میں بھی میں پیاسا کھڑا ہوں
میں ہر چہرے کو دیواروں کے پیچھے
بہت اچھی طرح پہچانتا ہوں
نشاط کرب میں دل کو بھگو کر
بساط زندگی پر کھیلتا ہوں

غزل

اب کسی سائے کا پیچھا نہ کروں
غم کے ساگر میں اتر کر دیکھوں
کب تلک یاس کا صحرا دیکھوں
کیوں نہ امید سے سودا کرلوں
چھوڑ کر جس کو چلا آیا تھا
کس سے اس شہر کا رستہ پوچھوں
جسکی چاہت میں کئی گھاٹ ملے
پھر اسی آنکھ میں کیونکر ڈوبوں
درد ہی درد ہے چاروں جانب
اب یہی سوچ کے گھر لوٹ چلوں

اب بزم سخن صحبت لب سوختگاں ہے
اب حلقۂ مے طائفۂ بے طلباں ہے
گھر رہیے تو ویرانیٔ دل کھانے کو آوے
رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے
پیوند رہ کوچۂ زر چشم غزالاں
پابوس ہوس افسر شمشاد قداں ہے
ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

ان اشعار میں احساس کی جو شدت موجزن ہے اس کے لئے نظم کا فارم مناسب نہیں ہو سکتا چنانچہ یہ کہنا بہت زیادہ غلط نہ ہوگا کہ ایک نظم گو کی حیثیت سے نہ سہی لیکن غزل میں فیضؔ کی عظمت اب بھی برقرار ہے۔ جس نے ایک نیا لہجہ، نیا رنگ اور نئی آواز بن کر دلوں میں گھر کر لیا تھا یہاں یہ بحث زیادہ مفید نہ ہوگی کہ فیضؔ نے غزلوں میں بحر و زا فن کے متعین اصولوں کو برتنے میں کہاں تک کامیابی حاصل کر لی ہے اور کہاں کہاں ناکام رہے ہیں۔ مجموعی طور پر پروفیسر احتشام کے یہ تاثرات ان کی شاعری پر صادق آتے ہیں کہ: "فیض پڑھنے والے کو اتنی جہات سے متاثر کرتے ہیں کہ تعصبات کا دائرہ بالکل تنگ ہو جاتا ہے۔" ان کے خیال میں کسی شاعر کو پسند کرنے میں اس کی پیش کی ہوئی ایسی بنیادی قدروں کا بھی ہاتھ ہوتا ہے جن سے احساس جمال اور احساس سود و زیاں دونوں کی تسکین ہوتی ہے اور ان دونوں کا امتزاج فیضؔ کی شہرت و مقبولیت کا سب سے بڑا راز ہے۔

"سر وادیٔ سینا" کے آخری حصہ میں فیضؔ نے داغستان کے مشہور شاعر رسول حمزہؔ (جنھیں وہ ملک الشعراء کے مرتبے پر کہتے ہیں) کے افکار کو نظم کے پیرائے میں پیش کیا ہے یہ خیالات و احساسات بھی فیضؔ کے اپنے دل کی پکار معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے فیضؔ کا جامہ پہنا دینے کے بعد بھی شاعری میں وہی شدت موجزن نظر آتی ہے جو شاعر کے جذبات سے گہرے طور پر ہم آہنگ ہو اسی لئے نہ تو یہ احساس ہوتا ہے یہ کسی دوسرے خطّے کے شاعر کا جذبہ ہے نہ یہ۔۔ کسی دوسرے زبان کی تخلیق۔ جیسے رسول حمزہؔ کے احساسات فیضؔ کے دل کے احساسات ہیں یا اگر رسول حمزہؔ ہی کے افکار ہیں تو انھوں نے فیضؔ ہی کے جذبات کی ترجمانی کر دی ہے۔ جذبات کی اس یک رنگی کا راز عقائد اور خیالات میں اشتراک ہے۔

غزل

منظر النساء نازؔ

ہنسی کے ذکر پہ گر آپ غم اٹھائے ہیں
خوشی کے نام پہ ہم بھی فریب کھائے ہیں
جہاں کہیں بھی نئے پھول مسکرائے ہیں
ہمیں پرانے کئی زخم یاد آئے ہیں
وفا کی بزم میں اب اک کمی سی رہتی ہے
نہ جانے جلدی میں کیا چیز بھول آئے ہیں
نگاہ شوق تو بس ایک نام پر ٹھہری
لبوں پہ اپنے کئی نام یوں تو آئے ہیں
شب فراق چراغوں کی طرح راہوں میں
کسی کے نقش قدم ساتھ ساتھ آئے ہیں
اکیلے پن کا اب احساس تک نہیں ہوتا
تمہاری یادوں کے دل پر حسین سائے ہیں
تمام عمر سلگنے سے کیا ملا اے نازؔ
نگاہِ دوست میں اب تک بھی ہم پرائے ہیں

غزلیں

نذرِ فیض

پائے ہیں جب سے ہم نے زمانے بہار کے
صدقے گئے ہیں رحمت پروردگار کے

اہلِ خرد کو گرد بھی جس کی نہ مل سکی
بیٹھے ہیں اہلِ دل وہ زمانے گذار کے

لے دے کے میرے پاس تھا اس زیست کا لحاظ
وہ بھی لٹا دیا تیرا صدقہ اُتار کے

تیرا خیال آتے ہی محسوس یہ ہوا
چھو کر مجھے گذر گئے جھونکے بہار کے

اے موسمِ بہار! عنایت کا شکریہ
انبار لگ گئے مرے دامن میں خار کے

پھر سینۂ حیات پہ مہکے گا زخمِ نو
بیٹھا ہے پھر کوئی شبِ ہجراں سنوار کے

تابشؔ یہ کم نہیں ہے کہ دل پر امید ہے
کیوں بیٹھ جائیے غمِ دنیا سے ہار کے

تابش صدیقی

کیا دَور ہے کہ جھوٹ ہے آرام گاہ میں
سچ کھو کے رہ گیا ہے مگر گردِ راہ میں

یہ بھی ستم ظریفیٔ حالات ہے کہ ہم
کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں اپنی نگاہ میں

کچھ ان سے جا کے پوچھئے جرم و سزا کی بات
جو زندگی گذار چکے ہوں گناہ میں

میرے جنونِ شوق کا عالم نہ پوچھئے
کانٹوں سے کھیلتے رہے پھولوں کی چاہ میں

فصلِ بہار آئے تو زنجیر ٹوٹ جائے
اتنا اثر تو چاہئے انساں کی آہ میں

ٹھہری نہ موت حرفِ صداقت کے سامنے
کہسار گردِ پا ہے عزائم کی راہ میں

تابشؔ گناہ گار ہے مالک معاف کر
شرمندہ ہو کے آیا ہے تیری پناہ میں

منتخب اشعار — بشیر بدر

آج ہم سب کے ساتھ خوب ہنسے
اور پھر دیر تک اداس رہے

انھیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہمسفر کہاں ہے

کوئی اجنبی تری راہ میں مرے پاس سے یوں گذر گئے
جسے دیکھ کر یہ تڑپ ہوئی ترا نام لے کے پکار لوں

خوبصورت، اداس، خوفزدہ
وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

اک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم، اپنا پیغام لاتی تھی موج رواں
آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلتا ہے اور بولتا تک نہیں

آنکھیں آنسو بھری پلکیں بوجھل گھنی جیسے جھیلیں بھی ہوں، نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہیے انھیں کچھ ہنسی آگئی۔ بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

چاہے کوئی موسم ہو دن گئی بہاروں کے پھر سے لوٹ آئیں گے
ایک پھول کی پتی اپنے ہونٹ پر رکھ کر میرے ہونٹ پر رکھ دو

ارمان شہابی

قطعات

لڑکھڑا کر میں گر پڑا ہوتا
وقت نے ایسا تیر مارا تھا
وہ تو کہیے شراب خانے کی
پختہ دیوار کا سہارا تھا

روح فرسا ہے میری تنہائی
ایک صحرا ہے میری تنہائی
کوئی آہٹ نہ لے۔ نہ گیت۔ نہ ساز
کتنی تنہا ہے میری تنہائی

آرزو کے دیئے بجھا ڈالے
دل کے داغوں سے روشنی کر دی
اے غم یار! میں نے تیرے لئے
ہر خوشی کل پہ ملتوی کر دی

بے کسی اس سے بڑھ کے کیا ہوگی
موت بھی اس سے بڑھ کے کیا ہوگی
جی رہا ہوں تیری جدائی میں
خودکشی اس سے بڑھ کے کیا ہوگی

مجھ سے پوچھو کہ میں نے کیسے کی
زندگی کی یہ سرد رات تمام
درد کا چاند آنسوؤں کے چراغ
چشم دیدہ ہیں واقعات تمام

جگمگاتی ہوئی ہے تو باقی
گل پڑا ہے جو وہ چراغ ہوں میں
آ کہ مل جل کے چاند ہو جائیں
روشنی تو ہے اور داغ ہوں میں

درد سے پائمال ہیں ہم لوگ
وقفِ رنج و ملال ہیں ہم لوگ
مر گئے جو جہان میں بے موت
ان کی زندہ مثال ہیں ہم لوگ

ساغروں کے چراغ کچھ بھی نہیں
چاند مبہم سا اک دیا سا ہے
جب سے روشن ہیں داغ ہائے جگر
سارا عالم بجھا بجھا سا ہے

مبارک ہو

فرحت آرا حیدری

"بیگم! چاند نکل آیا۔" صفدر نے اپنی بیوی شمسہ سے کہا۔

"کہئے! مبارک ہو۔" "مبارک ہو!" "نام لے کر کہئے مبارک ہو۔" "نام مبارک ہو۔"

"واہ بھئی۔ آپ بھی خوب ہیں۔ ہمارا مطلب ہے کہ اس کا نام لے کر کہئے۔"

"کس کا نام لے کر؟" "شب روشن کا۔" "شب روشن مبارک ہو۔"

"پھر وہی۔ نام تو لیجئے۔" "کس کا نام؟" "اوپر والے کا۔" "اوپر والا مبارک ہو۔"

"آپ عجیب آدمی ہیں۔ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی۔" "آپ کا مطلب کیا ہے؟" "آپ اس کا نام لے کر کیوں نہیں کہتے کہ مبارک ہو۔" "کہا تو کہ اوپر والا مبارک ہو۔"

"عقلمند! اس کا نام لے کر کہئے۔" "اب کس طرح نام لیں؟" صفدر چیخ پڑا۔

"آپ نے ابھی تک شب روشن کا نام ہی نہیں لیا۔" "شب روشن مبارک ہو۔"

"توبہ خدایا۔ آپ تو بچوں سے بدتر ہیں۔" "معلوم بھی تو ہو کہ آپ کا مقصد کیا ہے؟"

"ننھے منے سے بچے ہیں نا۔ ابھی تو آپ کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے ہیں۔"

"دیکھئے! فضول باتیں نہ کیجئے۔ ہمیں سمجھا کر بتائیے۔" "شب روشن کا نام لے کر کہئے۔"

"شب روشن مبارک ہو۔" "جو نگوڑ کہیں کے۔" شمسہ جھنجھلا اٹھی۔

"لو نگوڑ ہوں گی آپ۔ پتہ نہیں خود کیا اڑا رہی ہیں دوسروں کو بیوقوف سمجھتی ہیں۔"

"عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہے۔" "ہم اشاروں کی باتیں نہیں سمجھتے۔ ہم سے صاف کہئے۔"

"اشارہ نہ کنایہ۔ ہم تو صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ اس کا نام لے کر کہئے۔"

"کہا تو کہ مبارک ہو۔" "نام لے کر کہئے۔" "کس کا نام؟" "اوپر والے کا۔"

"خدا مبارک ہو۔" "پاگل کہیں کے۔" "پاگل ہیں آپ جو بے مقصد باتیں کر رہی ہیں۔"

"ہم نے ایسا آدمی کوئی نہیں دیکھا جو اتنی سی بات نہ سمجھ سکے۔"

"ہم نے ایسی اوندھی کھوپڑی والی عورت نہیں دیکھی جو خود بکواس کرے اور دوسروں کو بیوقوف بنائے۔"

"آپ کو کون عقلمند کہے گا۔ آپ تو بیوقوفوں کے افسر ہیں۔" "بیہودہ نہ بکئے۔ ورنہ ہمیں بھی غصہ آجائے گا۔" "خون تو آپ کھولا رہے ہیں۔"

"ہم کہتے ہیں کہ آپ کی باتیں گدھا بھی نہیں سمجھ سکتا۔"
"واقعی ہماری باتیں گدھا ہی نہیں سمجھ سکتا۔"
"ہم نے ایسی بیوقوف عورت کوئی نہیں دیکھی۔"
صفدر طیش میں آکر بولا۔
"تمیز سے بات کیجئے۔" "پہلے خود تمیز سیکھئے۔"
"اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات بتائیں۔" "فرمایئے۔"
"شرط یہ ہے کہ آپ قائل بھی ہو جایئے گا۔" "بلاشک وشبہ۔"
"آپ کی بغیر دماغ کی کھوپڑی نے آج تک جو جو کارنامے انجام دیئے اس پر جتنی بھی حیرت کی جائے وہ کم ہے۔"
"کاش آپ کی کھوپڑی بھی بغیر دماغ کے ہوتی تاکہ آپ بھی اس دنیا میں رہ کر کچھ کر پاتیں۔"
"خدا بچائے ایسی سوجھ بوجھ سے۔ جو معمولی بات نہ سمجھ پائے۔"
"آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔" صفدر نے تشویش انگیز لہجے میں سر کھجاتے ہوئے پوچھا۔
"صرف اتنی سی بات کہ آپ شب روشن کا نام لیکر کہئے کہ مبارک ہو۔"
"شب روشن مبارک ہو۔"
"یا خدا کس بدھو آدمی سے سابقہ پڑا ہے۔ کاش آپ بانس بریلی ہوتے تو ہم اس کہاوت پر یقین کرلیتے کہ لمبے آدمیوں کے عقل کم ہوتی ہے۔"
لوگ ہمارا جھوٹا کھاتے ہیں کہ ہمارا ایسا دماغ ان کا بھی ہو جائے۔ اگر چراغ لے کر بھی ڈھونڈھیئے گا تو ہمارا ایسا عقلمند آدمی نہیں ملے گا۔
"خدا بچائے ایسے دماغ سے اور بھاڑ میں جائے ایسی عقل۔"
"آپ کی زبان کٹ جائے۔" صفدر غیظ میں آکر بولا

"آج کے دن کوسیئے مت۔ زبان سنبھال کر بات کیجئے۔"
"آہا خوب فرمایا۔ خود کوسیں دوسرا نہ کوسے۔"
"ہم نے کب کوسا۔ ہم تو آپ کی عقل کا رونا رو رہے ہیں۔"
"عقلمند کو بیوقوف کہنا ہی سب سے بڑی گالی ہے جو کوسنے سے بھی بدتر ہے۔"
"نہ آپ ننھے بنتے نہ کہے جاتے۔ اگر آپ جاہل نہ ہوتیں تو ایسی باتیں کبھی نہ کرتیں۔"
"ہم تو آپ سے کہلوا کر چھوڑیں گے۔" "بد دماغ عورت سے خدا بچائے۔"
"یہ خوبیاں آپ ہی میں ہیں۔ بد دماغ بھی اور بد زبان بھی۔"
"میں بد زبان ہوں۔ اور نہیں تو کیا۔ اتنی سی بات کے لئے ہزاروں صلواتیں سنا ڈالیں۔"
"سبحان اللہ۔ میں بد زبان ہوں اور آپ کے منھ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔"
"بیشک۔ ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ بددماغ بھی ہیں اور بد زبان بھی۔ آپ کی عقل نے کوفت کرادی ہے اور زبان نے کلیجہ چھلنی کر دیا۔"
"آپ کی زبان ہے کہ تلوار کی کاٹ۔ آپ کی باتوں ہی سے انسان ختم ہو جاتے ملک الموت کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"آج کی رات مبارک وسلامت کے بجائے آپ خوب کوسیئے۔ کوسنوں کے سوا آپ سے ملتا کیا ہے۔"
شمسہ کی مسکراتی ہوئی کنول جیسی آنکھیں آنسوؤں کے جھیل میں تیرنے لگیں اور پھر وہ ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگی اس کے رونے کی آواز سن کر نندیں آگئیں۔
"بھابی! کیا ہوا۔ آپ کیوں رو رہی ہیں؟"
"بلا وجہ۔ عورتوں کو رونے کے سوا آتا ہی کیا ہے"

صفدر بولا۔
"تمہارے بیوقوف بھائی نے کلیجہ پکا دیا ہے۔
آج شب عید مبارکباد دینے کے بجائے کوس رہے ہیں"
"ہم نے کب کوسا۔ انھوں نے بکواس کی تو ہمیں بھی غصہ آ گیا"
"ہم نے صرف اتنا کہا کہ شب روشن کا نام لے کر مبارک کہیئے مگر یہ نہیں کہتے اور دنیا بھر کی باتیں بنا رہے ہیں"
"اچھا ہم لوگ مبارکباد دیتے دیتے ہیں"
"مطلب یہ ہے کہ شب روشن دیکھتے ہی پہلے کسی مرد کو اس کا نام لے کر مبارکباد دینا چاہیئے"
"اچھا میں مبارکباد دیئے دیتا ہوں۔ بھابی! عید مبارک ہو"
دیور نے آتے ہوئے کہا
"شب روشن کا نام لے کر کہیئے" "شب روشن مبارک ہو"
"پھر وہی۔ نام تو لیجئے" "نام ہی لے کر کہا ہے"۔
"بھئی۔ عورتیں نام نہیں لیتی ہیں اس لئے ہم شب روشن کہہ رہے ہیں۔ آپ اس کا اصلی نام لے کر کہیئے"
اس پر سب احمقوں کی طرح ایک دوسرے کا منھ تکنے لگے۔ شمسہ جھلا کر بولی
"بدعقلوں سے خدا بچائے"
"دیکھئے! آپ پھر فضول باتیں کرنے لگیں"
صفدر غصے میں بولا۔
"آپ کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں اس لئے آپ خاموش ہی رہیئے"
"آپ کی عقل گدی میں نہ ہوتی تو ایسی ناشائستہ باتیں نہ کرتیں"
"ہم تو بدتمیز ہیں۔ بددماغ ہیں۔ بدطینت ہیں۔ کون سی ایسی برائی ہے جو ہم میں نہیں ہے"
"خدا بچائے آپ سے۔ آپ کی پریشان کن باتوں سے اتنا تنگ آ گئے ہیں کہ اگر پاگل بھی ہو جائیں تو حیرت نہ ہو۔
"ہم آپ لوگوں سے پناہ مانگتے ہیں۔ آپ ہمیں سواری بلوا دیجئے ہم چلے جائیں"۔
"عید کر کے جائیے گا" نند نے کہا
نہیں۔ ہم یہاں عید نہیں کریں گے۔ یہاں ایسی بدشگونی ہوئی کہ ہمیں وہم آ گیا ہے جب بسم اللہ ہی غلط ہوئی تو پتہ نہیں آگے کیا ہو۔ اگر عید کا دن اچھا نہیں گزرتا ہے تو پورا سال . . . . "
شمسہ نے ادھورا جملہ چھوڑ کر صفدر سے تحکمانہ لہجے میں کہا
"جلدی سے سواری بلوائیے"
"اچھا بھئی اچھا۔ آپ اپنے میکے ہی میں عید منائیے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے"۔ پھر صفدر نے اپنے بھائی سے کہا "جاؤ! ایک ٹیکسی لے آؤ"
وہ ٹیکسی لینے جا ہی رہا تھا کہ اتنے میں شمسہ کا بھائی آ گیا اس نے سلام کے بعد کہا۔ "باجی! چاند مبارک ہو"
یہ جملہ سنتے ہی اس کے دل کے تار بج اٹھے۔ آنکھوں سے خوشی کی کرنیں پھوٹ نکلیں۔ لبوں پر ایک شفیق مسکراہٹ پھیل گئی اور چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ اس نے ممنونیت سے لبریز آنکھوں سے بھائی کی طرف دیکھا اور جذبۂ تشکر کے ساتھ پیار بھرے لہجے میں بولی
"تمہیں بھی مبارک ہو" پھر اس کی مسکراتی ہوئی نظریں صفدر کی نظروں سے جا ٹکرائیں جو اس کی خوشی کو بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔
"سنا آپ نے! شب روشن کا اصلی نام ہے چاند۔ آج سے آپ یہ روز مرہ نام یاد رکھیے گا۔ کہنا چاہیئے تھا کہ چاند مبارک ہو"
یہ سن کر سب اپنی حماقت پر مسکرا پڑے۔

تبصرہ

(تبصرے کے لئے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

اخلاق حسین عارف

دیوان حافظ مترجم

مترجمہ مولانا قاضی سجاد حسین
صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دلی
ناشر سب رنگ کتاب گھر دہلی
صفحات ۴۹۰ قیمت قسم اوّل پندرہ روپے
مجلد منقش ریکسین گرد پوش قیمت قسم دوم بارہ روپے مجلد منقش ریکسین۔

در شعر سہ تن پیمبر آنند
ہرچند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را
فردوسی و انوری و سعدی

مندرجہ بالا فارسی کا ایک مشہور قطعہ ہے جس کے دوسرے شعر میں شاعر نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ بیت میں فردوسی، قصیدہ میں انوری اور غزل میں سعدی فارسی شعراء میں پیغمبر مانے جاتے ہیں۔ فردوسی اور انوری سے قطع نظر اگر سعدی شیرازی کے تغزل پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں وہی غزل کا نیا موڑ فارسی شاعری میں ان کے یہاں ملے گا جو ہمیں ہندوستان کے عظیم المرتبت شاعر خواجہ امیر خسرو کے یہاں ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سعدی کی غزل اپنے اندر استعارات، تشبیہات، رموز و کنایات اور تلمیحات کا ایک گراں بہا ذخیرہ تنوع اور ندرت کے ساتھ لئے ہوئے نظر آتی ہے جب کہ ان سے قبل کے فارسی گو شعراء مجموعی طور پر یہ اوصاف اپنے کلام میں پیدا کرنے سے قاصر رہے۔ یہاں سعدی اور حافظ کا موازنہ مقصود نہیں بلکہ کہنا یہ ہے کہ حافظ کے تغزل میں سعدی کے وہ تمام اوصاف بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں بلکہ طرفہ یہ ہے کہ اس نے اپنے کلام میں شراب و شاہد کے امتزاج کو سمو کر سرمستی اور خوش عیشی کی جو کیفیت پیدا کر دی ہے اس کی وجہ سے اس کا کلام قبول عام کے درجہ پر پہنچ کر اسے لافانی بنا گیا ہے۔

ہندوستان میں فارسی کے دور انحطاط کے بعد یہ ضرورت ایک عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی کہ مشاہیر فارسی شعراء کا کلام ہر خاص و عام اردو داں تک پہنچ سکے جو اسے بہ آسانی سمجھ کر لطف اندوز ہو سکے۔ مسرت کا مقام ہے کہ اس دیرینہ خواہش کی تکمیل "دیوان حافظ مترجم" سے ہو گئی جو مولانا قاضی سجاد حسین صاحب کی کاوش کی رہین منت ہے۔ موصوف کی ذات نکتہ داں اور ادب نواز حلقہ میں محتاج تعارف نہیں وہ ہندوستان کے مانے ہوئے اہل قلم اور علم و دانش حضرات میں سے ایک ہیں جنھیں عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر پوری دسترس ہے ان کی پوری زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گذری ہے زیر تبصرہ مترجم دیوان ان کی ایک ایسی انتھک اور گراں مایہ کوشش ہے جو لائق صد تحسین

ہے۔ آپ نے خواجہ حافظ کے کلام کو ترتیب وار جمع کر کے ہر رکھے نیچے سلیس اور بامحاورہ ترجمہ پیش کیا ہے انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ جس مقام پر اشعار تشریح طلب ہیں اس جگہ حاشیہ پر اس کی تشریح و توضیح بھی کردی ہے۔

کتاب کے ابتدائی اوراق میں ہمارے ملک کے ممتاز فسانہ نگار ادیب جناب کوثر چاند پوری کا مدلل اور پرمغز دیباچہ شامل ہے جس کے مطالعہ سے نہ صرف حافظ اور کلام حافظ کو سمجھنے میں کماحقہ مدد ملتی ہے بلکہ فارسی شاعری کے مختلف ادوار اور ممتاز فارسی شعراء کے بارے میں بھی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

اسی پر اکتفا نہیں کی گئی ہے۔ تقریباً اردو داں طبقہ اس امر سے واقف ہے کہ دیوان حافظ سے فال نکالی جاتی ہے اس سلسلہ میں مولانا محمد میاں صاحب قمر دہلوی نے فال سے متعلق بہت سے تاریخی واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے فال نکالنے کے لئے کئی جدول فراہم کی ہیں جس سے شائقین استفادہ کرسکتے ہیں۔ کتاب آفسٹ پر طبع ہوئی ہے کتابت اور طباعت اعلیٰ درجہ کی ہے کاغذ بہت عمدہ اور دبیز ہے۔ قیمت اتنی عمدہ پیشکش کے مقابلہ میں بہت حقیر ہے۔

یہ ایک تبسم

مصنف موسیٰ کلیم برق آشیانوی
ناشر:۔ زندہ دلان حیدرآباد

ملنے کا پتہ:۔ ۲/۷ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱

قیمت مجلد ۳ روپے

اردو میں مزاح نگاری کی روایت کو مزاح نگاروں نے ہمیشہ پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ جدید سماجی مسائل پر ہلکے پھلکے اور برمحل جملوں میں پتے کی بات کہنے کا فن آسان نہیں ہے لیکن جناب موسیٰ کلیم برق آشیانوی نے "یہ ایک تبسم" میں سیاسی، معاشی معاشرتی اور دیگر پہلوؤں کو ہلکے پھلکے جملوں اور برجستہ فقروں میں اجاگر کیا ہے وہ ان کے جاندار فنی شعور کی شہادت دیتا ہے۔

سترہ مزاحیہ خاکوں کا یہ مجموعہ جس میں مصنف نے زندگی کے قریب قریب ہر گوشہ کو چھوا ہے ان کے قلم کی سنجیدہ شوخیوں اور ہمہ گیر طنز کا مظہر ہے۔ کتاب کی ابتداء میں "پیش لفظ" جناب بھارت چند کھنہ آئی۔ اے۔ ایس کے زور قلم کی عکاسی کرتا ہے جس نے مصنف کے بارے میں بھرپور خامہ فرسائی کے بعد ان کے فن پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

"فردوس نظر"

مصنف شارب لکھنوی
صفحات ۲۰۰ قیمت مجلد چار روپے

ملنے کا پتہ:۔ ۲۳۹/۱۱۸ ترمن گنج کاظمین لکھنؤ ۳۔

فردوس نظر جناب سلطان حیدر خاں شارب لکھنوی کا مجموعہ کلام ہے جو ان کی ۱۹۴۵ تا ۱۹۷۲ کی شعری تخلیقات کا ماحصل ہے۔ اس مجموعہ میں چند رباعیات اور قطعات بھی ہیں کتاب کا زیادہ حصہ غزلیات پر مشتمل ہے آخر میں کچھ نظمیں بھی شامل کردی گئی ہیں۔ موصوف کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ شاہراہ فن پر سمجھ بوجھ کر گامزن ہوئے ہیں۔ فن شاعری میں خرد اور جنوں دونوں کی کار فرمائیاں ہوتی ہیں فنی مطالبات کو سمجھنے اور سمجھ کر پیش کرنے کی صلاحیت کا تعلق خرد سے ہے جب کہ اظہار جذبات کے لئے جنوں کی کارکردگی لازمۂ شاعری ہے اور یہ دونوں اوصاف ان کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں شدت احساس متوازن انداز بیان قدیم اور جدید کا امتزاج لئے ہوئے ان کے کلام میں جگہ جگہ مترشح ہے۔ اس سے قبل بھی شارب صاحب کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آکر دل دادگان ادب سے داد و تحسین لے چکے ہیں انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف پر خامہ فرسائی کی ہے اگر بہ حیثیت شاعر انھوں نے تغزل کو نکھارا ہے تو "محسوسات شارب" "چودہ ستارے" اور "فردوس دل" میں قصائد پر بھی طبع آزمائی کی ہے اس کے علاوہ سلام اور نوحہ جات

[illegible] صاحب کا شمار لکھنؤ اسکول کے کہنہ مشق شعرا میں [illegible] ہے اور بقول نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ ان کا اسلوب خیال و انداز بیان اس بیار ذہنیت اور سطحی تخیل سے کوسوں دور ہے جسے جھولیت نے معیار غزل سمجھ لیا ہے۔ وہ جدید رجحانات سے باخبر ہیں اور نظموں کے علاوہ غزل میں بھی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مسائل پر تنقید کرتے ہیں اور روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ شعر میں صحیح اثر اندازی کا راز کیا ہے۔

نغمۂ شب }

مصنف :۔ اختر بستوی۔
ناشر :۔ سید رشید قادری
صفحات ۶۴ قیمت مجلد دو روپے
پتہ :۔ روشن محل گاندھی نگر بستی۔

جناب اختر بستوی کا پورا نام محمد اختر علی صدیقی اور آپ کا شغل تدریس ہے مگر چونکہ وہ ایک حساس دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے ہیں اسلئے وہ عرصہ ہوا شاعری کی طرف رجوع ہوئے اور اپنی لگن اور ذوق کے باوصف ایک کامیاب شاعر مانے جاتے ہیں۔ "نغمۂ شب" اختر صاحب کی ایک طویل نظم ہے جس میں انھوں نے اپنی فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر زندگی کے کرب اور پراگندی روزگار کے اسباب کا بڑے سلیقے سے تجزیہ کیا ہے انھوں نے اس وسیع و عریض دنیا پر بسنے والے اس طبقہ کا تذکرہ بڑی نزاکت سے کیا ہے کہ وہ کن مجبوریوں اور لاچاریوں میں پھنس کر لوٹ مار اور نوچ کھسوٹ کر کے مالدار بنتا ہے یہ اور اسی نوع کے دیگر مسائل پر بڑے ناقدانہ انداز سے تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے پوری نظم کو نبھایا ہے مناسب الفاظ اور متنوع انداز بیان سے دلکشی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اگر موصوف اسی طرح کاوش کرتے رہے تو وہ دن دور نہیں کہ وہ صف اول کے شعراء میں اپنی جگہ بنالیں۔

تثلیث فن }

مصنفین :۔ ظہیر غازی پوری، [illegible] ہاشمی اور مختار احمد عاصی۔
پیش کردہ :۔ کلچرل اکادمی۔ رینا ہاؤس۔ جگ جیون روڈ گیا۔
صفحات ۱۲۸ قیمت مجلد چار روپے

کلچرل اکادمی گیا نے پچھلے چند برسوں میں جو ٹھوس ادبی خدمات انجام دی ہیں ان میں ہفت روزہ "مورچہ" اور "آہنگ" ماہنامہ نمایاں حیثیت کے حامل ہیں یہ بڑی خوشی کا مقام ہے کہ صوبۂ بہار والے کتنی لگن اور کس قدر محبت سے اردو کی ٹھوس اور بے لوث خدمت میں ہمہ تن مصروف ہیں کہ منھ سے بے ساختہ مرحبا اور جزاک اللہ جیسے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ظہیر غازی پوری، اور مختار احمد عاصی صاحبان کی شعری تخلیق نیز نعمان ہاشمی صاحب کے چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اور بقول جناب فضا ابن فیضی "نظم، غزل اور افسانہ کی تثلیث پر مشتمل یہ مجموعہ جس میں ارباب ثلاثہ کی شعری اور افسانوی تخلیقات شامل ہیں اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس طرح ہم بیک وقت مختلف فنکاروں کا ایک مخصوص سطح پر جائزہ لے سکتے ہیں۔

آگے چل کر موصوف نے ظہیر غازی پوری کی شعری تخلیقات کو عصری آگہی کا آئینہ دار بتایا ہے۔ اسلوب میں شگفتگی اور شدت بھی۔ فکری رویہ سے پختگی اور توازن کی علامتیں نمایاں ہیں نظموں کا لب و لہجہ ترقی پسندانہ آہنگ سے قریب ہے لیکن جدید طرز فکر و اظہار کی کروٹیں بھی زیریں لہروں کی طرح ان میں موجود ہیں جس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ شاعر موجودہ فکری تبدیلیوں اور نئی بصیرت کے تقاضوں سے پوری طرح بہرہ ور ہے۔

مختار احمد عاصی کے باب میں فرماتے ہیں کہ وہ زندگی کے پاکیزہ رجحانات اور صحت مند ادبی نظریوں کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں جذبے اور فکر کی [illegible]

بقیہ صفحہ [illegible]

THE TARANNUM MONTHLY

Regd. No. L-2035
Vol. 2, No. 2

Registrar of Newspapers Gov. of India Registration No. R. N. 23380/72

ترنم



Editor

[illegible]MA AKHLAQUE

Re. 1

Annual Rs. 10 00

ماہنامہ ترنم لکھنؤ

۲۲۶۰۰۱

مدیرہ:- نجمہ اخلاق

جلد نمبر۲ ---- شمارہ نمبر۵	قیمت ایک روپیہ، سالانہ دس روپے، ششماہی چھ روپے

ہمارے قلم کار

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر محمد علی زیدی، ڈاکٹر خلیل اللہ خاں، جناب ساحل مانکپوری، محترمہ عطیہ پروین، جناب ارشاد امروہوی، جناب ایس۔ ایم۔ عابد نقوی، جناب شاہد ماہلی، جناب رمضان وارث، جناب نہال رضوی، جناب سعید عارف، جناب روشن پٹیالوی، جناب قتیل فیروز پوری، جناب وسیم انصاری، جناب اقبال عظیم، جناب پرویز رحمانی، جناب ساغر اعظمی، جناب عبرت بہرائچی، جناب احمد تنویر، جناب عمر اختر ردولوی، جناب آذر بارہ بنکوی،

خوشنویس سید نواب حیدر نقوی

گیہوں خرید کی سرکاری اسکیم

کسان اور عام شہری [illegible] ہے

اس کامیابی میں [illegible]

کسان گیہوں کہاں فروخت کریں؟

راجیہ سرکار [illegible] خریداری کے مراکز ہی صرف گیہوں کی [illegible] خرید کریں گے۔ خریدار [illegible] ان ہی مراکز پر فروخت [illegible]

یہ ایجنسیاں [illegible] اگر [illegible] اپنے ساتھ واپس لے جا سکتا ہے لیکن اگر وہ [illegible] کو فروخت کر [illegible] انتظام مریضوں اور جانوروں کے استعمال کے لئے کرے گی۔

کسان کو اپنے گاؤں سے منڈیوں تک گیہوں [illegible] کوئی پابندی نہیں ہے لیکن گیہوں پردیش کے باہر کوئی بھی نہیں لے جا [illegible] ہے۔

کسان کو کیا قیمت ملے گی؟

اوسط قسم کے لال دیسی گیہوں ۷۶ روپئے سفید اور عام قسموں کے گیہوں ۷۶ روپئے اور اعلیٰ فارم گیہوں ۸۲ روپئے فی کوئنٹل قیمت ملے گی۔

اس کے علاوہ سرکار ان کو دو روپیہ فی کوئنٹل گیہوں [illegible] کا کرایہ مزید دے گی۔ ان سے گاڑی سے گیہوں اترائی۔ چھنائی اور منڈی کی فیس نہیں لی جائے گی۔ [illegible] چنگی، [illegible] ٹیکس [illegible]

ـث اترائی کی رسید پیش کرنے پر اس کی بھی ادائیگی سرکار کرے گی۔

کسان کو پوری رقم آسانی سے بھگتان ہو جانے والے بیئرر چیکوں کے ذریعہ دی جائے گی۔

کی رقم سے کسی طرح کی کٹوتی نہیں کی جائے گی۔

ارفین، گیہوں کہاں سے حاصل کریں؟

راشن کی دوکان سے مقررہ مقدار میں۔

[illegible] لائسنس یافتہ پھٹکر دوکانداروں سے ۲ کوئنٹل تک ایک وقت میں

رجسٹرڈ پرچون سے ۲۰ کلو تک ایک وقت میں۔

وہ خود اپنے استعمال کے لئے کسان سے سیدھا ایک کوئنٹل گیہوں خرید سکتا ہے۔

وہ اپنے [illegible] قیمت کی پیداوار کا ایک کوئنٹل گیہوں ایک وقت میں اپنے شہر کے [illegible] کی جگہ پر بھی لا سکتا ہے۔

ـن کتنا گیہوں رکھ سکتا ہے اور کتنا فروخت کر سکتا ہے؟

کسان جتنا [illegible] گیہوں فروخت کرنے کے لئے خریداری [illegible] لیکن وہ [illegible] تک گیہوں لائسنس یافتہ پھٹکر کانداروں کو اور دو کوئنٹل تک رجسٹرڈ [illegible] کو اور ایک کوئنٹل تک صارفین ـوخت کر سکتا ہے۔

لائسنس یافتہ پھٹکر دوکاندار دس کوئنٹل تک ایک وقت میں خرید ـتا ہے اور پچاس کوئنٹل تک اسٹاک رکھ سکتا ہے۔

رجسٹرڈ پرچون دو کوئنٹل تک ایک وقت میں خرید سکتا ہے اور ـہ کوئنٹل تک اسٹاک رکھ سکتا ہے۔

ـسکیم سے کیا فائدہ ہوگا؟

کسانوں کو گیہوں کی مناسب قیمت ملے گی۔

صارفین کو بازار میں گیہوں مناسب قیمت پر ملے گا۔

تعلیم یافتہ بے روزگاروں اور مزدوروں کو زیادہ روزگار ملے گا

قیمتوں میں ٹھہراؤ آنے سے سماج کے سبھی حلقے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

سوز و ساز

ادھر کچھ عرصہ سے اُردو یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہ تجویز بہت اچھی ہے اور اُردو
کے سبھی ہمدردوں نے اس تجویز کی حمایت کی ہے۔ "ہماری زبان" میں اسلوب احمد انصاری نے اُردو یونیورسٹی کے
قیام کی تجویز کے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے اور آخر میں انھوں نے وہی بات کہی ہے جو بیگم حامدہ حبیب اللہ
عرصہ سے کہتی آئی ہیں اور باشعور طبقہ بھی جس بات پر سب سے زیادہ زور دیتا رہا ہے کہ حکومت سے
اُردو زبان کی ترویج و اشاعت میں مدد مانگنے کے علاوہ ہمیں خود اپنے ہاتھ مضبوط رکھنے چاہئیں۔ اُردو زبان
سے ناواقف نئی نسل اس کی ترقی و بقا کے لئے کیا جدوجہد کر سکے گی؟۔ اس کا حل اردو داں طبقہ کو تلاش
کرنا ہوگا۔ اسلوب احمد انصاری نے لکھا ہے کہ "ہم پریس اور پلیٹ فارم سے جو جی چاہے کہتے رہیں خود
ہمارے گھر کا حال پتلا ہے۔ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو اپنے بچوں کو نجی طور پر اُردو کی تعلیم دلانے کی
طرف رغبت دلاتے اور اس کے لئے عملی طور پر جدوجہد کرتے ہیں؟" اس بات کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں حکومت
سے اُردو کے لئے اپنی مانگوں کو ترک کر دینا چاہیئے بلکہ یہ ہے کہ ہمیں اُردو پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد میں
اضافہ کے لئے خود کوشش کرنی ہے، تاکہ آگے چل کر یہ لوگ ہم سے زیادہ اُردو کے لئے جدوجہد کر سکیں۔ آج کی
ہماری کمزور آواز تیز ہو سکے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ہم آپس کے سارے جھگڑے تعصبات بھول کر اپنی زبان
کی حفاظت کریں ورنہ ہمارے ہاتھ کچھ نہ لگے گا۔ اُردو زبان کے لئے کیے جانے والے سارے وعدے بے کار
ہیں جب تک اس کا پڑھنا ہر ایک کے لئے لازمی نہیں کیا جاتا۔ ابتدائی درجات میں وہ طلباء جن کی مادری
زبان اُردو ہے ایڈوانس اردو میں اور وہ لوگ جن کی مادری زبان اُردو نہیں وہ ابتدائی اردو لازمی
طور پر پڑھیں۔ اس طرح سے اُردو میں لکھی گئی درخواستیں واپس نہ کی جا سکیں گی اور اس زبان کا مستقبل
محفوظ ہوگا ورنہ چار دن کی چاندنی اور اس کے بعد گھپ اندھیرا۔

"ترنم" نے اس قلیل عرصہ میں جو ترقی کی ہے اس کے لئے بہت سے لوگوں نے ہمیں مبارکباد
دی ہے اور ہماری ہمت افزائی کی ہے ان کی خدمت میں عرض ہے کہ ہماری ادنیٰ کاوشیں اس لئے بارآور
ہو سکیں کہ آپ سب کا تعاون ہمیں میسّر ہے ورنہ ایسے دور میں اُردو کا پرچہ نکالنا بہت دشوار ہے لیکن ہمیں فخر ہے
کہ ہم نے کس حد تک ان دشواریوں پر قابو پالیا ہے اور باقی بھی عبور کرنے کا عزم ہے۔ ہم ترنم کے صفحات میں اضافہ
کرنے کے لئے شروع سے کوشاں ہیں لیکن کاغذ ملنے میں دشواری نیز بہت سی مشکلات کے باعث ایسا کرنے سے
فی الحال ہم قاصر ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی صفحات میں اضافے کا اعلان کیا جائے گا۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ بنارسی کا نایاب کلام

مرزا یوسف علی خاں نام عزیزؔ تخلص، سراج الشعرا، سلطان الذاکرین خطاب، شاگرد مرزا غالبؔ۔ عزیزؔ کی ولادت بنارس میں ہوئی۔ سنہ ولادت معلوم نہ ہو سکا۔ وہ مرزا انجف علی خاں متخلص بہ جنوںؔ کے صاحبزادے اور مرزا محمد علی خاں دیوانہؔ کے پوتے تھے۔ جناب مالک رام صاحب نے عزیزؔ، جنوںؔ اور دیوانہؔ کے نام سے پہلے "لفظ میرزا" لکھا ہے[1]۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سید تھے اس کی تصدیق اور کسی ذریعہ سے نہیں ہوتی ہے "میرزا" سید اور "مرزا" مغل کو کہتے ہیں۔ راقم الحروف کے پیش نظر شیفتہؔ کے گلشن بیخار کا ایک قدیم قلمی نسخہ سنہ ۱۲۶۱ ہجری کا مکتوبہ ہے۔ اس میں جنوںؔ اور دیوانہؔ کے نام سے پہلے "مرزا" درج ہے جو ان کے مغل ہونے پر دلالت کرتا ہے گلشن ہمیشہ بہار[2]، طبقات شعرائے ہند[3]، اردوئے معلی[4]، عود ہندی[5] اور سخن شعرا[6] میں بھی "مرزا" لکھا ہوا ہے۔

عزیزؔ کے دادا مرزا محمد علی خاں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ممتاز عہدے پر فائز تھے جب روشن الدولہ گوبرگ ناظم دہلی کے ساتھ بنارس سے دلی آئے تو شیفتہؔ سے بھی ملاقات کی تھی اور ان کے ہمراہ ایک دعوت میں بھی شریک ہوئے تھے[7] نصر اللہ خاں خویشگی اپنے تذکرے

[1] تلامذۂ غالب ص ۲۹۹ [2] تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار ص ۱۴۱ نصر اللہ خاں خویشگی [3] طبقات شعرائے ہند مولوی کریم الدین [4] اردوئے معلی ص ۱۵۶ مطبع مصطفائی دہلی ۱۸۶۸ء [5] عود ہندی ص ۱ ، [6] سخن شعرا ص ۳۳۰ مولوی عبد الغفور خاں [7] مخطوطہ گلشن بیخار۔

میں ان کا ترجمہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں:۔

"دیوانہ تخلص۔ مرزا محمد علی خان نام۔ از ثقات بنارس است۔ بمراتب عملیائے انگریزی سرفراز ماندہ، بہ عہد نظارت روشن الدولہ گوبرگ۔ برجہاں آبادی بود بعہدۂ تحصیلداری محالات کیرو چنڈوس متعلقہ ضلع علی گڑھ۔ خوش گزراں بودہ۔ حالا از حالش مطلع نیستم کہ کجا و چونست"[1]

مرزا عزیزؔ کے والد شیفتہؔ کے دوستوں میں تھے۔ گلشن بیخار میں ان کا ترجمہ یوں درج ہے۔

"جنوںؔ تخلص، مرزا انجف علی خان خلف مرزا محمد علی خان دیوانہؔ تخلص است کہ پدر و پسر ہر دو از بنارس اند۔ مرزا محمد علی خان پدرش را ہنگامیکہ وارد دہلی بود بسر رشتہ داری بودند مامور۔ با من ملاقات بارہا دادہ۔ علاقہ تحصیلداری و سر رشتہ داری وغیرہ کہ مناصب جلیلہ سرکار انگریزیست بیشتر بادے ماندہ"[2]

عزیزؔ کو شعر و شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ ان کے والد اور دادا بھی شاعر تھے اور تذکروں میں ان دونوں بزرگواروں کا کلام درج ہے۔

جنوںؔ بنارس چھوڑ کے علی گڑھ میں آ رہے تھے۔ اور وہاں کچھ جائداد بھی پیدا کر لی تھی۔ وہ مدتوں دہلی کے اطراف میں سر رشتہ داری اور تحصیلداری کے عہدوں پر مقرر رہے۔ جب جنوری ۱۸۵۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا تو عزیزؔ ان کے وارث

[1] گلشن ہمیشہ بہار ص ۱۴۱ [2] مخطوطہ گلشن بیخار

جوشے لیا اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ناتجربہ کاری یا کسی اور وجہ سے یہ ساری جائداد کھو بیٹھے۔ اور بہت جلد انھیں روزی کی فکر دامنگیر ہوگئی۔ آخر دہلی پہنچے اور یہاں کوشش کرنے لگے سلہ افضل تذکرہ نگار ... غدر کے بعد دہلی کے اسکول میں معلّم تھے اور ان سے ... ملاقات ہوئی تھی۔ مالک رام کہتے ہیں کہ انھیں دلی والوں کے ایک ہندو رئیس کے لڑکے کو پڑھانے کا شغل بھی رہا سلہ

اس سلسلے میں مرزا غالب مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں۔

"مرزا یوسف علی خاں عزیز ... مع عیال و اطفال اسی شہر میں مقیم ہیں ... کے گھر پر مکتب ... کر لیا ہے میرے ... پاس ایک مکان کرایہ کو لے لیا ہے۔ اس میں رہتے ہیں اگر ان کو خط بھیجو تو میرے مکان کے پتہ پر لکھ دینا" سلہ

قیام دہلی میں عزیز، مرزا غالب کے حلقۂ تلامذہ میں آ گئے تھے انھیں مرثیہ گوئی کا بڑا شوق تھا۔ انیس و دبیر کے مرثیوں میں اکثر جگہ جا و بیجا غلطیاں نکالی ہیں۔ عرصۂ دراز تک حضرت غالب کی خدمت میں رہے۔ انھیں کے توسط سے قلعہ میں رسائی ہوئی۔ اعتزام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر کے ذریعہ بہادر شاہ ظفر سے بہ نذر مرثیہ و قصیدہ خلعت چار پارچہ مع گوشوارہ و خطاب سراج الشعراء سلطان الذاکرین دلوایا۔ سلہ اور تیس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا ۱۸۵۷ء کے بعد جب وظیفہ بند ہو گیا تو محض مدرسی ذریعہ معاش رہ گئی سلہ۔

عزیز واقعہ غدر کے بعد پراگندہ حال رہے۔ بوجہ مفلسی مرزا غالب نے بھی ان کا کچھ مہینہ مقرر کیا تھا۔ اس سلسلے میں غالب مولوی منشی حبیب اللہ خاں ذکا کے نام دوشنبہ ۱۶ شعبان ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۶ نومبر ۱۸۶۶ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"یوسف علی خاں عزیز ... ان کا حال تباہ دہلی کی سرکار سے بیس روپے مہینہ پاتے تھے جہاں سلطنت گئی وہاں تنخواہ بھی گئی۔ شاعر ہیں ریختہ کہتے ہیں ہوس پیشہ ... علم اسی قدر ہے کہ لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ ان کا باپ میرا دوست تھا میں ان کو بجائے فرزند سمجھتا ہوں بقدر اپنی دستگاہ کے کچھ مہینہ مقرر کر دیا ہے مگر بسبب کثرت عیال وہ ان کو مکتفی نہیں۔ تم ان کی درخواست کے جواب سے قطع نظر نہ کرو گے تو کیا ..." سلہ

مرزا عزیز اور مرزا غالب کے درمیان بڑے خوشگوار تعلقات تھے اور دونوں کے مابین خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک مرتبہ غدر کے بعد انھوں نے مرزا غالب سے کلام کی فرمائش کی تھی۔ اس کے جواب میں مرزا ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"بھائی تم کیا فرماتے ہو۔ جہاں بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا۔ مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔ بھائی ضیاء الدین خاں صاحب ناظر حسین مرزا صاحب ہندی اور فارسی نظم اور نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے سو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں ہاں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ مئی کی گیارہویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی اکتیسویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا حال میں نے لکھا ہے اور نثر فارسی زبان ... میں ہے۔ کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آئے اور ... قصیدہ فارسی بے آمیزش عربی اور فارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت

سلہ تلامذۂ غالب ص ۲۳۶ سلہ سخن شعراء ص ۳۲۹
سلہ تلامذۂ غالب ص ۲۳۶ سلہ اردوئے ہندی ص ۱۸۶
سلہ ... تلامذۂ غالب ص ۲۳۶

سلہ آزادی ... سلہ اردوئے معلیٰ ص ۱۲۶ حصہ اول

فلک رفعت جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی ستائش میں نثر کے ساتھ شامل ہے یہ کتاب مطبع مفید خلائق آگرہ میں منشی نبی بخش صاحب حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر اور منشی ہرگوپال تفتہ کے اہتمام میں چھاپی گئی ہے۔ فی الحال مجموعہ میری نظم و نثر کا اس کے سوا اور کہیں نہیں اگر جناب منشی امیر علی خان صاحب میرے کلام کے مشتاق ہیں۔ تو نسخہ دستنبو مطبع مفید خلائق سے منگا لیں اور ملاحظہ فرمائیں۔[1]

مرزا غالب ایک اور ... ۱۸۶۰ء ... میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

"میاں کل ... تمہارا خط ... ٹکٹ دار لفافہ کے اندر رکھ کر بہ سبیل ڈاک بھجوا دیا ہے۔ آج صبح کو تمہارا خط آیا ... کھایا ... موتیوں کو پھیکا البتہ بہت مناسب ہے۔ خیر موتیوں کا نواسہ بھی سہی۔ حافظ کے شعر کی حقیقت جب سمجھو گے جب قواعد مقررۂ اہل سخن دریافت کرو گے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر مطلع میں یا اور اشعار میں قصیدہ کی احتیاط پڑے اور اس کی اطلاع ایک شعر میں کر دیں تو وہ عیب جاتا رہتا ہے جیسا کہ استاد کا قطعہ ہے اس میں ردیف ... قافیہ ہے اور شعر اخیر ... کا یہ ہے۔ شعر

غلط کردم ... کہ گفتم
زنخدان نگار خویش را سیب

حالانکہ صحیح سبب ہے بجائے موحدہ، شاعر نے اطلاع دی کہ میں نے غلط کہا جو سیب کہا۔ اسی طرح حافظ فرماتا ہے۔ مصرعہ

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

حاصل اس کا یہ کہ دیکھو کتنا تفاوت ہے۔ ایک جگہ حرف روی ساکن اور ایک جگہ متحرک۔ مگر یہاں ابھی معترض کو گنجائش ہے کہ وہ یہ کہے کہ ہاں تفاوت کو ہم بھی جانتے ہیں سوال یہ ہے کہ یہ تفاوت تم نے کیوں رکھا اس کا جواب پہلا مصرعہ ہے۔ مصرع

صلاح کار کجا و من خراب کجا

یعنی حافظ فرماتا ہے کہ میں عاشق زار و دیوانہ ہوں صلاح کار سے مجھ کو کیا کام۔ پورب کے ملک میں جہاں تک چلے جاؤ گے تذکیر و تانیث کا جھگڑا بہت پاؤ گے۔ سانس میرے نزدیک مذکر ہے۔ لیکن اگر کوئی مونث بولے گا تو میں اس کو منع نہیں کر سکتا۔ خود سانس کو مونث نہ کہوں گا۔ سیف کو عدو کش اور کینے کو عدو بند۔ سیف عدو بند نہیں ہو سکتی۔ تم کو کہتا ہوں کہ تم تلوار کو عدو بند نہ کہو۔ کوئی اور اگر کہے تو اس سے نہ لڑو۔ نیلات کو شب رنگ اور شبگون کہتے ہیں۔ شبگیر زلف کی صفت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ شبگیر اس سفر کو کہتے ہیں کہ پچھلی رات رہے چل دیں۔ نالۂ شبگیر آہ و زاری آخر شب کو کہتے ہیں زلف شبگیر ... سخن کا قافیہ بن بھی درست ہے اور تن بھی جائز ہے۔ یعنی سخن کا دوسرا حرف مضموم بھی ہے اور مفتوح بھی ہے اور اس پر متقدمین اور متاخرین ... ایران اور اہل ہند کو اتفاق ہے۔ ... پوست کے ... کو کہتے ہیں۔ اس میں ... تامل نہ چاہیے۔ تم اپنے تکمیل کی فکر میں رہا کرو۔ زنہار کسی پر اعتراض نہ کیا کرو

والدعا "[2]

مرزا آخر عمر میں تلاش معاش کے سلسلے میں بھوپال گئے۔ اور

---

[1] اردوئے معلی ص ۱۵۶

[2] عود ہندی ص ۱۰۱ مطبوعہ الہ آباد

وہیں ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں انتقال کیا [1] شاہ بہاء الدین شبیر نے تاریخ کہی [2]

جب عزیز سخن سرا کا شبیر
باغ فردوس میں مقام ہوا
اہل معنی کے لب پہ مثل جرس
آہ و نالوں کا اثر دھام ہوا
شہرۂ مرگ روستاد زماں
ہند سے تا بہ روم و شام ہوا
روئے صبح الم سے ہے فق فق (کذا)
رنگ شب کا سیاہ فام ہوا
یہی صدمہ ہے جہاں میں حضرت دل
باعث رنج خاص و عام ہوا
فکر تاریخ جب ہوئی مجھ کو
سر بزانو برائے نام ہوا
ناگہاں غیب سے صدا آئی
آہ کسب سخن تمام ہوا
(۱۲۸۹ھ)

ایضاً

چوں عزیز سخنور کامل
در جناں شد زعالم فانی
کلک تاریخ رحلتش بنوشت
شاعر بے عدیل لاثانی
(۱۲۸۹ھ)

ایضاً

عزیز یوسف مصر معانی
بجنت نقل کرد از دار دنیا
شبیر از من سنین رحلتش گفت
امام شاعران تاج المعلّی [3]
۱۲۸۹ھ

---

[1] خمخانۂ جاوید ص ۵۸۰ جلد پنجم۔ [2] کنز تواریخ قلمی بحوالہ اُردو سہ ماہی غالب نمبر کراچی۔

عزیز بڑے پرگو تھے۔ ان کے شاگردوں میں سیف الحق ادیب وہ شاگرد تھے کہ جن کو فخر استاد کہا جائے تو بجا ہے۔ غزل خوانی کا ڈھنگ بہت اچھا تھا۔ کلام میں رنگینی تھی [1] افسوس ہے کہ ان کا کلام نہیں ملتا ہے۔ گلستان سخن [2] گلستان بے خزاں [3] سخن شعرا [4] اور خمخانۂ جاوید [5] میں ان کے صرف دو شعر درج ہیں۔ جناب مالک رام نے بھی یہی اشعار نقل کئے ہیں [6]۔ راقم الحروف کو اودھ اخبار لکھنؤ کے چند شمارے دستیاب ہوئے ہیں ان میں ۱۲ اگست ۱۸۶۳ء مطابق ۲۶ صفر ۱۲۸۰ھ روز چہارشنبہ نمبر ۳۲ جلد ۵ کا شمارہ بھی شامل ہے۔ اس میں صفحہ ۵۶۲ پر مرزا یوسف علی خاں عزیز کی ایک طویل نظم "قطعہ وباہیہ" کے عنوان سے درج ہے۔ چونکہ ان کا کلام عنقا کے برابر ہے اس لئے ذیل میں مالک اخبار منشی نولکشور کی نثری عبارت کے ساتھ یہ نظم درج کی جاتی ہے۔

"قطعہ وباہیہ"

طبع زاد سراج الشعرا مرزا یوسف علی خان عزیز تخلص شاگرد نجم الدولہ اسداللہ خان غالب دہلوی بذریعہ خامۂ مشفقی مولوی محمد حسین صاحب مہتمم مطبع مصطفائی واقع دہلی بغرض ملاحظہ ناظرین پہونچا لہٰذا درج ہے۔

ہے عجب مرگ مفاجات آج کل
ٹوٹتا دم بھر میں ہے تار نفس
مرغ روح اہل عالم آن میں
چھوڑتا ہے جسم خاکی کا قفس
کیا کہیں و پیش اس سخن کی فہم میں
ایک سے ہے ایک گویاں پیش و پس

---

[1] خمخانۂ جاوید ص ۵۸۰ جلد پنجم [2] گلستان سخن ص مرزا قادر بخش صابر ۱۲۷۱ھ، [3] گلستان بے خزاں قطب الدین ۱۲۶۵ھ، [4] سخن شعرا ص ۳۲۹ نساخ، [5] خمخانہ ص ۵۸۰، [6] تلامذۂ غالب ص ۲۳۸

رشتۂ جاں تن میں جل جاتا ہے یوں
جس طرح آتش جلا دیتی ہے خس
جو کہ ہیں اس عصر میں اہل دُوَل
کرتے ہیں فریاد مانند جرس
بچ کر ان سے چھوٹتا ہے مال و زر
کیوں نہ چاہیں ذلت اپنی ہر برس
اور جو ہیں مفلس و مظلوم و خوار
موت ہی ہے زندگانی ان کو بس
مار مرنا زہر کھانا ڈوبنا
ہے حرام اس پر نہیں ہے دسترس
بس یہ عالم خوب ہے ان کے لئے
ایک گھر میں فوت ہوں گر آٹھ دس
کوئی سمجھا بھی کہ کیا ہے یہ کلام
لو سنو ہے شرح اس کی ملتمس
ہے سے ہمت ی سے یا دِ خلق ہے
ضاد سے ضربت ہے پھر ہے سے ہوس
ہمت اس کی یہ کہ ہر جا ہے رسا
یا دِ خلق ایسی کہ آدے ہر برس
ضربت اس کی یہ کہ مارے خلق کو
اور ہوس ایسی کہ پھر بھی ہو ہوس
دل کرے مالش کہ استفراغ ہو
یہ نہیں وہ قے کہ ہو کھا کر مگس
دست سے انسان کو کیوں ہو پیچ و تاب
یہ نہیں پیچش کہ ہو تکلیف پس
وہ طبیب آتا ہے اس کو دیکھنے
لطف حق سے ہاتھ میں ہے جس کے نبض
منفعت ہے اس سے ہر عطار کو
زر لیا جاتا ہے دے کر خار و خس
فائدہ ہے اس سے ہر بزاز کو

استفاضہ اس سے ہے غسّال کو
غسل دے کر لے وہ جتنی ہو ہوس
فیض یاب اس کے سبب سے گورکن
لے لیا کھودی اگر قبر ایک نفس
حاصل اس سے ہے بہت معمار کو
لے کے گنبد پر چڑھا جاتا ہے کلس
جال اس کی دہر میں مثل صبا
دوڑ اس کی خلق میں شکل فرس
گرچہ ہو برسات کے موسم میں پر
اشک کے باراں سے کہتا ہے برس
مارتا ہے اس طرح تیر قضا
نیزہ مارے جس طرح ابن انس[1]
دیتی ہے اس دیو سے رستم کی رگ
کھینچی ہے اس گیسو سے عالم کی نس
پھر اسے تکلیف دینا چھو نہ جائے
جس کو یہ اچھی طرح کر جائے مس
گر کسی انگریز سے پوچھوں اسے
یا اگر انڈر ہو یا ہو سانڈرس
معرفت میں اس کی جرأت کے لئے
لاکھ بار اپنی زباں سے وہ کہ بس
ہے قضا کے گھر کا جس کو اختیار
ہے یہ بازار اجل کا محتسب
قلزم ایسا ہے کہ لیتا ہے ڈوبا
شعلہ ایسا ہے کہ دیتا ہے جھلس
کافر ایسا ہے کہ گر بھر تو آب
کھائے کوئی ایک ذرا دال عدس

---

[1] سنان ابن انس۔ فوج یزید کا ایک سپاہی جس نے امام حسین علیہ السلام کو نیزہ مارا تھا۔

مار ڈالے اس کو فوراً بے دریغ
توڑ ڈالے اس کا بس تارِ نفس

ہے یہ دریا جسمِ خلق اس کے سبب
صاف ہے خار و خس و رد دار بس

ایک عالم میں بند ہے اس کی ہوا
لکھنؤ دِلّی بخارس یا ترس

یوں در آتا ہے یہ جسمِ خلق میں
جیسے اترے پاؤں میں ترسن کے رس

چوٹ گر ہو یہ تو ہو اس کا علاج
پیس کر کوئی لگا دے موچرس

کشتہ ہو جاتا ہے نیلا اس کا لون
جیسے جاتا ہے کسی کو سانپ ڈس

مار کر کہتا ہے مضطر دل کو یہ
تب میں جانوں اپنی جانے اے ادکس

قصہ کوتہ ہے یہ مشہور جہاں
چون ازیں آگہ بناشد ہیچ کس

کس کی فرمائش میں یہ بیتیں عزیز
کون ہے ہاں رمز دان و نکتہ رس

میم و حا و میم و دال و حا و سین
یا د خور از سے اسمِ پاک اس کا ہے بس

خان والا شان والا منزلت
صاحب روشن دل و روشن نفس

دیکھئے گا دے صلا اس کا مجھے
دولت و زر پر ہے اس کو دسترس

(بقیہ صفحہ ۲۶ کا)

نقش وفا میں زیست کے بھر دے عبودیت کے رنگ
عشق دوام کیلئے بادۂ جادے راہ تو ڈھونڈ

حضرت معروف نے بخشی غلامی ہے بقاؔ
اس لئے دارا و اسکندر سے ہیں سر زور ہم

ان مذکورہ اشعار میں مختلف احساسات جس طرح پیکر شعر میں ڈھالے گئے ہیں وہ استادانہ فکر کے حامل ہیں ہر خیال اور ہر موضوع اپنی ندرت صفائی اور بے تکلفی کے سبب عمدہ شعروں میں شمار کیئے جاسکتے ہیں۔ ان میں پہلا شعر دنیا کی بے ثباتی اور غیر آسودہ حالات کی ترجمانی میں لاجواب ہے۔ دوسرا اور ساتواں شعر عزم و ارادے کی تلقین اور پختگی کو واضح کرتے ہیں۔ چوتھا، پانچواں اور آٹھواں شعر عام باتوں، عام روایتی اسلوب کے حامل ہلکے پھلکے انداز کے ساتھ نظم ہوئے ہیں۔ تیسرے شعر میں انسان کی لازوال قدروں کا احاطہ کیا گیا ہے جس میں محبت کی فتح اور اس کی عظمت و توقیر کی گفتگو کی گئی ہے۔ نواں شعر قدرے مشکل مضمون کا ہے۔ جس کا پیرایہ اسلوب آتشؔ کی یاد دلاتا ہے۔ دسویں شعر میں عشق کی رفعت و بلندی اور پاکیزگی کا نور قاری کے شعور کو جلا بخشنے میں کامیاب ہے جو خسروی اسکندری کے تاریخی اور تہذیبی قدروں سے روشناس کراتا ہے اور اس کے مقابلے میں عشق کی رفعتوں کو دو چند کر کے پیش کیا گیا ہے۔ گیارھواں شعر خالص نعت کا ہے۔ بارھواں شعر تصوف کے آغوش میں اخلاقی اور انسانی قدروں کو اجاگر کرنے کی سعی کرتا ہے۔ تیرھواں شعر شاعر کے پیخ طریقت حضرت معروف ایٹھوی رح سے والہانہ عقیدت کا اظہار ہے۔

بلاشبہ بقاؔ نظامی نے غزل کی روایت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے شعر کی آبیاری کی ہے۔ ہر چند کہ ان کی شاعری رہینِ روایات کی پروردہ ہے جس میں میرؔ دردؔ، اور آتشؔ کی شاعری پروان چڑھی ہے۔ لیکن ان کے اشعار میں حالات حاضرہ کی دھڑکن [illegible]

ڈاکٹر محمد علی زیدی

داغؔ کی معاملہ بندی

معاملہ بندی مادی اور مجازی عشق کا لازمی جزو بھی ہے اور اس کا نتیجہ بھی ہے۔ یہ ایک آرٹ بھی ہے اور اس میں لذت بھی ہے۔ بقول داغؔ ؎

ہزار کام مزے کے ہیں داغؔ الفت میں ۔۔۔ جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

معاملات حسن و عشق کے نیرنگ بہت پر لطف ہیں۔ وصل کی چھیڑ چھاڑ، اشارے کنائے، معشوق کی عشوہ طرازی، وہ شوخیاں، [illegible] کی حاضر جوابیاں اور بے تابیاں، عہد و پیمان، شکوہ و شکایت، رشک و بدگمانی، چھینا جھپٹی، روٹھنا اور منانا، الجھن اور بے چینی، رشک اور جلن وغیرہ مجازی عشق کے لوازمات میں سے ہیں۔ یہی غزل کی جان ہیں۔ غزل کے لئے زیادہ تر وہ تجربات و مشاہدات قدر و قیمت رکھتے ہیں اور ابدی اور اہم حقائق سمجھے جاتے ہیں جو حسن و عشق کی دنیا میں پیش آئے ہوں۔ یہ آرٹ بھی ہے کیونکہ یہ سوئی ہوئی یادوں کی باز آفرینی کرتے ہیں اور اپنی دل کشی سے دبے ہوئے جذبات کو ابھارتے ہیں [illegible] نئی نئی جمالیاتی صورتیں تخلیق کرتی ہیں۔ اور جذبے میں مسرت کی رنگ آمیزی کرتی ہیں۔ فراق گورکھپوری معاملہ بندی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "یہ دونوں قسم کی نفسیاتی عشقیہ شاعری یعنی داخلی اور خارجی غزل میں کردار نگاری کی داغ بیل ڈالتی ہیں اور غزل کی شاعری کو ڈرامائی بنا دیتی ہیں۔ خاص کر شوخ اور چنچل مزاج کے شعرا مثلاً انشاؔ اور جرأت نے اس میدان میں بہت کھل کھیلے۔ لیکن معاملہ بندی والی شاعری کے لئے یہ لازمی نہیں کہ وہ شوقیہ ہو یا سطحی ہو۔ احتیاط اور بچاؤ سے کام لیا جائے تو معاملہ بندی کے اشعار میں بھی پاکیزگی کا امکان ہے شرط یہ ہے کہ خارجیت کو ابھارا بھی جائے اور اسے کچھ دبایا بھی جائے اس میں داخلیت کا امتزاج ہو اور [illegible] وضاحت اور [illegible] شوخی اور سنجیدگی کا میل ہو۔"

اردو غزل گوئی میں جرأتؔ اور انشاؔ سے پہلے دو رنگ قائم ہو چکے تھے۔ ایک رنگ تو وہ تھا جس میں [illegible] عشق کے پاک جذبات نہایت مہذب الفاظ اور مہذب پیرائے میں ادا کئے جاتے تھے۔ اس رنگ کو معرفت و تصوف سے بہت قریبی تعلق تھا۔ میرؔ، دردؔ، میر اثرؔ اور راسخؔ کا یہی رنگ تھا۔ دوسرا رنگ وہ تھا جس میں عشق حقیقی کے ساتھ [illegible] جذبات [illegible]

شامل ہو گئے تھے۔ اس میں مجازی عشق بھی اعلیٰ پایہ کا اور معیاری ہوتا تھا۔ میرؔ، سوداؔ، قائمؔ، یقینؔ اور میر حسنؔ وغیرہ نے یہی رنگ اختیار کیا۔ بعد میں مصحفیؔ نے بھی اس رنگ کو قائم رکھا اور تغزل کے اعلیٰ نمونے پیش کئے لیکن انشاؔ اور جرأتؔ نے عشق مجازی میں رندی و ہوسناکی کا عنصر غالب کرکے ان متعینہ حدود سے آگے قدم بڑھایا اور اس طرح اُردو غزل میں معاملہ بندی کی بنیاد پڑی۔ جرأتؔ نے اپنی طبعی مناسبت اور امراء اور اربابِ نشاط کی صحبت کے اثر سے غزل کو اختیار کیا اور غزل میں بھی معاملات عشق کو شوخی اور بانکپن کے انداز میں ادا کرکے ایک ایسی طرز ایجاد کی جو مقبول خاص و عام ہوئی۔ میرؔ کی فصاحت کا رنگ پہلے ہی موجود تھا۔ مولانا محمد حسین آزادؔ جرأتؔ کی معاملہ بندی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اُن کی طرز ادا انھیں کا ایجاد ہے اور آج تک انھیں کے لئے خاص ہے جیسی اُس وقت مقبول خلائق تھی آج تک ویسی ہی چلی آتی ہے خصوصیات اس میں یہ ہے کہ فصاحت اور محاورہ کی جان ہے۔ فقط حسن و عشق کے معاملات ہیں اور عاشق و معشوق کے خیالات گویا اس میں شراب ناب کا سرور پیدا کرتے ہیں۱؎"

جرأتؔ کی معاملہ بندی جس میں فحش و ابتذال کم ہے میر تقی میرؔ کے خیال میں چوما چاٹی سے آگے نہ بڑھ سکی نمونتاً جرأتؔ کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

جاؤں جاؤں کیا لگایا ہے ابھی بیٹھے رہو
ہوں میں اپنی زیست سے آگے ہی اکتایا ہوا

اس ڈھب سے کیا کیجئے ملاقات کہیں اور
دن کو تو ملو ہم سے رہو رات کہیں اور

دم وصل اُس نے رُخ سے جو نہ نقاب اُلٹا
ہمیں لگ گیا دم اُس دم یہ صد اضطراب الٹا

جرأتؔ کے بعد مومنؔ نے اس رنگ کو ترقی دی۔ معاملات عشق کا اظہار اُن کے یہاں اُن تمام منزلوں سے گذرتا ہے جن سے عاشق کو واسطہ پڑتا ہے۔ اُن کے عشق پردہ نشین، میں محبت بھرے دل کا احساس ہے اور میٹھا میٹھا درد ہے۔ وہ روایتی عاشق کی طرح ہجراں نصیب ہی نہیں رہتے بلکہ شراب وصل سے سرشار بھی ہوتے ہیں اُن کا نالہ رسا بھی ہوتا ہے اور اُن کا طالع ناساز گار بھی ہوتا ہے۔ اُن کے مشاہدات و تجربات عشق پر صداق[illegible]ن بھی ہوتا ہے اور اس میں خلوص بھی پایا جاتا ہے مومنؔ نے اپنی صاف گوئی میں دہلی کی متانت کا رشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور دائرۂ تہذیب میں رہ کر جذبات عشق کو ادا کیا ہے لیکن مبتذل معاملہ بندی کی مثالیں بھی اُن کے کلام میں اچھی خاصی تعداد میں پائی جاتی ہیں جہاں انھوں نے زبان و بیان کی سادگی کے ساتھ محبت کی نفسیات اور داخلی کیفیات کی مصوری کی ہے وہاں اُن کا جواب نہیں۔ اُن کی صاف گوئی کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے ؎

مجھے چپ لگی مدعا کہتے کہتے
رُکے ہیں وہ کیا جانیں کیا کہتے کہتے

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں
تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری
واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

اے شب وصل غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

لکھنؤ میں معاملہ بندی نے اتنا فروغ پایا کہ دبستان لکھنؤ کی خصوصیت بن گئی اس کی وجہ معاشرتی محرکات تھے دولت کی فراوانی

۱؎ آب حیات ص ۲۴۰

اور سیاسی اطمینان نے عیش کوشی و آرام طلبی کا شوق عام کر دیا تھا۔ چنگ و رباب شاہد و شراب اور عطر و گلاب لوازمات زندگی بن گئے تھے عشق میں پردہ داری، شرم و حیا اور دوسری اخلاقی پابندیاں قصۂ پارینہ قرار دی جا چکی تھیں۔ کیف و نشاط کی اس گرم بازاری میں عاشق و معشوق کے درمیان وصل و ملاقات اور حرف و حکایات میں کوئی امر مانع نہیں تھا۔ معشوق خود ہی عاشق کے لئے آغوش شوق وا کئے ہوئے تھا۔ حسن خود بے باکی و گستاخی کی دعوت دے رہا تھا۔ چنانچہ عاشق کو واردات کے بجائے معاملات، کاوشِ ہجر کے بجائے لذتِ وصل اور جگر سوزی کے بجائے عیش کوشی سے سروکار تھا اسی لئے اس دور کی لکھنوی شاعری کا ایک بڑا حصہ عاشق و معشوق کے ربط و اختلاط اور راز و نیاز کی باتوں پر مشتمل ہے لکھنؤ والوں کا یہ رنگ اتنا مقبول خاص و عام ہوا کہ دہلی والے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:۔

"اس (معاملہ بندی) نے لکھنؤ شاعری میں کچھ ایسا رچاؤ پیدا کر دیا تھا جس کے مقابلے میں دہلی کا دسترخوان نعمت بھی بے نمک معلوم ہونے لگا تھا اور کچھ عرصے کے لئے دہلی کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا"

لیکن اس لکھنوی رنگ کے کچھ اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے کیونکہ ان تجربات و مشاہدات عشق میں ہوس ناکی و کام جوئی کا عنصر غالب تھا۔ جذبات میں بجائے گہرائی کے سطحیت تھی اسی وجہ سے معاملات عشق اور متعلقات حسن کے بیان میں اکثر بازاری پن، ابتذال اور فحش پن پیدا ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کے کچھ ثقہ اور متین شعراء کا کلام بھی اس سے پاک نہیں۔ انھیں محرکات کے زیر اثر لکھنؤ میں غزل کے متوازی کچھ اور ضمنی اصناف سخن نے ترقی کی مثلاً واسوخت ہزل اور ریختی وغیرہ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کے اچھے اچھے شاعروں کے کلام میں حد درجہ مبتذل اور فحش اشعار مل جاتے ہیں۔

وصل کی شب عیش و عشرت کا یہ ساماں کیجئے ۔۔۔ خود بھی عریاں ہوجئے اس کو بھی عریاں کیجئے ۔۔۔ آتش

ہاتھ ملتا ہوں جو میں دیکھ کے سینے کا ابھار ۔۔۔ کہتے ہیں توڑیے جس کو یہ وہ تاریخ نہیں ۔۔۔ "

اترا کے آئینے میں چڑھاتے تھے اپنا منہ ۔۔۔ دیکھا مجھے تو جھینپ گئے منہ چھپا لیا ۔۔۔ شوق

ہوں گے ہم تیری چال سے محرم ۔۔۔ بند انگیا کا جب کہ وا ہوگا ۔۔۔ امانت

کچھ زلف پر نہیں کہ بلا ہیں تمام عضو ۔۔۔ جو جس میں پھنس گیا وہ اسے دام ہوگیا ۔۔۔ برق

معشوق کی کمی نہیں عاشق مزاج کو ۔۔۔ بس بس زیادتی نہ کریں اب حضور آپ ۔۔۔ رند

دم کہتے ہیں یہاں تو ہوگئی ہلکان جان اپنی ۔۔۔ اور اب تک حسرت وصل آپ کے دل سے نہیں نکلی ۔۔۔ امیر

اس دور کا تقاضا بھی یہی تھا۔ زمانے کے مذاق کو پوری طرح آسودہ کرنے کے لئے ایک تجربہ کار بے باک اور کامل فن کار شاعر کی ضرورت تھی اور داغ میں یہ تمام خوبیاں بیک وقت موجود تھیں۔ انھیں آغاز شباب سے ہی ممتاز اور قابل ترین اساتذہ سے کسب کمال کرنے، امراء و روساء کی صحبتوں میں رنگ رلیاں منانے اور عیش کرنے کے مواقع مل چکے تھے۔ بے باکی ان کی فطرت ثانی تھی چنانچہ ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں:۔

"وہ خود بھی حساس دل لے کر آئے تھے بار بار دل پر چوٹ کھا چکے تھے...... اتفاق سے ان کو قدرداں بھی ایسے مل گئے کہ ان کے تجربات و بیانات کو صدق دل سے سراہ سکتے تھے۔ اس موقع سے انھوں نے بھی جی بھر کر فائدہ اٹھایا۔ مثالی اخلاقیات اور فرسودہ روایات سے مغلوب ہو کر محسوسات قلم بند کرنے میں وہ جھجکے نہیں

> نظم کرنا شروع کر دیا۔ اُس وقت کے لوگ چاہتے بھی یہی تھے کہ کوئی دل کا چور نکال دے جو کچھ بزم نشاط میں گزرتی ہے اس کو سماج کے روایتی خوف سے نظر انداز نہ کرے بلکہ روزمرہ کی روداد کو شاعرانہ انداز میں پیش کر دے[1]"

داغ کی معاملہ بندی میں ایک چمک دمک ہے یہ خالی خوبی لفاظی نہیں بلکہ اس میں ایک خوش آئند صنعت گری ہے جو مذاق سلیم پر گراں نہیں گزرتی۔ روزمرہ اور محاورہ معاملہ بندی کی جان ہے تیور میں تیکھا پن اور طنز یا شوخی اُس کا زیور ہیں اور یہ سب داغ کی شاعری کے جزو لاینفک ہیں۔ اُن کی شاعری میں معنوی چمک دمک بھی ہے کیونکہ اس کا مدار اُن کی مبنی ہوئی معاملہ بندی پر ہے اس میں اُن کا جواب نہیں۔ انھوں نے جو عشقیہ اشعار کہے ہیں اُن میں سے زیادہ تر معرکتہ الآرا ہیں ان میں اصلیت و واقعیت کا گہرا رنگ ہے کیونکہ یہ اُن کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہیں۔

داغ کی معاملہ بندی میں جو ہوسناکی و عیاشی اور کھُل کھیلنے کا انداز ہوتا ہے تو اس کی اصلیت بھی ہے یہ تجربات و مشاہدات اُن کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان کے اظہار میں داغ نے ایک پر لطف کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اُن کی معاملہ بندی جراُت جان صاحب اور رنگین سے مختلف ہے۔ عیش پرستی اور لذت کوشی داغ کی گھٹی میں پڑی تھی اُن کی تمام عمر رنگینیوں میں گذری اسی لئے اُن کی غزلوں میں حسن پرستی اور لذت اندوزی کے تذکرے جا بجا ملتے ہیں لیکن انھوں نے معاملات درون پردہ کو کہیں کھول کر بیان نہیں کیا ہے بلکہ جو کچھ کہا ہے اُسے اشاروں اور کنایوں کے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلیں اُردو شاعری کے ماتھے کا جھومر ہیں اُن میں رمزیت و ایمائیت کی وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اردو غزل کی جان ہیں۔

حالانکہ داغ کی معاملہ بندی آزاد جنسی محبت کا رجحان ظاہر کرتی ہے لیکن اُن کا مقصد سستی لذت پرستی نہیں ہے بلکہ وہ واردات کے بیان اور جذبے میں وہ جمالیاتی رشتہ قائم کرنا چاہتے تھے جو پڑھنے والے میں شگفتگی پیدا کرنے اور نشاطیہ عناصر کو ابھارے۔ اُن کا مقصد جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنا نہیں ہے اگرچہ بعض اشعار میں وہ اپنی رندانہ شوخی کی رنگ میں حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی نے اُن کی معاملہ بندی پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:۔

> "داغ کی شاعری میں نہ حقیقت و مجاز کی بھول بھلیاں ہیں نہ فکر فلک پیما کی مطلق العنانیاں۔ تخیل کی بے اعتدالیاں ہیں نہ مصنوعی جذبات کی فراوانیاں .... البتہ خیال کی صداقت اور جذبے کی اصلیت کے ساتھ اُن کا بے باکانہ اظہار دیکھنا مقصود ہو تو داغ کی شاعری کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔ داغ کی رندانہ جراُت، قال اندیشی و مصلحت کوشی کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھتی ہے اور اظہار صداقت کی کٹھن راہوں سے دیوانہ گزرتی چلی جاتی ہے۔ یہی اُن کی خصوصیت ہے اور یہیں اس کی انفرادیت کے جوہر کھلتے ہیں[2]۔

معاملہ بندی اور واردات و کیفیات حسن و عشق کا بیان داغ نے جس فنکارانہ طریقے سے کیا ہے وہ داغ کا کمال ہی نہیں بلکہ اُن کا منفرد رنگ ہے اور یہ رنگ عوام و خواص میں اتنا مقبول ہوا کہ اُن کے حلیفوں نے ہی نہیں بلکہ حریفوں نے بھی پسند کیا اور اس کی تقلید کرنے کی کوشش کی یہی وجہ ہے کہ داغ اپنے دور کے ترجمان اور رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ ذیل میں اُن کے دواوین میں سے اُن کی معاملہ بندی

[illegible]

کی چند مثالیں دی جاتی ہیں ؎

آتا ہے مجھ کو یاد سوالِ وصال پر	کہنا کسی کا ہائے وہ منہ پھیر کر نہیں	گلزار داغ
طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی	چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی	"
چاہ کا نام جب آتا ہے بگڑ جاتے ہو	وہ طریقہ تو بتاؤ تمہیں چاہیں کیوں کر	آفتاب داغ
شب وصل ایسی کھلی چاندنی	وہ گھبرا کے بولے سحر ہو گئی	"
جوش میں اور قیامت کی جوانی آتی	ہاتھ میرا جو ترے سینے پر اکثر پھرتا	مہتاب داغ
ہمیں تو شوق ہے بے پردہ تم کو دیکھیں گے	تمہیں ہے شرم تو آنکھوں پہ ہاتھ دھر لینا	"
بدمستئ شباب میں فکر مآل کیا	ایسے میں سوجھتا ہے حرام و حلال کیا	یادگار داغ
راہ میں ٹوکا تو جھنجھلا کر کہا	دور ہو کمبخت یہ بازار ہے	"
کیا زانوئے رقیب لیا ہے نگاہ میں	تکیہ نہیں ہے آج تری خوابگاہ میں	ضمیمۂ یادگار داغ
طور بے طور ہوئے جاتے ہیں	وہ تو کچھ اور ہوئے جاتے ہیں	"

بعض نقاد داغ کی شاعری کا سلسلہ جرأت سے ملاتے ہیں لیکن درحقیقت داغ اور جرأت کے رنگ میں موضوع کی مماثلت کے علاوہ کوئی بات مشترک نہیں ہے بلکہ دونوں کی معاملہ بندی میں نمایاں فرق ہے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اس فرق کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"داغ کی یہ معاملہ بندی جرأت، رنگین اور جان صاحب کی معاملہ بندی سے مختلف ہے۔ ان شعراء کی عیاشی ذہنی عیاشی ہے اُن کی شاعری اس نفسیاتی رجحان کی غمازی کرتی ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں Perversion کہتے ہیں[1]"

اگرچہ داغ کی شاعری میں بھی رندی ہوس پرستی ہے لیکن اُن کا جذبہ صحت مند ہے اس میں جنسی تشنگی نہیں ہے بلکہ جنسی آسودگی ہے کیونکہ اُن کی شاعری کا مدار مبنی ہوئی معاملہ بندی پر ہے۔ داغ اور جرأت کی معاملہ بندی میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ داغ رازِ درونِ پردہ کو اس طرح اشاروں اور کنایوں میں بیان کرتے ہیں کہ بیان میں ابتذال اور رکاکت پیدا نہیں ہوتی۔ اُن کا محبوب بازاری اور سہل الحصول ہے اور اُسے پارسائی کا دعوٰی بھی نہیں ہے اُن کا لب ولہجہ نشاطیہ ہے لیکن جرأت کے یہاں صرف ذہنی عیاشی ہے جو جنسی آرزوؤں کی گھٹن اور ناکامی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں واقعیت کا عنصر کم ہے۔ داغ معاملاتِ عشق کو بے باکی و جسارت سے بیان کرنے میں جرأت سے بڑھے ہوئے ہیں دونوں کے اشعار کے تقابلی مطالعے سے یہ فرق واضح ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں دونوں کے کلام سے ملاحظہ کیجئے ؎

وعدہ پر آیا نہ وہ بت اور میں جیتا رہا	اُس سے شرماتا ہوں میں اور مجھ سے وہ شرمائے ہے	جرأت
غضب کیا ترے وعدے پر اعتبار کیا	تمام رات قیامت کا انتظار کیا	داغ
کفِ افسوس ملتے ہیں کہ جرأت ہم نہیں اس جا	نہیں تلوے تو سہلاتے گھڑی دو چار کیا کیجئے	جرأت

جو مرے دل میں ہے کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے — گدگداؤں تو کہوں پاؤں دباؤں تو کہوں — داغ
لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں — ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں — جرأت
کیوں وصل کی شب ہاتھ لگانے نہیں دیتے — معشوق ہو یا کوئی امانت ہو کسی کی — داغ
اس ڈھب سے کیا کیجئے ملاقات کہیں اور — دن کو تو ملو ہم سے رہو رات کہیں اور — جرأت
تمہاری طرح بھی ہوگا نہ کوئی ہرجائی — تمام رات کہیں پر کہیں، دسارے دن — داغ

داغ کے لئے کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُن کے کلام میں رنگ مومن کی جھلکیاں ہیں، یہ کسی حد تک صحیح ہے۔ اگرچہ داغ کا محبوب مومن کے محبوب کی طرح اُردو شاعری کے روایتی محبوب سے مختلف ہے لیکن وہ پردہ نشین نہیں ہے۔ مومن کا محبوب صرف انھیں کا محبوب ہے وہ اگر رقیب کی طرف مائل بھی ہوتا ہے تو صرف اس لئے کہ شعلۂ عشق اور بھڑکے، محبت کی چنگاری اور تیز ہو لیکن داغ کا محبوب ہرجائی ہے۔ بے نقابی اور بے حجابی اس کا شیوہ ہے۔ دونوں کے محبوبوں میں اس بنیادی فرق کے علاوہ دونوں شعراء کی زندگی اور تجربات عشق میں کافی فرق تھا۔ داغ اگرچہ مومن سے بڑے شاعر نہیں تھے لیکن معاملات عشق کے بیان میں انھوں نے کافی احتیاط سے کام لیا ہے لیکن مومن نے اپنے بیانات میں اس طرح پردہ دری کی ہے کہ بعض اوقات بیانات کے جزئیات میں مرزا شوق اور میر اثر سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ مومن اور داغ کے عشق میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ داغ کا تمام تر عشق جسمانی آسودگی کے نظریہ پر مبنی ہے لیکن مومن کے عشق میں جسمانی آسودگی اور روحانی آسودگی دونوں ملتی ہیں محبوب سے مومن کا انداز تخاطب عاجزانہ منکسرانہ اور نیازمندانہ ہے اس کے برخلاف داغ محبوب سے برابر کی منزل پر ملتے ہیں وہ برابر کی چوٹیں بھی کرتے ہیں اور کھری کھری بھی سناتے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے دونوں کے انداز تخاطب کا فرق واضح ہوجاتا ہے ؎

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا — مومن
کیا رہے گا کوئی حسیں نہ کہیں — جی بہل جائے گا کہیں نہ کہیں — داغ
کیوں لگے دینے خط آزادی — کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب — مومن
کیا سمجھتے ہو تم اپنے آپ کو — خوب رویوں سے جہاں خالی نہیں — داغ
وقتِ وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے — یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا — مومن
آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں — آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا — داغ

ناروا کہئے ناسزا کہئے — کہئے کہئے مجھے برا کہئے
جو گنہ [illegible] داغ پر صدقے — آپ بندہ نواز کیا جانیں

تم کو چاہا تو خطا کیا ہے بتا دو مجھکو — دوسرا کوئی تو اپنا سا دکھا دو مجھکو
تم نے [illegible] لے ہم سے گن گن کر لئے — ہم نے کیا چاہا تھا اس دن کے لئے

کہیں داغ کا لہجہ اس قدر [illegible] ہے کہ بالکل مومن کا لہجہ معلوم ہوتا ہے ؎

محشر میں وہ نادم ہوں خدا یہ نہ دکھائے — آنکھوں نے کبھی اُن کو پریشاں نہیں دیکھا

[illegible]

میں گھر کرنے کے لئے طنز سے زیادہ مؤثر، دل نشین اور کارگر کوئی اور حربہ نہیں ہو سکتا۔ مومن نے اس حربے کا استعمال پوری تیزی اور آبداری سے کیا ہے۔ کہیں اُن کا لہجہ حد درجہ تند و تلخ ہے اور کہیں حد درجہ نرم و شیریں اور کہیں نرمی، شیرینی، تلخی اور تلخی کا حسین امتزاج ہے۔ لیکن اُن کا طنز ایک خاص سطح سے نیچے نہیں اترتا اور آداب عشق کا خیال ملحوظِ خاطر رہتا ہے۔ مگر داغ طنز سے طعن و تشنیع پر اتر آتے ہیں وہ محبوب کے ہرجائی پن پر بڑے سستے قسم کی طنز اور اوچھی وضع کی دھمکیوں کا استعمال کرتے ہیں۔ پروفیسر وقار عظیم داغ کے طنز کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"مومن کے طرز کی اس خصوصیت کو داغ نے جی کھول کر برتا ہے یہاں تک کہ طنز اُن کے انداز بیان کی ایک نمایاں خصوصیت بن گئی ہے۔ لیکن عشق کے دوسرے معاملات کی طرح یہاں بھی داغ کے مزاج نے اپنا راستہ الگ بنایا ہے اور طنز کو طنز کی سطح سے اتار کر طعن و تشنیع کی سطح پر لاکر کھڑا کر دیا ہے اس لئے کہ اُن کے نزدیک اُن کا محبوب اس کا مستحق ہی نہیں کہ اس سے بات کرتے وقت لطافتوں کا سہارا لیا جائے یا حُسن بیان کے پردے ڈالے جائیں وہ لگی لپٹی رکھنے کے بجائے ہر بات صاف صاف کھُلم کھُلا اور برملا کہتے ہیں۔[1]"

درحقیقت جس طرح داغ کا عشق اور محبوب مومن کے عشق اور محبوب سے مختلف ہیں اسی طرح اُن کے معاملات عشق اور تجربات و مشاہدات بھی اُن سے مختلف ہیں اُن کا طنز اور اُن کا انداز تخاطب اُن کے مزاج عشق کے عین مطابق ہے اور یہ اُن کا اپنا انداز ہے۔ یہ ادعا کرنا کہ اس خصوصیت میں انھوں نے مومن کی خوشہ چینی کی ہے محض مومن سے عقیدت مندی پر مبنی ہے۔ جہاں داغ نے طنز یہ لہجے میں نرمی اور شاعرانہ لطافت پیدا کی ہے وہاں اُن کے اشعار مومن کے نشتروں سے کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتے ؎

عمر بھر آپ نے مجھکو کبھی اچھا نہ کہا — خیر اچھا نہ سہی آپ کا بیمار تو ہوں

ذکر مہر و وفا تو ہم کرتے — پر تمھیں شرمسار کون کرے

اُوپر کے شعر میں طنز کا ایمائی انداز خالص مومن کا سا ہے ؎

ہم مٹ گئے تو پرسش نام و نشاں ہے اب — اس کی تلاش کیا کہ محبت کہاں ہے اب

اس شعر کا طنز یاتی پہلو اور خالص طنز یاتی انداز قابل داد ہے اور مومن کے خالص رنگ میں اُن کے کسی نشتر سے کم نہیں۔ ایسے بہت سے اشعار داغ کے کلام سے پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ داغ معاملہ بندی میں مومن سے قریب تر ہیں۔ داغ اور مومن کے جمالیاتی احساس میں جو فرق ہے وہ اُن کے مزاج، ذوق اور ماحول کے اختلاف کے مطابق ہے اور یہی فرق اُن کی اس خصوصیت میں بھی نمایاں ہے۔ مومن اُردو غزل کے بہترین دور کی روایات کی نمائندگی کرتے ہیں اور داغ انحطاطی دور کی ترجمانی کرتے ہیں۔ داغ کے یہاں ہوسناکی اور تعیش پسندی کے جذبات کی ترجمانی خاصے متوازن انداز میں ہے۔

---

[1] نگار داغ نمبر (طنز: داغ میں رنگ مومن کی جھلکیاں) ص ۷۷

ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

اُردو کا آغاز

لفظ اُردو فارسی ادب سے لیا گیا ہے جن کے معنی امراء و سلاطین کی فرودگاہ یا کیمپ ہیں۔ اُردو لفظ مسلمانوں کے وسیلے سے ہندوستان میں آکر لشکر، فوج اور بیرک میں استعمال ہونے لگا۔ محمود شیرانی صاحب میر امن کا حوالہ دیتے ہوئے لفظ اُردو کی توضیح و وجہ تسمیہ کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں۔

"آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تک نام سلطنت کا چلا آتا ہے ہندوستان لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر کا بازار اُردو کہلایا۔ حضرت شاہجہاں نے قلعہ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا۔ اور یہ نیا شہر کہلایا اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلیٰ خطاب دیا۔"

(پنجاب میں اُردو محمود شیرانی مکتبہ کلیاں لبشیرت گنج لکھنؤ ص ۱۰۱) اس اُردو بازار کا ذکر غالب نے میر مہدی کے خطوط میں کیا ہے تعجب یہ ہے کہ اُردو ایک بازار کا نام ہونے سے زبان کا نام اُردو رکھ دیا گیا۔

ظہور اسلام سے قبل عرب کے تاجر مالابار کے ساحل پر ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آتے کچھ دنوں تک ان کا کام صرف تجارت رہا بعد میں انھوں نے تبلیغ بھی کرنا شروع کر دی، جب اسلام سارے عرب میں ... ظہور میں آیا تو یہ انتہائی قوت کی طرح ... ہر سمت بکھرنے لگا۔ آٹھویں صدی عیسوی ... جنوبی ہند میں شروع ہوئی اور گیارھویں اور بارھویں صدی تک رامانج اور شنکراچاریہ کے ہاتھوں میں پہنچ کر ہندو فلسفہ کی بنیادیں پڑیں اس میں اسلامی تصوف کے نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ پہلی صدی ہجری کے اوائل میں محمد بن قاسم کے فتوحات سے سندھ اور ملتان اسلامی قلمرو میں آ گئے تھے اور سندھ و ملتان میں مسلمان اس وقت سے قابض ہو گئے۔ پنجاب پر ان کا قبضہ نصر الدین محمد سام کی آمد سے ایک سو ستّر سال پہلے سے تھا۔ مسلمانوں کی یہ کثیر تعداد جو بغرض تجارت فوجی و سرکاری خدمت پنجاب میں ان ایام میں آباد تھی اس کو اپنا وطن تصوّر کرنے لگی لاہور اس عہد کے مسلم ہندوستان کا صدر مقام تھا اور پنجاب ان کی نگاہ میں مفتوحہ ملک نہ تھا بلکہ ان کا اپنا وطن اور ان کو اپنی زبان اختیار کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی یہ غلط ہوگا کہ ہم اردو کو شاہجہاں یا اکبر کے دربار سے منسوب کریں بلکہ اس کی قدامت اس وقت سے ہے جب سے مسلمان ہندوستان میں آئے اس کا ثبوت یہ ہے کہ گجرات و دکن میں اس زبان میں دسویں صدی ہجری کی ابتدا یعنی بابر کی آمد کے قبل سے ادبیات کا سلسلہ جاری تھا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد کے وقت دہلی میں کون سی زبان بولی جاتی تھی۔

آج دہلی۔ میرٹھ۔ مظفر نگر۔ سہارنپور یا یوں کہیے دوآبہ میں اُردو بولی جاتی تھی۔ اس وقت دہلی میں برج کا دور دورہ تھا۔ مغلوں کی آمد کے وقت گنگوہ ضلع سہارنپور میں عبدالقدوس گنگوہی برج میں لکھتے تھے۔ اردو نے

رفتہ رفتہ برج کو خارج کر دیا۔ اُردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ آئی۔ دہلی میں اسلامی حکومت قائم تھی اس لئے زبان اسلامی لشکروں۔ بیاجروں اور صنعت کاروں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ہر گوشہ میں پہنچ گئی۔ گجرات میں اُردو کو دہلوی گجری یا گوجری کے نام سے پکارا جانے لگا اور نویں اور دسویں صدی ہجری میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ گجرات میں شروع ہو گیا۔ فیروز شاہ تغلق کے بعد یک دم سے فارسی پر زوال آگیا اور تغلق۔ سید اور پٹھان اردو ہی اختیار کرنے لگے۔

میر جعفر زٹلی جن کا عہد عالمگیر سے لے کر فرخ سیر کے دور تک ہے اُردو کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں جان بیمز بھی اُردو کے لئے ہندوستانی زبان کا لفظ استعمال کرتا ہے کہیں ہندی بولیوں کے مقابلہ میں ملکی زبانوں کا ذکر کرتے ہوئے اُردو کو علمی زبان بتاتا ہے اور اس کے جاننے کو تعلیم یافتہ ہونے کی نشانی قرار دیتا ہے وہ ہندی اور اُردو کو الگ الگ دو زبانیں تسلیم نہیں کرتا اور دونوں کی مجموعی حیثیت کے لئے اکثر ہندی ہی کا لفظ استعمال کرتا ہے غرضیکہ اُردو پہلے ہندی یا ہندوی ہی کہلائی آگے چل کر اُردو ریختہ کہلائی ریختہ کے معنی ہوتے ہیں گرے ہوئے پس جو زبان اصلیت سے گر جائے اس کو زبان ریختہ بولتے ہیں چنانچہ جیسے فارسی زبان میں عربی کے لغت شامل ہو اسے زبان ریختہ فارسی کہتے ہیں اس طرح ریختہ ہندی کو زبان اُردو سمجھا گیا۔ ریختہ کے بارے میں مولانا آزاد آب حیات میں اس طرح تحریر کرتے ہیں۔

"اس زبان کو ریختہ کہتے ہیں کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے جیسے دیوار کو اینٹ۔ مٹی۔ چونا۔ سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی۔ پریشان چیز چونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں اس لئے اسے ریختہ کہتے ہیں"

ریختہ سے مراد ولی اور سراج کے یہاں نظم اُردو ہے لیکن دہلویوں نے اس کو زبان اُردو کے معنی دیئے اور یہ معنی فطرتاً پیدا ہو گئے اس لئے کہ ان ایام میں اردو زبان کا تمام سرمایہ نظم ہی [illegible]

طرح ریختہ قدرتاً اردو زبان کا نام پڑا۔ اُردو کو کبھی دہلوی کے نام سے بھی پکارا گیا مثلاً شیخ باجن متوفی ۹۱۲ھ نے اس کو زبان دہلوی کے نام سے یاد کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

"صفت دنیا بزبان دہلوی گفتہ"

حقیقت یہ ہے کہ اُردو کی داغ بیل اس دن سے ہی پڑ گئی تھی جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا اور یہ مغل بادشاہوں کے زمانہ میں ترقی پاتی رہی اس سلسلہ میں میر امن کا بیان ہے۔

"جب اکبر شاہ تخت پر بیٹھا تب سب قومیں فیض رسانی اس خاندان کی سن کر حضور میں آ کر جمع ہوئیں لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین۔ سودا سلف۔ سوال جواب کرتے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی"

سرسید اُردو کے آغاز و ترقی کے بارے میں اس طرح تحریر کرتے ہیں۔

"جبکہ شہاب الدین شاہجہاں بادشاہ ہوا اور اس نے انتظام سلطنت کا کیا اور سب ملکوں کے وکلا کے حاضر رہنے کا حکم دیا اور دلی کو نئے سرے سے آباد کیا اور قلعہ بنایا اور شاہجہاں آباد اس کا نام رکھا تمام ملکوں کے لوگوں کا مجمع ہوا جب آپس میں معاملہ کرتے ناچار ایک لفظ اپنی زبان کا دو لفظ اس کی زبان کے تین لفظ دوسری کی زبان کو ملا کر بولتے اور سودا سلف لیتے۔ رفتہ رفتہ اس زبان نے ایسی ترکیب پائی کہ یہ خود بخود ایک نئی زبان ہو گئی"

محمد حسین آزاد کا بھی خیال ہے کہ اُردو کا آغاز و ترقی مغل بادشاہوں کے زمانہ میں ہوئی وہ اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

"مسلمان بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے۔ شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی عربی لفظ ان کی زبان پر زیادہ آجاتے ہوں گے ... رفتہ رفتہ شاہجہاں کے زمانہ میں کہ اقبال تیموریہ کا آفتاب عین اوج پر تھا۔ شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دہلی دار الخلافہ ہوئی۔۔ ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں اُردو سے [illegible]

کی بولی کا نام اُردو ہوگیا۔" (آب حیات ص ۲۰)

اُردو کا آغاز اس وقت سے شروع ہوگیا تھا جب سے مسلمانوں نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا لیکن اس کی ترقی مسلمانوں اور مغل بادشاہوں کے زمانہ میں دارالخلافہ دہلی کے وسیلے سے سارے ہندوستان میں ہوتی رہی۔

ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔ برج بھاشا سے ہماری مراد وہ زبان ہے جو ضلع متھرا کی زبان تھی اور وسعت اختیار کرکے جنوب میں تمام ضلع آگرہ۔ علاقۂ بھرت پور۔ دھول پور اور قرولی۔ مغربی علاقہ ریاست گوالیر اور مشرق علاقہ ریاست جے پور میں پھیلی ہوئی تھی۔ شمال میں گڑگانوں کے مشرق حصہ میں۔ شمال مشرق میں دوابہ۔ بلند شہر۔ علی گڈھ۔ ایٹہ۔ مین پوری میں گنگا پار بدایوں۔ بریلی۔ اور ترائی پرگنہ نینی تال میں بولی جاتی تھی اور اس کے مختلف مقامات پر مختلف نام رکھ دئے گئے تھے مثلاً مشرق علاقہ میں جہاں قنوجی زبان سے اس کا استعمال ہوتا تھا۔ انتربیدی کہلاتی تھی۔ گوالیار کے شمال مشرق میں جو دھول پور کا متوازی ہے اور جہاں سِکروالر اور راجپوت آباد ہیں "سیکرواڑی" قرولی کے میدانی علاقہ اور بعض علاقہ گوالیار میں چمبل پار "جادوباٹی" کہلاتی تھی۔ بھرت پور کے جنوبی علاقہ قرون خاص اور مشرق علاقہ، جے پور میں جو ڈانگ کے نام سے موسوم ہے یہ "ڈانگی" کہلاتی تھی۔

ہم اردو کو برج بھاشا کی بیٹی ابھی تک سمجھتے آئے ہیں لیکن برج میں جمع کا طریقہ بہت سادہ اور سہل ہے لیکن اردو میں بہت پیچیدہ ہے اس لئے اردو کا بھاشا سے کوئی تعلق نہیں ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں ہے بلکہ بہنوں بہنوں کا رشتہ مناسب ہے۔ جس زبان سے اردو نے ارتقا پائی ہے وہ نہ برج ہے۔ نہ ہریانی اور نہ قنوجی۔ یہ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ ہریانوی سے مراد پرانی اُردو ہے جو گیارھویں صدی میں خود دہلی میں بولی جاتی تھی۔ دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی استعمال سے ترمیم قبول کرتی رہی اور رفتہ رفتہ اُردو کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔ پنجاب فوراً اردو کا مرکز رہا اس لئے اس نے لسانی تغیر کے اثرات زیادہ قبول کئے اس سلسلہ میں مرحوم پروفیسر احتشام حسین صاحب نے اس طرح لکھا ہے۔

"دہلی ایک ایسی مرکزی جگہ تھی جہاں کئی زبانیں ملتی تھیں۔ پنجابی۔ ہریانی۔ کھڑی بولی اور برج بھاشا سب اسی علاقہ سے قریب تھیں۔ برج بھاشا عام طور سے ادبی زبان کی حیثیت رکھتی تھی گو اس کے ادب کا پتہ بہت بعد میں چلتا ہے۔ گریرسن نے البتہ لکھا ہے کہ پرتھی راج راسو قدیم برج بھاشا میں لکھی گئی لیکن یہ عام خیال نہیں۔"

(ہندوستانی لسانیات کا خاکہ سید احتشام حسین ص ۵۷)

اُردو جتنی منزلوں سے گزرتی گئی اتنے نام پاتی گئی شروع شروع میں یہ زبان دہلوی۔ ہندی یا ہندوی کہلائی دکن پہنچ کر اس کا نام دکنی پڑا اور گجرات میں گجری کہلائی پھر ریختہ۔ زبان اردو اور اردوئے معلیٰ کہی گئی۔ مغربی مصنفین نے اس کو ہندوستانی یا ہندستانی کا نام دیا لیکن السانی کے لئے اس کو اُردو یا ہندوستانی ہی کہنا ٹھیک ہوگا۔ اُردو کو بادشاہوں اور امیروں نے منہ نہیں لگایا اسے تہذیبی زبان کا درجہ نہیں دیا لیکن وہ ناگزیر تقاضوں کے باعث پیدا ہوئی تھی اور اس کو علاقہ باقی حدبندیوں کو توڑ کر آگے بڑھنے کا موقع ملتا رہا صوفی اور درویشوں نے اپنا روحانی پیغام پہنچانے کے لئے اس زبان کو منتخب کیا اور یہ عوام کے قریب آتی گئی۔ عالمگیر کے عہد میں ایک تحریک چلی اور تعلیم کا ذریعہ ہندی زبانیں بن گئی اور بے شمار کتابیں بچوں کی تعلیم کے لئے لکھی گئیں جن میں اکثر و بیشتر منظوم تھیں یہ سلسلہ ہندوستان کے کئی صوبوں دہلی۔ دکن اور پنجاب میں جاری ہوا۔ اُردو کا آخری لیکن سب سے زبردست اور شاندار مرکز دہلی ہے جو دکن اور رنگ آبادی کے اثرات میں قائم ہوا اور کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے لکھنؤ سے کلکتہ پہنچ کر عام ہوگیا۔

کوئی زبان بالکل ٹھیک ایک ہی شکل میں ایک پورے

رقبے میں نہیں بولی جاتی اور یہ بات ایک حقیقت کے طور پر کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کی کوئی زبان چاہے وہ کتنے ہی مختصر علاقے میں کیوں نہ بولی جاتی ہو۔ بولیوں کے اختلاف سے خالی نہیں ہے۔ آج کی سیاست لسانی مسائل کو ایک حد تک الجھاتی چلی جارہی ہے۔ بھوج پوری، اودھی وغیرہ بولیاں ہیں جن کو گندی سیاست زبان کا مرتبہ دینا چاہتی ہے۔ بھوج پوری کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں اور نہ کوئی اس کا لٹریچر ہے ایک طرح سے پوربی لوگوں کی بگڑی ہوئی ہندوستانی بولی ہے اس کو اُردو یا ہندی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اُردو اگر قومی زبان بن جاتی تو لامحالہ اس میں اتنی لچک پیدا ہوتی کہ وہ ملکی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فارسی اور عربی کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے بیش بہا خزانہ سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا لیکن تنگ نظری نے ایسا نہ ہونے دیا۔ آج کل ہندی ہندوستان کی سرکاری زبان ہے۔ مختلف لسانی علاقوں میں مختلف زبانیں وہاں کے لئے سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دستور ہند میں اردو کو بھی اس ملک کی ایک قومی زبان قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے لئے کوئی علاقہ کا تعین نہیں۔ اس کا علاقہ اگر ہو سکتا ہے تو وہی ہے جسے ہندی کا علاقہ کہا جاتا ہے۔ اُردو کے مستقبل میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں اُردو پچھلے پچیس سال سے مسلسل سرکاری ریاستوں کی دھاندلی اور مرکزی سرکار کی وعدہ خلافی کا شکار رہی ہے انھوں نے اُردو کو بیوہ بنا دیا ہے اب اس کو مرحومہ بنانے کی کوشش میں ہیں اُردو کے سلسلہ میں اہل حکومت کی نیت میں فتور معلوم ہوتا ہے۔ اردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے کہا جاتا ہے اُردو اکاڈمی کا قیام بھی اترپردیش اور بہار میں ہو گیا ہے لیکن پرانے اور نئے شعراء کے مجموعۂ کلام کو شایع کروانے اور چند ادیبوں کی تصانیف پر انعام دینے سے اردو کے تحفظ کا آغاز بھی نہیں ہوتا اُردو کو سرکاری دفاتر، تعلیم گاہوں، یونیورسٹیوں میں پہنچانے اور عوام کے قریب لانے کی ذمہ داری موجودہ حکومت پر ہے اور اُردو نظام تعلیم کی تشکیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کی سرکاری اور قانونی حیثیت کا تعین دستور ہند کی دفعات ۳۴۵، ۳۴۶ اور ۳۴۷ کے تحت نہ ہو جائے۔

(بقیہ صفحہ ۴۳ کا)

"ہاں! ہاں ماں جی۔۔۔ بالکل۔۔۔۔ وہ حیران تھی خدایا دنیا میں اتنے نیک انسان بھی بستے ہیں۔ رادھا کی ماں نے بالوجی کو مختصر الفاظ میں اس کی کہانی سنائی اور ان کے سامنے ایک بار پھر اس کو سینے سے لگا لیا۔

"رادھا کی شادی کے بعد میرا گھر سونا ہو گیا تھا۔ بھگوان نے مجھے دوسری بیٹی دے دی۔۔۔"

"مگر ان کے گھر والوں کو معلوم ہو گیا تو! تم جانو رادھا کی ماں آج کل ذرا ذرا سی بات پر فساد ہو جاتے ہیں کہیں یہ بات نہ پکڑی جائے کہ ایک مسلمان لڑکی کو ایک ہندو نے اغوا کر لیا۔۔۔۔"

"کیا کہتے ہو جی۔ کون کہے گا۔ کس کی مجال ہے۔ کیسا ہندو کیسا مسلمان، یہ میری بیٹی ہے، دیبا۔۔۔۔ میرے گھر کا اجیارا۔۔۔۔۔۔۔"

"ہاں جی۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں بڑی بد نصیب ہوں۔ جہاں گئی نحوست پھیلا دی۔ مجھے جانے دیجئے۔۔۔۔"

"کہاں جاؤں گی؟"

"جہاں نصیب لے جائے!" اس نے ایک سرد آہ بھری۔

رادھا کی ماں نے دنیا کی اونچ نیچ سمجھائی۔ محبت بھرے لہجے میں ڈانٹا وہ چار آنسو بہائے اور آخر دیبا نے نڈھال سی ہو کر ان کی گود میں سر رکھ دیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ بڑی گہری نیند سو رہی تھی۔ جیسے کوئی تھکا ماندہ مسافر کسی گھنے درخت کی چھاؤں میں دم لینے کو رکے اور سکون پا کر نیند کی آغوش میں پہونچ جائے۔ (باقی آئندہ)

ساحلؔ مانکپوری

حضرت بندگی شاہ محمد برہان الدین بقاؔ نظامی

نام و نسب :- محمد برہان الدین نام، بندگی شاہ خطاب طریقت، بقاؔ تخلص آپ کی ولادت ۱۹۲۵ء بروز پنجشنبہ عظیم آباد میں ہوئی۔ سلسلۂ نظامی کی رعایت سے خود کو بقاؔ نظامی کہتے ہیں۔ آپ کے مورث اعلیٰ عہد فرخ سیر میں نیشاپور (ایران) سے سلسلۂ تجارت ہندوستان تشریف لائے تھے۔

تعلیم و تربیت :- ابتدائی تعلیم طرز قدیم پر گھر پر ہوئی۔ آپ کا گھرانہ صاحبان علم و فضل کا گھرانہ تھا۔ آپ کے والد مرحوم و مغفور مولانا محمد حسین صدیقی نے مشاہیر عظیم آباد سے آپ کو اسلامی علوم کی تعلیم دلوائی۔ علوم دینوی کے ساتھ ہی آپ نے پٹنہ سٹی محمڈن اینگلو ہائی اسکول سے درجہ ہفتم تک جدید تعلیم بھی حاصل کی۔

آپ کی شخصیت کی تعمیر اور جلا بخشنے میں حضرت معروف عرف گودڑ شاہ امیٹھوی [1] کا بہت بڑا حصہ ہے۔ شاہ صاحب کا شمار جید عالموں اور بزرگوں میں ہوتا ہے انھیں عربی فارسی کے علاوہ ہندی زبان پر بھی قدرت کاملہ حاصل تھی۔

حضرت بقاؔ نظامی نے باضابطہ طور پر مائلؔ لکھنوی سے اصلاح لی ہے۔ علامہ مائلؔ لکھنوی کا گھرانہ خدمت اردو زبان اور اصلاح شاعری میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کے جد حضرت صفیؔ لکھنوی کی علمی و ادبی خدمات کا ہر شخص نے اعتراف کیا ہے خود حضرت مائلؔ لکھنوی عزیزؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔

تصنیف و تالیف :- حضرت بقاؔ نظامی نے نظموں کے علاوہ نثر کی طرف بھی خصوصی توجہ فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی پہلی تصنیف "مطلوب القلوب" شائع ہوئی اس کتاب میں آپ نے اپنے شیخ محترم حضرت معروف امیٹھوی کی سوانح حیات قلم بند فرمائی ہے۔ دوسری کتاب مراۃ بندگی [2] ہے یہ حضرت بندگی نظام الدین اولیا محبوب ربانی ثانیؒ دادا پیر حضرت امیٹھوی رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] امیٹھی۔ صوبہ اودھ کا وہ مردم خیز خطہ ہے جہاں سے بڑے بڑے علماء و فضلاء شان طریقت لئے ہوئے اٹھے اور اپنے ذوق عبادت سے خلق عالم کو تقویت بخشی۔ ایک عرصہ تک قصبۂ امیٹھی نے خاص و عام کے لئے خیر آگیں مرکز قلب و نگاہ بنا رہا میں نے مدت جدید تک علم و حکمت کی روشنی پھیلائی۔ جہالت، تنگ نظری، اور تعصب کے خلاف سینہ سپر ہو کر عوام کی خدمت کی ہے۔ بزرگوں نے اپنے پاکیزہ کردار اور ذوق عمل سے ہر خاص و عام تک روحانی غذا پہونچائی ہے

[2] **بندگی نظام الدینؒ۔** راجے سید نور صاحب مانکپوری کے مرید و خلیفہ ہیں (الف) راجے سید نور کا پورا نام راجی سید نور الدین عرف نور الحق ہے ان کا روضۂ مبارک قلعہ مانکپور کے قریب دریائے گنگا کے کنارے مشرق و شمال کے جانب واقع ہے احاطہ اس کا خشت کا ہے جس میں بہت سے مقابر اُن کی اولاد کے ہیں اور روضہ کے ستون پتھر کے ہیں اور فرش سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کا ہے ٭٭٭

کی مکمل اور معتبر سوانح حیات ہے۔

حضرت کی تیسری کتاب مجربات درویشی ہے جس میں حضرت معروف کے سینہ بسینہ نسخے درج کئے گئے ہیں۔ (۳) کے علاوہ انتخاب دیوان یگانہ معروف مرتب کیا۔

زبان دفن:۔ آپ کا ایک شعری مجموعہ نقش ابنا ۵ ۲ جنوری ۱۹۶۵ء کو شائع ہو چکا ہے۔ جس کا پیش لفظ خود یگانہ نے سپرد قلم کیا ہے۔

---

(۴) زیر گنبد تین مقابر جس میں در سنگ مرمر کے اور راجی نور شاہ اور راجے سید مبارک کی ہے اور تیسری قبر مجہول تھی ہے روضہ پر راجی سید حامد شاہ فرزند اکبر سید نور شاہ کا ایک قطعہ تاریخ ہے۔ تعمیر روضہ بزمانہ اکبر بادشاہ معلوم ہوتی ہے۔

قادر ذو الجلال و الاکرام   آسمان راست قدرتش بانی
چوں حشوش شدہ عنایت او   ہم بتوفیق و لطف سبحانی
در زمان جہاں دین اکبر   کہ بہ اوشش خدر جہانبانی
روضہ را ساخت مصطفی راجی   کش چو رضوان سزد بدربانی
بہر سال بنا و تاریخ شد   ہم بیک بیت گفت دہقانی

قطعہ دیگر

جناب راجی سید نور دین شہ   شدہ واصل ز دنیا قرب اللہ
بجستن سال فوتش بود ذکر   کہ سید نور دین شد واصل اللہ

راجے سید نور مرید و خلیفہ راجی حامد صاحبؒ کے تھے آپ کی اولاد مختلف مقامات مانک پور رسول پور مصطفی آباد و بازید پور وغیرہ میں آباد ہے اس وقت بیشتر اولاد کا مذہب شیعہ ہے۔

(ب) راجے سید مصطفی نے جلال الدین اکبر کے زمانہ میں ایک گاؤں ونجیا بارکو از سر نو آباد کر کے مصطفی آباد آباد کیا۔ جو اب رائے بریلی میں واقع ہے۔ راجے مصطفی کی ایک تعمیر کردہ ایک شاندار مسجد مصطفی آباد میں موجود ہے۔

(ج) راجے سید مبارک راجی سید نور کے پوتے ہیں ان کے روضہ مبارک پر بھی ایک قطعہ سال وفات درج ہے جس میں کے دو شعر ہدیۂ ناظرین ہیں۔

امام سالکان قطب اقطاب   شہ دین حضرت راجے مبارک
درین دنیائے دون رحلت نمود   کہ ذاتش بد تعالی اللہ تبارک

(د) راجے سید حامد شاہ گردیزی۔ آپ خاندان سادات گردیزی مانکپور سے ہیں۔ آپ مرید و خلیفہ رشید مخدوم شاہ حسام الحق صاحب مانکپوری کے ہیں اور درجہ فقر میں آپ شاہ ولایت جونپور تھے اور آپ کے احاطہ درگاہ میں ایک قبر سنگین آپ کی ہے اور بہت سے مقابر اُن کے خاندان اور شہزادگان عصر کے ہیں اور شیخ پیر محمد صاحب سلونوی کو اول شرف بیعت سید احمد ثانی حاصل ہوا کیونکہ شیخ پیر محمد صاحب کے بزرگ جد اعلیٰ مخدوم شیخ جنتی عرف بڈھن سید احمد ثانی کے جد اعلیٰ راجے سید نور صاحب کے مرید و خلیفہ تھے۔ بعد وفات سید احمد صاحب شیخ پیر محمد نے سلسلۂ کریمیہ میں بیعت حاصل کی۔ راجے سید حامد شاہ کے محامد و فضائل کے متعلق مخدوم شاہ اشرف جہانگیر کچھوچھوی نے اپنی کتاب لطائف اشرفی میں تحریر کئے ہیں۔

"مٹیا برج کا یہ دور بھی بڑا ہی [illegible] تھا۔ ہمایوں کی ذات شمع محفل تھی۔ حضرت وحشت کلکتوی پورے بنگال پر چھائے ہوئے تھے۔ حضرت آرزو بھی اس کو اپنا میدان تصور کرتے تھے یہ تھا وہ ماحول جس نے راقم الحروف کو شعر و سخن کی طرف متوجہ کیا۔ آغا ئی دولائی دور حاضر کے سربرآوردہ سنفور حضرت معروف ایتھوی کی صحبت کیمیا اثر نے قوت بیان عطا کی اور استاد معظم حضرت مولانا ابو البیان مائل لکھنوی نے فکر و نظر کی صلاحیت بخشی۔"

موصوف کے اہم معاصروں میں شاد عظیم آبادی، وحشت کلکتوی، آرزو لکھنوی، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

موصوف آج سے ۷۲ سال پہلے کاروباری سلسلے میں اپنے والد محترم کے ساتھ عظیم آباد سے کلکتہ تشریف لائے اور جب سے کلکتہ میں آپ کا وطن ثانی بن گیا۔ جس زمانہ میں آپ نے شاعری شروع کی وہ زمانہ شاد عظیم آبادی کے دلکش نغموں سے تعبیر ہوا تھا۔ شاد نے بہار کو بھی اودھ اور دہلی کے مقابلے لا کھڑا کیا۔ دہلی اور لکھنؤ کے بعد عظیم آباد کو شاعری کا تیسرا دبستان کہا جاسکتا ہے۔ جس طرح علامہ سیماب نے دبستان اکبر آباد کی بنیاد رکھی اسی طرح شاد عظیم آبادی نے بہار اسکول کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔

عظیم آباد کے قیام کے زمانہ میں آپ کی شاعری ابتدائی مراحل میں تھی۔ لیکن کلکتہ میں مستقل قیام کے بعد مٹیا برج کے شاعرانہ ماحول نے اُن کے ذوق و شوق کی آبیاری کی۔ مٹیا برج لکھنؤ کی بربادی کے بعد خود لکھنؤ کا ایک محلہ معلوم ہوتا تھا۔

اس مختصر مجموعہ میں غزلیں، نظمیں، مسدس، نعت، منقبت و قطعات و رباعیات بھی شامل ہیں۔ ان کے غزلیہ اشعار میں احساس کی ندرت، شاعرانہ اور سماجی لب و لہجہ اور زبان و خیال کی تھرتھراتی ہوئی نغمگی شعر میں انفرادیت کی لہر پیدا کر دیتی ہے جو کچھ انھوں نے کہا وہ بے عیب ہے، مکمل ہے،

انداز بیان میں مذہبی فکر و فلسفہ کی متحرک کیفیت برجستہ نظر آتی ہے جس سے کلام میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی ہے۔ جہاں تک شعریت کا سوال ہے وہ مذہبیانہ فکر و خیال کے زیر اثر زخم خوردہ ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن کے کلام میں مخصوص محاسن شعری کا فقدان ہے۔ بعض شعروں میں انھوں نے اپنے مذاق سخن کے توسط سے گھلاوٹ، خود گداختگی کی کیفیت پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ بقول فراق گورکھپوری۔

شاعری کی روح جو کچھ بھی ہو یا بہت کچھ بھی ہو شاعری ایک فن یا آرٹ ہے، آرٹ کے معنی میں کسی چیز کو بنانا یا کچھ کرنا فن کے لحاظ سے شاعر کا کارنامہ بھلایا ہی نہیں جاسکتا "

عکس دلدار کا سراپا ہوں — پردہ ہو کر بھی روح جلوہ ہوں
احترام حیات کیا معنی — اتنا احساس ہے کہ زندہ ہوں
مجبور اختیار ہوں لیکن — اپنی بیچارگی پہ ہنستا ہوں
ابھی بے چارگی کا ہوش کہاں — محو آرائش تمنا ہوں
حل شدہ ہیں مسائل ہستی — پھر بھی ہر گام پر الجھتا ہوں
مختصر یہ ہے عرض حال بقا — کوئی قیمت نہیں کہ یکتا ہوں

یہ اسلوب بیان ایک ایسی استادانہ شان رکھتا ہے جس میں سلامت اور ندرت احساس کا تیکھا پن، فکر کی سنجیدگی اور لہجہ کی انفرادی سطح اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے اس میں قاری کو مومن کی شوخی، غالب کی فکر، میر کی نشتریت

جیسی خصوصیتیں نظر نہ آئیں لیکن یہ اسلوب بیان سو فیصدی غزل کا موزوں ترین اسلوب ہے۔ غزل کے لئے جس اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ کم از کم فارسی الفاظ کی بڑھتیں اور مشکل تراکیب کا استعمال ہوا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ سب ٹھیٹھ اُردو کے سانچے میں ڈھلے ڈھلائے اشعار ہیں۔ جن میں بے تکلفی، خود گداختگی اور معنوی سحر کاری کا حُسن ایک نوری شعاؤں کی طرح مطلع سے مقطع تک جاری و ساری ہے۔ ردیف و قافیہ کے معنوی ربط نے اشعار کو نمایاں اور پر تاثیر انفرادیت بخش دی ہے۔ اسی طرح اُن کی دوسری غزلوں میں اخلاقی مضامین اور جذبہ کی گداختگی کا حُسن تلاش کیا جا سکتا ہے۔

شوقِ عشق جتنا غنیمت ہے — کچھ بھی ہو ابتدا غنیمت ہے
گر میسر نہیں ہے فکرِ بہشت — ذوقِ جرم و خطا غنیمت ہے
ڈھونڈنے والے ہر جگہ ڈھونڈیں — اُن کا اتنا پتہ غنیمت ہے
زندگی کی حلاوتوں کی قسم — موت کا ذائقہ غنیمت ہے
زندگی کا سبق بھلا لے لو — عشق کا مدرسہ غنیمت ہے

پہلا، دوسرا شعر بہت صاف اور سادہ کیفیات کا حامل ہے اس شعر میں جو روانی ہے یا جو اس میں معنوی سحر کاری چھپی ہوئی ہے وہی اُسے شعریت سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اسی طرح دوسرے شعروں میں فکر کی گہرائی زبان کی روانی و برجستگی شاعرانہ مذاق کی بلندی کا پتہ دے رہی ہے۔ اس غزل کا چوتھا شعر نہایت استادانہ فکر کا حامل ہے ویسے تو شعر بہت سادہ اور صاف ہے لیکن معنوی پہلو پر غور کریں تو ایک دنیا آباد نظر آتی ہے موت و زندگی کا فلسفہ اپنی تمام کیفیتوں کے ساتھ مطلع شہود پر طلوع ہوا ہے جو اپنے جز دی اور اصالت کا نور چھپائے ہوئے ہیں غور و فکر کی جانب متوجہ کر رہا ہے۔

جس قدر کہ مرے حال پر ملتفت ان کی چشم عنایات ہوتی گئی
رنج بڑھتے گئے، درد بڑھتا گیا، زندگی نذر حالات ہوتی گئی
لاکھ پردوں میں جلوے نہ اُن کے چھپے آنکھوں آنکھوں ہی میں بات ہوتی گئی
گو وہ انجان بنکر ملے بارہا پھر بھی گہری ملاقات ہوتی گئی
وائے ناکامی حسرت و آرزو، وائے گمنامی منزلِ جستجو
جس قدر کی تمنائے نورِ سحر اور تاریک تر رات ہوتی گئی
وائے تہذیبِ نو کا ستم بالقا جتنی حاصل ہوئی منزلِ ارتقاء
جتنا اور اک علمی نمایاں ہوا روحِ انساں جمادات ہوتی گئی

غزل میں ردیف کا التزام توجہ کا مستحق ہے "ہوتی گئی" جیسی دشوار اور مشکل ردیف میں حالات، رات، جمادات وغیرہ قافیہ کا جس خوبصورتی اور بے تکلفی سے ربط لفظی و معنوی پیدا کیا گیا ہے وہ استادانہ ذوق فکر کا مبیّن ثبوت ہے۔ غور و فکر کے حامل ان شعروں میں فن کو بے تکلفی، بیان کی ندرت اور ذوق کی تمثیل دار آئینہ بندی شعور و ادراک کو رمزیت و اشاریت سے۔

ہم کنار کر دیتی ہے۔

کیوں خرد کا شکار ہیں ہم لوگ
اتنے بے اختیار ہیں ہم لوگ

صرف ماضی ہے زیست کا توشہ
ارتقاء کا حصار ہیں ہم لوگ

زندہ درگور ہیں مگر پھر بھی
زیست کے خواستگار ہیں ہم لوگ

خود فریبی ہے مدعائے حیات
کودکِ شیر خوار ہیں ہم لوگ

رکھ کے نادانیوں کا دانش نام
عاقلوں میں شمار ہیں ہم لوگ

آدمیت کا ربط کب ہے بقا
صرف مطلب کے یار ہیں ہم لوگ

غزل میں ردیف و قافیہ کے میل سے ایک ایسی فضا تعمیر ہوتی ہے جو حد درجہ بلیغ اور وسیع کیفیات سے دوچار ہو کر جذبات اور تخیل کی ایک ایسی دنیا بسا دیتے ہیں جہاں صفائی اور روانی اور بول چال کی چاشنی اشعار میں حسن تاثیر اور جذبہ کی فراوانی، غزل کی لطیف ترین مزاجی کیفیت کو بھرپور ہمہ گیری عطا کر دیتی ہے۔ اسی کے ساتھ ہی ساتھ موزوں اور دلکش تراکیب نے اشعار میں برجستگی اور معنویت پیدا کر دی ہے مثلاً زیست کا توشہ، ارتقاء کا حصار، کودکِ شیر خوار اس کی واضح مثالیں ہیں۔

تندیٔ موجِ حوادث کا نشانہ ہیں سب　　کون اس دہر میں آسودۂ ساحل ٹھہرا
مراذوقِ اسیری دیکھئے کیا رنگ لاتا ہے　　کبھی پرواز کی تصویر ہے دیوانہ زنداں پر
حالات سے ہم برسرِ پیکار رہیں گے　　انساں ہیں محبت کے خریدار رہیں گے
آنے لگا ہے دل کو مزا رسم و راہ کا　　اب غم نہ کیجئے مرے حالِ تباہ کا
ذرا عشرت کدوں سے آ کے باہر دیکھتا کوئی　　بظاہر کتنے دل آباد ویرانوں میں شامل ہیں
مدتوں شوقِ گرفتاری نے تڑپایا بہت　　مدتوں ہم حسرتِ زنجیر سے بہلا کئے
ہاں وہ حالاتِ زمانہ کو بدل سکتے ہیں　　گر کے جو راہِ حوادث میں سنبھل سکتے ہیں
میکدہ بردوش ہے ہستی ہماری زاہدو　　ساقیٔ کوثر کے ساغر سے ہوئے مخمور ہم
ابھی کہاں جاگی روحِ غافل ابھی کہاں طے ہوئی ہے منزل　　ابھی تو آغاز و ابتدا ہے قلندری کو نہ کھیل سمجھو
خسروی و اسکندری پا لو بس ہے　　عاشقی کے تاجداروں کی قسم
عشقِ احمد کے وسیلے سے بہشت　　ذاتِ باری کی تمنا کیجئے

ناولٹ

پیار کا بندھن ٹوٹے نا!

عطیہ پروین

(چھٹی قسط)

(۱۶)

چچی کا دماغ نت نئی اسکیمیں بنا رہا تھا۔

پہلے تو انہوں نے نیک کام یہ کیا کہ ساری مہمان عورتوں کے مجمع میں دیبا کے کردار پر بڑے مہذب انداز میں کیچڑ اچھالی۔ خوب ہی اچھالی۔

"میرا ایک اکلوتا لڑکا ہاتھ سے نکل گیا بی۔۔۔ میرے دل میں آگ نہ لگے۔ جان چھڑکنے والی بہن کو گھر سے نکلوا دیا میری جوتی آنکھوں سے لگاتا تھا اب جوتی لے کر کھڑا ہو جاتا ہے۔۔۔"

وہ دھاروں دھار رو رہی تھیں۔ عورتیں منہ کو کھولے سن رہی تھیں۔

"ہائے یہ لچھن۔۔۔"

"یہ صورت یہ گن۔۔۔"

"وہی مثل ہے بہن بھولی بھالی صورت والے ہوتے ہیں جلاد بھی۔۔۔"

"کون جانے گلزار سے بھی تعلقات پاکیزہ ہوں"

"ہاں اور کیا۔۔۔ ایسی آوارہ کا کیا ٹھیک"

"توبہ! میں سمجھتی تھی فرشتہ ہے"

"اے بیوہ کی کھلاڑی بالی لڑکیوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا غلط ہے۔ خربوزے کو دیکھ کے خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اللہ بچائے"

"جوانی دیوانی اسی کو کہتے ہیں۔۔۔"

دیبا غریب سے فرشتے بھی نہ جانتے تھے فضا کیسی بدل گئی ہے۔ پلٹ کر آئی تو ہر چہرہ سخت تھا، ہر آنکھ میں بے رخی تھی، ہر لب پر طنزیہ مسکراہٹ تھی، ہر سمت سے سرگوشیوں کے تیر چل رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا! ایک سوال بہت تیزی سے اس کے دماغ میں گردش کرنے لگا۔ جن لڑکیوں کے ساتھ وہ ہر وقت رہتی تھی اب ایک دم سے کھنچ گئی تھیں یا ماؤں کی طرف سے کھینچ لی گئی تھیں۔ چچی کو دیکھا تو قاتل مسکراہٹ کھیلتی نظر آئی۔ ماتھا ٹھنکا ہو نہ ہو، چچی نے گل کھلایا ہے۔ خالہ جان ایک سمجھدار عورت! فوراً ہوا کا رخ پہچان گئیں۔ ابھی فضا ہموار کرنے کا موقعہ نہیں تھا۔ دیبا کو تسلی دے کر وہ سہرا اتارنے کے انتظامات میں لگ گئیں۔ دیبا کو بھی اپنے ساتھ مصروف کر لیا۔

"چلو گلزار میاں! اپنی دلہن کو اتارو" رشتہ کی ایک بھاوج نے گلزار کو پکارا۔ وہ سہرا صافے پر لپیٹے۔ شب بیداری سے سرخ آنکھیں، مسرت سے دمکتا چہرہ لیے چھوٹے میاں سے راز داریوں میں مشغول تھے۔ چونک کر بولے۔

"جی! یعنی کس طرح اتاروں؟"

"گود میں لے کر۔ بھاوج نے شرارت سے کہا، یہی رواج ہے"

"بے غیرت آپ ہی لوگ بن جاتی ہیں پھر کہتی ہیں میاں بیوی بڑے بے شرم ہیں!"

وہ کسی طرح گود میں اٹھانے پر راضی نہ ہوئے۔ دیبا کو للکارا۔

"دیبو! چلو اس گٹھری کو سنبھالو، جیسے بڑے چاؤ سے بیاہ کر لائی ہو"

"یہ دونوں گٹھریاں تم میرے حوالے کردو" چھوٹے میاں نے ان کو لوکر دیا دونوں ہنس پڑے اور دلچسپی سے دیبا کو دیکھنے لگے۔

وہ خود ہلکی پھلکی تھی لیکن دلہن اس سے بھی نازک نکلی غرارے کے پائنچے کھونس کر یا علی مدد کہتے ہوئے اس نے شرماتی لجاتی گٹھری بنی دلہن کو گود میں اٹھالیا۔ اونچے پائنچوں سے اس کی [illegible]صیا پنڈلیاں بجلی کی طرح لائٹ مار رہی تھیں۔ ٹخنوں پہ نازک سی پائل چھنک رہی تھی۔ چھوٹے میاں کا دل اس چھن چھن کی تال پہ ناچنے لگا۔

پردے کی وجہ سے وہ اندر تو نہ جاسکے لیکن باہر ہی کھڑے کھڑے دیبا کی مترنم آواز اور کھنکتے قہقہوں سے لطف اٹھاتے رہے۔

"دیبا کے انتظار میں کھڑے ہوں گے بے چارے...."

"چھی چھی۔ کس رنڈی کا نام لے رہی ہو......" دو لڑکیاں کہتی ہوئی ان کے پاس سے نکل چلی گئیں ـــ

چھوٹے میاں کے کانوں میں کھولتے ہوئے تیل کی دھاریں اتر گئیں۔

دیبا تو پھول بن گئی یہاں!
چاندنی بن کر چھائی ہوئی تھی!
یہ کایا پلٹ کیسے ہوگئی۔
یہ زہر کس نے چھڑک دیا۔
وہ ہنسی بھول کر بے چینی سے ہاتھ ملنے لگے۔
آہ اماں! آخر آپ نے دیبا پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے لئے کمر پھر باندھ لی۔!

"مگر یار! ہے بڑی خوبصورت...... خاص طور پر اس کا جسم...... آج کا نکھار دیکھا تھا؟ کون کہہ سکتا ہے یہ کلی پھول بن چکی ہے...."

"اتنی خوبصورت اور پھر اتنی جوان، ناممکن جو بیوگی کا زمانہ رو رو کر گزارے اس کی بچی ٹھیک کہتی ہوگی، اس کا لڑکا تو پھسلا ہی اس شیشہ کی مورت پر یار میرا دل خود بغاوت پر آمادہ ہے......"

دو نوجوان نہیں نوجوانی سے قریب لڑکے جن کی حال ہی میں مسیں بھیگنی شروع ہوئی ہوں گی کھڑے آپس میں یہ گفتگو کر رہے تھے۔

چھوٹے میاں کو سمجھتے دیر نہ لگی کس کے متعلق باتیں کی جارہی ہیں۔ غصہ سے ان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ لڑکے ان کو دیکھ کر ایک دوسرے کو اشارے کرتے۔ ڈھٹائی سے ہنستے وہاں سے کھسک گئے۔

گئی رات تک ہنگامہ رہا۔

ریتیں رسمیں، گانا بجانا، قہقہے باتیں، بھاگ دوڑ پھر کھانے کا اُدھم۔ دیبا، اپنا آپ بھول گئی۔ کچھ دیر کے لئے وہ سرگوشیاں اور طنز کے نشتر بھی تھم گئے تھے۔ اتنی ساری دلچسپیاں تھیں کہ سب ہی مصروف ہوگئی تھیں۔

دیبا بار بار دلہن کے پاس جاتی۔ اس نے ساری رسمیں ہو چکنے کے بعد دلہن کو اس کے کمرے میں لے جاکر آرام سے لٹا دیا تھا۔ یہ حجلۂ عروسی اپنے بھائی اور بھاوج کے لئے اس نے دن بھر کی محنت اور لگن کے بعد سنوارا تھا۔ دلہن اس کی آہٹ محسوس کر کے آنکھیں بند کرلیتی تو دیبا اس کو گدگدانے لگتی۔ جھک جھک کر کان میں میٹھی میٹھی شریر سرگوشیاں کرتی۔ دلہن اور سمٹ جاتی۔

گلابی گلابی رنگت والی ننھے سے قد اور سڈول جسم کی یہ لڑکی دیبا کو بے حد پسند آئی تھی۔

"میرا بھیا بڑی قسمت والا ہے اتنی پیاری بہو لے آیا"

وہ بار بار کبھی دلہن کے ساتھ میں آتی ہوئی عورت ہنس کر کہتی۔

"تم بھی کم پیاری نہیں ہو۔ بھیّا سچ مچ بڑی قسمت والا ہے"

دلہن کا کھانا وہ بڑے اہتمام سے لائی تھی۔ قسمیں دے دیکر اپنے ہاتھ سے نوالے کھلائے، منہ دھلایا پھر بڑے چاؤ سے اس کا سنگھار کیا۔

"بارات کی رات ایسا سنگھار نہیں کیا جاتا ہے شہانی دلہن کو دولھا دیکھتا ہے" ۔۔۔ کسی نے اعتراض کیا۔

وہ چیخ کر بولی۔

"جی ہاں! شہانی دلہن یا چڑیل دلہن۔ اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہے۔ پھر یہ بال ایسے بنے ہیں کہ بھلی صورت تھالی بن کر رہ گئی ہے۔ دولہا پہلی بار منہ دیکھے گا اور پہلا تاثر ہی غلط ہوا تو زندگی بھر یہی قائم رہے گا۔

"کرنے دو من مانی! بے چاری اپنی حسرت پوری کر رہی ہے" کسی دوسری آواز نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ حسب معمول مسکرا دی۔ اس نے تو اس سے بڑے اور جاں لیوا نشتر سہے تھے۔

جی بھر کر دلہن کا سنگھار کرنے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر دیکھا۔

"ہائے! بے ہوش نہ ہو جائیں میرے بھیّا" اس نے جھٹ سے دلہن کی پیشانی چوم لی۔ پیشانی کی افشاں اس کے لبوں پر سمٹ آئی۔ دلہن بیر بہوٹی بن گئی۔

"اگر اللہ نہ کرے بھیّا رعب حسن کے سبب بے ہوش ہو جائیں تو لخلخہ کی جگہ یہ معطر زلفیں سنگھا دینا بھابھی پیاری!"

اس نے خوب ہی چھیڑا۔

اور جب باہر نکلی تو چچی اپنے گنبد نما پیٹ پر غرارے کا نیفہ چڑھاتی اندر داخل ہوتیں۔ دیکھنے ان کو نہیں دیکھا تھا۔ دو چار انگڑائیاں توڑ کر وہ گلزار کا حال دیکھنے کے لئے ڈیوڑھی میں جا گھسی۔ ابھی اس نے باہری کمرے کے دروازے کی جھری سے آنکھ لگائی تھی کہ دو بازوؤں نے اس کو پشت کی طرف سے گرفت میں لے لیا۔

"ہائے۔۔۔۔۔" اس کے لبوں کی چیخ گھٹ گئی۔ چپ چپ کہتے ہوئے کسی نے اس کے گرم گرم کپکپاتے لبوں پر اپنے سرد لب رکھ دیئے ۔۔۔ وہ تڑپی مچلی مگر پھر ساکت ہو گئی۔

ہلکی سی روشنی میں اس نے اس وجود کو پہچان لیا تھا جو اس کے دل و دماغ اور زندگی پر چھا کر رہ گیا تھا۔

"دیبو! میری زندگی!" وہ لب کانپے کئی بار اس کے لبوں سے ملے۔

"بس!" اس نے ایک جھکولا لیا اور مچھلی کی طرح پھسل کر ان کے بازوؤں سے نکل گئی۔

ڈیوڑھی کی اس آنکھ مچولی سے بے خبر چچی دلہن کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی دیبا کی من گھڑت دلچسپ کہانی میں زبردستی کے آنسوؤں کی روانی بھر رہی تھیں۔

---

(۱۷)

بڑے ارمانوں سے گلزار نے دلہن کا گھونگھٹ اٹھا۔ دیبا ان کا اشتیاق اس حد تک بڑھا دیا تھا کہ انتظار کی یہ گھڑیاں ان کے لئے صدیاں بن گئی تھیں۔ جانے کتنے رومانی جملے انھوں نے اپنی زبان پر محفوظ کر لیے تھے۔ دلہن کی آنکھیں کھلوانے کے لیے کیا کیا جتن کرنا پڑیں گے۔ یوں چھیڑ چھاڑ۔ یوں گدگدی۔ وہ اس ساعت کے لئے بے قرار ہو اُٹھے تھے۔

لمبے گھونگھٹ کے اندر سے دلہن کا چاند سا چہرہ چمکا تو ان کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں اور یہ چکا چوند دور ہوئی تو حیرت سے پھٹ کر رہ گئیں۔

دلہن کی خوبصورت آنکھیں نہ صرف کھلی تھیں، ان میں غصہ

"اور شک کی آگ دہک رہی تھی۔ نرم و نازک چہرہ تنا ہوا تھا۔ پتلے پتلے لب سختی سے بھنچے تھے۔

گلزار کے ہاتھ بے جان سے ہو کر گود میں آ گرے۔ انھوں نے تھوک نگل کر پوچھا۔

"طبیعت ٹھیک ہے نا آپ کی ؟"

"جی ہاں ! ابھی تک تو ٹھیک رہتی تھی اب اللہ جانے ! ٹی بی سے کم تو کوئی مرض ہوگا نہیں !" ایک بجلی چمکی اور گلزار کے حواسوں پر آ گری۔

"آپ کی تو بڑی تعریف سنی تھی"

"جی نہیں ! میں بہت بُری ہوں آپ سے غلط کہا گیا تھا۔ مجھے حیرت ہے آپ کو اپنی ظاہری منھ بولی بہن سے فرصت کیسے مل گئی۔ آج تو وہ قیامت نظر آ رہی ہیں"

"یٰسین ...... میری عقل حیران ہے کہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں !"

"ایکٹنگ بلاشبہ آپ ٹاپ کی کرتے ہیں لیکن حقیقت چھپانے سے چھپ نہیں سکے گی ...... میں پوچھتی ہوں جب آپ کی محبوبہ موجود تھی تب ایک لڑکی کی زندگی سے کھیلنے کی کیا ضرورت تھی ......"

"کیسی محبوبہ ! کون محبوبہ ؟" گلزار کو غصہ آنے لگا۔ خدا کی پناہ یہ چند گھنٹوں کی دلہن اور زبان پر مرچوں کی ڈھیری !

"وہی ! جو آپ کی طرح ایکٹنگ میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔" دلہن تیکھے لہجے تیکھی چتون کے ساتھ بولی۔ معاذ اللہ کیسا میرے کمن چھیڑ رہی تھیں"

"دربا کو کہہ رہی ہو ......" گلزار کا لہجہ دکھ سے بھرا تھا۔

"کسی بیوہ اور دل جلی کو تو میں نے ایسا بنا سنورا اور شہانہ جوڑا پہنے نہیں دیکھا اس کا مطلب یہ ہوا وہ ظاہر [illegible]

کے لئے میرے وجود کی آڑ کرائی کی گئی ہے۔ میں پوچھتی ہوں اور کوئی سہاگن گھر میں نہیں تھی کیا جو مجھکو ڈولے سے ایک رانڈ کی گود میں اس کے منحوس آنچل کے تلے اتار لیا ؟"

"تم تعلیم یافتہ ہو ...... کیا نام تمہارا ...... یاسمین !" (کچھ دیر پہلے اس نام کو سن کر غنچے سے چٹکنے لگے تھے)

"میرا نام بھی فراموش کر دیں گے آپ ! خوب ! کل میرا وجود بھی نہ یاد رہے گا۔ دیبا کے ساتھ دادِ عیش دیں گے اور میں ......"

"چپ رہو !" گلزار دبی آواز میں گرجے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا اس فتنہ نما لڑکی کا گلا داب دیں - !

اُف ! اس پاک رشتہ پر کتنا گھناؤنا الزام تھا۔ اس بدنصیب لڑکی کی عصمت پر کتنی بے دردی سے غلاظت اچھالی جا رہی تھی !

"جی نہیں ! میں چپ رہنے والی آسامی نہیں ہوں مجھے دبنا نہیں دبانا بھی آتا ہے۔ آپ نے میری زندگی کو مذاق بنایا ہے میں آپ دونوں کی زندگی کو جہنم بنا دوں گی ...... سمجھے آپ !" وہ آپے سے باہر ہوئی جا رہی تھی ہاتھوں میں پہنے پھولوں کے کنگن نوچ نوچ کر پھینک رہی تھیں یوں جیسے کسی کی بوٹیاں نوچ رہی ہو

گلزار کا خون کھول رہا تھا لیکن مصلحت اسی میں تھی کہ ضبط سے کام لیں۔ دنیا کے سامنے ننگا ناچ انکو منظور نہیں تھا۔ بمشکل نرم آواز بنا کر بولے۔

"تمہیں کسی نے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے یاسمین۔ خدا کی قسم یہ الزام محض الزام ہے۔ بے بنیاد۔ حقیقت سے دور۔ دیبا بڑی دکھ زدہ لڑکی ہے، اس کو اب اور دکھ نہ دو، میں نے اس کو پناہ دی ہے میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا ہے، بہن کہا ہے اس کو اور یہ مقدس رشتہ اٹوٹ ہے ......"

"دنیا الزام لگا سکتی ہے جھوٹ بول سکتی ہے لیکن ایک ماں جھوٹ نہیں بول سکتی ......"

"تم سے یہ سب ممی نے کہا ہے؟" گلزار دل پر ہاتھ رکھ کر کراہے۔
"آپ کی ممی اس بات کو چھپائیں گی کہ بتائیں گی۔ مجھ سے تو بے چاری
غمزدہ چھوٹے میاں کی ماں نے سب حال بتایا ہے"
"چھوٹے میاں کی ماں..... یعنی خالہ جان اف خالہ جان!
آپ انسان نہیں ہیں"
"جی ہاں! انسان آپ لوگ ہیں اور سب جانور ہیں، جانوروں کے
پاس یہ جنس زبان نہیں ہوتی ہیں اس لیے انسانوں سے وہ بہتر
ہوتے ہیں ..."
"تم کیا جانو یاسمین ... تم کیا جانو... ."
"میرا اور نہ جاننا ہی بہتر ہے۔ اللہ کی پناہ! ان بے چاری
کا اکلوتا لڑکا چھینا اب آپ پر ہاتھ صاف کر رہی ہے ..
خدا کی قسم میں..... ..."
"بس! اب میں کچھ نہیں سننا چاہتا" وہ تیزی سے اُٹھ کر
دروازے کی طرف چلے۔
"سہاگ رات کسی دوسرے کمرے میں منائی جائے گی..."
ایک تیر آیا اور ان کی سماعت میں پیوست ہو گیا۔
"تم سے سر مارنا فضول ہے۔ وقت تمہیں خود بتا دے گا..."
وہ اتنی پھرتی سے باہر نکلے جیسے پیچھے کوئی بھوت لگا ہو ساتھ
ہی اتنی ہی تیزی سے ایک انسانی وجود سے ٹکر بھی ہوئی۔!
"کون؟"
"عقبا! ..." ایک سسکی ابھری۔ وہ آواز اونچی ہونے کے
خوف سے منہ بھینچ کر رو رہی تھی۔
"دیبا ..... میری بہن ....."
"میں ... میں..... وہ سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش
کرتی ہوئی بولی۔ میں..... آپ کے لیے دودھ لائی تھی بھیا۔
میں نے کلام ضرور کیا ایسی ویسی کی باتیں....."
"ہوں..... تو تم ... یہ کی جدائی بھی گوارا نہیں ہے لیجیے
پھر اس پر پڑھا دو۔ یہ کوئی پہنچا دیجئے گا جس سے ...
کی ... یہ ... آ ... پر ..."

پیش کرنے کے لئے بڑے حوصلے کے ساتھ گلزار ہیرے کی انگوٹھی
لائے تھے۔
دیبا کے منہ سے ایک چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس نے آنچل منہ میں
ٹھونس لیا۔
گلزار اس کا ہاتھ پکڑنا ہی چاہا تھا کہ خفیف جھنکار کے ساتھ
ایک جگمگاتی شئے پھر ان کے درمیان آگری۔ یہ جھومر تھا۔
"نہیں بھابھی نہیں! یہ بدشگونی ہے" دیبا بلبلائی۔
"اپنا سہاگ میں نے تم کو سونپ دیا" یاسمین عورت نہیں
دلہن نہیں خونخوار شیرنی لگ رہی تھی۔ اب نکلی باہر اور
پھاڑ کھایا۔!
گلزار ساکت کھڑے تھے۔
گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ سب سو رہے تھے تو کیا ہوا۔ دیواروں
کے بھی کان ہوتے ہیں۔ یاسمین کا جنون بڑھتا ہی جا رہا تھا۔
دیبا نے بےبسی سے کبھی ان کو کبھی یاسمین کو اور کبھی جھنا جھن گرتے
ہوئے زیورات کو دیکھ رہی تھی۔
"یہ لو... یہ ہے میرا سہاگ، لوٹ لو ..... چھن، ٹیکہ گرا، یہ
لو، چھناک، گلوبند گرا، یہ لو، چھن چھن چھن، پائل گری۔ یہ
لو......"
"یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ سب کیا ہے گلزار؟ دیبا؟"
خالہ جان حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔
یاسمین نے ایک دم رونا شروع کر دیا۔ گلزار نے لہو اگلتی
نظروں سے ماں کو دیکھا۔
"ہو بے منہ کی ملی ہے ممی آپ کو کہتی تھیں نا آپ کہ خاندان
کا نام اونچا کر دے گی گھر میں اجالا پھیلا دے گی، پھیل رہا
ہے اجالا، اونچا ہو رہا ہے خاندان کا نام....."
"یہ سب ہے کیا آخر گلزار؟ میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا،
ہائے یہ سب ہے کیا؟......" خالہ جان لڑکھڑا کر دیوار
سے ٹک گئیں۔
"یہ سب کیا دھرا آپ ہی کا ہے محترمہ! گھر میں بیٹے کی

داشتہ رکھتے ہوئے' پیسے کی لالچ میں ایک لڑکی کی زندگی خراب کردی' . . . . "

" ایک رات کی دلہن . . . " خالہ جان آگے پیچھے جھولتی ہوئی کراہیں۔

" ایک رات کی دلہن نہیں' ایک رات کی بیوہ . . . . "

" ذلیل عورت' دفع ہو جا یہاں سے . . . . " گلزار کمرے کے اندر چیخے۔

" نہیں گلزار نہیں! تمھیں میرے خون کا واسطہ . . . . " خالہ جان اتنا کہہ کر سنگلاخ فرش پر گریں اور بکھر کر رہ گئیں۔

ہائے! ہائے! جس گھر کی تباہ کر کے رکھ دیا ' چچی نمودار ہوئیں اور سر پیٹنے لگیں۔!

---

(۱۸)

زمین سخت تھی' آسمان دور تھا!

سوائے خودکشی کے اب کوئی چارہ نہیں تھا۔

زندگی کی تلخی اب زہر بن گئی تھی۔

وہ چپ چاپ' اندھیری سڑک پر بڑھتی چلی جارہی تھی۔ کسی نامعلوم منزل کی طرف!

ہر چاپ پر اس کا دل دھڑک اٹھتا۔ ہر روشن جگہ پر وہ سمٹ جاتی اپنے ہی سائے سے بھڑکتی وہ چلی جارہی تھی۔

کاش کوئی نالہ مل جائے' کوئی کنواں نظر آجائے' کوئی موٹر کوئی ٹرک' کوئی بھی ایسی چیز جو اس کو زندگی کے جنجال سے نجات دلا دے۔

لیکن' اتنی دیر گزرنے اور اتنی دور چلنے کے بعد بھی زندگی اس کے دامن سے لپٹی رہی۔ وہ موت کے پیچھے بھاگ رہی تھی زندگی اس کے تعاقب میں تھی۔

دور سے کسی کا [illegible] سنائی دی پھر بھاری بوٹوں کے دھماکے۔ وہ لرز اٹھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا مکانات کا سلسلہ دور تک گیا تھا۔ دھماکے اس کے قریب آرہے تھے۔

بگولے کی طرح اڑ کر وہ نزدیک کی کوٹھی کے سلاخوں دار پھاٹک سے چپک کر کھڑی ہوگئی۔ اب یہ اس کی قسمت تھی یا اتفاق' پھاٹک صرف بھڑا ہوا تھا' اندر کمروں کی بجلیاں بھی جل رہی تھیں۔ مدھم باتوں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ مطلب یہ تھا گھر کے مکین نئی صبح کے استقبال کے لئے جاگ اٹھے تھے۔ غیر ارادی طور پر اس نے پھاٹک کھولا اور اندر چلی گئی۔ دھماکے دور ہوتے چلے گئے۔

اطمینان کی ایک سانس لے کر وہ زمین پر پھاٹک سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ چلتے چلتے پاؤں تھک گئے تھے گردن لکڑی کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔۔۔ سلاخوں سے ٹیک لگا کر اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں موندلیں۔ جانے کتنے بیتے ہوئے مناظر بند آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔

کوئی نہیں!

کوئی اپنا نہیں!

جس در پر گئی ذلیل ہو کر نکلی!

یہ در بھی تو کسی اجنبی کا تھا۔ اب تک اپنے کہے جانے والوں نے جو کچھ دیئے تھے اب کسی غیر کے ہاتھوں خوار ہو گی دیپا! اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ اٹھنا چاہا اٹھا نہ جاسکا۔ تکان نے جسم کی رگ رگ میں درد بھر دیا تھا۔

" ارے یہ پھاٹک کیسے کھلا ہے۔ رامو! او رامو . . . "

وہ چونک اٹھی۔ باہر سڑک کی روشنی کھلے ہوئے پھاٹک سے اندر آرہی تھی اور برآمدے سے اترتا ہوا کوئی ادھر بڑھ رہا تھا۔ بوکھلا کر وہ کھڑی ہوگئی۔

" کون ہے؟" ایک للکار سنائی دی۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ بھاگ بھی نہ سکی بت بنی کھڑی رہ گئی۔

وہ اب قریب آگیا تھا۔ صبح کاذب کے مدھم نور اور سڑک کی روشنی میں دیپا کی خوف زدہ آنکھوں نے ایک ادھیڑ عمر کے مرد کو دیکھا۔ دھوتی اور بنگالی کٹ کرتا ہاتھ میں مسواک ! [illegible]

"چوری کرنے آئی تھی، رامو، او رامو ....."

"نہیں نہیں! دیپا کے لبوں سے رندھی ہوئی آواز نکلی۔ مجھے غلط نہ سمجھئے..... میں..... میں .. تھک کر یہاں بیٹھ گئی تھی"

"تھک کر! اور اس وقت! اس نے سر سے پیر تک دیپا کو دیکھا کہاں سے آرہی ہو؟ کدھر جا رہی تھیں؟"

دیپا کے پاس الفاظ نہ تھے آنسو تھے۔ سسکیاں تھیں۔

مدھم اجالا بھرپور روشنی میں بدلتا جا رہا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے دیپا کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔

"یہ کپڑے اور زیور..... مرد بڑبڑایا۔ تم پر کون مصیبت پڑی لڑکی جو تم شادی کی رات بھاگ آئیں؟"

"شادی کی رات۔ دیپا نے غور کیا۔ وہ سچ ہی تو سمجھا تھا۔ یہ شہانہ جوڑا یہ بیش قیمت زیورات! میرے بھائی کی شادی تھی ......"

"اچھا۔ پھر؟"

"پھر ... (اب کیا کہوں) پھر... !" اس کے آنسو پھر بہنے لگے۔

"رادھا کے باپو..... وہاں کیا کر رہے ہو؟" برآمدے کی طرف سے ایک تیز آواز سنائی دی۔

"یہاں تو آنا رادھا کی ماں! یہ ایک لڑکی جانے کہاں سے آگئی ہے"

"لڑکی!" وہ عورت تیزی سے بھری آنکھیں اس کے سراپا پر گاڑی تھیں۔ آنسو پونچھ کر اس نے کہا۔

"معاف کیجئے گا مجھے اور یقین کیجئے کہ میں کسی برے ارادے سے آپ کے گھر میں نہیں گھسی تھی۔ کانسٹبل کے ڈر سے اندر آگئی تھی۔"

دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"خدا کے لئے مجھے کوئی ایسی ویسی عورت نہ سمجھ لیجئے گا..."

رکھ کر نرمی سے بولی۔

"بیٹی تم کسی بھلے گھرانے کی بہو بیٹی معلوم ہوتی ہو، جانے کیا بپتا پڑی ہے تم پر، آؤ میرے ساتھ اندر چلو، ذرا دم لو پھر بتاؤ شاید ہم تمھارے کوئی کام آسکیں"

ہو بہو خالہ جان! وہی نرمی وہی وقار! فرق صرف اتنا تھا کہ خالہ جان سیندور نہیں بھرتی تھیں ماتھے پر بندی نہیں لگاتی تھیں اور ساڑھی کا پلو آگے کی طرف سے نہیں اوڑھتی تھیں

دیپا کا ہاتھ پکڑ کر وہ ایک کمرے میں لے آئی۔ بڑا شاندار ڈرائنگ روم تھا۔ صوفے گہرے کتھئی مخمل کے کشن اور کور سے ڈھکے تھے عورت اس کو بیٹھاتی ہوئی خود بھی بیٹھ گئی۔

"بالکل چنتا نہ کرو بیٹی۔ تم اپنوں ہی میں ہو"

"اپنوں میں! دیپا سسک کر بولی۔ اپنوں ہی نے ظلم توڑے ہیں ماں جی!"

"کہہ ڈالو بیٹی۔ من کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا"

(وہ جاننا چاہتی ہوگی کہیں دھوکہ تو نہیں کھا رہی ہے۔ بھولی بھالی صورت والے .)

دل پکا پھوڑا ہو رہا تھا، دماغ تپک رہا تھا، اس نے سب کچھ سنا ڈالا شروع سے آخر تک! اور جب اس نے آخری لفظ ختم کر کے نظر اٹھائی تو اس شفیق عورت کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"بچی! تو کتنی دکھی ہے۔ مجھے چھما کر دے میں نے تیرے لئے جانے کیا سوچ لیا تھا۔ وہ دیپا کا سر چھاتی سے لگا کر بولی۔

ہائے رے!

"تو، تم ہتیا کرنے نکلی تھی۔ یہ بھولی صورت اس طرح مٹی ہو جائے۔

نا بیٹی! جیون بھگوان کی دین ہوتا ہے اس کو جب وہ لے گا تب ..."

"ارے رادھا کی ماں...."

ارشاد امروہوی

پیار کے دیپ

اچانک آنکھوں کی روشنی چلے جانے پر رمیش جیسے زندگی کے گھپ اندھیروں میں گم ہو گیا تھا۔ اور آج اس کے ذہن میں خیالات کی پٹریاں تیزی سے بدل رہی تھیں۔ وہ امید و بیم کے اتھاہ سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ زندگی اچانک اتنا بھیانک رخ اختیار کر لے گی۔ آج بینائی ختم ہو جانے کے بعد کون اسے یقین دلا سکتا تھا کہ اب لتا اس کی اپنی بن سکے گی۔ اسے کبھی کے اپنے اور لتا کے جملے یاد آ رہے تھے۔ حسین ماضی قریب کے جھونکوں سے بلند ہوتی ہوئی یادیں اسے تڑپا رہی تھیں —— کبھی لتا [illegible] اپنے پیار بھرے جملوں پر اس کی کتنی ہمت افزائی کیا کرتی تھی۔ آج ان ہی یادوں کے نقوش اس کے دل و دماغ پر گہرے ہوتے جا رہے تھے —— وہ جب لتا سے کہتا —— لتا میں ایک شہرت یافتہ لیکھک ضرور ہوں لیکن دولت مند نہیں —— ہم کہانی کاروں کو شہرت ملتی ہے دولت نہیں۔ جس روشنی میں تم میری طرف بڑھی ہو وہ ایک دھندلی چاندنی ہے جس میں داخل ہو کر تم صاف اور چمکتی نظر نہ آؤ گی۔ ہم کہانیاں لکھنے والے حسین جگمگاتی دنیا کو پیش کرتے ہیں اس سے ہمارے وجود بہت دور ہوتے ہیں۔ تم ڈاکٹری کا آخری سال ختم کر کے اپنی آئندہ تعلیم کے لئے اپنے بھائی کے پاس امریکہ چلی جاؤ گی —— اور پھر اس کے بعد تمہاری شادی کسی انجینیر یا ڈاکٹر سے ہو جانا چاہئے تاکہ تم اس کی بڑھیا سی کار میں اس کے پہلو میں بیٹھ کر اپنے بلند مقام کا اعلان کر سکو، اپنے حسن کی شادابی اور نکھار کو قائم رکھ سکو —— لتا میرے پاس وہ سب کچھ نہیں جس کی موجودگی میں دنیا شخصیت کا طواف کرتی ہے۔ میں تم کو چند حسین جملوں کے علاوہ اور کیا دے سکتا ہوں —— " اور لتا نے اتنا سن کر اپنائیت بھرے لہجہ میں کہا تھا —

" نہیں رمیش تمہارے پاس وہ سب کچھ ہے جو دولت مند لوگوں کے پاس نہیں ہوتا۔ تمہارے دل میں سچا پریم ہے، سارے جہاں کا دکھ درد ہے۔ رمیش دولت ہی سب کچھ نہیں۔ دولت تو انسان کو یوں بھی محدود کر دیتی ہے۔ دولت کی دنیا بہت مختصر سی ہوتی ہے، اس کی خوشیاں محدود ہوتی ہیں، اس کے قہقہے کھوکھلے ہوتے ہیں۔ تمہاری دنیا تو بہت وسیع ہے۔ تم نہ جانے کتنے دلوں پر راج کرتے ہو۔ تم دلوں کے راجہ ہو رمیش —— پھر میں وہ سب کچھ سوچ کر تمہاری طرف نہیں بڑھی جس کے بارے میں تم سوچ رہے ہو۔ میری نظروں میں تمہاری بلند شخصیت ہے، کردار اور اونچے وچار ہیں۔ تم نہیں جانتے رمیش تم ایک جادو ہو تمہارے جملے دل کی ان گہرائیوں کو چھوتے ہیں جن کو ایک دولت مند انسان نہیں چھو سکتا۔ تم کیوں نہیں سوچتے کہ زندگی تو دلوں کا سودا ہوتی ہے۔ کیا تم اپنا وہ دن بھول گئے جب ایک تقریب میں تمہاری

تقریر کے بعد لڑکیاں رڑ کے ایک طوفان کی طرح تم سے تمہارے آٹوگراف لینے کے لئے بڑھے تھے۔ تم ان کی نگاہوں میں کتنے عظیم تھے، کیا وہ سب تم کو دولت مند دیکھ کر بڑھے تھے۔"

اور پھر لتا نے اتنا کچھ کہہ کر اپنی مرمریں باہیں ریش کے گلے میں حمائل کر دی تھیں ——— تو کیا آج بھی لتا وہی سب کچھ کہے گی، کیا اب بھی اس کے تاریک وجود کو اپنے میں سمالے گی، اپنے پرانے جملے یاد رکھے گی ——— کیا اس کے بھیجے ہوئے خطوط میرے لئے سہارے بن سکیں گے ——— میرے حسین جملے اب بھی اس کے دل کی گہرائیوں میں محفوظ ہوں گے۔

ریش اپنے کمرہ میں مسہری پر لیٹا ہوا خیالات کے بہاؤ میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ آج لتا امریکہ سے واپس آرہی ہے لیکن کس انقلاب کے ساتھ وہ اپنی جگہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کی اپنی دنیا تو تاریک ہو چکی تھی۔ آج وہ پیار بھری نظروں سے اپنی لتا کو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اچانک وہ کچھ دیر کے لئے اس خیال سے کھل اٹھا تھا کہ لتا امریکہ سے آنکھوں کے علاج کی خصوصی تربیت حاصل کر کے واپس آرہی ہے وہ آتے ہی اس کی زندگی میں پھر سے اجالا کر دے گی ——— تو کیا میں اسی عالم میں اس کو ہوائی اڈے پر لینے جاؤں ——— لیکن کہیں وہ مجھے اندھا دیکھ کر بھٹک نہ جائے ——— لوگ مجھ اندھے کو اس کی طرف بڑھتا دیکھ کر اس کا مذاق اڑائیں گے ——— اور اگر میں نہیں گیا تو ——— تو وہ مجھ سے ناراض بھی تو ہو جائے گی۔ مگر میں اسے پھر منا لوں گا ——— کہوں گا "لتا ان آنکھوں میں جھانک کر دیکھو وہ تمہارا ایک مہینے سے انتظار کر رہی ہیں، یہ کب سے تمہاری راہ تک رہی ہیں، تم کب سے ان میں سمائی ہوئی ہو۔ غور سے دیکھو آج بھی تم ہی صرف تم ہی ان میں چھپی ہوئی ہو ——— اور یہ دیکھو تمہارے ریش کو اس کتاب پر ایوارڈ ملا ہے ——— " ریش ابھی یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ اس کے کمرہ کا دروازہ کھلا اور لتا اس کو پکارتی ہوئی تیزی سے اس کی طرف بڑھی ——— ریش اپنی بند آنکھوں میں جس کو پہلے سے محفوظ کئے ہوئے لیٹا تھا ———

"ریش میں آگئی ——— مگر تم مجھے ایرپورٹ پر لینے کیوں نہیں پہونچے ——— جاؤ میں تم سے نہیں بولتی ——— " لتا نے جذباتی کیفیت میں کئی جملے ایک ساتھ کہہ ڈالے۔

"تو کیا تم مجھ سے سدا کے لئے روٹھ جاؤ گی لتا ——— میری روح، میری روشنی ——— " ریش یہ سب کچھ کہنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ بڑھ کر اپنی لتا کو اپنے سینے سے لگا لے لیکن جیسے اس کا دل بیٹھ سا گیا تھا، اور اس مسرتوں نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا ——— اس کو خاموش پا کر لتا اس کے پہلو میں بیٹھ گئی اور بڑے اپنائیت بھرے لہجہ میں بولی۔

"ریش کیا آنکھیں کھول کر اپنی شمع کو نہیں دیکھو گے جس کے اجالے میں تم اپنا قیمتی وقت گزارا کرتے تھے ——— کیا تم اتنے ہی دنوں میں اپنی لتا کو بھول گئے ——— " اس جملے نے ریش کو جواب دینے پر مجبور کر دیا۔

"کیوں نہیں دیکھوں گا ——— تم کب سے ان پلکوں کے پردوں میں محفوظ ہو ——— "

"تو پھر فوراً ان پردوں کے ہٹا کر مجھ کو میری تصویر دکھا دو ——— دیکھوں تو سہی تمہاری ان آنکھوں میں آج بھی میرا وہی روپ ہے کہ نہیں۔"

"بالکل وہی ——— تم بتاؤ مجھے دیکھ کر تم تو نہیں بدل جاؤ گی ——— " ریش کے کسی خوف نے سر بلند کیا۔

"تم کو اپنی لتا سے ایسی امید ہے ——— ؟"

"اپنی لتا سے تو نہیں البتہ بدلے ہوئے حالات اور وقت سے ایسی امید کر سکتا ہوں ——— اچھا لتا اگر میں بدل گیا ہوں تو ——— "

"تم کبھی نہیں بدل سکتے رمیش، تمہاری دنیا کبھی نہیں بدل سکتی، تمہارے یہ ہاتھ کبھی نہیں بدل سکتے۔ تمہارے یہ پیار کے دیپ کبھی نہیں بجھ سکتے جن کی روشنی پاکر میں سب کچھ بھول جاتی تھی۔" لتا کے مدت سے پیاسے جذبات کے حلقے دراز ہوتے جا رہے تھے۔

"نہیں لتا نہیں ـــ میرا بہت کچھ بدل گیا ہے، میری دنیا تاریک ہو چکی ہے۔ اب میری زندگی میں کوئی کرن اجالا نہیں کر سکتی۔ لتا اب میں تم کو نہیں دیکھ سکتا ـــ میں اندھا ہو گیا ہوں ـــ اب مجھے صرف ہلکا سا اجالا محسوس ہوتا ہے" اتنا کہہ کر رمیش نے آنکھیں کھول دیں۔ کھلی آنکھوں میں بالکل اندھیرا تھا۔

"رمیش ـــ یہ تم نے کیا کہہ دیا ـــ؟ لتا کی آنکھوں میں بھی جیسے گہرا اندھیرا چھا گیا ہو ـــ یہ تم نے کیا کر لیا ـــ؟

"میں نے نہیں لتا یہ سب کچھ میری قسمت نے کیا ہے ـــ کچھ عرصے پہلے بنگلہ دیش سے آشوب چشم کی وبا پھیلی تھی جس میں، میں بھی مبتلا ہوا۔ ابتدا میں ادھر ادھر کا علاج کیا لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا پھر میں تمہارے بتلائے ہوئے ڈاکٹر راکیش کے پاس پہونچا ـ ـ اور پتہ نہیں اس نے کونسی دوا میری آنکھوں میں ڈال کر میری روشنی جاتی رہی ـــ"

"تو کیا راکیش نے تم سے کوئی انتقام لیا ـ ـ ـ تم نے اسے دوبارہ جاکر نہیں دکھایا ـــ" لتا کے ذہن میں تیزی سے کچھ شکوک ابھرے۔

"گیا تھا لیکن وہ بنگلہ دیش کے پناہ گزینوں کی دیکھ بھال کے لئے جا چکا تھا ـــ مگر لتا اس نے مجھ سے انتقام کس بات کا لیا ـــ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو ـــ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا ـــ" رمیش کا ذہن قلابازیاں کھانے لگا تھا۔

"تم نے نہیں ہم دونوں کی محبت نے اس کا بہت کچھ بگاڑا ہے۔ وہ مجھے چاہتا تھا اور اسے پتہ لگ گیا تھا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔

معاف کرنا ـــ یہ گھات، یہ دھوکہ ـــ لیکن لتا اب میری زندگی کیا ہمیشہ اندھیری رہے گی۔ کیا تم جیسی کرن بھی میری زندگی میں اجالا نہیں کر سکتی ـــ" رمیش کے لہجہ میں التجا اور افسردگی کے ملے جلے تاثرات تھے۔

"دیکھو ـــ" لتا نے کس قدر تھکے سے لہجہ میں کہا ـــ جیسے خود اس کے ذہن پر بھی مایوسیاں مسلط ہو گئی ہوں ـــ رمیش کا تاریک مستقبل اس کو اپنے لئے ایک گہری کھائی نظر آنے لگا ہو ـ

"لتا تم نے بھی صرف "دیکھو" ہی کہا ـــ ٹھیک ہی کہا تم نے۔ حالات کی تاریکی اور عزت انسان کے چہرہ پر بہت بڑا کلنک ہوتی ہے۔ اب تم کیا سوچ کر میرا سہارا بنو گی ـــ تاریک حالات میں تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ بقول شاعر۔

کون ہوتا ہے برے وقت کی حالت کا شریک
مرتے دم آنکھوں کو دیکھا ہے کہ پھر جاتی ہیں

پھر یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ میں اندھا ہو گیا۔ اب کم از کم میں ان آنکھوں سے زمانے کی بے رحمیاں، دکھ درد اور مظالم تو نہیں دیکھ سکوں گا ـــ اور ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا تم کو فارن کی ڈگری مبارک ہو، تم ہمیشہ خوش رہو ـ ـ تمہارا یہ ایک لفظ ہی میرے لئے بہت کافی ہے ـــ" رمیش کے چہرہ کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔

"رمیش میں نے تم کو مایوس تو نہیں کیا ـــ پھر تمہاری ہی زبان میں جگمگاتے اندھیرے کس اچھے لگتے ہیں، سامنے کی حقیقتوں پر کون پردہ ڈال سکتا ہے؟"

"تم نے ٹھیک ہی کہا ـــ خدا تم کو اپنی جگمگاتی زندگی مبارک کرے۔ میں اپنی زندگی کی بھٹی میں سلگتے رہنے

پھر بھی تمہارے لئے دُعائیں کرتا رہوں گا ـــــ کیا بتاؤں میں اس وقت کھلی آنکھوں کے باوجود تمہاری کوئی خاطر نہیں کر سکتا ـــــ خیر اگر تم پسند کرو تو اپنی کامیابی کے سلسلہ میں یہ کچھ مٹھائی کھا کر اس ہار کو پہن لو ـــــ" رمیش نے اتنا کہہ کر اپنی داہنی جانب سے مٹھائی کا ایک ڈبہ اور ہار اُٹھایا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بولا۔

"کیا اس کو پہنانے کا آخری حق مجھ کو دے سکتی ہو ـ" اتنا کہتا ہوا رمیش اُٹھ بیٹھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں لٹکا ہوا ہار لتا کے گلے کا منتظر تھا۔ لتا نے کچھ سوچ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے رمیش کے دونوں ہاتھوں کو گرفت میں لے کر ہار پہن لیا۔

اور پھر رمیش کے چہرہ پر ایک عجیب سی شادابی پھیل رہی تھی۔ اس کی موجودہ مسکراہٹ، مخلوط جذبات کی مظہر تھی ـــــ

"بھگوان تمہاری آئندہ زندگی ان پھولوں کی طرح لہکتی رکھے۔ خدا تم کو ہر ہر قدم پر کامرانیاں اور رفعتیں عطا کرے ـــــ" رمیش دل سے دُعا دینے لگا۔

"بس ـــــ؟" لتا نے ایک عجیب سے لہجہ میں لفظ "بس" کہا ـــــ "کیا تم مجھے اپنی وہ کتاب نہیں دو گے جس پر تم کو ایوارڈ ملا ہے ـ"

"کیوں نہیں دوں گا ـــــ میرے پاس اور ہے ہی کیا تم کو دینے کے لئے ـــــ" رمیش نے اتنا کہہ کر اپنا ناول "یادوں کے زخم" لتا کی طرف بڑھایا۔

"یادوں کے زخم" لتا نے ناول کا نام لیتے ہوئے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"ہاں لتا شاید بھگوان نے یہ ناول مجھ سے آج ہی کے دن کے لئے لکھوایا تھا۔"

"رمیش چلو میں تم کو آنکھوں کے اسپتال میں داخل کرا دوں۔ بہت ممکن ہے وہاں پہنچ کر تمہاری روشنی واپس آجائے ـــــ"

"روشنی ... ؟ مگر اب کس کے لئے ـــــ اپنی ویران اور سپاٹ زندگی کو دیکھنے کے لئے، اپنی زندگی کے اس سوکھے درخت کو دیکھنے کے لئے ـــــ" رمیش نے اپنے اور لتا کے درمیان بلند ہونے والے فاصلہ کو ذہن میں رکھ کر کہا۔

"لیکن یہ میری خواہش ہے ـــــ" لتا نے کچھ سوچ کر کہا ـ ـ

"لتا خواہش تشنگی کا نام ہے پھر بھی اگر یہ تمہاری خواہش ہے تو میں اسکو ضرور پورا کردوں گا تم نے بھی تو میری آخری خواہش یہ ہار پہن کر پوری کی ہے ـــــ" رمیش کے لہجہ میں بڑا درد تھا۔

آج رمیش کی آنکھوں پر سے پٹی کھولی جا رہی تھی۔ رمیش کی آنکھوں میں اجالے کچھ تاریکیاں لئے بلند ہو رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا ـــــ کاش آج وہ اپنی لتا کو دوبارہ دیکھ سکتا صرف پیاسی نظروں کو سیراب کرنے کے لئے ـــــ آج روشنی واپس آرہی لیکن اس وقت جب لتا اس کی اندھیری زندگی سے بہت دُور نکل چکی ہے۔ ابھی وہ یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ انچارج ڈاکٹر نے کہا۔

"رمیش جی آج آپ کی زندگی میں پھر سے اجالا ہو رہا ہے، آپ پھر اپنی دنیا کو دیکھ کر بہت کچھ لکھ سکیں گے۔ ہمارے سماج کے لئے آپ جیسے لکھنے والوں کی آنکھیں بڑی ضروری اور قیمتی ہیں انھیں وہ سب کچھ دکھائی دیتا ہے جو ہماری لاکھوں آنکھوں کو نظر نہیں آتا ـــــ"

"میری دنیا ـــــ؟ لیکن ڈاکٹر صاحب میری دنیا نے مجھے کیا دیا۔ اب اس پتھریلی دنیا کو دیکھ کر کیا کروں گا جس میں رہنے اور جس کو دیکھنے پر صرف زخم ہی ملتے ہیں ... ـ" رمیش کے لہجہ میں بڑی تلخی تھی۔

۔ رمیش جی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے محض کہانیاں ہی نہیں لکھیں کسی سے حقیقی محبت بھی کی ہے اور اس سے شاید آپ کو مایوسی ہوئی ہے ۔۔۔ ایک دوسرا معاون ڈاکٹر بولا۔

۔ نہیں ڈاکٹر صاحب ایسا نہ کہئے مجھے کسی نے دھوکہ نہیں دیا۔ دھوکہ تو مجھے میری قسمت نے دیا ہے۔ آپ خود سوچئے میری کل کی اندھیری زندگی کی طرف کون بڑھنا پسند کرتا۔ ڈاکٹر صاحب بوجھ کسی پر نہیں رہنا چاہیئے۔ میں خود کسی پر بوجھ بننا گوارہ نہیں کرتا۔ زندگی جب بوجھ بن جائے، ایک ڈھیر بن جائے تو اسے کسی طرف بڑھنے کا حق نہیں ہونا چاہیئے ۔ رمیش یکھ حقیقت بیان کرتا رہا اور ڈاکٹر اس کی آنکھوں کی پٹی کھولتا رہا ۔۔۔ اور پھر ایک بار رمیش کی آنکھیں کھلنے پر اسے کچھ دھندلے دھندلے عکس دکھائی دینے لگے ۔۔۔ اور ان ہی دھندلکوں میں سامنے کھڑی لتا کا عکس صاف ہوتا گیا ۔۔۔ اور رمیش مضطربانہ لہجہ میں بولا ۔۔۔

۔ لتا تم ۔۔۔؟

۔ تم نہیں آپ کہئے رمیش جی۔ یہ آپ کی ڈاکٹر ہیں آنکھوں کے علاج کی اسپیشلیسٹ جنھوں نے آپ کا سب سے پہلا اور کامیاب آپریشن کیا ہے ۔۔۔ اور جو دن و رات خاموشی کے ماحول میں آپ کی دیکھ بھال رکھتی تھیں؟ ایک تیسرے نوعمر ڈاکٹر نے زیر لب مسکرا کر کہا ۔۔۔ اتنا سن کر بیک وقت لتا اور رمیش نے ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھا ۔۔۔ پیار کے دیپ پھر روشن ہو گئے تھے۔

۔ جی ہاں ہم لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ آپ لتا جی کی زندگی ہیں لیکن ان کے حکم کے مطابق کچھ کہنے کی اجازت نہیں تھی ۔۔۔

۔ لتا تم کو تو جگمگاتے اندھیرے پسند نہیں تھے ۔۔۔ پھر یہ سب کیوں لئے ۔۔۔؟

۔ پسند تھے روشنی میں بدلنے کے لئے ۔۔۔ جو کچھ میں نے کہا تھا تمہارا امتحان لینے کے لئے کہا تھا۔ سوچا تھا شاید میرے ایسا کہنے پر تمہارا کوئی جذبہ دم توڑ دے اور تم مجھ کو برا بھلا کہنے لگو مگر تم نے مجھے اس کے بدلے میں دعائیں دیں اور خدا نے وہ دعائیں قبول کر لیں۔ ہاں مگر تم ایک لیکھک ہوتے ہوئے بھی اتنا بھول گئے تھے کہ سچی محبت بھٹکتی نہیں ہے، روپ نہیں بدلتی۔ وہ بلندی دیکھتی روشنی یا اندھیروں سے نہیں گھبراتی۔ رمیش پیار کے دیپ اتنے جلدی اور آسانی سے نہیں بجھ سکتے ۔۔۔ اتنا کہتی ہوئی لتا اس کے قریب بیٹھ گئی ۔۔۔ اتنا قریب کہ تمام فاصلے دور کھڑے مسکرا رہے تھے۔

بتاریخ ۲ر مئی ۱۹۷۳ء ۸½ بجے شب اردو کلب اترپردیش شاخ فتحپور کی مجلس انتظامیہ کی ایک میٹنگ جناب وحید الدین خاں متینؔ کی صدارت میں دفتر اردو کلب میں منعقد ہوئی جسمیں شب افسانہ منانے کے امکانات پر غور کیا گیا۔ اور کچھ مفید تجاویز بھی پاس کی گئیں ۔۔۔ اس سے قبل کی میٹنگ میں اردو کلب کے مجلس انتظامیہ کی تشکیل اور عہدیداران کا انتخاب عمل میں آیا۔

۱۔ جناب وحید الدین خاں متینؔ — صدر
۲۔ 〃 پرنسپل اندر سروپ سریواستو — نائب صدر
۳۔ 〃 احمد نسیم — 〃
۴۔ 〃 قمر صدیقی — سکریٹری
۵۔ 〃 جاوید اقبال کاظمی — جوائنٹ سکریٹری
۶۔ 〃 ظفر اقبال — سکریٹری نشر و اشاعت
۷۔ 〃 اے جمال — خازن

اور دس ممبران مجلس انتظامیہ
کر حذ گزا

ویرانیاں

ایس۔ ایم۔ عابد نقوی (لندن)

جہاز جب جینوا کے ایئرپورٹ پر اُترا۔ تو جمشید اپنے دل کی ویرانی کو سوئیزرلینڈ کے حسین مناظر سے بہلانے لگا۔ سوئیزرلینڈ زمین پر بہشت ہے اس کی نگاہ پہاڑوں پر سے پھسل کر نشیب میں حد نظر تک۔ پھیلے ہوئے عظیم سمندر پر جم گئی اور جب اُس کی نگاہیں سرو کی جھومتے درختوں پر پڑھیں تو بے اختیار اُسے اپنے وطن کی حسین سرسبز وادی یاد آگئی۔ جمشید نے اپنے ذہن کو ماضی کے ویرانوں میں بھٹکنے سے بچانے کے لئے۔ جلدی سے جیب سے شوکت کا خط نکالا اور بڑی محویت سے پڑھنے لگا۔ شوکت نے لکھا تھا جمشید تم جلدی لندن پہنچو یہاں کی رونقیں تمہارے دل پر چھائی ہوئی اُداسی کو رفع کر دیں گی۔ پکاڈلی سرکس یہاں کا خوبصورت مقام ہے۔ افسانوں میں بہت بدنام جگہ کا نام پکاڈلی پڑھا تھا۔ مگر اب چند قوانین نافذ کر کے اس سلطنت کو اب بہت حد تک دور کر دیا گیا ہے یہاں کا ٹیوب اسٹیشن بہت بڑا ہے۔ یہاں سے چھ اطراف بیک وقت ٹرینیں جاتی ہیں۔ جب بجلی کی سیڑھیوں پر سے ہوتے ہوئے اوپر آؤ تو سامنے ہی وہ گھڑی نظر آئے گی جو تمام دنیا کا وقت بتاتی ہے۔ ذرا باہر نکلو تو پکاڈلی کے درمیان ایروز کا مجسمہ ایک خوبصورت چبوترے پر لگا ہوا ہے۔ اور ایروز کے ہاتھ میں جو کمان ہے ایسے محسوس ہوتا ہے تیر چھوٹنے والا ہے۔ اور دیوتا کی شرارت سے کوئی دل تڑپے گا۔ مگر جمشید ہمارے دل تو پہلے ہی زخمی ہیں۔ لندن کا مرکزی مقام ہونے کی وجہ سے یہاں فرمیں اپنے اشتہارات کچھ اس انداز پیش کرتی ہیں کہ بے اختیار نگاہیں رک جاتی ہیں۔

(TRAFALGAR S O) دسمبر کی اسار کو کا نظارہ قابل دید ہوتا ہے۔ تم انشاءاللہ اسار دسمبر تک لندن پہنچ جاؤ گے جمشید یہاں کی سڑکیں اتنی کشادہ ہیں کہ بیک وقت چھ کاریں آجا سکتی ہیں۔ قریب ہی کرائی ٹیرین تھیٹر ہے یہ لندن کا واحد زیر زمین تھیٹر ہے۔ جمشید تم جلد آؤ اور ان رونقوں میں گم ہو جاؤ۔ بکنگھم پیلس میرے تخیل سے کم تر ثابت ہوا۔ اس سے بہتر ایک مزدور کے دل میں پیار کا محل تعمیر ہوتا ہے۔ بلکہ باڈی گارڈ عجیب طرز کی وردیاں پہنے بت کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔

ہائیڈ پارک کارنر جو یہاں کا خوبصورت ترین مقام ہے یہ عظیم پارک ہے ہر طرح کی آزادی ہے۔ ایک حصے کو اسپیکرز کارنر کہتے ہیں لوگ آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ خواہ حکومت پر نکتہ چینی ہو یا مذہب۔ سیاست جو موضوع آپ چاہے بول سکتے ہیں۔ پولیس سامنے کھڑی رہتی ہے مگر کچھ نہیں کہتی۔

ہائیڈ پارک کا یہ کونہ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں کے پارک بہت خوبصورت ہیں قدرتی منظر نظر نہیں آتے سب مصنوعی اور ان لوگوں کی دماغی تخلیق ہے۔ ہم دیسی لوگ خدا سے یہ شکوہ نہیں کر سکتے۔ گل مطمئن نہیں ہیں ترتیب گلستان سے، مگر یہاں کا سب کچھ اس زندہ دل قوم نے اپنے طابع کر رکھا ہے لیکن اب بھی ایک ایسا مقام ہے جہاں پر یہ سفید نسل والے بھی مجبور نظر آتے ہیں

بقول ذوقؔ۔

موت نے کردیا لاچار وگرنہ انساں
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

جمشید یہ دیکھنے کی چیز ہے میڈیم ٹوساڈ (MADAMTUSSAUD) کا بنوایا ہوا خوبصورت میوزیم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ٹوساڈ اپنے زمانے کی حسین ترین لڑکی تھی۔ جسے ایک فرانسیسی سنگ تراش سے محبت ہوگئی تھی۔ حکومت فرانس نے اُس پر جاسوسی کا الزام لگاکر اُسے جیل میں بند کر دیا اور اُس کے محبوب کو قتل کروا دیا وہ اپنے تنگ و تاریک قید خانے میں اپنے محبوب کا کٹا ہوا سر سامنے رکھے اُس کے مجسمے تیار کرتی رہی یہی اُس کا شغل حیات تھا۔ جمشید محبت کرنے والے کا دل دیکھو ٹوساڈ لندن کے ایک بہت بڑے امیر کبیر کی اکلوتی لڑکی تھی۔ جس کے باعث وہ جلدی ہی فرانس سے اپنے وطن واپس آگئی۔ یہاں آکر اُس کی خواہش کے مطابق یہ میوزیم اُس کے محبوب کے نام پر بنایا گیا۔

میڈیم ٹوساڈ کا مجسمہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے صدیوں پرانی طرز کا ایک چھوٹا سا کمرہ جس میں خوبصورت پلنگ ہے کمرہ اسی زمانے کی طرز کا سجا ہوا ہے۔ مسہری پر ایک نازک لڑکی سوئی ہوئی ہے۔ جس کا لباس پرانی وضع کا ہے۔ مگر اس کا حُسن ملکوتی جدید طرز کا منہ سے بولتا نظر آتا ہے۔ گلے میں چھوٹی سی صلیب پڑی ہے۔ ایک ہاتھ پیشانی پر رکھا ہوا ہے۔ اور دوسرا پہلو میں۔ رات کی دھیمی دھیمی روشنی میں وہ ہلکی ہلکی سانس لے رہی ہے اور ہاتھ کی خوبصورت رگیں بھی تڑپتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مسہری سے کچھ فاصلے پر خادمہ کھڑی ہے۔ جیسے یہ معلوم کرنے آئی ہو کہ۔ یہ بے چین روح کیا سوئی بھی ہے۔ یا نہیں؟ ———— مگر حُسن سویا ہے۔ اور محبت کے دلکش خواب دیکھنے میں محو۔

یہ صدیوں پرانی کہانی ہے مگر کل کا واقعہ معلوم ہوتی ہے قید خانے کی وہ چھوٹی سی کوٹھڑی بھی دکھائی گئی ہے جہاں اُسے قید رکھا گیا تھا۔ پہرے دار سنگین لئے کھڑے ہیں اور وہ اپنے محبوب کا تصور لئے اُس کا عکس پتھر پر اُتارنے میں مصروف ہے دلوں پر کون پہرہ دے سکتا ہے؟ جمشید محبت تو ہمیشہ زندہ رہے گی۔

اس میوزیم میں دنیا بھر کی مشہور ہستیوں کے مجسمے بھی رکھے ہوئے ہیں یہ سب موم کے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سچ مچ کے زندہ انسان ہیں۔

تہہ خانے میں جاؤ تو وہ سزائیں جو زمانہ قدیم میں مجرموں کو دی جاتی تھیں دکھائی گئی ہیں۔ مجرم کو خاردار پہیوں والی گاڑی کے نیچے کچلتا ہوا دکھاتے ہیں اور مجرم کے چہرے پر کرب و بے چینی کے آثار نمایاں ہیں جیسے وہ زندہ انسان ہیں۔ برابر کے کمرے میں ایک بوڑھا بیٹھا ہے۔ جو دس سال کی سزا کاٹ کر رہا کیا گیا۔ لیکن آزادی برداشت نہ کرسکا قید اتنی پسند تھی کہ ظالم دنیا سے بھاگ کر واپس قید میں جانا چاہتا تھا۔ قید کے دروازے پر آگیا اور وہیں جان دے دی۔

آخر میں موجودہ دور کی پھانسی خوبصورت صوفے پر بیٹھے ہوئے موت کو اپنا لینا۔ بجلی کا کرنٹ ایک منٹ میں دل کی دھڑکنوں کو خاموش کردے گا۔ اُس سے باہر نکلیں تو (Planitarium) پلانیٹر ہے جس میں آسمان پر چاند اور ستارے ایک مزدور کی قسمت کی طرح چاند ستاروں کی گردشیں دکھاتے ہیں۔ جو سب بیان سے باہر ہے۔

یہاں کے کنٹری سائڈ بہت دلکش ہیں۔ یہاں امیر کبیر زیادہ تر کنٹری سائڈ میں رہتے ہیں۔ جمشید یہاں کے بوڑھوں کی زندگی عبرت انگیز ہے۔ بزرگوں کا احترام و عزت جو ہمارے ملکوں میں ہے۔ وہ یہاں نہیں۔ بوڑھے یہاں لاوارثی کی زندگی گزارتے ہیں۔ یہاں کی جوان لڑکیاں جن پر کوئی پابندی نہیں وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ جہاں چاہیں جاسکتی ہیں۔ محبت کو اس ملک میں پھلنے پھولنے کا وقت ملا ہے۔ ہمارے ملک میں محبت تو ایک سسکتی تڑپتی لاش ہے۔ جمشید تم جلد آنے

کی کوشش کرو۔ یہاں کی آزاد خیال لڑکیاں تمہارے دل کے زخم رفو کر دیں گی۔ ویسے بھی جمشید تمہارا ان حالات میں ایسے گھر میں تنہا رہنا۔ تمہاری صحت کے لئے خطرناک ہے اس گھر میں جہاں قدم قدم پر تمہاری محبت کی لازوال نشانیاں ہیں۔ میں امید کرتا ہوں جمشید تم اپنی یادوں کو وہیں چھوڑ آؤ گے اور اپنی محبت کے۔ مدفن پر آخری آنسو بہا کر جب دیارِ غیر میں قدم رکھو گے تو کوئی یاد تمہیں ستانے ساتھ نہ آئے گی۔

جمشید۔ یہ دنیا ہے اور یہاں وہ بھی دیکھنا اور سننا پڑتا ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جمشید نے پرنم آنکھوں سے۔ شوکت کا خط بند کیا اور سوچنے لگا۔ کیا! میں سب کچھ بھول کر اپنے وطن سے جا رہا ہوں۔ اس نے اپنی نگاہیں عظیم اور گہرے سمندر پر جما دیں۔

سمندر کی لہروں پر لیٹا ہوا اس کا ماضی قریب آنے لگا۔ اور جمشید اپنے ہی زندگی کے ویرانوں میں بھٹکتا ہوا۔ ایک بار پچھلی دنیا میں چلا گیا۔

ٹینس کا ریکٹ گھماتا۔ ایک شوخ گیت گنگناتا میں اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ رائٹنگ ٹیبل کے قریب کھڑی شاہینہ گلدان میں۔ پھول سجا رہی تھی۔ میں نے ریکٹ اس کے سر پر رکھتے ہوئے پوچھا آپ کی تعریف؟ دو حسین نگاہیں اٹھیں اور گلابی پھول کھلے پھوپھی جان سے پوچھئے میری تعریف۔ کمرے کا نیلا پردہ ہلتا رہا شاہینہ جا چکی تھی۔

اس وقت میں نے سوچا بہار آئی اور اتنی جلدی چلی بھی گئی۔ میں نے گردن جھکا کر نرگس کے پھولوں سے سرگوشی کی۔ مگر پھول پھول ہی رہے۔ کپڑے تبدیل کر کے میں لیٹی بجاتا امی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ پلنگ پر دراز تھیں اور شاہینہ ان کا سر دبا رہی تھی۔ میں امی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

انھیں کوہ قاف سے کون دیو یہاں پھینک گیا؟
موت کا ظالم دیو۔ امی کی پلکیں بھیگ گئیں اور شاہینہ کی آنکھوں میں ابر برسنے کو تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

امی کیا بات ہے آپ اداس ہو گئیں۔

جمشید بیٹے شاہینہ میرے خاندان کی ایک بے کس لڑکی ہے۔ دور کے رشتے سے میں اس کی پھوپھی ہوتی ہوں۔ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ باپ بچپن ہی میں مر چکا۔ اب تمام خاندان میں۔ ہم لوگوں کے سوا اس کا کوئی سرپرست نہیں ہے۔ میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ آخر بچاری جاتی کہاں۔ بیوہ ماں نے اسے مصیبتوں سے میٹرک تک تعلیم دلوائی اس کا ارادہ تو ڈاکٹر بننے کا تھا مگر قسمت کے کھیل۔ امی آپ کی بیٹی کوئی نہیں ہے اسے آپ اپنی بیٹی بنا لیں۔ پھر ڈاکٹر بنا کر اس کے والدین کی دعائیں لیں۔ ان کی روح خوش ہو جائے گی۔

کیوں نہیں! زندگی میں نیکی کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں اس ارادے کو اپنی زندگی میں ضرور پورا کروں گی۔ شاہینہ کو خدا نے میری تنہائیوں کا ساتھی بنا کر بھیجا ہے جمشید تم مرد ہو اور باپ کی طرح بے حس دل کے مالک۔ تمہیں کیا پتہ جب تم گھر سے چلے جاتے ہو تو اس بھرے گھر میں ایک بیٹی کی کمی مجھے شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ تمہارے باپ کی بے نیازیوں سے جب دل دکھتا ہے تو یہ خواہش شدت سے جاگ اٹھتی ہے۔ کاش میری بھی کوئی بیٹی ہوتی۔ تو میرے دکھوں کی شریک ہوتی آج شاہینہ کی صورت میں مجھے بیٹی مل گئی۔ لیکن میں اسے بیٹی ہی بنا کر رکھوں گی جو ماں باپ کو جدائی کا غم دے کر دوسرے کا گھر آباد کرنے چلی جاتی ہے۔ شاہینہ ایسی بیٹی ہو گی جو میرے ہی گھر کی رونقوں میں اضافہ کرے گی۔ اس چاند کی روشنی سے۔ میرا تاریک گھر جاگ اٹھے گا۔ جمشید۔ بیٹے تم شریر بہت ہو شاہینہ کو تنگ مت کرنا۔ بلکہ اس کا احترام کرنا۔ یوں شاہینہ میری زندگی میں آئی اور میرے دل کی دھڑکنوں میں بس گئی۔ اس کے آنے سے گھر جنت بن گیا۔ امی اپنی خراب صحت کی وجہ سے گھریلو کام سرانجام نہ دے سکتی تھیں۔ ابا کو اپنے رنگین مزاج دوستوں ہی سے فرصت

ہوتی تھی — گھر گھر نہ رہا تھا بلکہ چڑیا گھر بن گیا تھا۔ نوکروں کے رحم و کرم پر پڑا ہمارا گھر عجائب خانہ لگتا تھا۔ شاہینہ کی آمد سے ویران صحن میں پھول کھل گئے۔ کمروں میں چڑیوں کے گھونسلوں کی جگہ ہر چیز ترتیب سے سج گئی۔ اور میرا کمرہ تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی شہزادہ کا کمرہ ہے۔ اپنی تعلیمی مصروفیتوں کے باوجود۔

وہ گھریلو کاموں میں بھی دلچسپی لیتی تھی۔ سجا سجایا پر سکون گھر اور لذیذ کھانے شاہینہ کی آمد کے ہی ملنے لگے تھے۔ وہ ایسی نیک سیرت لڑکی تھی کہ گھر کے ملازم بھی اس کی آمد سے مطمئن اور مسرور تھے۔ میں اسے شرارت سے ڈاکٹر صاحب کہا کرتا تھا وہ اپنی معصوم صورت اور اچھی عادت کی وجہ سے امی کے دل میں گھر کر گئی تھی۔

شاہینہ کیسی تھی اس کی خوبیاں اور حسن کو میں اپنے الفاظ کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتا۔ بس جب بھی اسے دیکھتا یہی محسوس ہوتا جیسے امی سے بچپن میں سنی بچپن کی کہانیوں والی "کوہ قاف کی پری" میرے گھر آگئی ہے۔ اپنی بیرونی مصروفیات سے ابا کو بھی جب کبھی گھر بیٹھنے کا موقع ملتا۔ وہ بھی شاہینہ کے سلیقہ کی تعریف کرتے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں چچی جان بھی اپنی اکلوتی - سلمہ - کے ہمارے گھر آپہنچیں۔ جہاں شاہینہ انھیں کانٹے کی طرح کھٹکتی چچی بچپن ہی سے مجھ پر خاص لطف رکھتی ہوئی تھیں جیسے ان کی سلمہ کے ناز نخرے اٹھانے کے لئے۔ بس ہی رہ گیا ہوں۔ سلمہ میری چچا زاد بہن تھی۔ صورت کی بری نہ تھی بلکہ جاذب نظر تھی مگر اس کی عادات چچی جان کی غلط تربیت کا مکمل ثبوت تھیں۔ شاہینہ اتنے عرصہ ہمارے گھر میں رہتی تھی پھر بھی وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتی اور کبھی بے وقت میرے کمرے میں نہ آتی۔ میری غیر موجودگی میں کمرہ سجا جاتی۔

برعکس اس کے سلمہ [illegible] کھلی کھلی حرکتیں کرتی کہ میں خود شرما جاتا۔ ایک شام میں اپنے کمرے اداس بیٹھا تھا۔

چچی جان امی کا سر کھا رہی تھیں۔ اور شاہینہ پر سلمہ طنز کے تیر چلا رہی تھی۔ شاہینہ کو کالج میں ڈرامہ دیکھنے جانا تھا۔ سرمئی رنگ کی ساڑی میں وہ ایک بادل کا بھٹکا ہوا ٹکڑا معلوم ہو رہی تھی۔ جو میری ویران زندگی کو سیراب کرنے آیا ہو۔ اس کا چہرہ ساڑی کے سرے سے لپٹا ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے یہ اس کا حسین چہرہ نہیں بلکہ سرمئی بادلوں میں گھرا چودھویں کا چاند جگمگا رہا ہے۔ اسے کار کی طرف جاتا دیکھ کر میں بھاگا اور ڈرائیور کو بلا ضرورت کچھ خریدنے کے لئے بھیج دیا اور خود سیٹ پر ڈرائیور کی ٹوپی پہن کر اسٹیرنگ تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ آئی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ڈرائیور کالج چلو۔

جیسے ہی ڈاکٹر صاحب ارے جمشید بھائی آپ
ادھر سلمہ آپا آپ کو لے کر پکچر دیکھنے جانا چاہتی ہیں۔ آپ کو دیر ہو جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب ہم حضور کے خادم ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کی تمام خاندان کی غلامی کریں۔ اور ڈاکٹر صاحب مجھ مریض کا بھی علاج کریں یہ دل ہر وقت دھڑکتا کیوں ہے "سلمہ کے لئے" شاہینہ مسکرا کر بولی۔ یہی تو دکھ ہے ڈاکٹر صاحب یہ دل واقعی ایک پری کے لئے دھڑکتا ہے۔ چڑیل کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا ویسے بھی دل کا علاج آپ ہی کر سکتی ہیں۔ مگر جناب کے ڈاکٹری کے سال دیوار کی طرح حائل ہیں۔ آپ کو مجھ سے زیادہ ڈاکٹری سے پیار ہے۔ میں نے سیٹ کے سامنے شیشہ میں دیکھا شاہینہ شرمائی ہوئی بیٹھی کیسی پیاری لگ رہی تھی آنکھوں پر دو جگمگاتے ستارے روپوش تھے۔

ڈرامہ دیکھ کر جب ہم دونوں واپس آئے تو چچی جان نے حقارت سے ہمیں دیکھا۔ ہم دونوں بالکونی میں خاموش بیٹھے تھے خوب گہرا میک اپ کئے تیز سا عطر لگائے۔ ہم دونوں کو اس نے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ڈرامہ دیکھ کر آئے ہو یا کسی پارک سے [illegible] ہم تو ڈرامہ [illegible] کالج سے آرہے ہیں البتہ آپ سج دھج سے [illegible] ہوٹل جا رہی ہیں۔
میں نے سلمہ کے سراپا کو طنزیہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔

ہیں تو تمہارے ساتھ پکچر دیکھنے جانا چاہتی تھی۔ مگر تجھے کیا معلوم تمہیں دو مردوں کی غلامی سے ہی فرصت نہ ہوگی۔

فرصت تو بہت ہے سلمہ مگر میں تمہاری صحبت سے خائف رہتا ہوں۔ یوں سمجھو میں [illegible] الرجک [illegible] ہوں۔ بعض لوگ پنسلین سے ہوتے ہیں کوئی [illegible] کے مطابق [illegible] سرخ رنگ سے الرجک ہے اسی طرح میں آ[illegible] سے بس دور ہی [illegible] چاہتا ہوں۔

شاہینہ کھل کھلا کر ہنس دی واہ جمشید بھائی ڈاکٹری [illegible] پڑھ رہی ہوں اور ڈاکٹروں کی [illegible] [illegible] شاہینہ! میرا منہ [illegible] دماغ [illegible] ہوگیا [illegible] باتیں بھی نکلتی ہیں۔ شرم کرو [illegible] ایک [illegible] کی [illegible] ہو [illegible] غریب گھر کی لڑکی کو اتنا سر پر چڑھا لیا [illegible] اس کے سامنے میری [illegible] دو مردوں کے [illegible] [illegible] [illegible] شاہینہ بھرائی [illegible] کو صفر طے کرکے یہ تمہاری رشتہ کی [illegible] [illegible] طنز سے نگاہ شاہینہ کو دیکھ کر کہا۔ جمشید کے [illegible] دونوں ایک ہی جیسے ہیں تم اگر باپ کا خون ہو تو [illegible] کا خون [illegible] ہوں شاہینہ یہ کہہ کر بہت تیزی سے اپنے کمرے [illegible] چلی گئی دروازہ بند ہونے کی سخت آواز سن کر میں نے ملامت کی نگاہ [illegible] سلمہ کو گھورا۔ اب خوش ہو اس غریب لڑکی کا دل دکھا کر میں نے اپنی اونچی آواز سے کہا سلمہ تمہیں معلوم [illegible] امی نے بچپن میں ہی میری منگنی شاہینہ سے کر دی ہے۔ وہ اس گھر کی مالک ہے تمہیں اس کی توہین کرنے کا کوئی حق نہیں ہے [illegible] اگر [illegible] ہی تو دیکھوں گی وہ کس طرح گھر کی مالک [illegible] ہے چچی جان گرجتی ہوئی کمرہ [illegible] داخل [illegible] اور سلمہ کا بازو پکڑ کر کھینچتی ہوئی اپنے کمرے لے گئیں۔

[illegible] شاہینہ کے [illegible]

[illegible] اپنے پاؤں دوسرے کمرے سے [illegible]

داخل ہوا۔ سامنے میز پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی شاہینہ میں نے اس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ [illegible] سلمہ کی بدتمیزی پر معافی مانگتا ہوں۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ تم میری ہونے والی بیوی ہو [illegible] دل کیوں ہو تمہاری عزت جو میری ماں کی نگاہوں میں [illegible] وہ میری بھی نہیں جو لوگ تم سے ہمیشہ جلتے ہیں اور جلتے رہیں گے۔ کیونکہ وہ لوگ چاہتے ہیں اس گھر کی جائداد ان کے حصہ میں آئے۔ اور تم اگر یوں ہی بات بات پر روتی رہیں [illegible] آنکھیں [illegible] کن آنکھوں سے دنیا دیکھوں گا۔ [illegible] آنکھیں [illegible] رومال سے صاف کیں شاہینہ [illegible] لیتے ہوئے کہا [illegible] آج ہی پھوپھی سے اجازت لے کر اپنے گھر چلی جاؤں گی [illegible] ہاں اگر کوئی نہیں میرے ماں باپ کی [illegible] ہوں [illegible] ڈاکٹری نہیں پڑھوں گی بلکہ کسی اسکول میں نوکری کر لوں گی۔ مجھ میں سلمہ کے طعنے سننے کی ہمت نہیں۔ دیکھو شاہینہ [illegible] ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا میں سلمہ کی [illegible] معافی مانگتا ہوں۔ اگر تم روٹھ کر چلی گئیں تو میں انجنیئر نہ بن سکوں گا۔ جب [illegible] کون [illegible] ہوگا تو پڑھوں گا کیا خاک [illegible] آخری سال ہے پھر انجنیئرنگ کے لئے [illegible] جاؤں گا۔ امی تنہا رہ جائیں گی اگر تم بھی چلی گئیں۔ تو اس کو [illegible] وہ زندہ کیسے رہیں گی۔ ابا کو مصروفیت سے فرصت نہیں۔ امی کی دیکھ بھال کون کرے گا انھیں وقت پر غذا اور دوا کون دے گا۔ [illegible] نے اپنے ہاتھوں میں اس کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ تھام لیا۔ شاہینہ میں لندن سے جب انجنیئر [illegible] کر لوں گا تو تم ڈاکٹر بن چکی ہوگی۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھی بن جائیں گے اور عوام کی مدد کریں گے۔ [illegible] کا علاج کرنا

[illegible] اونچی محل [illegible] کے کرنے [illegible]

[illegible]

[illegible] بہت سے کے شاں

جو گر جائیں۔ اٹھو اب منہ ہاتھ دھو لو۔ امی تمھاری یہ آنکھیں لال لال دیکھ کر پریشان ہوں گی ان کا دل تو پہلے سے کمزور ہو شاہینہ خاموش بیٹھی رہی۔ اگر تمھارے دل میں میرا ذرا بھی خیال ہے تو میرا کہنا مان لو اور منہ دھونے چلی گئی۔

دوسرے دن شام کی گاڑی سے چچی جان بمعہ سلمہ کے اپنے گھر چلی گئیں اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ امی کی طبیعت ان دنوں بہت خراب تھی۔ کھانا بالکل ہضم نہ ہوتا تھا۔ شاہینہ دن رات ان کی خدمت میں مصروف رہتی۔ ابا جان اور ان کے دوست بازار کی ایک حسینہ پر فریفتہ تھے۔ بزنس جائداد کا سب روپیہ اس پر لٹایا جا رہا تھا۔ امی کے علاج سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں جانتا تھا امی کی صحت کیوں خراب رہتی ہے ابا کی بڑھتی ہوئی عیاشیوں نے انھیں بیمار کر دیا تھا۔ گھر کے اخراجات کے لئے میں بمشکل ان سے رقم حاصل کرتا جسے شاہینہ اس خوش اسلوبی سے خرچ کرتی کہ ہمیں کبھی دقت نہ اٹھانی پڑتی۔ امی کو پریشان دیکھ کر میں کہتا۔ آپ گھبرائیں مت جب میں لندن سے آؤں گا آپ کو اپنے بنگلہ دیش میں لے جاؤں گا۔ اور وہاں آپ کی خدمت کرنے کے لئے ایک حسین بہو ہوگی۔ وہ کون ہوگی امی — جمشید اگر تم لندن سے کوئی بندریا نہ لے آئے تو میں ایک پری تمھیں دوں گی جسے میں نے بیٹی بنا کر رکھا ہے۔

ایک دن کالج سے آکر کتابیں ابھی میز پر رکھی ہی تھیں کہ شاہینہ سرخ کمبل میں لپٹی ایک گڑیا کو اٹھائے میرے پاس آئی جمشید بھائی۔ مبارک ہو بہت خوبصورت بہن اللہ میاں نے دی ہے امی کمال ہو گیا۔ میں نے لپک کر ننھی منی بہن کو اٹھا لیا۔ تم نے ۲۲ سال تک اپنے بھائی کو تنہا رکھا۔ میں نے اس کے سرخ رخساروں کو چومتے ہوئے کہا — اب جلدی سے بڑی ہو جاؤ — تم جمشید کی بہن ہو تمھارا نام جمیلہ رکھوں گی ارے تم تو رونے لگیں۔ میں جمیلہ کو ہاتھوں پر اچھالنے لگا۔ اور وہ زور زور سے رونے لگی۔ جمشید بھائی آپ تو خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ اب آپ اسے مجھے دیدیں وہ جلدی سے جمیلہ کو لے کر امی کے کمرے میں چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد ہی لیڈی ڈاکٹر گھبرائی ہوئی آئی۔ مریضہ کی حالت خطرناک ہے۔ وہ آپ کو ایک نظر دیکھنا چاہتی ہیں جب میں ڈاکٹر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو امی کا زرد چہرا اور منتظر نگاہیں دیکھ کر میرا دل کانپ اٹھا۔ پاس ہی چچی جان جو صبح کی گاڑی سے آئی تھیں افسردہ چہرا بنائے بیٹھی تھیں۔

میں امی کے پاس جاکر رک گیا۔ انھوں نے جمیلہ کو اٹھاکر شاہینہ کے ہاتھ میں دینے کا اشارہ کیا۔ میں نے جلدی سے ننھی بہن کو اٹھاکر شاہینہ کے ہاتھ میں دیدیا۔ جسے اس نے روتے ہوئے سینے سے لگا لیا۔ امی نحیف آواز میں بولیں شاہینہ میری بچی خدا کے بعد تمھارے سپرد ہے۔ شاہینہ یہ وہ بچی ہے جس کے لیے میں اٹھارہ سال تڑپتی رہی ہوں اور یہ میری بدقسمتی جب یہ آئی تو میں اس دنیا سے جا رہی ہوں۔

تم بیٹی کے داغ سے آشنا ہو شاہینہ! میری بچی کا خیال رکھنا۔ اسے ماں کی کمی نہ محسوس ہونے دینا۔ جمشید میرے بچے تم شاہینہ کا دل نہ دکھانا۔ امی نے کمرے کے چاروں طرف دیکھا۔ اور پھر کہا۔ کاش میری زندگی کا رفیق بھی یہاں ہوتا۔ میں اس سے معافی مانگتی۔ میں زندگی بھر اسے برے کاموں سے روک کر ان کا دل دکھاتی رہی۔ جمشید بیٹے میرا آخری سلام اپنے باپ کو پہونچا دینا۔ امی نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ اور آخری ہچکی کے ساتھ زندگی کے دکھوں سے نجات پاگئیں۔

میری وہ تو شفیق ماں تھیں ان کے لئے جتنا روتا تڑپتا کم تھا لیکن شاہینہ کی حالت مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ ننھی جمیلہ کو گود میں لئے ہر وقت روتی رہتی اس کے لئے دنیا میں۔

اب کچھ نہ تھا۔ ننھی کی دیکھ بھال شاہینہ ہی کرتی۔ چچی جان اور سلمہ تو بس گھر کی قیمتی چیزوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتیں۔ وہ آہستہ آہستہ ان کے بکسوں میں بند ہونے لگیں۔ ابا کو جب کبھی فرصت ملتی۔ تو وہ جمیلہ کو ایک نظر دیکھ کر سرد آہ بھرتے پھر زندگی کے اس دکھ کو ساغروں میں ڈبو دیتے۔

ایک دن چچی جان خاندان کے دوسرے افراد کو لے کر ابا کے کمرے میں پہونچیں۔ میں نے شاہینہ سے کہا آؤ۔ دیکھیں کیا اہم معاملہ ہے۔ چچی جان ابا کو مجبور کر رہی تھیں۔ دوسری شادی کرنے پر۔ اس طرح تنہا وہ گھر میں کس طرح رہیں گے۔ پھر انہیں اپنی مرحوم بیوی کا بھی تو احترام ہے جنھوں نے دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے اپنی بچی جمیلہ کو میرے ہاتھوں میں دے کر وعدہ لیا تھا چچا جان کا انتقال ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ صرف چچی جان اور ان کی لڑکی سلمہ تنہا رہ گئے تھے چچی جان کا جملہ سن کر دوسرے معزز افراد جو بھڑکائے ہوئے تھے ابا کو ہاں کہنے پر مجبور کر رہے تھے ادھر چچی جان کی شادی ابا کے ساتھ' ان کے دوسرے ساغر و مینا کے ساتھی کی شادی شاہینہ کے ساتھ طے کر رہے تھے۔ چچی کا سارا پروگرام سمجھ میں آ چکا تھا۔ یہ سب جائداد حاصل کرنے کی خاطر چالیں چلی گئی تھیں۔ لہٰذا اپنا احسان جتاتے ہوئے اس ننھی بچی کو جو محبت میرے دل میں ہے۔ کسی کے دل میں کیسے ہو سکتی ہے۔

آخر میں اس گھر کو اتنے عرصہ سے سنبھالے ہوں ابا جان نے کہا۔ شاہینہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ اس پر سب لوگ یک زبان ہو کر بولے اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں' غیر پھر غیر۔ شاہینہ کی شادی محبوب خان صاحب سے کر دی جائے گی تو وہ اپنے گھر چلی جائے گی۔ اور جمشید کی شادی سلمہ سے بچپن سے طے ہے۔ گھر کی چیز گھر میں رہے گی۔

یہ باتیں سن کر میرے باپ نے ارادہ ظاہر کر دیا۔ مجھے آپ لوگوں کا فیصلہ منظور ہے۔ میری زندگی میں جو تنہائی کا خلا ہے۔ وہ آپ ہی بھر سکتی ہیں۔۔۔۔ ابا جان نے یہ نہ سوچا یہ پاپی لوگ جال پھیلا رہے تھے وہ سوچتے بھی کیسے۔ ان کے دل میں احساس دل نہ تھا چچی نے جس طرح امی کی وصیت کو۔۔۔۔۔۔ توڑ مروڑ کر پیش کیا تھا۔ وہ اسی ناگن کا کام تھا۔

یہ سب باتیں سن کر میں سکتے میں آ گیا اور جب اپنی پھٹی پھٹی آنکھیں کھول کر دیکھا تو شاہینہ بت بنی دروازے کے پیچھے کھڑی تھی۔ جمیلہ اس کی گود میں تھی اور وہ سماج کے اس غلیظ فیصلہ پر دم بخود کھڑی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو اس طرح دیکھا جیسے پھانسی کا حکم پانے والے ملزم ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔

جب میرے حواس بحال ہوئے' تو شاہینہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔۔۔۔ میں نے دروازہ پر دستک دی مگر اس نے بند دروازہ نہ کھولا۔ میں گھبرا کر باغ کی طرف بڑھا اور شاہینہ کے کمرے کی کھڑکی' جو باغ کی طرف کھلتی تھی۔ اس تک پہونچنے کے لئے ایک چٹان پر سے دیکھا۔ شاہینہ جمیلہ کو گود میں لئے۔ سسک سسک کر رو رہی ہے۔ اسے یوں روتا دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھا۔

شاہینہ مت رو' اور اس بچی کو مجھے دے دو جس کے نصیب میں نہ ماں نہ باپ کا سایہ ہے۔ یہ بدقسمت ہے

جمشید ایسا مت کہو یہ تو معصوم ہے۔ قصور تو ان دنیا والوں کا ہے جو لالچ میں آ کر انجام نہیں سوچتے۔ میں چچی جان کو تسلی دے دوں گی کہ میں جمشید سے شادی نہیں کروں گی۔ میں اپنی زندگی جمیلہ ننھی کے لئے وقف کر دوں گی۔ اپنی پھوپی کی آخری خواہش پوری کروں گی۔ میں جمیلہ کو ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دوں گی۔ پھوپی نے میرے لئے کیا کچھ نہ کیا سسرال والوں کے طعنے سنے مگر مجھے اپنے سائے سے جدا نہ کیا۔ وہ تو مجھے ڈاکٹر بنا کر جاتیں مگر ظالم موت نے وقت نہ دیا۔ چچی جان بے فکر رہیں۔

میں تمام عمر شادی نہ کروں گی۔ کر دیں آپ کی شادی اپنی لڑکی سے۔
وہ جمشید کو بے شک اپنالیں۔

شاہینہ ایسی باتیں کرنے سے پہلے تو میرا گلا گھونٹ دو۔
شدت غم سے میری آواز رک گئی۔

وہ جمیلہ کو اٹھائے کھڑکی کی طرف بڑھی جمشید بھائی ادھر مت دیکھئے آپ کی ننھی بہن آپ کو روتا دیکھ کر منھ بسور رہی ہے۔ میں نے آنسو بھری آنکھیں اٹھائیں تو جمیلہ کو اپنی طرف دیکھتے پایا۔ جو اپنی معصوم چمکیلی آنکھوں سے کہہ رہی تھی جمشید بھیا میں بے قصور ہوں۔ قصور تو ان دنیا والوں کا ہے۔ جو دوسروں کا دل دکھاتے ہیں۔ بھیا مجھے نفرت سے نہ دیکھو۔ میں تو اپنی ماں کی آغوش کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ میں اداس ہوں۔۔۔
بھیا مجھے پیار کرو ننھی جمیلہ کی خاموش پکار سے میرا دل بھر آیا۔ شاہینہ اس کا منھ آگے بڑھاؤ شاہینہ نے کھڑکی سے جھک کر جمیلہ کا منھ آگے بڑھا دیا۔ اور میرا دل بے اختیار اسے دیکھ کر تڑپ گیا۔ اس کے روئی جیسے گالوں کو چومنے لگا۔

خدا سے ڈرو جمشید یہ غیر لڑکی کا منھ چوم رہے ہو۔
بالائی منزل سے جھک کر چچی جان نے کہا۔ میں تو اپنی بہن کو پیار کر رہا ہوں چاند کو کون چوم سکتا ہے۔ شاہینہ کے سہمے چہرے کو دیکھ کر کہا اور چچی میری سوتیلی ماں تو آپ بن گئیں۔ چچا کو فوت ہوئے عرصہ ہوگیا ابا ضرور آپ کو خوش رکھیں گے۔ تم نے کہا تھا۔ شاہینہ اس گھر کی مالکہ بنے گی۔ چچی اپنے غلط رنگ دیکر امی کی وصیت کو ابا کے سامنے پیش کیا۔ میں ابا جان کو کل سب سمجھا دوں گا ارے کیا سمجھاؤ گے اس بڑے میاں کو۔ تمام عمر تمہاری ماں اس کے گلے کا ہار بنی رہی اب موقع ملا ہے بچارے کو دل کی حسرتیں نکالنے کا۔

چچی میں کہتا ہوں خاموش ہو جاؤ غصہ سے میری بری حالت تھی ایسا معلوم ہوتا تھا بدن آگ ہے۔ گئی جی چاہتا تھا کہ چچی کا گلا گھونٹ دوں۔ میں تیزی سے کار کی طرف بڑھا۔ میں نے سوچا ابا کو کسی بہانہ سے ڈھونڈ کر اس ظلم سے [illegible] دکھوں

غم و غصہ کی وجہ سے بھاگا آگے خاں صاحب مل گئے جو سر میں خضاب لگا کر شاہینہ کو بیاہ کر لے جانے کی ریہرسل کرنے آئے تھے۔ انہیں کو دھکا دے کر غم و غصہ کی حالت میں کار میں بیٹھا۔ کار ٹاپ گیر میں جا رہی تھی۔ دماغ پر قابو نہ تھا۔۔ اسٹیرنگ قابو سے باہر تھا ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ابا نے کار میں پٹرول کے بجائے شراب کے گیلن بھروا دیئے ہوں۔

ایک دم ایک غریب میری کار کے سامنے سے نکل گیا۔ اس کو بچاتا ہوا۔ ایک سائیکل سوار سے جا ٹکرایا۔ سوار بری طرح زخمی تھا ادھر میں اپنی چوٹ کو قابو میں کر کے زخمی کو ہسپتال لے گیا۔ اس کے ورثا کو ڈھونڈتے ہوئے اور خون کا انتظام کرتے ہوئے وہ رات ہسپتال میں ہی گذاری۔ زخموں کی مرہم پٹی کرا کے صبح جب نیند سے بوجھل پلکیں لئے لڑکھڑاتا گھر آیا تو کوٹھی کے برآمدے میں قدم رکھتے ہی بوڑھے خانساماں کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے دیکھا جمیلہ کو گود میں لئے اونچی آواز سے رو رہا تھا۔ کیا ہوا جمیلہ کو میں نے جلدی اسے گود میں لیتے ہوئے۔۔ میرے خدا! جمیلہ کا سر پھٹا ہوا تھا اور خون تمام اس کے کپڑوں پر جما ہوا تھا۔ اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ کر مجھ سے کہہ رہی تھی۔ بھیا اب کون دیکھ بھال کرے گا۔ اماں کہاں ہے۔ وہ اکلوتی بہن۔ وہ بہن جس کے لئے میں ۲۲ سال سے تڑپ رہا تھا جس کی خاطر میری ماں ۱۸ سال سے تڑپتی رہی اور دنیا سے رخصت ہوگئیں اسے اس حالت میں دیکھ کر میں چیخا۔ یہ کیسے گری۔ شاہینہ کہاں ہے۔ بوڑھے خانساماں نے اپنی قمیض کے دامن سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

چھوٹے سرکار آپ کے جانے کے بعد آپ کی چچی جان نے مولوی صاحب کو بلا کر شاہینہ بی بی کا زبردستی نکاح بڑے صاحب کے دوست خاں صاحب سے پڑھوا دیا۔ اور پھر انہیں بے ہوشی کی دوا کھلا کر ان کے ساتھ گاڑی میں بھیج دیا۔ اور خود [illegible] چلی گئیں اور بے بی تنہا کمرے میں

روتی رہی۔ پھر نہ جانے کس طرح پلنگ پر سے گر گئی۔ میں جب کمرے میں داخل ہوا۔ تو بے بی فرش پر اوندھے منہ پڑی تھی میں نے جب بے بی کو فرش پر سے اٹھایا۔ تو مر چکی تھی۔

کون کہتا ہے جمیلہ مر گئی مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس وقت دروازہ پر ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی گر پڑا ہو۔ دروازہ کھولا تو آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

شاہینہ اپنے پھٹے ہوئے کپڑوں کے ساتھ دروازے پر پڑی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی اندر بھاگ کر آئی ننھی جمیلہ کو دیکھ کر بولی۔ مجھے بتاؤ اسے کیا ہوا۔ پھوپھی جان کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ گود میں لے کر اسے فرش پر بیٹھ گئی۔ جمیلہ آنکھیں کھولو نا۔

پھر وہ باورچی خانہ سے دودھ لے آئی۔ لو دودھ پی لو۔ بھوکی ہو۔ ایک قہقہہ مارا۔ میں پھوپھی کے پاس لے چلوں گی۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہی۔ ہی۔ ہی اور بالوں کو بکھیر کر شور کرنے لگی۔

آہ بے چاری پاگل ہو گئی۔ بوڑھا خانساماں ہاتھ مل مل کر کہہ رہا تھا۔

شاہینہ پاگل ہو گئی۔ شاہینہ پاگل ہو گئی۔ میں نے پوری قوت سے اپنا سر دیوار سے ٹکرا دیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ مجھے جب ہوش آیا تو [illegible] سب والی شاہینہ پاگل خانہ [illegible] تھی

اس غریب یتیم لڑکی پر اتنے ظلم ہوتے دیکھ کر۔ خدا کا غضب جوش مارنے لگا۔ اس رات جب شاہینہ کو خان صاحب کے ساتھ رخصت کیا گیا تھا۔ وہ چچی اپنی لڑکی سلمہ کے ساتھ پکچر دیکھ کر واپس آ رہی تھیں تو [illegible] کو اٹھا لیا۔ اور اب میری چچی فالج کی مریضہ [illegible] صورت دیکھنے کو ترس رہی ہیں۔ [illegible] شاہینہ کی زندگی اس کی بے ہوشی میں تباہ کر کے [illegible] حجلہ عروسی سے قدم باہر رکھا تو کثرت شراب نے اپنا اثر دکھایا

اور کمرے کی دہلیز پر ہی دم توڑ دیا۔ میں نے شاہینہ کی صحت کے لئے ہزار کوشش کی۔ مگر حساس لڑکی کا دماغ اتنے ظلم برداشت نہ کر سکا۔ ڈاکٹروں کی سب تدبیریں رائیگاں گئیں۔ وہ پاگل ہو کر [illegible] کے رحم و کرم پر پڑی ہے۔ میں اس وقت جو سوئزرلینڈ کے حسین مناظر سے اپنے آپ کو بہلانے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔ تمام زندگی اپنی ہی ویران زندگی کے خواب میں بھٹکتا رہوں گا۔ صرف ایک امید کے سہارے شاید شاہینہ کا دماغ ٹھیک ہو جائے اور جب میں لندن سے انجینئر بن کر آؤں گا تو میری شاہینہ ڈاکٹر بن کر۔ اور مسکرا کر میرا استقبال کرے گی۔ میری نظر میں وہ اب بھی پہلے کی طرح پاک ہے۔ یہی امید لے کر ملک چھوڑ کر جا رہا ہوں اور یہی امید مجھے زندہ رہنے پر مجبور کرتی ہے لیکن یہ امید میری زندگی کے صحرا کا سراب ہے سراب۔ کیونکہ جانے والے لوٹ کر نہیں آتے۔

"ترنم" کے کرم فرماؤں سے گذارش

"ترنم" کے سالانہ خریدار بننے کی خواہش رکھنے والے قارئین سے گذارش ہے کہ وہ سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں، پرچے وی۔ پی۔ سے نہ طلب کریں۔

نجمہ اخلاق ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر نے الواعظ صفدر پریس ۱۶ کننگ اسٹریٹ سے چھپوا کر احتشام نگر (بارود خانہ) لکھنؤ ۱۔ ۲۲۶ سے شائع کیا

مفاہمت

شاہد ماہلی

یہ آرزوؤں کی بستی
یہ درد کے اشجار
خزاں رسیدہ بہاریں
یہ زخم گل کا لہو
یہ بزم اشک و تبسم
یہ ظلمتوں کے چراغ
یہ بھٹکی بھٹکی نگاہیں
یہ دیدۂ حیراں
گھٹی گھٹی سی تمنا
تھکے تھکے سے قدم
شعور و فہم کی وحشت
یہ شورش ادراک
خیال و فکر کے طوفاں
یہ شدت احساس
یہ سہمی سہمی مسرت
یہ تلخیوں کے ہجوم
اداس اداس سویرا
بجھی بجھی سی یہ شام
یہ دن بھی چاک گریباں
یہ شب بھی چاک جگر
کچھ ایسی فکر بھی کیا ہے، حیات اپنی ہے
زمیں سے تا بہ فلک کائنات اپنی ہے

جانِ غزل

رمضان وارث

تم مہر کا ٹکڑا بھی ہو تم پارۂ مہتاب   تم اخترِ تاباں بھی ہو تم قطرۂ سیماب
تم لعل بدخشاں بھی ہو تم گوہرِ نایاب   آدم کی تمنا کا ہو تم ایک حسیں خواب
زہرہ ہو ثریا ہو عطارد ہو زحل ہو
تم جانِ غزل جانِ غزل جانِ غزل ہو

تم پرتوِ خورشید ہو تم گوہرِ تاباں   تم انجمِ ضو پاش ہو تم ماہِ درخشاں
تم پیکرِ انوار ہو تم شمعِ فروزاں   تم مشعلِ ناہید ہو تم نورِ شبستاں
تم برقِ سرِ طور ہو تم نورِ ازل ہو
تم جانِ غزل جانِ غزل جانِ غزل ہو

تم میر و ولی مومن و سودا کے ہو شہکار   تم داغ کا لہجہ ہو تو حالی کی ہو گفتار
تم فکرِ ظفر ناسخ و جرأت کے ہو اشعار   تم مثنوی ردم کے ہو کاشفِ اسرار
تم فلسفۂ غالب و اقبال کا حل ہو
تم جانِ غزل جانِ غزل جانِ غزل ہو

تم خالقِ کونین کی بے مثل ہو صنعت   تم حورِ بہشتی ہو ہمہ مہر و محبت
تم عصمتِ مریم کی ہو اک پاک امانت   تم روحِ لطافت ہو حسیں پھول کی نکہت
تم دہر میں زینتِ دہ صد راج محل ہو
تم جانِ غزل جانِ غزل جانِ غزل ہو

تم گلشنِ عالم میں ہو وہ حسنِ مجسم   بھونروں کا ہے جس کے لئے گفتنی عالم
بلبل کی نظر جس پہ لگی رہتی ہے ہر دم   نہلاتی ہے اشکوں سے جسے باغ میں شبنم
چمپا ہو چنبیلی ہو گلِ تر ہو کنول ہو
تم جانِ غزل جانِ غزل جانِ غزل ہو

تم وامق و فرہاد کے خوابوں کی ہو تعبیر — تم قیس کے وحشت زدہ پاؤں کی ہو زنجیر
تم ترکش کیوپڈ سے ہو نکلا ہوا اک تیر — تم رانجھا کی بنیاد محبت کی ہو تعمیر

تم نقش اجنتا ہو حسیں تاج محل ہو
تم جانِ غزل، جانِ غزل، جانِ غزل ہو

وہ پھول ہو تم جس کی جدا سب سے ہے بو باس — اللہ نے بخشی ہے تمھیں خوشبوئے انفاس
نکہت سے تمھاری ہے بسا دامن احساس — تم نازش صد لعل ہو تم غیرت الماس

تم شاخ جوانی پہ ابھرتا ہوا پھل ہو
تم جانِ غزل، جانِ غزل، جانِ غزل ہو

ہر گام قدم بوس ہیں شبنم کے ستارے — ششدر ہیں متعجب دیکھ کے فطرت کے نظارے
بیتاب تماشہ ہیں مچلتے ہوئے دھارے — پھیلائے ہوئے ہاتھ ہیں دریا کے کنارے

تم ندی کی آغوش میں بہتا ہوا جل ہو
تم جانِ غزل، جانِ غزل، جانِ غزل ہو

بے رنگ ہے جسے دیکھ کے قصر سلیماں — سر اپنا جھکاتی ہے جہاں صنعت انساں
نظارۂ فطرت ہے جہاں خلد بداماں — ہوتے ہیں جہاں شام و سحر آکے غزلخواں

تم شام اودھ کا وہ حسیں رنگ محل ہو
تم جانِ غزل، جانِ غزل، جانِ غزل ہو

تم نغمۂ پرکیف کا ہو ایک حسیں ساز — دھڑکا ہے جسے سن کے دل حافظ شیراز
تم مانی و بہزاد کے ہاتھوں کا ہو اعجاز — تم طائر تخئیل کی ہو قوت پرواز

تم سحر تفکر کا حسیں ردِ عمل ہو
تم جانِ غزل، جانِ غزل، جانِ غزل ہو

نہالؔ رضوی

غزل

نہ پہنا ہے نہ پہنے گی لباس انکسار آتش
روش شبنم کی سہ سکتی نہیں ہے اختیار آتش

غم الفت چھپانا اس طرح توہین الفت ہے
عطھریانی سمجھ کر پینے والے بار بار آتش

گلے شعلوں سے ملنا مسکرا کر یہ بتاتا ہے
نظر آتی ہے پروانے کو شہر لالہ زار آتش

گلستاں کے تحفظ کی ضمانت اپنے ذمے لے
نشیمن کے جلانے کو اگر ہے بے قرار آتش

نگاہ دوست میں اپنی جگہ پانے نگاہوں میں
بدلتی جاتی ہے اپنا چلن اپنا شعار آتش

خزاں کی حکمرانی جسکے شعلے ختم کر دیں گے
لگائے گی چمن اندر چمن ایسی بہار آتش

حیات عشق کی آفاقیت سے جو عبارت ہے
پلا دے مسکرا کر بھی وہی اے چشم یار آتش

اگر دل شاد ہو تو ہر نفس دنیا ہے نغموں کی
ہے افسردہ دلوں کے واسطے صورت ہزار آتش

بدلنا صورت و سیرت کا ورنہ غیر ممکن تھا
نہالؔ اہل محبت سے اگر کرتی نہ پیار آتش

سعیدؔ عارفی

غزل

سورج کو ترے درد سے منسوب کیا ہے
تب جا کے تخیل کو نیا روپ ملا ہے

کمرے میں دریچوں سے اتر آئی ہیں کرنیں
لیکن کوئی ایسے میں بھی بستر پہ پڑا ہے

اس دور کے ہنگاموں میں ہم بھول گئے ہیں
انسان کا انسان سے کیا ربط رہا ہے

ہر چوٹ کے ہر زخم کے احساس کو تم نے
کب ہم نفسو! میری طرح پیار کیا ہے

یادوں کا اُجالا بھی بڑی چیز ہے، یارو
کس سوچ میں ہو چاند اگر ڈوب گیا ہے

صحراؤں میں گم ہو گئے قربت کے زمانے
اب تک دل بیتاب انہیں ڈھونڈھ رہا ہے

دے اں تو دعائیں کہ سعیدؔ اسکی نظر سے
کل رات سر بزم مرا قتل ہوا ہے

"جوئے شیر"

روشن پٹیالوی

سل نہیں سکتا یہ ہرگز چاک ہے تقدیر کا
کام آئے گا نہ ٹانکا سوزنِ تدبیر کا

کیا بدل جائے گا رُخ میری بُری تقدیر کا
دوستو! انجام کیا ہوگا میری تدبیر کا

خوبیٔ قسمت سے ہم کو غم ملا ہے لادوا
کیا شکایت آپ کی یا کیا گلہ تقدیر کا

انتہائے عشق کا جذبہ سلامت چاہئے
کوہکن! مشکل نہیں کچھ کام جوئے شیر کا

زندگی کی ایک بھی ساعت نہ گزری چین سے
یہ کرم ہم پر ہوا ہے آسمانِ پیر کا

حسرتوں کی گود میں ہے عاشقِ حرماں نصیب
اِک تصور ہی سہارا ہے دلِ دلگیر کا

کردیا مرقوم دردِ عشق قسمت میں میری
یہ بڑا احساں ہے مجھ پر کاتبِ تقدیر کا

ساغرِ مے سے ہے زاہد بدگماں بے سبب
تیرے ایماں کی قسم یہ جام ہے اکسیر کا

کھلکھلا کر میں ہنسا جب رُو برُو ان کے ہوا
یہ نیا پہلو نکالا شوق نے تقصیر کا

سر کٹانے کے لئے جب جھک گیا جانبازِ عشق
پھر گیا رُخ کے لئے ظالم تیری شمشیر کا

جب اندھیرا ابر کا چھایا وفا کی راہ پر
لڑکھڑایا ہر قدم پھر عشق کے رہگیر کا

سنگدل سے سنگدل انسان بھی ہوتا ہے رام
کون ہے قائل نہ ہو جو حسنِ عالمگیر کا

جلوہ آرائی ہوئی ہے بزم گاہِ ناز میں
کون بنتا ہے ہدف دیکھیں نظر کے تیر کا

جلوہ گاہِ نورِ یزدانی نہ ہو کیوں میرا دل
عکس اس میں ہے کسی کے روئے پُر تنویر کا

دل کے بہلانے کو ہی لکھتا ہے گو اشعار تو
پھر بھی قائل ہے ہر اک روشن تیری تحریر کا

جرأتِ پیماں —— قتیل فیروز پوری

پاسِ خودی تھا جراتِ پیماں نہ کر سکے
ہم تیرگی کے دل میں چراغاں نہ کر سکے

بدنام کر گئے وہی جشنِ بہار کو
فصلِ خزاں میں خود کو جو ویراں نہ کر سکے

تیری نظر سے گر کے فلک کو تو چھو لیا
لیکن کسی نگاہ کا ارماں نہ کر سکے

کس کو نہیں کیا مرے نغموں نے اشکبار
بس ایک آپ ہی کو پریشاں نہ کر سکے

رگ رگ سے خون پی کے بھی تیری گلی کے لوگ
میرے جنوں کی موت کا ساماں نہ کر سکے

اے شیخ مے نے کچھ تو سیا زخمِ روح کو
دیر و حرم تو اتنا بھی ارماں نہ کر سکے

تعظیمِ حسن ہو تو یہ کہنا نہیں بجا
ہم ایک دن بھی ان کو پریشاں نہ کر سکے

رقصاں ہے نشتر کی طرح دل میں اے قتیل
وہ اک نگاہ ہم جسے مہماں نہ کر سکے

وسیم انصاری رُدولوی

غزل

تجھے دیکھا ہے تیری شکل و صورت کہہ نہیں پاتے
زباں رکھتے ہوئے اہل بصیرت کہہ نہیں پاتے

ہم اپنے عشق کی رنگیں حکایت کہہ نہیں پاتے
نہ رُسوا ہو کہیں حسن محبت کہہ نہیں پاتے

مُشابہہ ہیں بہت کچھ پھر بھی سُن لو اے وطن والو!
کہ ہم صبح وطن کو شام غربت کہہ نہیں پاتے

گریباں کو بتاتے ہیں کرشمہ دشتِ وحشت کا
مگر اُن کے تبسم کی حکایت کہہ نہیں پاتے

گلوں کو چاک دامن فصلِ گل میں جب سے دیکھا ہے
فسانہ ہم بعنوانِ محبت کہہ نہیں پاتے

محبت کو ہم افسانہ بنا کر پیش کرتے ہیں
قیامت ہے حقیقت کو، حقیقت کہہ نہیں پاتے

یہ مانا خوف ہے دار و رسن کا حق کے کہنے میں
مگر اندھیر ہے ظلمت کو ظلمت کہہ نہیں پاتے

ترے جلوے نظر کے سامنے ہر وقت رہتے ہیں
مگر کیسی ہے تیری شکل و صورت کہہ نہیں پاتے

اقبال عظیم

غزل

ایک دورِ زندگی یوں ناگہاں یاد آگیا
لمحہ لمحہ داستاں در داستاں یاد آگیا

جس سفر کی یاد سے وابستہ ہیں کچھ حادثات
وہ سفر پھر کارواں در کارواں یاد آگیا

جن چراغوں کو بجھا کر ہم اُٹھے تھے بزم سے
وقت رخصت اُن چراغوں کا دھواں یاد آگیا

امتیاز تلخ و شیریں فاصلوں میں کھو گیا
مہرباں یاد آگیا، نامہرباں یاد آگیا

رنگ و بو سے برق و گلچیں تک سبھی یاد آگئے
ظاہر و باطن تمام گلستاں یاد آگیا

چند تنکے، چند شعلے، کچھ سہارے، کچھ فریب
وہ چمن، وہ آشیاں، وہ باغباں یاد آگیا

توڑ پھینکا تھا جسے، قفل درِ زنداں کے ساتھ
تو گرفتاری میں وہ طوقِ گراں یاد آگیا

خلوت و جلوت کے سب یاد آگئے رازو نیاز
دوستوں کے ساتھ ساتھ، اک بدگماں یاد آگیا

باوجودِ ضبط غم، پلکیں بھی نم، دامن بھی نم
اپنے اس عالم میں اک تسکینِ جاں یاد آگیا

مضطرب سا اک تبسم، پردہ دارِ رازِ دل
وہ بغیر گفتگو، طرزِ بیاں یاد آگیا

پرویز رحمانی

غزل

روٹھے ہوئے ایام گذشتہ کے ہیں سائے
کب تک کوئی اب زیست کا پھر بار اٹھائے

خوابوں کا محل آپ سجائے ہوئے رکھئے
ممکن ہے دریچے سے کوئی جھانک ہی جائے

اس دور کی تہذیب کی بنیاد ہے اس پر
کچھ ہو تو وچن جائے مگر جان نہ جائے

آواز کی نگری کا پتہ پوچھ رہا ہوں
امید کے کاندھے پہ غزل اپنی اٹھائے

ڈرتا ہوں کہ سویا ہے جو طوفاں مرے اندر
پھر درد کی ٹھوکر سے کہیں جاگ نہ جائے

جب زخم ملے کرب کے تب ہم نے بھی پرویز
افکار کے ماتھے سے سبھی نقش مٹا لئے

ساغر اعظمی

غزل

غموں کے پھول کھلیں گے وفا کے دامن میں
ادائے لطف و کرم ہے جفا کے دامن میں

کیا ہے عرش کے تاروں نے بڑھ کے جنکو سلام
وہ جلوہ بار ہیں آنسو خطا کے دامن میں

گرے ہیں راہ وفا میں جو اشک وحشی کے
متاع غم یہ ہیں رکھ لو اٹھا کے دامن میں

ہمیں نہیں ہیں مشیت بھی پیار کرتی ہیں
وہ بانکپن ہے فروزاں حیا کے دامن میں

خوشا نصیب بنام خلوص اہل کرم
ملے ہیں طنز کے نشتر چھپا کے دامن میں

یہ انقلاب زمانہ تو دیکھئے ساغر
ملے ہیں آگ کے شعلے صبا کے دامن میں

عبرتؔ بہرائچی

"فریبِ وفا"

آتا نہیں نظر کوئی غم آشنا کیساتھ
تنہا ہی لڑ رہا ہے جو موجِ بلا کیساتھ
خاموشیوں کے شہر میں سنتا ہوں میں جسے
ملتی ہوئی صدا ہے وہ میری صدا کیساتھ
رونے کا ہے خیال نہ ہنسنے کی آرزو
کچھ لوگ جی رہے ہیں اس اک ادا کیساتھ
بجلی بدل کے بھیس گلستاں میں آ گئی
اٹھکھیلیاں ہی کرتے رہے گل حیا کیساتھ
صحرائے زندگی میں اٹھاتا ہوں جب قدم
چلتے ہیں خضرِ راہ مری گردِ پا کیساتھ
یارانِ میکدہ سے کہو جام توڑ دیں
آمادۂ سفر ہیں گھٹائیں ہوا کیساتھ
اشکوں کے آبشار میں گم ہو گئی نظر
یارب یہ کیا ہوا ہے دلِ التجا کیساتھ

احمد تنویر

غزل

پلکیں میری بھیگ گئی ہیں کب تک آنسو پیا کروں
دل کی باتیں کہہ بھی ڈالوں کب تک لب کو سیا کروں
کبھی نہیں کہنا یہ درپن میرا اکھڑا سا سندر ہے
توڑ بھی دوں میں اسکو آخر آشا کب تک کیا کروں
دکھ میں ڈوبا دیکھ کے مجھکو سب کا من مسکاتا ہے
میں نے بھی جگ تیاگ دیا ہے کب تک یونہی جیا کروں
سب دلوں سے پیار کا رشتہ جوڑ رہا تھا لیکن اب
میں نے بھی منہ پھیر لیا ہے جھوٹا کب تک پیار کروں
سوچ رہا ہوں لوٹ چلوں اب بھول بھی جاؤں اسکو آخر
پتھر کی اس بستی میں آواز کب تک دیا کروں

غزل —— عمر اختر ردولوی

بجلی طرازی تیرے جلووں کی یہاں تک دیکھوں
پھول کھلتے ہوئے دامان خزاں تک دیکھوں
آکہ یوں چشم تمنا میں بسا لوں تجھ کو
تیری صورت ہی نظر آئے جہاں تک دیکھوں
بڑھ کے جاتی ہیں کہاں دیر و حرم کی راہیں
آج میں چل کے در پیر مغاں تک دیکھوں
اپنی آنکھوں کو بچھا کر ترا انداز خرام
آرزو ہے ترے قدموں کے نشاں تک دیکھوں
کفر سامانیٔ دل کا ہے تقاضہ پیہم
جلوۂ حسن بتاں کعبۂ جاں تک دیکھوں
حسن تاثیر کی صورت بھی کوئی ہے کہ نہیں
بات آئے جو کبھی دل سے زباں تک دیکھوں
تو نے رکھا نہ کہیں کا دل بیمار مجھے
ورنہ میں اور نگہ چارہ گراں تک دیکھوں
اٹھ کر لے درد جگر دل کے تڑپنے کا سماں
ٹھہر گئی نگہ برق تپاں تک دیکھوں
خرمن دل بھی جلا لوں میں ابھی شعلۂ عشق
پھر تجھے مرحلۂ سوز نہاں تک دیکھوں
زندگی کا بھی سفر ختم نہ ہو جائے کہیں
کوئی حد ہے میں تری راہ کہاں تک دیکھوں
جی میں ہے آئینہ لے دل ترا حیراں ہو نا
آئینہ دار ترے شیشہ گراں تک دیکھوں
دیکھنا چاہوں بھی تو اے دل مضطر تجھ میں
تاب ہی کب ہے جو بینائی جاں تک دیکھوں
دل وہ سودا نہیں لے چشم خریدار کہ میں
سر بازار پھروں سود و زیاں تک دیکھوں
بات تو جب ہے کہ شادابی گلشن کی بہار
خشک ہوتی ہوئی کانٹوں کی زباں تک دیکھوں
چشم فنکار میسر ہو تو میں بھی اختر
تیرے اشعار ترے حسن بیاں تک دیکھوں

غزل

آذر بارہ بنکوی

ہائے یہ برہم مزاجی ایک بسمل کے قریب
سنگ باری اور میرے شیشۂ دل کے قریب
میں گزر جاتا ہوں طوفانوں سے بے خوف و خطر
دل لرزتا ہے کہیں میرا تو ساحل کے قریب
جب اجل نے پردۂ غفلت اٹھایا تب کھلا
عمر بھر سے ہم کھڑے تھے اپنی منزل کے قریب
کیا خبر وہ آتش غم تھی کہ ان کی یاد تھی
آج اک شعلہ سا بھڑکا تھا مرے دل کے قریب
میں تو آذر خود تلا بیٹھا ہوں اپنے قتل پر
لا کے خنجر صرف رکھ دے کوئی قاتل کے قریب

ترنم

لکھنؤ



Editor:
NAJMA AKHLAQU

2(11)

ممبر آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس و ممبر آل انڈیا اردو اسمال نیوز پیپر ایڈیٹرز کونسل

حکومت جموں کشمیر کی لائبریریوں کیلئے منظور شدہ

ماہنامہ ترنم لکھنؤ

جلد نمبر ۳ ——— شمارہ نمبر ۱۱

مدیرہ ——— نجمہ اخلاق

غزلیں

افسانے

مضامین وغیرہ

• ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، مالک • طباعت • خوشنویس • قیمت فی پرچہ • سالانہ • مقام اشاعت •
• نجمہ اخلاق • نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۳ • نواب حیدر نقوی • ایک روپیہ • دس روپے • ۱۰۵، احتشام نگر لکھنؤ •
(۲۲۶۰۰۱)

سوز و ساز

سب سے پہلے ہم جناب ایم دتی نندن بہوگنا کو صوبۂ اتر پردیش کی قیادت سنبھالنے پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے امید کرتے ہیں کہ وہ پورے عزم و استقلال کے ساتھ عوام کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا کر ان کی روزمرہ کی تکالیف اور شکایات رفع کرنے پر توجہ دیں گے اور حتی المقدور عوامی مسائل کو حل کرنے میں دلچسپی لیں گے ساتھ ہی ساتھ اپنے صوبے کے پچھڑے ہوئے چھوٹی پونجی والے اردو اخبارات اور رسائل کی فلاح، بہبود اور بقا کے لئے کوشاں ہوں گے جیسا کہ انھوں نے حال ہی میں منعقدہ آل انڈیا اُردو ایڈیٹرس کانفرنس کے اجلاس ۲ر نومبر ۷۳ء میں کہا اس سلسلہ میں ان کی ذرا سی دلچسپی ہماری ترقی اور بقا کی ضامن ہو سکتی ہے اور ہم آسانی کے ساتھ اپنا کاروبار چلا سکتے ہیں جب وہ فرماتے ہیں کہ اردو ہمارے مشترکہ کلچر کا نشان ہے ہم اس کی حوصلہ افزائی کریں گے اور اسے ہر طرح سے مدد دیں گے، تو ان سے ہماری مانگ ہے صوبے سے نکلنے والے مقبول عام قومی یکجہتی کے علمبردار اردو ماہناموں کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے ماتحت تمام محکموں کے سربراہوں کو ایک خاص سرکلر جاری کریں کہ وہ ہمیں ہر ماہ مستقل اشتہار دیکر ہماری زندگی کی ضمانت دیں۔ محکموں کی فہرست انھیں ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش لکھنؤ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

اسی ضمن میں اس امر پر روشنی ڈالنا ضروری ہے کہ وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے اپنی تقریر میں جناب اندر کمار گجرال کو اردو اخبارات کے مرکزی مسائل حل کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا، آپ نے فرمایا کہ انھیں ہی اس مسئلہ میں پورے اختیارات دیدئے گئے ہیں اور وہ ہی اردو اخبارات و رسائل کی مرکز سے متعلق دشواریوں کو حل کرنے کے ذمہ دار ہیں ہماری گجرال صاحب سے درخواست ہے کہ کاغذ کی گرانی اور نایابی کا مسئلہ ان کے پیش نظر ہے ایسی صورت میں اگر وہ واقعی ہماری دشواریوں کو حل کرنا چاہتے ہیں تو وہ اردو کے تمام چھوٹے رسائل اور اخبارات کا نیوز پرنٹ کوٹہ مقرر کرانے اور انھیں ہر ماہ خاطر خواہ ڈی۔ اے، وی۔ پی سے اشتہارات دلوانے کے احکامات جاری کریں نیز ڈی۔ اے۔ وی۔ پی نے اشتہارات کے استحقاق کے لیے جو سخت شرائط عائد کر رکھی ہیں انھیں قدرے آسان اور نرم کریں تاکہ ہم انھیں پورا کرکے مرکزی محکمہ کے اشتہارات حاصل کر سکیں۔ اس سلسلہ میں آل انڈیا اُردو ایڈیٹرس کانفرنس کے ذمہ داران کی توجہ ادھر مبذول کرائی جاتی ہے کہ وہ مجموعی طور پر ہمارے ان دو اہم مطالبات کو جناب اندر کمار گجرال کے روبرو پیش کرا کے اسے منظور کرائیں کیونکہ موصوف اس نوع کے مطالبات اجتماعی طور پر انجمن کی جانب سے پیش کئے جانے کو پسند کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کی کانفرنس میں شمولیت اسی وقت ہمارے لئے مفید اور کارآمد ہو سکتی ہے جب وہ ہمارے لئے کچھ ٹھوس کام کرے۔

نومبر کا مہینہ بڑی ہماہمی میں گذرا۔ سب سے پہلے کل ہند غیر مسلم مصنفین کانفرنس ۱۰ر اور ۱۱ر نومبر ۱۹۷۳ء کو منعقد ہوئی جس کے روح رواں اُردو کے مشہور افسانہ نگار جناب رام لعل تھے، اس میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے ادیب، شاعر، نقاد اور صحافی تشریف لاکر شریک ہوئے اور سبھوں نے مل کر اسے کامیاب بنایا۔ جیسا کہ ہمیں پتہ چلا ہے اس کی کئی نشستیں ہوئیں اس طرح ہندو، سکھ، عیسائی ہر نکتۂ خیال و نظر کے حضرات نے رجعت پسندوں کی اس دلیل کو جھوٹا ثابت کر دیا کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے بلکہ اس کے متضاد اس کانفرنس نے یہ واضح کر دیا کہ اس کی آبیاری ہندوستان میں بسنے والے کروڑ ہا لوگوں نے رنگ و نسل اور عقائد و فرقوں سے بالاتر ہو کر کی ہے اسے پروان چڑھایا ہے ان کا اجتماع ایسا لگتا تھا جیسے بذات خود تمام نگار ایک قوم ہیں جن میں کسی قسم کا بھید بھاؤ نہیں ہے۔

کل ہند غیر مسلم مصنفین کانفرنس کے موقع پر ہم نے اپنا شمارہ " ہومیٹری نمبر " شائع کر کے اپنے خلوص کا ثبوت دیا تھا

جس کے سلسلہ میں ہمیں بہت سے تعریفی خطوط موصول ہوئے ہیں ہم ان تمام حضرات کے متشکر ہیں مگر یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ صرف تعریف و توصیف سے مسائل حل نہیں ہوتے کاغذ کی نایابی اور طباعت کی گرانی اظہر من الشمس ہے اس کے باوجود نہ ہم نے اپنے صفحات کم کئے ہیں نہ رسالہ کے دام بڑھائے ہیں اگر "ترنم" اور اردو زبان سے محبت ہے تو پوئٹری نمبر کے پہلے صفحہ پر شائع شدہ جناب رام لعل کی "خصوصی اپیل" پر توجہ مبذول کر کے جملہ دلدادگان اردو سے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں کچھ کام کرنے کی استدعا کی جاتی ہے۔

کل ہند غیر مسلم مصنفین کانفرنس کے اختتام کے چند ہی روز بعد آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس منعقد ہوئی جس کا سلسلہ ۱۶ ر نومبر کی شام سے شروع ہو گیا مگر اس کا باقاعدہ اجلاس ۱۷ ر نومبر سے شروع ہو کر ۱۹ ر نومبر تک رہا پہلے دن اجلاس میں ملک کی ہر دلعزیز وزیر اعظم محترمی اندرا گاندھی نے شرکت کی اور تقریر فرمائی جس کے چند الفاظ اوپر کی سطور میں دئے جا چکے ہیں ان کے بعد جناب اندر کمار گجرال نے تقریر فرمائی اس کے بعد ہمارے صوبہ کے وزیر اعلیٰ جناب ہیم وتی نندن بہوگنا نے تقریر فرمائی ان تمام حضرات کی تقاریر کے خلاصے ملک کے سیکڑوں اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں انھیں دہرانا مقصود نہیں مختصر یہ کہ ان سبھوں نے اردو کی عظمت، ہمہ گیری اور ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے اردو اخبارات صحافیوں اور ان سے متعلق مسائل کے بارے میں اپنے تأثرات کا اظہار کیا اور پورا پورا تعاون اور امداد کا وعدہ کیا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے طور پر کئے ہوئے وعدوں کا تکملہ کر کے ہمیں متشکر فرمائیں گے۔ اجلاس ۱۸ ر اور ۱۹ ر نومبر کو بھی چلا اور رسائل و جرائد کی نمائش ہوئی مختلف طبقۂ خیال کے لیڈروں نے اردو کے مسئلہ پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا جو بہت کامیاب رہا سب سے آخر میں دستور العمل پیش ہو کر چند ترمیمات کے بعد منظور ہوا پوری کانفرنس بہت کامیاب رہی کیونکہ ملک کے قریب قریب ہر صوبہ سے آئے ہوئے کئی سو مندوب صحافی بڑے انہماک اور جوش و خروش سے تمام کارروائیوں میں حصہ لیتے رہے۔

ماہ نومبر میں جہاں یہ سب کچھ ہوا وہاں ہمیں غم و اندوہ سے بھی دوچار ہونا پڑا اسی ماہ ہندوستان کے مشہور طنز شاعر سلام مچھلی شہری کو دست قضا نے ہم سے جدا کر دیا اور محترم سید شبیہ الحسن نونہروی شعبۂ اردو دانش گاہ لکھنؤ کی والدۂ گرامی جنت الفردوس سدھار گئیں۔ ان دونوں جانکاہ صدمات میں ادارۂ ترنم مرحومین کے وابستگان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور مرنے والوں کیلئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

نجمہ اخلاق

"ترنم کا پوئٹری نمبر"

ہم نے غیر مسلم مصنفین کانفرنس کے موقع پر اس کا پوئٹری نمبر شائع کیا تھا اس کی کچھ کاپیاں ہمارے پاس محفوظ ہیں جس کی قیمت ایک روپیہ ہے مگر ہم یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ جو حضرات اس کے خواہش مند ہوں وہ ہمیں ترنم کا سالانہ چندہ مبلغ دس روپے بذریعہ منی آرڈر مرحمت فرمائیں ہم بشمول پوئٹری نمبر ان کی خدمت میں ایک سال تک ترنم برابر ارسال کرتے رہیں گے آپ کی ادب نوازی سے یہ توقع بعید از امکان نہیں کیوں کہ اردو کے لیے اسّی پیسے ماہانہ آپ کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ «ادارہ»

غزل

جگن ناتھ آزاد

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو تو اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری

بہا ملتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتائے پیرِ میخانہ کہ میخانوں پہ کیا گزری

فضائیں ہر طرف کیوں دھجیاں آوارہ ہیں ان کی
جنونِ سرفروشی تیرے افسانوں پہ کیا گزری

وصالِ شمع کی حسرت میں سب بیتاب پھرتے ہیں
حضورِ شمع پروانوں پہ کیا گزری

کہو تم نے کیا فسوں پھونکا
یہ حیوانوں پہ کیا گزری

کہو دیر و حرم والوں پہ کیا بیتی
خدا سمجھے صنم خانوں پہ کیا گزری

نشانِ برگِ گل تک بھی نظر آتا نہیں ہم کو
سمجھ میں کچھ نہیں آتا گلستانوں پہ کیا گزری

جہاں نورِ سحر کے بھی قدم جمنے نہ پاتے تھے
بتائے کون آخر ان شبستانوں پہ کیا گزری

وہ رنگ و نور سے بھرپور ریستانوں پہ کیا بیتی
شباب و شعر سے معمور کاشانوں پہ کیا گزری

ابھی تو چشمِ عبرت وقت کی رفتار دیکھے گی
ابھی کس طرح کہہ دیں ہم کہ ویرانوں پہ کیا گزری

ابھی آزاد اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ
ابھی کچھ ... بیگانوں پہ کیا گزری

اظہار اثر

سمندروں پہ جہاں ہو گیا اختیار مجھے
بلا رہا ہے وہی دشت بے کنار مجھے

ترے لہو میں نہ گھل جاؤں میں جنوں بنکر
خدا کے واسطے شیشے میں مت اتار مجھے

گلی گلی سے گذرتا ہوا بگولا سا
تمام شہر نے دیکھا ہے بے قرار مجھے

تمام عمر میں سرکش رہا ہوں دنیا سے
بڑا عجیب سا لگتا ہے انکسار مجھے

ترے بدن کے خد و خال لیکے آیا ہے
ستا رہا ہے بہت موسمِ بہار مجھے

نہ دیکھئے مری جانب نگاہِ حیرت سے
نہ کیجئے بھری محفل میں شرمسار مجھے

اثر ہوائیں ہیں کب سے مرے تعاقب میں
بکھر رہی ہیں کسی دشت میں غبار مجھے

مظفر انشاء ناز

غزل

دل کا ہر زخم پھر مسکرانے لگا
لوئی بھولا ہوا یاد آنے لگا

کسقدر تیز ہے زندگی کا نشہ
بن پیے دل میرا لڑکھڑانے لگا

زخم ابھرے تھے پلکوں پہ تیری مگر
دامنِ دل مرا بھیگ جانے لگا

کتنا چاہا خیالوں پہ پہرے لگیں
پھر مسلسل کوئی یاد آنے لگا

بیار کا ایک بندھن تھا وہ بھی تو ناز
بیگانگی سے اب ٹوٹ جانے لگا

اختر بستوی

ریاضت رائگاں

یں وہ گوتم بدھ ہوں جس نے ترک کی دنیا، مگر
ہو نہ پائی ذہن و دل کو دولت عرفاں نصیب
یں نے ہر ہر طرح ڈھونڈیں آگہی کی منزلیں
جستجو لیکن نہ پہنچی کامیابی کے قریب
مل گئی کوسی[1] ندی بھی اور شب مہتاب بھی
آشکارا ہو سکا پھر بھی نہ رمز کائنات
عمر بھر فکری ریاضت کی، مگر سوجھی نہیں
اپنے اور دنیا کے دکھ کے واسطے راہِ نجات

---

[1] مہاتما گوتم بدھ کو کوسی ندی کے کنارے چاندنی رات میں فکری ریاضت کرتے ہوئے عرفان ملا تھا۔ (اختر بستوی)

غزلیں

نفیس غازیپوری

ہو جو حاصل خوشی غم کے ماروں کو بھی
کچھ سہارا ملے بے سہاروں کو بھی
رونق میکدہ جن سے ہے ساقیا
ایک دو گھونٹ اُن بادہ خواروں کو بھی
حسن والوں سے کوئی توقع نہیں
ہم نے دیکھا ہے اِن ماہ پاروں کو بھی
جن بہاروں میں دل کا چمن جل گیا
آگ لگ جائے کاش اُن بہاروں کو بھی
اُس نہیں، ہیں بھی، ہاں، نفی نہ سمجھے یہ ہم
ناسمجھ تھے نہ سمجھے اشاروں کو بھی
جس کی صحرا نوردی تھی روحِ وفا
یاد ہے قیس وہ ریگ زاروں کو بھی
سو رہو رات کاٹی گئی اب نفیس
نیند آنے لگی چاند تاروں کو بھی

سعید عارفی

اپنے کو چھپاتی ہیں ٹھکرائی ہوئی غزلیں
سمٹی چلی جاتی ہیں پچھتائی ہوئی غزلیں
دو چار گھڑی ہم بھی ہنس بول کے جی لیتے
وجدان پہ چھا جاتیں شرمائی ہوئی غزلیں
میں شوق کی منزل سے جس وقت گذرتا ہوں
آئینہ دکھاتی ہیں اترائی ہوئی غزلیں
خوابوں کے جزیرے میں جاتے ہوئے ڈرتا ہوں
احساس جگا دیں گی من بھائی ہوئی غزلیں
اس دورِ ترقی میں ڈھونڈے سے نہیں ملتیں
پاکیزہ تبسم میں نہلائی ہوئی غزلیں
سنتے ہیں سعید اکثر تنہائی کے عالم میں
وہ شوق سے پڑھتا ہے گدرائی ہوئی غزلیں

اظہار وارثی

باقی وفا کا نام رہے گا جفا کے ساتھ
اک ربط ہے چراغ کو ظالم ہوا کے ساتھ

ناکامیوں سے مٹ نہ سکے دل کے حوصلے
اک آس پل رہی ہے ہجوم بلا کے ساتھ

راہ وفا کو پھر نہ رہی روشنی کی پیاس
جلتے گئے چراغ مرے نقش پا کے ساتھ

آواز دے رہی ہے اجالے کو تیرگی
جو میرا ہمسفر ہو چلے دل جلا کے ساتھ

اپنے ہی بازوؤں پہ رہا جب نہ اعتماد
بندے خدا کے ڈوب گئے ناخدا کے ساتھ

پنہاں کس آستیں میں ہے خنجر کسے خبر
ہوتا ہے اب ستم تو فریب وفا کے ساتھ

[illegible] ہیں قتل گاہ لہو کی پکار سے
انصاف ہو رہا ہے کسی بے خطا کے ساتھ

محمود خاں محمود

کیا میکدے میں رندنشیں پارسا کی بات
سنتا نہیں ہے کوئی یہاں پر خدا کی بات

کتنی بھی ہو زمانے میں فہم و رسا کی بات
لیکن خدا کی بات ہے پھر بھی خدا کی بات

تصدیق کر رہے ہیں زمانے کے حق پسند
ہر اک زبان پر ہے ہماری وفا کی بات

اے ناشناس درد تجھے میری کیا خبر
تو نے سنی ہی کب دلِ غم آشنا کی بات

طوفاں نے خود سفینہ کنارے لگا دیا
رکھ لی مرے خدا نے مرے ناخدا کی بات

کیا کیا تخیلات کے لمحے تھے دلفریب
تا دیر دل ہی دل میں کل ان سے ہوا کی بات

محمود مانگنا ہو تمھیں جو بھی مانگ لو
ہرگز کبھی وہ رد نہیں کرتا گدا کی بات

روحِ سخن کا ایک ورق

ہم قافیہ اشعار

مرتبہ پنڈت سوامی دیال بسوانی

جلیل مانکپوری ـ ساقیا دیر نہ کر گردشِ مے لانے میں
جان پیاسوں کی پڑی ہے ترے پیمانے میں

جگر بسوانی ـ جو مقدر کا ہے مل جائے گا میخانے میں
خطِ تقدیر نہیں ساقی ترے پیمانے میں

ولی شاہجہانپوری ـ مست شوق آیا ہوں ساقی ترے میخانے میں
جوش بھرنا ہے چھلکتے ہوئے پیمانے میں

نادر لکھنوی ـ مضطرب روح کوئی آ گئی مے خانے میں
خود بخود مے کو ہے گردش مرے پیمانے میں

فضا بسوانی ـ جوش ایسا ہو مئے کہنہ کو میخانے میں
خم سے آ جائے چھلک کر مرے پیمانے میں

اثر لکھنوی ـ رات مستی کا یہ انداز تھا میخانے میں
بجلیاں کوندتی تھیں شیشے میں پیمانے میں

جگر مرادآبادی ـ سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے میخانے میں
خلد شیشے میں ہے فردوس ہے پیمانے میں

آرزو لکھنوی ـ گم ہے احساس خودی ہوش کے میخانے میں
بھر کے ساقی نے یہ کیا دے دیا پیمانے میں

باسط بسوانی ـ فصلِ گل آئی ہے پھر دھوم ہو میخانے میں
مئے گلرنگ چھلکتی رہے پیمانے میں

نور شاہجہانپوری ـ نہ تو کعبے ہی میں ملتا ہے نہ بت خانے میں
کچھ جھلک تیری جو ملتی ہے تو پیمانے میں

دواکر راہی ـ اب تو اتنی بھی میسر نہیں میخانے میں
جتنی ہم چھوڑ دیا کرتے تھے پیمانے میں

معز لکھنوی ـ کون یہ گرم نظر آ گیا میخانے میں
لگ گئی آگ چھلکتے ہوئے پیمانے میں

جلیل مانکپوری ـ ساقیا توبہ شکن فصلِ بہار آنے دے
خون توبہ کا بھریں گے ترے پیمانے میں

ریاض خیرآبادی ـ دیدے تو میری جوانی ترے صدقے ساقی
ہے وہی ترے چھلکتے ہوئے پیمانے میں

فضا بسوانی ـ ٹپکی پڑتی ہے تری آنکھ میں مستی ساقی
اتنی مے ہے کہ سماتی نہیں پیمانے میں

ولی شاہجہانپوری ـ کس ترحم سے دمِ نزع کسی نے دیکھا
روح ڈالی ہے مرے عمر کے پیمانے میں

اثر لکھنوی ـ امتحانِ ظرف کا منظور جو تھا ساقی کو
دی مئے بے خبری ہوش کے پیمانے میں

واقف بسوانی ـ کس کے لب پر تھی ہنسی چوم لیا منہ کس نے
باتیں ہوتی ہیں یہی شیشے میں پیمانے میں

باسط بسوانی ـ دور میں رند چہک اٹھتے ہیں بلبل کی طرح
مئے گلرنگ ہے یا پھول ہے پیمانے میں

نشاط بسوانی ـ نشۂ نظم سے کیوں میں نہ رہوں مست نشاط
بادۂ فیضِ جگر ہے مرے پیمانے میں

خمار بارہ بنکوی ـ شرم رکھ لے مری توبہ شکنی کی ساقی
میکدہ سارا الٹ دے مرے پیمانے میں

سرور جہاں آبادی ـ مجھ سے میخوار کو سیری نہیں ہوتی ساقی
ڈھال دے اور ذرا سی مئے پیمانے میں

نور شاہجہانپوری ـ غیر مستی میں کہے دیتا ہے سب عشق کے راز
تم نے کیا دے دیا کم ظرف کو پیمانے میں

ناتک لکھنوی ـ حاصلِ بادہ پرستی ہے یہی اے ناتک
دل کی تصویر نظر آتی ہے پیمانے میں

ندرت نواز

تأثرات

دن کی طرح اُجلا ہے شب کی طرح میلا ہے
یہ پیار کا آئینہ کیا سمجھے کوئی کیا ہے
دل کس کو دکھاؤ گے، غم کس کو سناؤ گے
جو آنکھ ہے اندھی ہے، جو کان ہے بہرا ہے
تم وقت کی راہوں میں کس آس پہ بیٹھے ہو
آغاز کے ہاتھوں میں انجام کا چہرا ہے
راتوں کے سمندر سے خوابوں کو چُنتے جاؤ
جو خواب حقیقت ہو مشکل سے ہی ملتا ہے
وہ لمحے جنھیں کل تک ہم پھول سمجھتے تھے
اُن لمحوں کے چہروں سے اب خون ٹپکتا ہے
وہ شعلہ بدن یارو یوں اُترا ہے آنکھوں میں
جس شے پہ نظر ڈالو شعلہ سا لپکتا ہے

نسیم صدیقی

غزل

یوں ہی سرد آہیں جو بھرتے رہیں گے
فضاؤں میں نغمے بکھرتے رہیں گے
تصور کی آغوش میں تم کو لے کر
یونہی گفتگو تم سے کرتے رہیں گے
اُمیدوں کے اور آرزوؤں کے لشکر
دلوں میں قیام اپنا کرتے رہیں گے
ترے دل کے آنگن میں اے میرے ہمدم
یونہی زینہ زینہ اترتے رہیں گے
ہوں کتنی ہی دشواریاں راستے میں
تعاقب مگر ان کا کرتے رہیں گے
غم عاشقی میں وفا کی جو دل نے
تو ہم درد بن کر ابھرتے رہیں گے
نسیم اپنے خوں سے منا کر چراغاں
اُجالوں کو رنگین کرتے رہیں گے

غزلیں

منظور ہاشمی

ابھی یہ کھیل تلاطم بہت دکھائے گا
کبھی ڈبوئے گا مجھ کو کبھی بچائے گا

طلسم کوہ ندا جب بھی ٹوٹ جائے گا
تو کاروانِ صدا بھی پلٹ کے آئے گا

کھنچی رہینگی سروں پر اگر یہ تلواریں
متاعِ زیست کا احساس بڑھتا جائے گا

ہوائیں لے کے اڑیں گی تو برگ آوارہ
نشان کتنے نئے راستوں کا پائے گا

کواڑ اپنے اسی ڈر سے کھولتے ہی نہیں
سوا ہوا کے انھیں کون کھٹکھٹائے گا

میں اپنے قتل پہ چیخا تو دور دور تلک
سکوتِ دشت میں اک ارتعاش آئے گا

ہوائیں گرد سے ہر راستے کو ڈھک دینگی
ہمارے بعد کوئی قافلہ نہ جائے گا

یونہی ڈبوتا رہا کشتیاں اگر سیلاب
تو سطحِ آب پہ چلنا بھی آ ہی جائے گا

انور پانی پتی

غم کی لذت دوام ہو نہ سکی
زیست پابند جام ہو نہ سکی

زندگی نذرِ جام ہو نہ سکی
باعثِ احترام ہو نہ سکی

دلکشی اس غزل میں کیا آتی
گلرخوں کے جو نام ہو نہ سکی

شہر خوباں کی داستاں کے بغیر
فکر عالی مقام ہو نہ سکی

ندرتِ فن نے خودکشی کرلی
فکر جب تیز گام ہو نہ سکی

میری نظر دل کی ایک لغزش سے
دل کی دھڑکن پیام ہو نہ سکی

صبح تو تھی حسیں بہت حسیں انور
خوبصورت یہ شام ہو نہ سکی

غزلیں

عبدالحفیظ آتش

اس دور کا بدلا ہوا انسان خدا ہے
حالات کے اُترے ہوئے چہروں پہ لکھا ہے
جو بات نکلتی ہے زباں سے وہ ادھوری
کیا جانے کوئی ضبط کے پردے میں کہ کیا ہے
کیوں رات کے آنگن میں بکھرتی ہے سیاہی
کیوں دن کے ہی دامن میں اجالوں کو سیا ہے
صدیوں بھی نہیں لوٹ کے آجانے کی اُمید
جو رنگِ حیا چہرۂ مشرق سے اُڑا ہے
ہر جنگ کا انجام ہے نسلوں کی تباہی
ہر فتح نے ہی موت کا اعلان کیا ہے
ہے کس کے تبسم سے مزین شب تاریک
یہ کون ہے جو آج یہاں جلوہ نما ہے
آتش ہی نے نغموں میں سمویا ہے ہر اک درد
الفاظ کے آئینوں میں ہر عکس جُدا ہے

سید مرتضیٰ خوشتر

جو پیش آتے ہیں ہر شخص سے بھلوں کی طرح
اُنھیں سمجھتے ہیں کیوں لوگ پاگلوں کی طرح
کسی کی یاد کے نقش و نگار دیرینہ
نکھر گئے ہیں مرے دل میں ولولوں کی طرح
گریز کرتے ہیں وہ آج میرے سائے سے
کبھی تھا آنکھوں میں جن کی میں کاجلوں کی طرح
کوئی تو چوٹ پڑی ہوگی اس کے دل پہ ضرور
جو شخص چیختا رہتا ہے پاگلوں کی طرح
برس نہ جائیں یہ اپنے تھمے ہوئے آنسو
دھواں سا کیا ہے یہ ہر سمت بادلوں کی طرح
بہار بن کے رہے جو مرے گلستاں میں
اب ان کی یاد مہکتی ہے آنچلوں کی طرح
حسد کی آگ میں جو لوگ جلتے ہیں خوشتر
وجود اپنا جلاتے ہیں مشعلوں کی طرح

رام لعل

باغی

میں تمام رات سو نہ سکا۔ بات یوں تھی۔

ماہ اکتوبر کی سہ پہر تھی۔ ایسا مہینہ اور ایسا وقت جب گرمی اور سردی صبح اور شام گلے ملتے ہیں۔ میں اپنی لائبریری میں بیٹھا اگلے دن کے کلاس کے لئے لکچر تیار کر رہا تھا۔ اور رہ رہ کے موجودہ نسل کے نوجوانوں کی طرف دھیان جاتا تھا۔ اور اپنی اس محنت کو تضیع اوقات سمجھ رہا تھا کیونکہ موجودہ طلباء کو نہ تو پڑھائی کی ضرورت ہے۔ اور نہ پروفیسر کی۔ میں ان ہی خیالات میں مگن تھا۔
کہ آواز آئی۔

"ہی۔ پاپا۔" آواز مانوس تھی۔

میں نے نظریں اٹھائیں۔ میرا اکلوتا لڑکا جو انجینئرنگ کے فائنل ایئر کا ہونہار طالب علم تھا۔ چھٹیوں میں گھر آیا تھا۔ اور یہ موجودہ نسل کا طرز تخاطب تھا۔ پرنام۔ پالاگن۔ نمسکار تو خیر پرانی باتیں تھیں۔ لیکن "ہی" یہ میرے کانوں کے لئے نیا تھا۔ اور میرے اپنے بچے کا چہرہ بھی غیر مانوس تھا۔ ہے تو انہونی سی بات لیکن حقیقت ہے۔ کہ اس حلیہ میں میں اسے پہچان نہ پایا۔

لمبے لمبے بال۔ دونوں طرف ڈھلکی ہوئی مونچھیں۔ ٹھوڑی پر بکری سی داڑھی۔ نیچے پتلون۔ اوپر کرتا۔ کرتے پہ رنگ برنگی واسکٹ۔ اور گلے میں دو تین عجب فیشن کی مالائیں۔

"ہلو تم" میرے منھ سے نہ جگ جگ جیئو نکلا۔ نہ کیسے ہو کب آئے۔ پوچھا۔ اور شاید اسے اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس نے ایک کرسی کھسکائی۔ میری کتابوں والی میز پر ٹانگیں اطمینان سے پسار دیں۔ پتلون کی جیب سے ایک مسلا ہوا ادھ جلا سگرٹ نکالا۔ میرے لائیٹر سے سلگایا۔ اور لپکتا ہوا شعلہ میرے ادھ بجھے سگار کی طرف بڑھایا۔ اس جسارت پہ میں دم بخود سا رہ گیا۔ ہمارے قدیم اور شریف خاندان میں ایسی بات کبھی نہ ہوئی تھی۔

اور اس رات میں سو نہ سکا —!

تمام رات مجھے رہ رہ کے اس کے بے ڈھنگے لباس اور عجیب وضع قطع کا دھیان رہا۔ اور نہ معلوم کیوں اس کی مشابہت میرے پردادا کی تصویر سے تھی۔ ہمارے آبائی مکان کے نشست کے کمرے میں ہمارے بزرگوں کی بڑی بڑی تصویریں ہیں۔ جن کے بڑے بڑے کاموں کا ہم ہمیشہ پرانے اور نئے مہمانوں کے سامنے بڑے فخر سے ذکر کیا کرتے ہیں۔ میرے پردادا کی بھی مونچھیں ہونٹوں کے دونوں کناروں پہ ڈھلکی ہوئی تھیں۔ ٹھوڑی پہ چھوٹی سی داڑھی۔ انھوں نے بھی واسکٹ زیب تن کی ہوئی ہے۔ جس کی اوپر کی جیب سے گھڑی کی ایک موٹی سی زنجیر ہویدا ہے۔ جیسے اس فصل کے نوجوانوں کی مالا۔ لیکن یہ تصویر تو ایک صدی پرانی ہے — جب شاید کیمرے نئے نئے ایجاد ہوئے ہوں گے۔ لیکن آج —

میرے دادا ہمارے بچپن میں اسی نشست کے کمرے میں تخت پوش پر آلتی پالتی مار کے جسم کے ارد گرد کشمیری گرم شال لپیٹ کے اپنے باپ کی کہانی بہت مزے لے کے سنایا کرتے تھے۔ یہ کہانی انھوں نے اپنے دادا یعنی میرے لکڑ دادا سے سنی تھی۔ جبکہ میرے پردادا نے بھی بغاوت کی تھی۔ اور میرے دادا ہنس کے

بتایا کرتے تھے۔ کہ جب وہ ڈاکٹر بنے۔ تو ہمارے خاندان میں زلزلہ سا آ گیا۔ اور جب وہ اپنے آبائی گاؤں سے جو ضلع سیالکوٹ میں تھا۔ لاہور پڑھنے کے لئے گئے۔ تو میرے لکڑ دادا تمام رات سو نہ سکے۔

اور بات یوں تھی۔

کہ میرے لکڑ دادا اس قصبہ نما گاؤں کے ساہوکار بھی تھے اور حکیم وید بھی۔ پنجاب پر انگریزوں کا نیا نیا تسلط ہوا تھا۔ ہمارا خاندان تب بھی تعلیم یافتہ مشہور تھا۔ ہمارے لکڑ دادا بھی اردو۔ فارسی۔ ناگری اور گورمکھی پڑھے ہوئے تھے۔ اور اُن کے لڑکے نے تو باقاعدہ پنڈت اور مولوی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اِس نو عمری میں بھی میرے پر دادا بہی کھاتہ دیکھنے کے علاوہ اپنے باپ کا ہاتھ حکمت میں بٹایا کرتے تھے۔ نہ معلوم انگریزوں کو کیسے علم ہو گیا۔ کہ فلاں گاؤں میں فلاں کا لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ اور وہ اک دن گھوڑوں پہ دندناتے گئے۔ اور میرے لکڑ دادا سے ان کا لڑکا مانگ لیا۔ حاکم کے آگے کیا چلتی۔ لیکن لاہور کا لاکوسوں دور تھا۔ اور انگریزوں کی تعلیم۔ دونوں چیزیں مر یادا کے خلاف تھیں۔ میرے پر دادا کو بھی باہر جانا پسند نہ تھا۔ لیکن نہ معلوم کون کونسی طفل تسلیاں انھوں نے دیں۔ کہ جاتے ہی بنی۔ پہلا ایک سال تو خیریت سے گزرا۔ تعلیم ملی جلی پنجابی اردو اور ملی جلی انگریزی جو دیسی بھاشا میں لکھی جاتی تھی اس میں تھی لیکن دوسرے سال جب لاشیں چیرنے کا معاملہ درپیش ہوا۔

میرے دادا نے مسکرا کے کہانی سنائی۔

تو ان کے باپ بگڑ گئے۔ بھلا۔ براہمن نے کبھی مردے کو ہاتھ لگایا ہے۔ وہ لاہور سے پیدل ہی واپس چل دیئے۔ انگریزوں کو اطلاع ہوئی۔ اور ان کا پیچھا گھوڑوں پہ کیا۔ بس پھر یہ جا پکڑا۔ پنجاب کے گنے چنے ڈاکٹروں میں سے ایک [illegible] یہ اس وقت کی انگریزی حکومت کے اصول کے خلاف [illegible] ان کو ڈاکٹر بنانے پر تلے تھے۔ [illegible] زمانہ تھا۔ آج کل جگہ جگہ میڈیکل کالج کھل گئے ہیں۔ لوگ سفارش اور پیسہ دے کے بھی اپنے بچوں کو داخل نہیں کرا پاتے۔ ہزاروں امیدواروں کے حصے میں نا امیدی آتی ہے۔ اور تب امیدوار تعلیم کو دھتکارتا تھا۔ اور تعلیم دینے والے خوشامد کرتے تھے۔

ہاں۔ میرے پر دادا نے تین شرطیں رکھیں۔ ایک تو ان کے باپ کو لاش چیرنے کا علم نہ ہو۔ دوسرے جو شہر انھیں پسند ہو گا۔ وہاں ملازمت کریں گے۔ اور تیسرے جب تک ان کی مرضی ہوگی۔ وہ وہاں رہیں گے۔ یہ سب منظور ہو گئیں۔

میرے پر دادا تیس برس تک گوجرانوالہ شہر کی ایک ڈسپنسری کے انچارج رہے۔ لیکن پہلی شرط چھپانے سے چھپ نہ سکی۔ کسی پوسٹ مارٹم کی خبر میرے لکڑ دادا کو ہوئی۔ اور اس کے بعد نہ تو وہ مرتے دم تک اپنے لڑکے کے گھر گئے۔ اور نہ ہی اپنے گھر کے برتنوں میں انھیں کھانا دیا۔ لیکن میری لکڑ دادی نے اپنے بچے کے کانسی پیتل کے برتن ایک لکڑی کے صندوق میں گو علیحدہ رکھے تھے۔ لیکن اپنے خاوند کی غیر حاضری میں سنا ہے۔ وہ انھیں اپنے ہاتھوں سے مانجھ دھو کے رکھتی۔ اور کہار کو ہاتھ نہ لگانے دیتی۔ اور جب سے میرے لکڑ دادا اور پر دادا میں ناچاقی ہوئی تھی۔ میرے دادا کو اپنے دادا اور دادی سے بہت پیار ملا تھا۔ کیونکہ ان کے اپنے بچے کے حصے کا پیار بھی انھوں نے اپنے پوتے کے حوالے کر دیا تھا۔

لیکن میرے باپ سنایا کرتے تھے کہ میرے دادا نے اپنے باپ کو اس درجہ ناراض کر دیا تھا۔ کہ اُن کے تعلقات بھی کشیدہ ہو گئے۔ گو ٹوٹے نہیں۔ اور جب یہ بات ہوئی۔ تو میرے باپ کی نوجوانی کی عمر تھی۔ وہ بتلاتے ہیں۔ وہ کہتے تھے۔ کہ اس دن میرے پر دادا یعنی اُن کے دادا ساری رات نہیں سو سکے۔

بات یوں تھی کہ

تعلیم ہمارے گھر میں آ چکی تھی۔ انگریزوں نے جگہ جگہ اسکول کھول دیئے تھے۔ بہت سے اسکول تو مشن والوں کے تھے اور میرے دادا نے انھوں [illegible]

پاس بھی خال خال تھے۔ میرے پردادا نے خود ان کو میڈیکل کالج میں داخل کرا دیا تھا۔ ایک تو خود میرے دادا بہت لائق تھے۔ اور دوسرے ڈاکٹر کے لڑکے۔ داخلہ تو ملنا ہی جانا تھا۔ آج کل والی بات تو تھی نہیں۔ دادا جان چار سال میں ڈاکٹر بن گئے۔ اولاً دو تین جگہ کام کر کے ایک جگہ پہ اٹک گئے۔ اور بیس اکیس سال وہیں رہے۔ آنکھوں کے علاج کے ماہر تھے۔ انگریزوں کے خیرخواہ رائے بہادر بن گئے۔

ہمارے والد بھی براہمن زادہ کی بجائے رائے زادہ کہلانے لگے۔ اور ہم بچے بھی رائے بہادر کے خاندان میں سے تھے انگریزی راج کی برکتیں سب جگہ پہ نازل تھیں۔ تو ڈی پچوں کی قدر تھی۔ اور ہم تو جہاں تو ڈی خاندان میں سے تھے۔ ہاں بات پردادا اور دادی کی تھی۔

جب دادا کو خطاب ملا تو ان کی عمر مشکل سے پینتالیس برس کی تھی۔ اور والد صاحب سناتے ہیں۔ کہ ان کے دادا کوئی ۵۶ سال کے لگ بھگ۔ ہر طرف سے مبارک باد کا تانتا بندھا چلا آتا تھا۔ ہمارے دادا اب یا اس سے بھی پہلے۔ کوٹ پتلون اور پگڑی پہنتے تھے۔ کبھی کبھی شلوار۔ کوٹ اور نکٹائی اور سولا ہیٹ بھی لگا دیتے۔ ہمارے پردادا نے یہاں تک تو گوارا کیا۔ لیکن رائے بہادر بننے کے بعد جب انھوں نے اپنے انگریز حاکموں کو دعوت دینے کی سوچی۔ تو ہمارے پردادا بگڑے بڑے۔ لیکن پرانے زمانے کے لوگوں کو کون پوچھتا ہے۔ اور جب کرسی میز پہ بیٹھ کے ڈپٹی کمشنر صاحب۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب۔ سول سرجن صاحب۔ اور سشن جج صاحب جو سب کے سب انگریز تھے۔ انھوں نے ہندوستانی عمائدین خطاب یافتہ طبقے۔ اور خاندانی رئیسوں۔ جاگیرداروں اور زمینداروں کے ساتھ بیٹھ کے ہنس۔ انڈا اور مچھلی کھائی۔ تو ہمارے پردادا برداشت نہ کر سکے۔ وہ اسی دن بیل گاڑی یا گھوڑا گاڑی۔ ٹھیک سے یاد نہیں۔ اس میں بیٹھ کے اپنے آبائی گاؤں چلے آئے۔ اور پھر کبھی اپنے لڑکے کے ہاں نہیں گئے۔ سنا ہے۔ میرے دادا کے برتن بھی میرے پردادا نے علیحدہ کر دیے۔ اور وہ جب بھی کبھی بھولے بھٹکے گھر آتے۔ تو انھیں تام چینی کی سپید سپید رکابیوں اور کانچ کے گلاسوں میں کھانا پانی ملتا۔ تاہم تبرک کے طور پہ میرے والد اپنے دادا دادی کے پاس رہتے۔ کیونکہ اب ہمارے آبائی قصبہ میں بھی گورنمنٹ ہائی اسکول تھا۔

میرے دادا کا خیال میرے والد کو بھی ڈاکٹر بنانے کا تھا کیونکہ یہ رگھو کل ریت تھی۔ لیکن میرے والد آرٹس لینے پہ بضد تھے۔ دادا نے ضد کی۔ لیکن جب والد انٹر سائنس میں فیل ہوئے۔ تو انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اور تب میرے والد نے ایف۔ سی کالج لاہور۔ جو سدا سے ہی شہزادوں کا کالج مشہور ہے شہزادوں کی طرح زندگی بسر کر کے طمطراق سے بی۔ اے کیا۔ تو ہمارے خاندان میں دھوم مچ گئی آخر رائے بہادر کے نور نظر تھے۔ آج کل۔ میں سوچنے لگا۔ بی۔ اے ٹکے سیر بکتے ہیں۔ لیکن وہ زمانہ اور تھا۔ سنا ہے جب والد کانووکیشن کے بعد جس میں خود گورنر صاحب بہادر پنجاب نے نہ صرف صدارت فرمائی تھی بلکہ اپنے ہاتھ سے ڈگری مرحمت فرمائی اور ہاتھ ملایا (اب تو ہاتھ ملانے والا تھک جائے۔ تب ڈگری یافتہ پرچون میں تھے۔ اور اب تھوک کے حساب سے ہیں) اور واپس اپنے آبائی گاؤں آئے۔ تو حویلی میں چراغاں ہوا تھا۔

دادا نے والد کے متعلق بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ وہ انھیں آئی۔ سی۔ ایس بنانے کی فکر میں تھے۔ اور انھوں نے ہماری دادی کی صلاح کے بغیر ان کو سات سمندر پار بھیجنے کی اسکیم بنائی۔ اپنے انگریز آقاؤں سے مشورہ کیا۔ جنھوں نے ایک اور ذہنی غلام بننے والے کی تجویز پر آمنا اور صدقنا کہا۔ اور جب والد بمبئی جانے والی گاڑی کے ڈبے میں سوار ہوئے۔ میری دادی میرے والد کے گلے لگ کے بہت روئیں۔ اور شاید اس رات وہ کبھی سو نہ سکیں۔

میرے والد آئی۔ سی۔ ایس تو نہ بن پائے۔ لیکن ٹمپل بار میں کچھ دن گزار کے بار۔ ایٹ۔ لا ضرور بن گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب بھی دادا ان کو چٹھی لکھتے۔ تو پتہ پہ ان کے نام کے ساتھ [illegible] بار۔ ایٹ۔ لا۔ لکھنا کبھی نہ بھولتے۔ بھلا ہو! پچھلے وقتوں کا۔

دادا کی رائے بہادری کا۔ پردادا کی پرانے دفتروں کی ڈاکری کا۔ اور پکڑ دادا کی خاندانی روائت کا۔ تھوڑے ہی عرصے میں انگریزوں کی سرپرستی میں ان کی وکالت کی دھاک بندھ گئی۔

لیکن برا ہو وقت کا۔ دادا کیا سوچتے تھے۔ اور والد نے کیا کیا۔ جب ایک دن انھوں نے اپنے انگریزی کپڑوں کی ہولی جلائی۔ اور خود کھدر کا کرتا اور پائجامہ۔ فلیکس کے بوٹوں کی جگہ دیسی جوتی پہنی۔

اس رات ہمارا دادا جو رائے بہادر اور سرکار انگلشیہ کے وفادار تھے۔ وہ ساری رات نہ سو سکے۔ ان کا خواب کہ ان کا لڑکا پنجاب ہائیکورٹ کا جج ہوگا۔ ادھورا رہ گیا۔ والد صاحب نے سمجھایا کہ وہ اب بھی کافی کما لیتے ہیں۔ لیکن پیسہ اپنی جگہ ہے۔ عزت اپنی جگہ۔ اس پہ بھی دادا صاحب نے قانونی نقطہ نظر سے وضاحت کی۔ کہ ان کی عزت عوام کی نظروں میں بہت ہے۔ لیکن سلام اور چیز ہے۔ زندہ باد اور چیز۔ رائے بہادر صاحب اس کے بعد اپنے لڑکے کی کوٹھی نہیں گئے۔ اور ان کی حسرتوں کو بھی آبائی حویلی نے اپنے دامن میں پناہ دی۔ اب بھی جب کبھی والد اپنے گھر آتے۔ تو گو ان کے لئے علیحدہ برتنوں کا بندوبست تو نہیں کیا گیا۔ لیکن ہمارے دادا کبھی اپنے سرپھرے لڑکے کے ساتھ بیٹھ کے روٹی نہیں کھاتے تھے۔ ان کی جگہ ہماری دادی بیٹھتی۔ جو روٹی تو میز پہ نہیں کھاتی تھی۔ لیکن گرمیوں میں اپنے لڑکے کو پنکھا جھلتی رہتی۔ اور سردیوں میں گرم دودھ کا گلاس پکڑے اس کا منہ دیکھتی رہتی۔ کہ کب اسے پلا سکے۔

اب میری باری اپنے دادا اور دادی کے پاس رہنے کی تھی۔ دادا جی کے رسوخ کا نتیجہ تھا کہ اب ہمارے قصبے میں انٹر تک کا کالج تھا اور اگر آپ اس خاندان کے بچے اس میں نہ پڑھیں۔ تو اور کون پڑھے گا۔ والد صاحب مجھے شملہ یا دہرہ دون پڑھانا چاہتے تھے۔ لیکن ایک تو دادا جان کی ضد اور تب ان کی یکدم سودیشی قالب میں کایا پلٹ ہم نے قصبہ سے انٹر کر کے لاہور کے ڈی۔ اے۔ وی کالج سے ایم۔ اے۔ کیا۔ سرکاری نوکری مل نہیں سکتی تھی کیونکہ والد وکیل کے ساتھ ساتھ لیڈر بھی تھے۔ اور پولیس کی رپورٹ بہت ضروری ہے۔ ولایت جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ والد صاحب کا تجربہ تھا۔

دوسرے اچھے کالج میں لکچرر شپ مل گئی۔ پڑھنے کا شوق تھا ویسے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ ساتھ ڈاکٹریٹ کر لی۔ نوکری دل پسند تھی۔ تنخواہ گزارے کے لئے کافی تھی۔ اور تب ایک خاندانی روایت کے خلاف ایک واقعہ ہوا۔ اور اس رات والد صاحب ساری رات نہ سو سکے۔ بات یوں تھی۔ کہ اب لڑکیوں میں تعلیم کافی تھی۔ گو عام نہ تھی۔ اور وہ میرے ساتھ ہی کالج میں سیاست کے شعبہ میں لکچرر تھی۔ میرا مضمون گو انگریزی تھا۔ لیکن سیاست گھٹی میں پڑی تھی۔ پہلے باتیں ہوئیں۔ پھر بحث میں وقت گزرنے لگا۔ اور تب ایک دن ہم نے جیون ساتھی بننے کا فیصلہ کر لیا۔ اور تب ہم دونوں گھر پہنچے۔ تو والد صاحب نے آزاد خیال کے باوجود کہا۔ "لیکن وہ براہمن نہیں ہے"

"تو کیا ہوا" میں نے مودبانہ لہجے میں کہا۔ "وہ لڑکی تو ہے نا؟"

"لڑکیاں تو اردگرد بہت سی گھومتی ہیں۔ میں فلاں صاحب کو کیا جواب دوں گا۔ جو ہماری برادری کے ہیں صاحب اقتدار ہیں۔ ان کا بہت بڑا بزنس ہے۔ علاقے میں عزت ہے۔ اور سنا ہے اس کا باپ تو کسی ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہے" والد اس دن بڑے غصے میں تھے۔

لیکن میں اپنی ضد پہ قائم رہا۔ اور تب سے والد صاحب میرے پاس نہیں آئے۔ اور یہ کفر تب ٹوٹا۔ جب میرے گھر پہلوٹی کا لڑکا ہوا۔ والد صاحب نہیں۔ فقط میری والدہ آئیں۔ رسمیں ادا کیں۔ اور چلی گئیں جب بچہ پانچ برس کا ہوا۔ تو میرے والد نے مجھے ایک خط لکھا۔ کہ لڑکے کو ان کے پاس بھیج دیا جائے۔ اس کے مستقبل کا بھی انھوں نے ہی سوچا۔ ان کے پاس ہی اس نے پری انجینئرنگ کیا۔ اور انھوں نے ہی اسے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لے کے دیا۔ اور آج وہ صاحبزادے آج میرے کمرے میں میرے سامنے بے ڈھنگے لباس میں سگرٹ پی رہے ہیں کیونکہ دادا کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑا۔ اس کی ہر خواہش پوری کی۔

اب وہ کالج کا پریذیڈنٹ ہے۔ سیاست داں ہے۔ دادا کا دوست۔ پڑھائی میں بہت اچھا ہے۔ ماں باپ کا اثر۔ لیکن طور اطوار یہ ہیں۔ وقت کی بات۔ اب آپ بتلائیں۔ کہ وقت سے سمجھوتہ کر لوں۔ یا میں بھی حسب معمول لڑکے سے ناطہ توڑ لوں؟

حسن پاشاہ

یہی میرا گھر ہے

جب سیفی چچا کی شادی کا پروانہ ملا تو ہم اتنا خوش ہوئے جیسے ویت نام کی جنگ بندی کی خبر مل گئی ہو۔ واقعی سیفی چچا اپنی تنہائی سے ایسی ہی جنگ کر رہے تھے۔ سچ پوچھیے تو وہ ماہی گیر سے بھی زیادہ صابر ٹھہرے۔ اور اتنی جانفشانی کرنے کے بعد شکار پایا کہ تو یہ ہی بھلی۔ سیفی چچا بی۔ اے تھے۔ اور محکمۂ P.W.D میں کوئی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ خالص سید گھرانے سے تعلق تھا۔ بڑے سلیقہ مند نیک شعار اور سنجیدہ آدمی کہلاتے تھے۔ اور چاہتے بھی یہی تھے کہ دلہن بھی ایسی ہی ملے۔ موجودہ دور کی ماڈرن لڑکیاں انھیں قطعی بھاتی نہ تھیں۔ ویسے خود ظاہر میں ماڈرن ہی تھے۔ مگر باطن میں بالکل متضاد۔ روکھا سوکھا کھاتے تھے۔ جب گھر میں ہوتے تب پھٹا پرانا پہنتے۔ صبح بلّی ورکر کی مشق کیا کرتے اور شام ٹینس کھیلنے جاتے۔ ٹینس میں کئی تمغے بھی حاصل کئے تھے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ سیفی چچا کی شادی کا رقعہ ملا تو ہم اتنے خوش ہوئے کہ اپنا بھی ہوش نہ رہا۔ اور نوران کے گھر تو تیاریوں کا شور شرابا شروع ہوگیا۔ نوران کی کل بہنوں نے اپنی روزمرہ کی کمائی کا کل اثاثہ خرچ ڈالا۔ اور شرکت کی ساری تیاریاں کر بیٹھیں۔ نئے کپڑے بنوائے، دولہے کے لئے ایک تحفہ خریدا۔ اور پل پل گنتی رہیں کہ کب ہفتہ کی صبح ہو اور کب پھر سے حیدرآباد اُڑ آئیں۔

نوران بھی اسی قدر سرگرم تھا۔ ادھر اُدھر سے اچھے اچھے [illegible] رہا تھا۔ کیونکہ وہ خود بھی بے روزگار تھا اس لئے اس

اس نے اپنے سارے اندوختے کی مرغیاں خرید ڈالی تھیں۔ کیونکہ اسے اس کے سر پولٹری فارمنگ کا بھوت سوار تھا۔ مگر اس کی آرزو ادھوری ہی رہ گئی۔ کیونکہ ساری مرغیاں ایک ایک کر کے ختم ہوگئیں۔ اور نوران کا دیوالیہ نکل گیا۔ اب اس نے ٹکٹ خرچ کے لیے بس کچھ پیسے اٹھا رکھے تھے۔ اور ہفتہ کی صبح کا شدت سے منتظر تھا۔ جمعہ آیا۔ دھڑکنیں بڑھ گئیں۔ شام کو علیحدہ آندھرا کے حامیوں نے بہت بڑا جلوس نکالا۔ شہر کا ہر فرد پریڈ گراؤنڈ میں جمع ہو رہا تھا۔ مگر نوران اور اس کے گھر والے ہفتہ کی صبح کی تسبیح پڑھ رہے تھے۔ اتنے میں حیدرآباد سے ایک آدمی آیا کہ گاؤں سے سبھی عزیز و اقارب حیدرآباد روانہ ہو چکے ہیں اور اُن کے بڑے بہنوئی صاحب کو فوراً حیدرآباد آنے کے لیے کہا ہے۔ بڑے بہنوئی یعنی درویش صاحب گھر پر موجود نہ تھے۔ لیکن اُن کے بڑے بھائی احمد صاحب اور ان کا بڑا لڑکا نوران موجود تھے۔ انھوں نے قاصد سے دریافت کیا کہ کیا وہ ہمیں بھی آنے کے لیے کہہ گئے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے صرف درویش صاحب کو لے آنے کی ہدایت کی ہے۔ یہ سنتے ہی ان کی تمام تیاریوں پر جیسے اوس سی پڑ گئی۔ اور سب کے سب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ شام کا وقت تھا۔ علیحدہ آندھرا کے احتجاجیوں کا پر شور جلوس نعرے لگاتا ہوا گزر رہا تھا۔ مگر احمد صاحب اپنا سا منہ لے [illegible] کے پاس بیٹھے [illegible] بھون رہے تھے۔ اُن کی بیوی [illegible]

بیس اور آگ بگولا ہوئی جا رہی تھیں کہ سیف الدین نے ہم غریبوں کا مذاق اڑایا۔ اور وہ بیچتے دونوں کی ساری پول کھول رہی تھیں کہ سیف الدین کی پڑھائی کے لیے ہم نے کیا کچھ جھیل کیا۔ کس کس طرح ہم نے پندرہ سال تک اس کے کھانے پینے کے جتن نہیں کئے۔ اور آج وہ بڑے عہدے پر کیا چلا گیا ہم سب کو بھول گیا۔

پچھلے پندرہ برس کی بات ہے کہ میرے بڑے بھائی منیر حسین پڑھائی کے لیے جب ہار نے گھر آ بیٹھے تو ہمارے دیور (درویش صاحب) نے بھی فوراً اپنے گاؤں خط لکھ دیا اور اپنے چھوٹے سالے (سیف الدین) کو بلوایا۔ پھر دونوں نے مل کر شہر کی سب اسکولوں کا داخلی امتحان لکھا۔ امتحان تلگو، انگریزی اور اردو میں تھے۔ منیر حسین تمام اسکولوں کے امتحانوں میں کامیاب قرار پایا۔ مگر سیف الدین صرف دو اسکولوں میں داخلہ کا مجاز رہا۔ اور دونوں نے تعلیم جاری رکھی۔ اور دسویں جماعت میں تھے کہ منیر حسین نے بانگ دے دی۔ رائچور میں اپنی چھوٹی بہن کی شادی ہوئی اور اسی گھر میں ایک لڑکی تھی جو منیر حسین کو بہت پسند آئی۔ اور اس نے اسی سے شادی کرلینا چاہا۔ مگر لڑکی والے راضی نہ تھے۔ تب سے منیر حسین کے دل و دماغ پر اس لڑکی کا بھوت مسلط ہوگیا۔ اور پڑھائی میں لگاتار ناکام ہوتا گیا۔ کسی طرح اسی لڑکی سے شادی ہوگئی۔ اور وہ پڑھائی ختم کرکے کمپونڈری کی ٹریننگ کے لیے چلا گیا۔ اور صدر ہسپتال میں ملازمت کرلی۔ مگر سیف الدین نے تعلیم جاری رکھی۔ ایف۔ اے کے بعد آگے پڑھنے کی استطاعت نہ تھی۔ انھیں کے گاؤں کے ایک متمول شخص نے ان کی مدد کی۔ پڑھائی پوری ہوئی۔ اور ملازمت کی تلاش شروع ہوئی کیونکہ پڑھائی کا سارا قرض انھیں کو ادا کرنا تھا۔ ان کے والد اس علاقے میں تعویذ فلیتے کرنے میں اپنی مثال آپ تھے۔ [illegible] ایک امیدوار نے الیکشن میں حصہ لے کر ان سے [illegible] مدد چاہی۔ اس کی مراد پوری ہوئی اور وہ [illegible] احسان شناسی و شکر گذاری وہ خاں صاحب سے ملنے آیا۔ تو انھوں نے بطور صلہ احسان کچھ لیا نہیں بلکہ اپنے بیٹے کا تعارف کرایا۔ پھر سیف الدین کو D.S.P. میں ایک اچھا عہدہ مل گیا۔ ترقی کرتے کرتے وہ بڑے عہدے پر پہنچ گئے۔ پڑھائی کا سارا قرض ادا کیا۔ بہن بھائیوں کی شادیاں کیں۔ جب کہیں جا کے اپنی شادی رچائی۔ غرض کہ ایسے احمد صاحب نے ساری رام کہانی سنا ڈالی۔ روٹیاں پک گئیں۔ مگر جلوس کے نعرے ابھی سنائی دے رہے تھے۔ جب ہفتہ کی صبح ہوئی تو درویش صاحب نوراں کو لئے دکن چلے آئے۔ سبھوں نے ناک بھوں چڑھائے دل گرفتہ رہ گئے۔ ہفتہ کی رات آئی پھر ایک ایلچی نازل ہوا اور احمد صاحب کو لیکر چھک چھک ہوگیا جیسے درویش صاحب کا گھر بار تو پہلے ہی جا چکا تھا۔ میں بھی احمد صاحب کی طرح ہمہ تن انتظار بنا بیٹھا رہا کہ میرے پاس بھی اتوار کی صبح تک کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا۔ اور میں بھی چلا جاؤں گا۔ انتظار کرتے کرتے اتوار کی صبح گذر گئی۔ دوپہر بھی۔ اور رات بھی مگر میرے لیے کوئی نہ آیا۔ اور سیفی چچا کو دولہا بنتے دیکھنے کی حسرت دل ہی دل میں دفن ہوگئی۔ بالکل اُن بچوں کی گرسنگی کی طرح۔ جن کے ماں باپ انھیں یہ مبہم تسلی دئے جا رہے ہیں کہ ہڑتال کی وجہ سے ابھی دکانیں نہیں کھلی ہیں۔ ابھی بھی کرفیو ہے وہ اپنے بچوں کو کیوں اس طرح فریب میں مبتلا رکھے ہیں۔ کیوں انھیں مسلسل دھوکہ دئے جا رہے ہیں۔ شاید اس کا حل مجھے اس وقت تک نہیں ملے گا۔ تب تک کہ سیفی چچا کو نوشہ بنتے نہ دیکھ لوں۔ لیکن میری یہ آرزو کبھی شرمندۂ حقیقت نہ ہوگی اب اخبار میں مجھے صرف ان کا فل سکیپ ہی دیکھنے کو ملے گا۔

اور میں اپنے مضطرب دل کو یوں بھی ڈھارس دے رہا ہوں بالکل انہی ماں باپ کی طرح جو اپنے بھوکے بچوں کو دئے جا رہے ہیں۔ اب مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ فریب۔ دغا۔ دھوکہ جو کچھ بھی وہ دے رہے ہیں۔ ٹھیک ہی کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ اور اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ سیفی چچا نے ہمارے لیے بھی تو نہیں کیا۔ بڑے عہدے پر تو چلے گئے مگر اتنے بڑے

[illegible] ایک فرد کو بھی دوزخی سے نہیں گھرائے۔ بقول اہلیہ احمد صاحب کہ وہ قسمت سمجھا لکھا کہ ہم کو اب کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ مگر میں سمجھا کہ ان کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھ رہا تھا۔ ان کی خوشی میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ میں ایسا کیوں چاہ رہا تھا۔ اسی لئے کہ جب ہمارے غم دوسروں میں نہیں بانٹے جا سکتے تو دوسروں کی خوشی میں تو ہم ضرور شریک ہو سکتے ہیں!!

۲۶ جنوری کی صبح تھی۔ علیحدہ آندھرا کے ایجی ٹیشن کے شہیدوں کی نوحہ خوانی کی صبح تھی۔ اور راجدھانی میں گورنر کا صدر راج کے نافذ ہونے پر ان کی پہلی تقریر تھی۔ میں احمد صاحب کے گھر پہنچا۔ گھر میں کچھ ایک پکار نہیں تھی۔ پھر داخل گھر ہوا۔ اہلیہ احمد صاحب تنہا بیٹھی تھیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے آداب بجا لایا اور سب سے پہلے یہ پوچھ بیٹھا کہ سب کہاں گئے ہیں۔ جواب ملا کہ گاؤں چلے گئے۔ سیف الدین کی شادی کے فوراً بعد درویش صاحب کی صاحبزادی کی بھی شادی مقرر ہو گئی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا یہ ہڑتالیں ہم شادیاں کرنے ہی کے لئے کر رہے ہیں!! پھر میں نے تفصیلی گفتگو چھیڑ دی کہ لڑکی کا عقد کس سے طے پایا ہے اور لین دین کیا ہے؟۔ اور مجھے ان سب باتوں میں ایک بات بہت ستانے لگی کہ میں سلطانہ کی بھی شادی پر حاضر نہ ہو سکا۔ کیونکہ آمد و رفت کے وسائل بھی بند تھے۔ سلطانہ — میٹرک تک میری کلاس فیلو رہ چکی تھی پر تکلف۔ متلون مزاج!!۔ اگر اس کا رشتہ یہیں پر طے پا جاتا تو کیا وہ مجھے نہیں بلاتی!۔ نہ صرف [illegible] بلکہ عاجزی و انکساری بھی کرتی۔ مگر اس کا رشتہ [illegible] سیفی چچا کی شادی کے فوراً بعد کیسے طے پا گیا؟!!۔ [illegible] کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ دل یقین نہیں کرتا۔ [illegible] سلطانہ مس تھی۔ آج مسز ہے۔ اور کل کو ماں ہو جائے گی۔ بوڑھی ہو جائے گی اور پھر وفات پا جائے گی۔ اور ہم [illegible] کی طرح سب ہنستے اور تڑپتے رہ جائیں گے!!

[illegible]

جذبات میرے سوچنے سمجھنے کے ہیں کاش [illegible] اپنے طویل تجرد کے بعد شادی کر لی اور سلطانہ جو میری ہم جماعت بھی تھی دلہن بن گئی۔ انسان اپنے جذبات و احساسات سے سمجھوتہ کرے تو یہ تڑپ اور تصادم [illegible] سے آپ مٹ جائے۔ مگر ہم ایسا نہیں کرتے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمیں اپنے جذبات اس قدر عزیز ہیں۔ تو ہم گوارا نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے بنانے بگاڑنے والے سے بھی کیا مانگتے ہیں۔ یہی نا کہ اے خدا ہمارے جذبات کی قدر کر!۔ اور اس سے زیادہ کیا ہے؟!۔ مگر ہمارے جذبات مجروح ہو جاتے ہیں۔ اور ہم سسک اٹھتے ہیں۔ جیسا کہ میں سسک رہا ہوں اس لیے نہیں کہ میں سیفی چچا کے عقد پر نہیں جا سکا اور نہ سلطانہ کے!۔ بلکہ اس لیے کہ میرے جذبات تڑپتے سسکتے کس طرح سو گئے!!۔

صبح کا وقت ہے۔ سب آ چکے ہیں۔ شادیاں ہو چکی ہیں۔ میز پر صبح کا اخبار رکھا ہوا ہے۔ جس میں پہلے صفحے پر جلی حروف میں ویت نام جنگ موقوف ہونے کی خبر شائع ہوئی ہے۔ اور آخری صفحے پر سیفی چچا کی شادی کا فل اسکیپ بھی چھپا ہے۔

اُسی موڑ پر ....

اکرام الدین شبنم

تھکے تھکے قدموں سے شیامو گھر کی طرف آ رہا تھا۔ اُس کی جیب میں دو دن کی مزدوری کے پیسے تھے۔ آج صبح وہ جیسے ہی کام پر لگا تھا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی دوپہر تک اُس کے مزاج میں چڑچڑاپن آگیا تھا ایک مزدور سے اُس کی جھڑپ بھی ہو گئی تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ ایک بچّے والی عورت کو مزدوری کرتے اور اُس کے شیر خوار بچّے کو بھوک سے بلبلاتے دیکھ اُس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا تھا۔ ''دیکھتا منگلا!! اپنے مرد کے ہوتے ہوئے بھی یہ عورت ننھی سی جان کو صرف چند سکوں کے لیے کس طرح تڑپا رہی ہے ۔!'' منگلا نے کہا تھا۔ ''بھئی! پیٹ کی آگ ہی سب کچھ کرا دیتی ہے ـــــ اب تو اپنی عورت کو ہی دیکھ در بدر بھیک مانگتی ہے۔ کیا یہ کام اس سے بھی بُرا ہے!؟''

غصّے میں آکر اُس نے اپنی ٹوکری پھینک دی تھی اور منگلا کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ یوں تو آج اُس کی طبیعت خراب تھی لیکن یہ جملہ سنکر اُس کا خون کھول اُٹھا تھا۔ نجانے اُس کے نحیف جسم میں کہاں سے قوت بھر آئی تھی۔ جیسے منگلا نے اُسے کوئی موٹی سی گالی دی تھی۔ اگر مزدور عین وقت پر آڑے نہ آتے تو وہ منگلا کے ہاتھ پاؤں ضرور توڑ دیتا بات ختم ہو جانے پر منگلا کا کہا جملہ اُس کے کانوں میں زہر گھول رہا تھا۔ ''محبّت دار بنتا ہے گھر والی سڑکوں پر بھیک مانگتی ہے!''

[illegible] بات سنکر شیامو کو ایسا لگا تھا جیسے [illegible] ہو گیا تھا۔ کتنے دنوں سے شیامو اس [illegible] تھا اس نے آج تک کسی مزدور [illegible] کیا تھا۔ سب لوگ اُس کی تعریف کرتے تھے۔ کل جب منش کے ذریعہ ٹھیکیدار کو اس جھگڑے کے بارے میں معلوم ہو گا تو وہ کیا سوچے گا!؟ ـــــ کہیں وہ اس کو نکال نہ دے؟!ـــــ لیکن اُس نے ایسا کہا ہی کیوں؟ اور پھر اُس کے ذہن میں کہیں سے یہ سوال اُبھرا۔ اگر اس نے ایسا کہا بھی تو کیا غلط کہا۔!''

یہ سب کچھ سوچتا ہوا وہ جب گھر پہنچا تو جھگی پر تالا لگا ہوا تھا ـــــ اُس کا ماتھا ٹھنکا طبیعت میں مزید جھنجھلاہٹ پیدا ہو گئی اور وہ آنگن میں پڑی ٹوٹی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی دو تین گہرے کش لگا کر اُس کے کثیف دھوئیں کو فضا میں بکھیر دیا۔ اُسے اِس دھوئیں میں چمپا کا چہرہ نظر آیا اور وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

چمپا! ـــــ اُس کی بیوی تھی جسے وہ اپنی تمام تر قوّتوں کے ساتھ چاہتا تھا۔ شادی سے پہلے اُس نے چمپا کو صرف ایک نظر گاؤں کے پنگھٹ پر دیکھا تھا۔ وہ بھرے بھرے خطوط کی ایک مکمل عورت اُسے نظر آئی تھی۔ جو اُس کے شعور میں ایک عجیب سا احساس لیے بستی چلی گئی ـــــ اُنہی لمحوں میں اُس نے چاہا تھا۔ کاش! چمپا کے ساتھ میری شادی ہو جائے؟ کتنی دیر تک وہ چمپا کے دلکش نقوش کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا تھا۔ یہ احساس اُسے زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ کسی کی چاہت میں دل اُس کے پہلو میں زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اُس نے سرعت کے ساتھ سوچا چمپا میری نظروں سے اب تک اوجھل کیوں رہی؟ مجھے تو بہت پہلے اس سے قریب ہو جانا چاہیئے تھا! رشتے کی چاچی کو اُس نے اپنی شادی کی

[illegible] لے کے لیے تیار کر لیا تھا۔

زندگی میں پہلی کی آرزو پوری ہو گئی اور چمپا کا بیاہ اس کے ساتھ ہو گیا۔ چمپا کو پا کر اُسے ایسا لگا تھا۔ جیسے اُس نے اپنی زندگی میں کچھ نہ مانگا تھا اور جو مانگا تھا وہ اُسے مل گیا تھا۔ وہ اپنے مقدر پہ ناز کرنے لگا۔ بچپن ہی سے اُس نے اپنی آنکھوں سے شہر کی رنگینیوں کو دیکھا تھا۔ شہر کے خوبصورت ماحول میں شعور پایا تھا۔ چمپا پا کر بھی شہر کی آرزو کرتے ہوئے اُس کا دل کسی صورت گاؤں میں نہ لگ سکا۔۔ اور چمپا کو ساتھ لیے شہر چلا آیا۔ یہاں مزدوروں کی جھگیوں میں اُسے ایک جگہ سر چھپانے کے لیے مل گئی تھی۔ چمپا کے ساتھ مل کر اُس نے کتنی چاہت اور ارمانوں سے اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے اس جھونپڑے کو بنایا تھا۔ اس شہر میں اُس نے بچپن سے جوانی کی عمر تک سب کچھ دیکھا تھا وہ چمپا کو ساتھ لیے شہر کی خوبصورت سڑکوں پہ پھرا تھا اور خوشنما پارکوں میں گھوما تھا۔ کئی فلمیں بھی اُس نے چمپا کو دکھائی تھیں۔ پہلے پہلے چمپا کا دل کچھ اُچاٹ رہا لیکن پھر جلد ہی شیامو کا قرب پا کر وہ اُن رنگینیوں میں کھو گئی تھی جس کا اُس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

وہ اس ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اور پھر اپنے ماضی کے خیالوں میں کھو گیا۔

شادی کے ٹھیک ایک سال بعد اس بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ وہ بھی ایک بچے کا باپ بن گیا تھا۔ چمپا وہ انجان تھے لیکن پڑوس کی عورتوں نے اُن کی بہت مدد کی تھی۔ شیامو کو حیرت تھی۔ اُس نے اُن عورتوں سے اپنی مدد کے لیے ایک لفظ بھی نہ کہا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ نہ آ سکی تھی۔ یہ کونسا جذبہ ہے جو ایک عورت کو دوسری عورت کے اتنا قریب کر دیتا ہے۔۔؟

شاید اسی طرح دنیا کی آبادی روز بروز بڑھتی رہے گی۔ بچے کی پیدائش کے بعد شیامو نے محسوس کیا کہ اُس پہ ذمہ داری کا بوجھ اور بڑھ گیا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرتا [illegible]

چھوٹی سی دنیا کو دیکھ کر مستقبل کے سپنے آنکھوں میں سجائے زندگی کی طرف تیزی سے قدم بڑھاتا۔ اس کے ساتھ ساتھ شاید چمپا نے بھی ایسا ہی سوچا تھا۔۔!

ایک رات جب چمپا بچے کو سلا کر شیامو کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ تو اُس نے کہا تھا۔ "پڑوس کی جھگیوں کی ساری عورتیں کوٹھی بنگلوں میں کام کرتی ہیں" جواب میں شیامو کو خاموش پا کر اُس نے پھر کہا تھا۔ "اگر تم کہو تو۔۔ میں بھی۔۔ اُن عورتوں کے ساتھ۔۔!"

اور شیامو نے اپنی ٹانگیں اس طرح کھینچ لی تھیں جیسے اُسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"تو کیا تو بھی اُن عورتوں کی طرح اپنی عزت بیچے گی۔؟" چمپا کی بات اُسے ناگوار گزری تھی۔ اُس نے بڑے سخت لہجے میں چمپا کو ڈانٹ دیا تھا کہ وہ آئندہ اپنے دل میں ایسا گندہ خیال نہ لائے۔۔ اور یہ حقیقت بھی تھی اس کے بعد چمپا نے پھر کبھی ایسی کسی خواہش کا اظہار نہ کیا تھا۔ اُس کے خیالات کی ڈور ٹوٹ گئی۔ پڑوس کی جھگی کی عورت اُس سے مخاطب ہو کر سامنے سے نکلی چلی گئی تھی۔

"کیوں شیامو! کیا چمپا شہر گئی ہے۔؟"

اُس نے شہر کے راستے کی طرف نگاہیں جما دیں۔۔ لیکن چمپا کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

اور پھر اُسے وہ دن بھی یاد آیا۔ جب وہ متواتر کئی دن تک بخار میں تپتا رہا تھا۔ جو کچھ بھی چمپا نے پس انداز کیا تھا وہ سب دوا کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ لیکن شیامو بدستور بیمار رہا۔۔ اُس کی حالت میں ذرا بھی فرق نہ ہوا اور ان مجبوریوں میں وہ ایک دن شیامو کو بخار کی غفلت میں چھوڑ کر کسی کوٹھی میں کام مانگنے چلی گئی تھی۔

جب وہ شام کو لوٹی تھی تو اُس کے ہاتھ میں چند [illegible] اور کچھ بچا کھچا کھانا بھی۔۔ اُس نے چاہا [illegible]

ٹھیک ہوتا رہا ـــــ اور کئی دن کے بعد وہ صحت یاب ہو کر وہ کام پر جانے لگا تھا۔ اُس نے چمپا سے منع کر دیا تھا کہ مجبوری نے اسے کسی کے گھر کے جھوٹے برتن منجوائے تھے۔ وہ اُس نے سہہ لیا تھا۔ لیکن اب وہ یہ ہرگز برداشت نہیں کرے گا کہ اس کی چمپا، ننھے سے بچے کو تڑپائے اور کام کرے۔

پھر کئی دن کے بعد اُس نے سُنا تھا۔ چمپا اب بھی کام پر جاتی ہے۔ اور کئی عورتوں نے تو اس سے یہاں تک کہا تھا کہ چمپا بھیک مانگتی ہے۔ یہ سُن کر اُس کے تمام جسم میں آگ لگ گئی تھی۔

رات کو اُس نے چمپا سے اس بارے میں پوچھا تو وہ خاموش رہی تھی۔ کئی بار اس نے چمپا کو سخت وسست بھی کہا تھا۔ مارا بھی تھا۔ لیکن اس کے بعد بھی اس کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ تب اس نے چمپا کو اپنی اور اس کی عزّت کا واسطہ دیا تھا کہ وہ یہ گندہ کام نہ کرے اُس کے بعد اُسے پتہ نہ چل سکا چمپا نے کہاں تک اس کی بات مانی تھی۔

لیکن آج پھر جھگی کا دروازہ بند تھا۔ اور چمپا موجود نہ تھی۔ اُس نے شہر کے راستے پر نگاہیں جما دیں ـــــ لیکن چمپا کا دور تک پتہ نہ تھا۔ شیامو نے سوچا کئی بار میں اس گنوار عورت کو سمجھا چکا ہوں یہ بڑا ذلیل کام ہے۔ جس کی وجہ سے آج اُسے اپنے مزدور ساتھیوں میں کس قدر ذلیل ہونا پڑا تھا، کتنی خفت اٹھانی پڑی تھی ـــــ اُس نے بیڑی سلگائی اور اس کے گہرے گہرے کش لگاتے وہ سوچنے لگا...... منگلا نے سچ ہی تو کہا تھا۔ واقعی سچی بات کڑوی ہوتی ہے۔ ناحق اس نے منگلا پر ہاتھ اٹھایا جو اس سے عمر میں کتنا بڑا تھا وہ اپنی اس حرکت پر افسوس کرتا رہا۔ اور ساتھ ہی ساتھ چمپا کی ذلیل حرکت پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آج میں اس گنوار عورت کو بتا کر رہوں گا اگر تجھے میرے ساتھ رہنا ہے تو میرا کہا ماننا ہوگا۔ ورنہ وہ میری زندگی سے دور ہی چلی جائے تو اچھا ہے۔ ایک تو ... بھی خراب تھی۔ اور اس ذہنی پریشانی

نے اُسے اور بھی نڈھال کر دیا تھا۔

اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

چمپا اُسے جگا رہی تھی۔ شام دھندلکا اندھیرے میں بدل چکا تھا۔ پتہ نہیں کتنی دیر سے وہ سو رہا تھا۔ چمپا نے چٹائی بچھا کر اُس پر کھانا لگا دیا۔ اور وہ شیامو کو کھانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ شیامو کو فوراً ہی سب یاد آگیا۔ یہ کھانا ـــــ اور چمپا کا اتنی دیر سے گھر آنا ـــــ یہ سب کیا تھا۔ اس کے ذہن میں کئی سوال ایک ساتھ اُبھرے اُس نے ان سوالوں کو اپنے ذہن میں ترتیب دیا اور چمپا سے بہت ہی دھیمے لہجہ میں بولا۔

" چمپا دیکھ! تو میری بات ٹھنڈے دل سے سن لے!" اس نے چمپا کا ہاتھ کھینچ کر اپنے پاس چٹائی پر بٹھا لیا۔

" پہلے تم کھانا کھا لو ـــــ پھر جو کچھ بھی ـــــ؟"

" نہیں، چمپا! تو پہلے میری بات سن لے!" اس نے اپنے لہجہ کو سختی میں بدل دیا۔ اور ٹھہرے ہوئے لہجہ میں بولا۔

"چمپا! عزّت کی روٹی بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ اگر تجھے میرا ساتھ پسند ہے، اور میرے ساتھ ہی تجھے اپنا جیون گزارنا ہے تو میرا کہا ماننا ہوگا۔ ورنہ تو ـــــ میری زندگی سے دور چلی جا! یہ میرا آخری فیصلہ ہے!"

اُس نے چمپا کو خاموش دیکھ کر۔ " یہ تیرا اس طرح کسی کے گھر کے جھوٹے برتن مانجھنا، بھیک کے ٹکڑوں سے پیٹ بھرنا مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ ـــــ چمپا! میں عزّت کی زندگی چاہتا ہوں ـــــ اگر آج کے بعد تو نے گھر سے باہر قدم نکالا تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گا ـــــ!"

ضبط کے تحمّل کے بعد بھی اس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا تھا۔

اُس نے اپنے لہجے میں ٹھہراؤ پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "چمپا! اگر تجھے کام کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو کل سے

میرے ساتھ بہت ... دوسری ... بھی تو کام کرتی ہیں۔

" میں تمہارا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں " جیسے پتھر کی مورت میں جان پڑ گئی تھی۔ " ... کے بعد کہیں نہیں جاؤں گی اور نہ بھیک مانگوں گی۔ لیکن کل تمہیں میرے ساتھ بھیک مانگنے جانا ہوگا۔ بس! ایک دن کے لیے ——— !"

چھپا کے منہ سے یہ خلافِ توقع جملہ سنکر اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اُسے گالی دی ہو، غصے کے زہر کا کڑوا جام نے اپنے حلق سے نیچے اُتار لیا۔ مایوسیوں کے تاریک سائے اُس کی زندگی سے کہیں دور چلے جاتے ہیں!

متواتر کئی دن تک وہ اس بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچتا رہا۔ وہ عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اپنی سوچوں کے زیرِ اثر کوئی فیصلہ کر لینے کے بعد اُس سے مطمئن نہ ہوکر وہ پھر از سرِ نو سوچنے لگتا۔ آخر ایک دن اس نے اس بُرائی کو ختم کرنے کے لیے فیصلہ کر ہی لیا۔ اگر میرے ایک دن کے بھیک مانگنے سے چھپا سیدھے راستے پر آسکتی ہے تو اس میں کون سی بُرائی ہے ؟

اور پھر وہ بھیک مانگنے کے لیے نکل پڑے ——— !

امتحان میں کٹھن راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بعض بعض جگہ شیامو بہت گھبرایا لیکن یہ اُس کی آزمائش تھی۔ یہی سوچ کر وہ سب کچھ سہتا رہا!

اور جب شام کا دھندلکا چھانے تک وہ اپنی جھگی پر لوٹے تو کئی طرح کے خوشبودار کھانوں سے انھوں نے اپنے پیٹ کی آتما کو شانت کیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے چھپا کی آنکھوں میں جھانکا اس کی آنکھوں میں ایک نشہ تھا چراغ کی مدھم روشنی میں اُس نے پیسے گنے ——— بارہ روپے کے پیسے تھے۔ وہ دونوں رات کو خاموش رہے ——— ایک دوسرے سے کوئی بات نہ ہوئی۔!

صبح کو کافی دن چڑھ آیا تو چھپا نے اُسے اٹھایا۔ جب ... چھپا نے کہا۔

" چلو! جلدی چلو! کہیں کام پر جانے میں دیر نہ ہو جائے ——— !"

شیامو نے سگریٹ سلگا کر اُس کا دھواں چھپا کے منہ پر چھوڑتے ہوئے کہا۔

" نہیں! چھپا! ——— اب ہم کام پر نہیں جائینگے ——— کیا اس سے اچھا کوئی اور کام بھی ہو سکتا ہے ——— ؟ "

(بقیہ صفحہ ۳۳ کا)

ادبستان۔ دین دیال روڈ۔ لکھنؤ

۵ ر دسمبر ۷۱ء

عزیز محترم۔ سلام سندیلوی

آپ کی کتاب " مراثی انیس میں جذباتی تاویل " کوئی تین ہفتے ہوئے ملی تھی۔ میں نے اوقات فرصت میں ذوق و شوق سے اس کا مطالعہ کیا۔ آپ نے جس وسعت و جامعیت کے ساتھ موضوع کتاب سے ناقدانہ بحث کی ہے اس کے لیے آپ داد اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔

امید ہے کہ آپ بفضلہ خیریت سے ہوں گے۔

والسلام

خیر اندیش

سید مسعود حسن رضوی۔

چونکہ مراثی انیس کی تنقید و تحقیق کے سلسلے میں ہندوستان اور پاکستان میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے مقابل کا کوئی نقاد اور محقق نہیں ہے، اس لیے سلام سندیلوی صاحب کی اس کتاب پر پروفیسر صاحب موصوف کی چند سطریں اہمیت رکھتی ہیں بلکہ اس خط کی ایک سرٹیفکٹ کی حیثیت ہے۔ اس خط کی روشنی میں ہم ڈاکٹر سلام سندیلوی کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اعتراف کر سکتے ہیں۔

ہندی کہانی

"زخم"

بھیشم ساہنی

ترجمہ:- عظیم اقبال

ہندی کے مایہ ناز ادیب جناب بھیشم ساہنی کی ایک حال ہی میں شائع شدہ ہندی کہانی کا ترجمہ بھیج رہا ہوں۔ کہانی ہمارے اپنے دَور کی نمائندگی میں پیش پیش ہے۔ بھیشم ساہنی مرحوم بلراج ساہنی کے چھوٹے بھائی ہیں اور دلی یونیورسٹی میں انگریزی کے سینیئر لیکچرر ہیں روس میں سات سال رہ چکے ہیں اور رُوسی اور ہندوستانی ادب کی خدمت کا سہرا ان کے سر ہے۔ ان کا حالیہ ناول "تمس" بڑی تحسین و آفرین کا مرکز بنا ہوا ہے۔ موصوف سے میرے گہرے مراسم ہیں۔ اُن کی خواہش پر ہی یہ ترجمہ میں نے کیا ہے۔

رسالہ کی ایک کاپی موصوف کو بھجوادیں۔ انھیں اُردو سے واقفیت ہے۔

افسانہ کی رسید سے نوازیں۔ خلوص کیش

عظیم اقبال

گاڑی چلی، تو وہ دیر تک دروازے میں کھڑا باہر دیکھتا رہا۔ کبھی دائیں جانب انجن کی سمت سر گھماتا، کبھی بائیں طرف پیچھے بوڑھا آدمی کیا دیکھے جا رہا ہے، یہ جان پانے کے لیے میں نے بھی کھڑکی میں سے سر باہر نکالا۔ مجھے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی، سوا اس کے کہ اسٹیشن پیچھے چھوٹ جانے پر ریل گاڑی سانپ کی مانند بل کھاتی ہوئی لائن بدل رہی تھی لگا، جیسے ڈبوں کے نیچے پہیئے نہیں ہیں اور گاڑی پیٹ کے بل لائن کاٹ رہی ہے۔ گاڑی کے اگلے ڈبے اب ایک اور لائن کاٹ کر تیسری لائن پر جا رہے تھے۔ میں نے پیچھے کی طرف دیکھا۔۔۔۔ گاڑی تین [illegible] گاڑی تھی اور اس میں بھرے پڑے رہے تھے۔ کیا بوڑھا [illegible] رہا ہے [illegible] کا جوش مجھے بڑا بچگانہ اور [illegible] گاڑی رفتار پکڑ رہی تھی اور لائن کے ساتھ ساتھ کھڑے پیڑ سرپٹ بھاگنے لگے تھے، جبکہ وادی کے پار کھڑے پیڑ لپک لپک کر آگے کی طرف آنے لگے تھے۔ آس پاس کا سارا علاقہ گاڑی کی رفتار کے ساتھ حرکت پذیر ہو اٹھا تھا۔

تبھی وہ دروازہ بند کرکے اپنی سیٹ پر آگیا۔ اب وہ ضرور گاڑی کے بارے میں کوئی ریمارک کرے گا۔ جب سے شروع ہوا تھا، اس ضعیف آدمی کے مکالمے چل رہے تھے۔ بات بات پر وہ اپنے سمجھاؤ، رائے، ریمارک دیتا آرہا تھا۔

۔۔۔۔ اب گاڑی چھوٹنے پر جھٹکا نہیں لگتا، جیسے پہلے لگا کرتا تھا۔ اس نے بہت تشفی کے انداز سے کہا۔ "گاڑی بڑی، ہموار حرکت سے رفتار پکڑتی ہے۔ پھر اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر ہوا میں تیراتا ہوا سا گاڑی کی ہموار حرکت کا اشارہ

کرنے لگا ــــ اب انجن ڈیزل سے چلتے ہیں، پہلے اسٹیم سے چلا کرتے تھے۔ اسٹیم سے چلنے والے انجن میں جھٹکا لگتا تھا،

میں نے اخلاقاً سر ہلا دیا۔

..... اسٹیم انجن کا زمانہ اب ختم ہو چکا ہے۔ وے ان دنوں چلائے گئے تھے، جب کوئلہ عام ہوا کرتا تھا۔ اب کوئلہ مہنگا پڑتا ہے۔ پھر یکایک اُس نے ناک بھوں سکیڑ کر کہا۔۔۔ ،، بھئی میں سارا وقت کوئلہ جھونکتے رہو، کیوں بھلا ؟ اس سے کپڑے بھی گندے ہوتے ہیں۔ بجلی صاف ستھری چیز ہے۔ بٹن دباؤ اور گاڑی چلنے لگتی ہے۔۔،

میں نے پھر سر ہلا دیا، لیکن وہ میرے سر ہلا دینے سے مطمئن نہیں ہوا۔

..... فرانس والوں نے ایک بہت بڑھیا ترکیب نکالی ہے۔ وے دو ٹریک لائن پر گاڑیاں چلانے لگے ہیں۔ بجلی کی کرنٹ نیچے پٹری کے راستے آتی ہے؛ وہ بڑے ولولے سے سُنائے جار ہا تھا۔۔۔ و گاڑی کے نیچے انھوں نے ٹرانسفارمر لگا دئے ہیں۔ اب ہوتا کیا ہے، ٹرانسمیشن لائن تو اے، سی میں رہتی ہے، جبکہ ٹرانسفارمر لگ جانے سے استعمال ڈی، سی، ہوتی ہے وہ سستی بھی رہتی ہے اور کام بھی صاف ستھرا ہوتا ہے۔۔۔

بوڑھا اپنے علم کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس سے زیادہ کھلنے والی بات یہ تھی کہ وہ بڑے جوش کے ساتھ بولے جار ہا تھا۔ میں ایسے بے شمار لوگ دیکھ چکا ہوں، جو بڑے ولولہ سے باتیں کرتے ہیں، بات بات پر ہنستے ہیں، اپنی رجائیت کی نمائش کرتے ہیں۔ یہ آدمی کوئی پنشن یافتہ انجینیر لگ رہا تھا ایسے بڑھاوا دیا تو ریلوے کی ساری ہسٹری سنائے گا۔ اور ڈبے میں ہم دو ہی مسافر ہیں۔ مجھے ہی سب سننا پڑے گا۔ لیکن اسے بڑھاوا دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

..... ہمارے ایر کنڈیشنڈ کوچ دنیا میں سب سے بڑھیا ہیں۔۔۔ مگر ابھی بھی کہیں کہیں خامی پائی جاتی ہے۔۔۔ دھول مٹی ابھی بھی اندر آجاتی ہے۔ پھر ایک ہی کمرے میں چار چار کالی بیل لگانے کی کیا ضرورت ہے ؟ ایک ہی کال بیل سے ڈبے کے سبھی مسافروں کا کام چل سکتا ہے۔ میں نے ریلوے بورڈ کو اس بارے میں لکھا ہے۔،،

بوڑھا الگ بھگ ۶۰ سال کا رہا ہوگا۔۔۔ اپنے اڈے سے ٹوٹا ہوا کوئی انجینیر، جو پنشن پا چکنے کے بعد بھی اپنے ماحول سے چھٹکارا نہیں پا سکتا تھا۔ دبلا سا سانولے رنگ کا آدمی اوپر سے نیچے تک پچکا ہوا اور سر پر سفید کشتی نما ٹوپی۔

مجھے اس کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ میں چپ چاپ اپنی سیٹ پر الگ تھلگ پڑے رہنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ پوچھنے کی خواہش بھی نہیں تھی کہ وہ کون ہے، کہاں جار ہا ہے۔ ہر راہ جاتے مسافر سے بھائی چارہ کون کرے !

اُس نے شاید میری بے رُخی کو بھانپ لیا ــــ ،، آپ کو اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ظاہر ہوتی ؟ اُس نے ٹھٹھک کر کہا۔ میں اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

..... نہیں۔۔۔ نہیں، آج کل کتنا کچھ ہو رہا ہے، اس میں دلچسپی تو ہونی ہی چاہیئے۔

تھوڑی دیر تک وہ چُپ رہا۔۔۔ شاید میری بے رخی کی وجہ سے گم میں جانتا تھا، وہ بولے گا، بولے بغیر نہیں رہ سکتا بڑھاپے میں قدم رکھنے پر سبھی ہندوستانیوں کے ذہن میں سچھلوٗ پھوٹ، پھوٹ کر نکلنے لگتے ہیں۔ سبھی بوڑھوں کے پاس دیش کی سبھی بیماریوں کے نسخے موجود ہوتے ہیں۔۔۔ غریبی دور کرنے کے بدعنوانی دور کرنے کے، ہندوستانیوں کا کردار بلند کرنے کے، یہ بھی کوئی ایسا ہی سماج سیوک لگتا ہے۔ ایسے لوگوں سے مجھے چڑھ ہے۔

...... آپ دلّی سے آرہے ہیں۔ دلّی میں آپ کی ملاقات وزیر اعظم سے ہوئی ہوگی، ؟ میں نے طنز میں کہا۔

اُس نے بڑے سہل ڈھنگ سے میری طرف دیکھ

کر کہا۔۔۔۔ وہ بہت مشغول تھیں۔ میں نے درخواست تو دی تھی، لیکن اُن سے ملاقات نہیں ہو پائی۔'

'۔۔۔۔ مشغول تو صدر جمہوریہ بھی رہے ہوں گے!'، میں نے پھر طنز میں کہا۔

'۔۔۔۔ اُنھیں کیا کام ہے؟ فوجیوں کے سینوں پر میڈل لگانا، تقریریں کرنا، اسپتالوں کا افتتاح کرنا۔۔'

اُس نے سر جھٹک دیا۔ مجھے محسوس ہوا، صدر جمہوریہ کے پس منظر سے وہ مطمئن نہیں ہے۔ مگر پتہ چلا کہ وہ سچ مچ صدر جمہوریہ سے مل کر آیا تھا اور اُنھیں اپنے مشورے بھی دے کر آیا تھا۔

'۔۔۔۔ حقیقت میں دلّی میں انکم ٹیکس بورڈ کے کسی ممبر سے ملنا چاہتا تھا۔ انکم ٹیکس کے نظام میں اصلاح کی بڑی ضرورت ہے۔ میں اپنے مشورے لکھ کر دے آیا ہوں۔'

پنشن جو نہ کرائے کم ہے، میں نے دل ہی دل کہا۔ کسی طرح ڈوبنے سے بچ پاؤ۔ زندہ رہنے کے لئے اس آدمی نے سماج سیوا کا دامن پکڑ رکھا ہے۔

وہ اُٹھا اور سیٹ کے نیچے سے ایک چھوٹا سا بکس نکال لایا۔ بکس کاغذات سے بھرا تھا۔ چھوٹے، چھوٹے، دو، دو تین، تین صفحوں کے مضامین انگریزی میں ٹائپ کئے ہوئے وہ نکال نکال کر اور اُن کے عنوان پڑھ پڑھ کر اپنی بغل میں رکھ رہا تھا، لیکن انکم ٹیکس سے متعلق مشوروں کے کاغذات نہیں ملے۔

'۔۔۔۔ میں اپنے خیال لکھ ڈالتا ہوں۔ خیالات کو لکھ ڈالو تو اپنے ہی دل میں ایک طرح کی وضاحت آجاتی ہے۔'

اور اُس نے چار پانچ مضامین چُن کر میری طرف بڑھا دئے۔ مضامین ہی تھے، چھوٹے چھوٹے، مختلف موضوعات پر۔ میں نے عنوان پڑھے، تو اب اُکتاہٹ کے باوجود ہنسی آگئی۔ جمہوریت کی خامیاں، ہندو سماج میں بیوہ کی حالت، رام کی کامیڈی، سیتا کی ٹریجڈی، ایک گفتگو ـــ ایک سائنسداں، پنڈت اور بھگوان کے درمیان، ننگا سچ، وغیرہ۔ مگر پھر دل اکتاہٹ سے بھر اُٹھا۔ وہی برسوں کے گھسے پٹے خلاصے۔۔۔ لڑکی کو خود اپنا شوہر چُننے کا حق ہونا چاہیئے، جہیز کی رسم نہیں ہونی چاہیئے، بیوہ کو دوبارہ شادی کی اجازت ہونی چاہیئے۔ میں نے نظر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا تین چار برس کا اور کھیل ہے۔ زیادہ سے زیادہ سات آٹھ برس کا، میں نے دل ہی دل میں کہا۔ لکھنے دو، کتنے مضامین اور لکھ لے گا! سماج سُدھار کے کتنے سجھاؤ اور پیش کر لے گا! میں نے مضامین لوٹاتے ہوئے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک سے خالی تھیں، لیکن ان میں گہرائی نہیں تھی۔ ساکت، مطمئن نظر آنے والی آنکھیں، گویا زندگی بھر کی بے چینی سے چھٹکارا پا گیا ہو، لیکن ایسی آنکھیں تو کسی گھٹیا کلاکار کے چہرے پر بھی مل جاتی ہیں، جو بھونڈی تخلیق کی تکمیل کے بعد مطمئن، مسکراتا ہوا چلتا ہے۔ اور اب، انگنت سادھوؤں کے چہرے پر بھی، جنھوں نے ایک نقاب اوڑھ رکھا ہوتا ہے۔

*

پھر یکایک اُس آدمی کے لیے میرا رویہ بدل گیا۔ اس آدمی کو کُریدو، میں نے دل ہی دل کہا۔ جو آدمی اصلاح کرنے نکلتے ہیں، وے ضرور اندر سے کہیں ٹوٹے ہوتے ہیں۔ یہ آدمی ضرور کہیں سے بھاگ کر سماج سیوا کی پناہ میں آیا ہے۔ اسے کُریدو۔ جو آدمی اس عُمر میں سماج کو پٹری پر بیٹھانے نکلا ہے، اُس کے اندر گہرائی میں کہیں ضرور کوئی زخم ہوگا۔ ایسے لوگ دنیا کو تو دھوکا دیتے ہی ہیں، سب سے بڑھ کر خود کو دھوکا دیتے ہیں۔

وہ آدمی مسکرا رہا تھا۔ شانت، ساکت مُسکان۔ جی میں آیا، اُس کے چہرے پر سے اس اوڑھی ہوئی مسکان کا لبادہ نوچ ڈالوں، تاکہ اُس کا اصلی چہرہ، زندگی سے گھبرایا

بھولا، ڈرا ہوا چہرہ، سامنے آجائے۔

..... آپ کا خاندان تو گاؤں میں رہتا ہوگا؟

میں نے ٹھیک سوال پوچھا ہے۔ سبھی زخم خاندان میں ہی لگتے ہیں، اس کا چہرہ صاف بتا رہا ہے کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ اُس کے چہرے پر سایہ سا اُڑ گیا۔

اُس نے اپنے بیٹے کے بارے میں بعد میں بتایا، پاگل بیٹی کے بارے میں سب سے پہلے۔ وہ ۲۳ برس کی ہے لیکن چلاتی نہیں..... چپ چاپ بیٹھی رہتی ہے۔ چھوٹا موٹا اپنا کام بھی کر لیتی ہے۔ میں نے اُسے اپنی بہن کے پاس دوسرے گاؤں میں چھوڑ رکھا ہے۔ میں گھر کا خرچ دیتا رہتا ہوں — بیٹے کی موت پانچ برس پہلے ہوئی ہے۔... میرے ریٹائر ہونے کے بعد..... دل کی حرکت رک جانے سے۔ وہ بہن سے تین برس چھوٹا تھا۔ بولا — لیکن مجھے اس کا افسوس نہیں ہے کیسی کو دیر سویر مرنا ہی ہے، مرجانے والے فرد پر کیا رونا!

اب یہ جھوٹ بولنے لگا ہے۔ اپنے زخم کو پھر سے ڈھکنے لگا ہے۔ مجھے پھر سے شبہ میں ڈالنے لگا ہے۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ بیٹے کے مرجانے اور بیٹی کے پاگل ہو جانے کی وجہ سے ہی سماج سدھار کرنے نکلا ہوں۔ میں بھی تو تکلف میں سرہلائے جا رہا ہوں! یہ تکلف ہی تو ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے، ہمیں حقیقت سے آنکھیں چار نہیں کرنے دیتا۔ میں چاہتا ہوں، یہ آدمی اپنے زخم کو دیکھے اور کہے کہ یہ کبھی بھر نہیں پائے گا، کہ میں اپنے کو جھٹلا رہا ہوں۔ یہ جانتا بھی ہے، پھر بھی اس بات کو تسلیم کیوں نہیں کرتا؟

...... کیا آپ کے بیٹے کا بیاہ ہو چکا تھا؟

میں پھر کریدنے لگا ہوں۔ لمحہ بھر کے لیے اُس کی آنکھیں میری جانب تاکتی رہیں، پھر کہنے لگا.... بیٹے کی بیوی اب ایک اسکول میں پڑھاتی ہے۔ اپنے گاؤں میں ہم نے بچوں کے لئے ایک اسکول کھول رکھا ہے، وہ اُس اسکول کو دیکھتی ہے۔ ہمارا اسکول ضلع بھر میں سب سے بڑھیا اسکول مانا گیا ہے۔ اس سال ہم اسکول میں دو درجے اور بڑھا دیں گے۔ اُس نے پھر سے ویسے ہی اپنا ہاتھ ہوا میں تیرایا، جیسے اسٹیم کے مقابلے میں بجلی کے اوصاف بتاتے ہوئے تیراتا رہا تھا۔ اُس کا ولولہ پھر بڑھنے لگا تھا۔

*

وہ آدمی اپنے کاغذ سمیٹ کر بکس میں ڈال رہا تھا۔

میں نے دل ہی دل کہا، آج سے پانچ سال بعد اس آدمی کے ہاتھ کاغذ سمیٹتے وقت کانپ رہے ہوں گے۔ کہہ چکنے کے بعد میں نے پایا کہ میرے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آج سے دس برس بعد یہ آدمی دنیا میں نہیں ہوگا۔ کہیں پر بھی نہیں ہوگا۔ میں نے آنکھ اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ اس جملے کا بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہ جیتے جی اتنا ہی بے ڈھنگا ہے، جتنا مرنے کے بعد ہو جائے گا۔ اس درمیان اُس نے چشمہ اتار کر ہاتھ میں لے لیا تھا اور بڑی فلسفیانہ سی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ابھی تک جتنے بھی مذاہب ہوئے ہیں، ان میں اخلاقی قوانین کا تو دخل تھا، لیکن سائنس اور معاشیات کا دخل نہیں تھا۔ اب ہمیں ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے، جو سائنس، معاشیات اور اخلاقیات پر قائم ہو۔

اپنے ایک ایک جملے سے وہ میرے سامنے ننگا ہو رہا تھا۔ یہ مذہب کی بات اس لئے کرتا ہے کہ اسے خود مذہب کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ بیٹے کی موت کو نہ سمجھ پانے کی ہی وجہ سے یہ نئے مذہب کا تصور کرنے لگا ہے، لیکن یہ مانتا کیوں نہیں؟

میرے اندر کا ایک ببھوکا سا اٹھا۔ میں نہیں جانتا کیوں میرے دل میں اُس آدمی کے لئے نفرت کی اتنی تیکھی لہر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کیا اس لئے کہ وہ بوڑھا ہو چلا تھا؟ کیا اس لئے کہ وہ مجھے بہت بڑے وہم اور بناوٹ کا شکار لگنے لگا تھا، جو جھوٹ کا لبادہ اوڑھے مسکراتے رہنا چاہتا ہے، جو نہ انسان کو سمجھتا ہے اور نہ انسان کی فطرت کو!

..... آپ کی ان تجویزوں سے کیا دیش میں رام راجیہ آجائے گا ؟

وہ ٹھٹھک گیا۔ بولا ۔۔۔ کون جانے ! شاید کچھ بھی نہیں ہوگا ؟ پھر بڑی انکساری سے بولا ... کیا سچ مچ میرے خیالات میں کوئی مطلب نہیں ہے ؟ آپ کیا سوچتے ہیں ؟ ہمیں کیا کرنا چاہیئے ؟

میں چپ رہا۔ اُس کی انکساری اور صاف گوئی میں مجھے فخر کی بُو آنے لگی تھی۔

گاڑی اب لق و دق میدانوں کے درمیان بھاگتی چلی جارہی تھی۔ اندھیرا ہوچکا تھا اور کھڑکی میں سے جھانک کر بھی دیکھو، تو اندھیروں کے ڈھیر ہی ڈھیر نظر آتے تھے۔ یہ آدمی کسی شہر میں مجھ سے ملتا، تو اس گفتگو کا کوئی سلسلہ ہوتا۔ بھاگتی گاڑی میں تو انسان نہ صرف اپنے سراپے سے۔ بلکہ دین دنیا سے ہی کٹ جاتا ہے صرف بھاگتی گاڑی کے پس منظر میں ہی ہم ایک دوسرے کو دیکھے جارہے تھے۔ کسی چیز کا کوئی مستقل وجود نہیں رہ گیا تھا۔ وجود تھا تو، دوڑتی گاڑی کا، لمحہ بہ لمحہ بھاگتے وقت کا۔ محسوس ہوتا جیسے گاڑی زمین کی گہری گھاٹیاں پار کرتی جارہی ہے۔ اور صدیاں پیچھے چھوٹتی چلی جارہی ہیں۔ اور مافوق الفطری انسان ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو گھورتے جارہے ہیں۔ جب کسی چیز کا کوئی مطلب، نہیں رہ گیا ہے، تو یہ کس چیز سے چمٹا ہوا ہے ؟ جہاں سب کچھ ٹوٹ رہا ہے، وہاں یہ کن ٹکڑوں کو جوڑنے کی کوشش کررہا ہے۔

میرا دل چاہا، آگے بڑھ کر اُس کی ٹوپی سر پر سے اُٹھا کر اچھال دوں۔ اور میں نے وہی کیا۔ میں اپنی سیٹ پر سے اُٹھا۔ اُس وقت وہ اپنے مضامین کی پٹاری کھولے اُن پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے میری آہٹ پاکر سر اوپر اٹھایا۔ ... یہ دیکھو، انکم ٹیکس والا مضمون مل گیا ہے ! اور وہ اپنی بھونڈی انکساری میں مسکراتا ہوا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے میرے ہاتھ ٹھٹھکے ... میں بھی تو اپنی روایتوں کے جنگل سے جھپٹ کر ہی نکلتا ہوں ! میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے اپنا مضمون اُٹھا کر میری جانب بڑھایا اور میں نے مضمون کی طرف ہاتھ بڑھانے کی بجائے اُس کے سر کی طرف، اس کی سفید چھجانی کشتی نما ٹوپی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اُسے ایک جھٹکے سے اوپر پھینک دیا۔ ٹوپی اُڑی، ڈبے کی چھت سے ٹکرائی، بجلی کے پنکھے سے ٹکرائی اور اڑتے پنچھی کی طرح پھڑپھڑاتی دائیں جانب کی دیوار کے ساتھ جاکر ٹکرائی، جہاں کھونٹی پر اس کی تھرمس بوتل لٹک رہی تھی۔ اور وہاں سے پھٹے بیتھڑے کی طرح جھولتی نیچے آگری۔

... یہ کیا مذاق ہے ؟ اس کا مطلب ؟

... یہی نہیں، میں کچھ اور بھی کرنے جارہا ہوں ! اور میں نے آگے بڑھ کر ایک کے بعد ایک، دو تھپڑ اس کی چاند پر جکڑ دئے۔

وہ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا ... تم میری بے عزتی کررہے ہو جی ! میں تمھارے باپ کی عمر کا ہوں ! تم ہو کون ؟ کون ہو تم ؟ اس کا مطلب ؟ میں ابھی زنجیر کھینچوں گا ! تم سمجھتے کیا ہو ؟

وہ دائیں ہاتھ کی دیوار کی جانب بڑھا۔ میں نے سوچا، زنجیر کھینچنے جارہا ہے، لیکن زنجیر کھینچنے کی بجائے وہ حقیقت میں اپنی ٹوپی اٹھانے گیا تھا۔ اس نے نیچے جھک کر سامان کے نیچے گری اپنی ٹوپی اٹھائی، اُسے آستین کے ساتھ پونچھا اور سر پر پہن لیا۔

وہ چپ چاپ میری طرف دیکھتا رہا۔ اُس کی سانس پھول رہی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے اُس کے چہرے کے پٹھے کچھ کچھ ڈھیلے پڑنے لگے۔ مجھے ایسا گمان ہوا، جیسے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لوٹ آئی ہے۔ وہ پھر سے عیاری کا نقاب چڑھا رہا ہے ... تم نے میرا امتحان لیا ہے کیا ! لیکن میں پورا نہیں اُترا ! میری باتیں تمھیں اکھریں گی، یہ میں سمجھ سکتا ہوں، لیکن تم نے کس بات کا احتجاج کیا ہے ؟ جب میں تمھارے

ہو گیا تھا، تو میں نے ایک انگریز افسر کی ٹوپی اُتار کر پھینک دی تھی اور میں تین سال تک جیل میں رہا تھا، لیکن وہ زمانہ دوسرا تھا پھر دھیرے سے بولا۔ مگر وہ تو دیش کا دشمن تھا، میں تو دشمن نہیں ہوں! میں کس کا دشمن ہوں؟

میں نے آگے بڑھ کر سیدھا ایک جھانپڑ اُس کے منھ پر جڑ دیا۔ اُس کا منھ دوہرا ہو گیا۔ اس کی ناک بہہ آئی جس سے میری ساری ہتھیلی سن گئی۔ اُس کی ٹوپی پھر نیچے جا گری تھی اتنے زور کا جھانپڑ دینے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میرا اپنا دل دہل گیا۔ میں بھی تو اپنی روایتوں سے اپنا پنڈ پوری طرح سے چھڑا نہیں پایا ہوں۔ اس کے منھ سے چیخ سی نکلی۔

.... سور کے بچے! وہ چلایا۔ پھر جیسے رو کر بولا۔۔

مار ڈال.... مجھے مار ڈال! میں اکیلا ہوں، بوڑھا ہوں، میرے بدن میں طاقت نہیں ہے، کیا اسی لیے تو مجھے مار ڈالنا چاہتا ہے؟

میں جتنا زیادہ اپنے سلوک پر حیران ہو رہا تھا، اتنا زیادہ مجھے بڑھاوا مل رہا تھا۔ میں اُسے ذلیل کرنا چاہتا تھا وہ آدمی مجھے چیتھڑا سا لگ رہا تھا، جیسے میں اپنے پیروں تلے روند ڈالنا چاہتا تھا جی میں آیا، آگے بڑھ کر اُس کے کپڑے پھاڑ دوں، انھیں تار تار کر دوں مجھے محسوس ہوا، جیسے وہ میرے ساتھ چپٹا ہوا ہے اور میں اُسے اپنے جسم سے الگ نہیں کر پا رہا ہوں۔ میں اُسے اکھاڑ کر اپنے سے الگ کر دینا چاہتا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی کا پلّہ اُٹھا دیا۔ پھر اُس کی جانب لوٹ آیا۔ وہ اپنی سیٹ میں دھنس گیا تھا اور میری جانب دیکھے جا رہا تھا، لیکن اُس نے میرے سامنے ہاتھ نہیں جوڑے۔ بلبلایا گڑگڑایا بھی نہیں۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، نیچے جھک کر اُس کے مضامین کا بکس اُٹھایا اور اُسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ باہر گرنے کے پہلے ہی بکس میں سے مضامین اُڑنے لگے تھے۔ دو ایک کاغذ تو کھڑکی میں سے اُڑتے ہوئے پھر اندر آ گئے تھے۔

پھر میں نے کھڑکی کا پلّہ گرا دیا۔

لیکن یہ کام کرنے کے بعد یکایک میرے دل میں گھٹن سی ہوئی۔ اُس آدمی کی طرح، اس کے چھپے مضامین کی طرح مجھے اپنی یہ حرکت بھی چھچھلی اور بیہودہ لگی۔ اچانک بڑی گہری اُداسی کا احساس مجھے ہوا۔ مجھے یہ سارا سفر، اس سفر کا سارا کارنامہ بے معنی اور بیہودہ لگنے لگا، لیکن شاید میں پھر سے کمزور ہو رہا تھا۔ سچ سچ، پرانی روایتیں مر کر بھی نہیں مرتیں۔

میں نے سگریٹ سلگائی اور اپنی سیٹ پر لوٹ آیا۔ میرے اندر کی اُداسی کو صرف سگریٹ کے گہرے کش ہی دور کر سکتے تھے۔ وہ پہلے کی ہی طرح دبک کر بیٹھا مجھے گھورے جا رہا تھا۔

لمبے لمبے کش کھینچتے ہوئے مجھے گہری اُکتاہٹ نے جکڑ لیا۔ کب یہ سفر ختم ہوگا؟ میں یہاں کیوں بیٹھا ہوں؟ میری بےچینی کا، میرے پھٹتے سینے کا، میرے ناقابلِ برداشت درد کا کوئی علاج نہیں تھا۔ بکس پھینکنے کی بجائے مجھے خود گاڑی میں سے کود جانا چاہیے تھا۔ ایسے سفر کا یہی انجام ہو سکتا ہے مجھے پہلے وہ آدمی بے ڈھنگا سا لگ رہا تھا، اب میں خود کو بے ڈھنگا محسوس کرنے لگا تھا۔ میں اُس کے زخم کریدنا چاہتا تھا، جبکہ میرا اپنا کلیجہ زخموں سے چھلنی ہو رہا تھا۔ میرے دل میں آیا، اُٹھ کر ڈبے کی دیوار سے اپنا سر پھوڑ لوں اُس بڈھے سے... ابھی بھی مجھے نفرت تھی، لیکن میرا دھیان اپنی ناقابلِ برداشت حالت پر لوٹ آیا تھا......

میں کیا کروں؟ میں یہاں کیوں کر ہوں؟

وہ آدمی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بولا کچھ نہیں، صرف مشتبہ سی آنکھوں سے میری جانب دیکھتا رہا، اچھا ہی ہوا، جو وہ کچھ نہیں بولا، ورنہ میں پھر اُس پر ٹوٹ پڑتا اور شاید اُس کا گلا گھونٹ دیتا۔

*

دیر تک سیٹ پر بیٹھے رہنے اور ایک کے بعد ایک تین سگریٹیں پھونک چکنے کے بعد میں تھک کر چور ہو گیا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے میں اکڑوں ہو کر سیٹ پر لڑھک گیا۔

گاڑی دھاڑتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ شاید یہ سارا شرمناک ڈرامہ اس چنگھاڑتی گاڑی کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں اُسے برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ شاید اس آدمی کی ہموار آواز نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔۔ اُس کے اس خطیبانہ یقین نے کہ زندگی کو بدلا جا سکتا ہے، بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

جب میری آنکھ کھلی، تو گاڑی کسی اسٹیشن پر رُکی تھی، نہ جانے کتنی دیر سے رُکی کھڑی تھی۔ میرا جسم اکڑ رہا تھا۔ ٹیڑھا اوندھے منھ پڑے رہنے کی وجہ سے میرا عضو عضو اکڑ گیا تھا گاڑی کھڑی تھی اور چپ تھی، جیسے چنگھاڑتا جانور یکایک چپ ہو گیا ہو۔ نہ جانے رات کتنے پہر بیت چکی تھی۔

تبھی میری نظر سامنے کی سیٹ پر گئی۔ وہ آدمی سیٹ کے ایک کونے میں بیٹھا، گھٹنوں پر کاپی رکھے کچھ لکھے جا رہا تھا کوئی مضمون لکھ رہا ہے، میں نے سوچا۔ حالات کی ستم ظریفی کو دیکھتے ہوئے مجھے نہیں دینا چاہئے تھا، لیکن اس کے برخلاف میرا گلا رندھنے لگا مجھے محسوس ہوا، جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھ کر اُٹھا ہوں۔

تبھی گارڈ کے سیٹی دینے کی آواز آئی اور گاڑی رینگنے لگی۔ اُس کی گردن کاغذ پر جھکی تھی اور ٹوپی پھر سے سر پر تھی۔ مجھے محسوس ہوا، جیسے اب وہ مجھ پر ہنس رہا ہے، مجھے ذلیل کر رہا ہے۔ اب کی بار اُس کی ٹوپی اُتار پھینکنے کی ہمت مجھ میں نہیں رہ گئی تھی۔

پھر اُس نے ایک عجیب بات کی۔ مجھے اپنی سیٹ پر اٹھ کر بیٹھا دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور دیر تک چپ چاپ میری جانب دیکھتا رہا، ایک محزون مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر آئی۔ اُس نے لوٹ کر اپنے کاغذ کی جانب دیکھا، جس پر وہ لکھ رہا تھا پھر اُس نے مڑ کر کھڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا، اُس کا پٹ اٹھایا اور ہاتھ میں پکڑا کاغذ مروڑ کر باہر پھینک دیا۔

[illegible]

شاید تم ٹھیک کہتے ہو، بوڑھوں کو زندگی سے کنارہ کر لینا چاہئے! بہتر ہے، یہ اندھیرے میں ڈوب جائیں! جنم لیتے ہی مر جائیں! پھر دھیرے سے بولا۔۔۔ میں تو دو، تین برس میں جاؤں گا، لیکن تم۔۔۔؟ تمہارا کیا ہوگا!

گاڑی دھیرے دھیرے رُکنے لگی تھی۔ وہی ٹھنڈی عیارانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر لوٹ آتی تھی، گویا اس کے اندر پھر سے کوئی سرگم بجنے لگی تھی۔ اور وہ اُس کی لئے پر اپنا ہاتھ تیراتے ہوئے پھر کچھ بولنے جا رہا تھا، پھر سے کوئی نصیحت جھاڑنے جا رہا تھا میں نے منھ پھیر لیا اور باہر پھیلے اتھاہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا ـــــ

*

"مراثی انیس میں جذباتی تاویل" میری نظر میں

احمد رضا رضوی

"مراثی انیس میں جذباتی تاویل" ڈاکٹر سلام صاحب کی ایک ایسی تصنیف ہے جس نے واضح کر دیا کہ مراثی انیس میں جذباتی تاویل کا عنصر بدرجہ اتم پایا جاتا ہے. اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ مرثیہ ایک ایسی کمل صنف شاعری ہے جس نے اُردو زبان کو دنیا کی دیگر زبانوں کے دوش بدوش چلنے کے لائق بنا دیا ہے کے ساتھ ہی ساتھ اس تصنیف نے ڈاکٹر سلام صاحب کا تعارف ایک نئے انداز سے کرایا ہے. اس تصنیف کے غائر مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ ڈاکٹر سلام صاحب انگریزی ادب اور انگریزی شاعری کے نکات، لوازمات اور ماہیات پر مکمل عبور رکھتے ہیں. اس میں شک نہیں ہے کہ مصنف موصوف نے اس کتاب میں انگریزی و ہندی زبان کے شعراء کے کلام کا متوازن ملاپ پیش کر کے اپنی روشن خیالی اور ادبی صلاحیت کا بین ثبوت دیا ہے. اس کے علاوہ جذباتی تاویل کا واضح اور مکمل تجزیہ کر کے آپ نے مراثی انیس کے تنقیدی باب میں ایک قابل قدر اور نادر اضافہ کیا ہے.

باب اول میں ڈاکٹر صاحب نے جذباتی تاویل کا مفہوم بہت سادہ الفاظ میں پیش کر کے عوام کے اذہان کو جذباتی تاویل سے روشناس کرایا ہے. اس سلسلے میں آپ نے یہ محسوس کر لیا کہ عوام مراثی انیس سے دلچسپی رکھتے ہیں اور گرویدہ ہوتے ہوئے بھی مراثی انیس کے رموز سے ناآشنا ہیں. اس لیے آپ نے یہ ضروری سمجھا کہ قبل اس کے کہ مراثی انیس میں جذباتی تاویل سے روشناس کرایا جائے، عوام کو جذباتی تاویل کے صحیح مفہوم سے واقف کرا دیا جائے. ڈاکٹر صاحب کا یہ عمل ان کے ماہر نفسیات ہونے کی واضح دلیل ہے اور ان کی بصیرت افروز استدلالی بحث قابل صد ستائش ہے. اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اُردو نقادوں کی حسرت آمیز عدم توجہی کا اعتراف کرتے ہوئے انگریزی نقادوں کا سہارا لیا ہے اور سب سے پہلے جان رسکن کے مضمون OF THE PATLE TIC FALLACY کا حوالہ دیتے ہوئے جان رسکن کے اس قول کو نقل کیا ہے کہ اشیا بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہیں. جب تک ہمارے حواس بیدار نہیں ہوتے ہیں اور آگے چل کر اس نے مبالغہ کو شاعری کی طلسیت کا جزو لاینفک بتایا ہے. بشرطیکہ شعراء کے بیانات میں صداقت زیادہ ہو اور مبالغہ اس کے جذبات کے تاثرات کے نتیجہ میں معرض وجود میں آیا ہو. چونکہ جذباتی تاویل کا تعلق براہ راست انسان کے جذبات سے ہے اور جذبات پر قابو پانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ جذبات کی رو میں بہہ جانا ایک آسان بات ہے اس لیے یہ کہنا غیر مناسب نہ ہو گا کہ جذباتی تاویل کا اثر وہ لوگ زیادہ قبول کرتے ہیں جو کمزور طبیعت کے ہوتے ہیں اور حالات کا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں رکھتے ہیں. لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہر انسان کسی نہ کسی حد تک جذباتی ضرور ہوتا ہے. اور شاید یہی سبب ہے کہ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور پائی جاتی ہے. جب انسان کی انسانیت کا وجود جذبات پر منحصر ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ ہر صنف شاعری میں جذباتی تاویل کا عنصر اس طرح واضح ہے کہ خوشی و مسرت کا اظہار کرتے ہوئے شاعر کے ذہن پر کیف و مستی کے متوالے بادل چھا جائیں اور اس کے بیانات اتنے فرحت افزا ہوں کہ سامعین اور قارئین کے دل و دماغ پر سحاب نشاط کا ابر چھا جائے

رہے۔ اسی طرح المیہ واقعات کو نقل کرتے وقت اس کے دل و دماغ پر درد و غم کی یاس آمیز گھٹا چھا جائے۔ تاکہ اس کے غم انگیز بیانات سے سامعین و قارئین کے دل محزون ہو جائیں۔

قول رسکن کو نقل کرنے کے بعد ڈاکٹر سلام نے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جہاں تک جذباتی تاویل کا تعلق ہے یہ اس دماغی کیفیت کا نتیجہ ہے جو افسردہ ہے۔ شاعر جذباتی تاویل کا اظہار اس وقت کرتا ہے جب وہ مغموم ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ تمام خارجی اشیا سے اپنے جذبات کی شدت کو وابستہ کر دیتا ہے۔ دراصل اس کو اپنے شکستہ آئینۂ دل میں ساری دنیا کا عکس افسردہ نظر آتا ہے۔ چونکہ وہ غمگین ہے اس لیے اس کو ساری کائنات غم میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے، بقول شاعر

کہتا ہے کون یار کی محفل اداس ہے
کوئی نہیں اداس مرا دل اداس ہے

باب دوم میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ جذباتی تاویل مختلف زمانوں میں پائی جاتی ہے اور اس کا وجود ابتدائے آفرینش (یعنی جب سے انسان اور فطرت میں رابطہ قائم ہوا ہے) سے ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے نہایت دلکش انداز میں حضرت آدمؑ کے بیٹوں یعنی ہابیل اور قابیل کی آپسی جنگ اور اس کے نتیجہ میں چھوٹے بھائی کے ہاتھوں بڑے بھائی کے قتل پر باپ کے مرثیہ میں جذباتی تاویل کی جھلک کو نمایاں کیا ہے۔ زبان عربی میں اقتباسات پیش کر کے ڈاکٹر سلامؔ صاحب نے عربی داں حضرت کی ادبی تشنگی کو آسودہ کیا ہے اور اپنی قوت تجسس سے ثابت کر دیا کہ قاتل قابیل ہی ہے۔ ہابیل کے قتل پر حضرت آدم علیہ السلام از حد غمگین ہیں۔ اس لیے ان کو ساری دنیا غم میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ سی طرح ڈاکٹر صاحب نے فردوسی کے اس مرثیہ کے چند اشعار جو سہراب کی موت پر اس کی ماں کی طرف سے ہیں، کی وضاحت کر کے جذباتی تاویل کی جھلکیوں کو نمایاں کیا ہے۔ اسی طرح مختلف زمانے اور مختلف ممالک اور مختلف زبانوں کی مثالیں پیش کر کے ڈاکٹر صاحب [illegible] بھی شاعر کے احساسات مجروح ہوں گے، اس [illegible] محسوس ہوگی اور کبھی کبھی فرط الم میں وہ غیر متحرک چیز کو بھی مخاطب کر کے اپنے غم و غصہ کی شدت کو ناواقف طور سے کم کرنے کی سعی پیہم کرتا رہے گا۔ چونکہ جذبات پابند ہوتے ہیں واقعات کے۔ اس لیے جذبات کی قلت و شدت کا انحصار رنج و غم کی کمی و زیادتی پر ہے۔ جب شاعر دوسروں کے دکھ درد محض اس انداز میں بیان کرتا جا رہا ہے گویا کہ اس نے خارجی طور سے واقعات کو بارتقاء مشاہدہ نقل کیا ہے۔ تو اس میں جذباتی تاویل کی بہت مدھم جھلک دکھائی پڑتی ہے۔ یعنی جب شاعر خود واقعات سے مکمل طور سے متاثر ہوتا ہے تو اس میں جذباتی تاویل کی بہت واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ڈاکٹر سلامؔ صاحب نے مراثی انیسؔ میں جذباتی تاویل منظر عام پر لانے سے قبل جو تمہیدی ماحول تیار کیا ہے، وہ قابل صد ستائش ہے۔ ابواب کی ترتیب ان کی کاوش اور نفسیاتی استعداد کا پتہ دیتی ہے۔

تیسرے باب میں ڈاکٹر صاحب نے واضح کیا ہے کہ اردو شاعری میں شروع ہی سے مرثیہ کا وجود ہے۔ گویا کہ اردو شعراء نے ابتدا ہی سے فطرت سے رابطہ قائم کر لیا ہے۔ اور انھوں نے فطرت کا تجزیہ اپنے جذبات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ محمد قلی قطب شاہ کے مرثیوں میں جذباتی تاویل کی جھلک موجود ہے۔ انھوں نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے ماتم میں فطرت بھی غمگین ہے ڈاکٹر صاحب موصوف نے محمد قلی قطب شاہ کے علاوہ وجہیؔ، افضلؔ پانی پتی، کاظم گولکنڈوی، شاہیؔ، نصرتیؔ، مرزاؔ گولکنڈوی وغیرہ کے ان مرثیوں کو پیش کیا ہے جن کا تعلق صرف حضرت حسینؑ کی شہادت سے ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ غم حسینؑ وہ ہے، جس کی جگہ ہر دل میں ہے اور خصوصاً وہ دل جو رضائے الٰہی اور ولائے رسول اکرم صلعم کی طرف مراجعت کر چکا ہو۔ کربلا کی خونچکاں داستان پر انسان کے علاوہ ساری فطرت رونے پر مجبور ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق رحمۃ للعالمین کے پارۂ جگر سے ہے۔ جن کے متعلق رسول مقبولؐ نے خود فرمایا ہے کہ "حسینؑ منی و انا من الحسین" یعنی حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اس حدیث کے جزو ثانی پر اگر آپ غور فرمائیں تو آپ کو صاف صاف پتہ چل جائے گا کہ رسول مقبول نے قبل شہادت

امام حسینؑ کو۔ میرے نواسے کی قربانیاں میری بقا کی ضامن ہوں گی۔ ایسی قربانی جس کو اللہ اور اس کا حبیب دونوں نے وجہ بقائے انسانیت کہہ کر نوازا ہو، اس کے غم میں جملہ مخلوق عالم غمگین ہو تو اس میں تعجب کا محل نہیں ہے۔ یہ عین تقاضائے فطرت ہے۔

اس کے بعد لکھنؤ کے مرثیہ گو شعراء میں میر ضمیر کے مرثیہ کے چند بند پیش کر کے مصنف نے واضح کیا ہے کہ لکھنؤ کے مرثیہ گو شعراء کے یہاں انسان کے ساتھ فطرت کا جذبۂ ہمدردی بہت زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔ اسی جذبۂ ہمدردی کو ایک جگہ میر عشق نے بھی پیش کیا ہے۔ بعد شہادت امام حسینؑ امام مظلومؑ کا بیمار بیٹا سید سجاد اس قافلے کی سارباں کر رہا ہے، جس میں خانوادۂ رسالت کی عورتیں گرفتار ہیں۔ جناب سید سجاد اسیر بلا بیواؤں اور یتیموں کو لیے ہوئے قافلے کے ساتھ زنداں کی طرف جا رہے ہیں۔ اس موقع پر انسان تو انسان حیوان اور درخت وغیرہ بھی آنسو بہا رہے ہیں۔

جاتے تھے پیٹتے ہوئے سر، حشر تھا عیاں
آنسو ہر ایک اونٹ کی آنکھوں سے تھے رواں
جنگل اداس، زرد بگولوں سے آسماں
تھے بیچ میں سر شہداء گرد برچھیاں
اس دھوپ میں سروں کی چمک آشکار تھی
نکلے تھے چاند قدرت پروردگار تھی

باب چہارم میں ڈاکٹر صاحب نے نہایت استدلالی انداز میں ثابت کر دیا ہے کہ میر انیس کے مرثیوں میں جذباتی تاویل سب سے زیادہ کیوں پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ بیان فرماتے ہیں کہ

"اردو شاعری میں جذباتی تاویل کا رجحان مرثیہ گو شعراء کے یہاں زیادہ نمایاں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مرثیہ گو شعراء غم حسینؑ کا ذکر کرتے ہیں۔ چونکہ وہ اس موقع پر خود افسردہ خاطر ہوتے ہیں اس لیے وہ فطرت میں بھی اپنے غم کا عکس دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ در حقیقت جذباتی تاویل میں وہی شاعر کامیاب ہوتا ہے جو افسردہ دل ہوتا ہے چونکہ مرثیہ گو شعراء میں میر انیسؔ کا مرتبہ سب سے زیادہ بلند ہے اس لیے ان کے یہاں جذباتی تاویل کی حسین اور موثر شکلیں فراوانی کے ساتھ نظر آتی ہیں۔"

باب پنجم میں میر انیسؔ کے مرثیوں میں جذباتی تاویل کی کافی مثالیں موجود ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ میر انیسؔ کی ساری شخصیت پر مودّت اہلبیت چھائی ہوئی ہے۔ بقول سلام صاحب اگرچہ جذباتی تاویل کی بنیاد فریب نظر اور فریب خیال پر قائم ہے کیونکہ جب انسان خود غمگین ہوتا ہے تو اس کو فطرت بھی غمگین نظر آتی ہے۔ تاہم کسی نہ کسی حد تک ہم اس افسانہ و افسوں کے دھندلکے میں صداقت اور حقیقت کی کرن بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ دراصل انسان اور فطرت دو اکائیاں نہیں ہیں بلکہ دونوں کا ہیولیٰ ایک ہی خمیر سے تیار ہوا ہے۔ اسی لیے اگر فطرت کو انسان سے ہمدردی ہے تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ اس بات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھانے کے لیے مصنف موصوف نے تخلیق کائنات کے مسئلے کو نہایت مفصل و مکمل طور پر بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کازمک دور (COSMIC ERA) کو فطرت کا پہلا دور بتایا ہے۔ جس کو محققین نے نہایت اہم قرار دیا ہے اس دور میں یہ کرۂ ارض موجودہ شکل میں نہیں تھا۔ مگر یہ کرۂ ارض جس مادّہ سے تعمیر ہوا وہ مادّہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ وہ قوت جس کے ذریعہ مادّہ کی نمو ہوتی ہے، موجود تھی۔ نہایت سلیس اور عام فہم الفاظ میں ڈاکٹر صاحب نے کرۂ ارض کی ارتقائی منزلوں کو طے کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب علم سائنس اور علم ارضیات میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مسلسل کاوشوں اور اس مضمون میں گہرے مطالعہ کے بعد اس کتاب کو لکھا ہے۔ بہر حال کرۂ ارض کی قدریجی تبدیلی سے انسان فطرت ہی کا ایک جزو ہے۔ اس نے رفتہ رفتہ ارتقائی منزلوں کو طے کیا اور آخر کار حسن و جمال کا مجسمہ بن کر نمودار ہوا۔ چونکہ اس کا فطرت سے گہرا تعلق ہے۔ اس لیے انسان اور فطرت میں ہمدردی کا رشتہ قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان پر غم پڑتا ہے تو فطرت

بھی آنسو بہاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب انسان مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ فطرت اس کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ نہیں کر رہی ہے تو وہ اس سے شکوۂ شکایت کرتا ہے اور بربنائے یگانگت اس کو ظالم بھی قرار دیتا ہے۔ میر انیس کی جذباتی تاویل انھیں تصورات پر قائم ہے۔ چنانچہ حضرت رسول اکرم محمد مصطفیٰؐ کی وفات کے موقع پر میر انیس نے اپنے ایک بند میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا اثر فطرت پر دکھایا ہے۔

سکّانِ سماوات کو واں پہنچا یہ پیغام
اور قابضِ ارواح نے یاں اپنا کیا کام
بیت الشرف فاطمہ میں پڑ گیا کہرام
کانپ اٹھی زمیں ہل گئے مسجد کے درو بام
فریاد گئی عرش تلک شیر خدا کی
کونین میں غل تھا کہ محمد نے قضا کی

حضرت علیؑ کی شہادت کے موقع پر میر انیس نے ایک بند میں حضرت علیؑ کی شہادت کا اثر فطرت پر دکھایا ہے۔ بقول سلام صاحب، اس موقع پر حسن تعلیل کے دریچے سے جذباتی تاویل کی پری اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔

مرحب ہوا علیؑ ولی پر جو حملہ ور
حضرت نے اپنے فرقِ مبارک پہ لی سپر
تیغ اس لعیں کی ہو گئی لیکن یہ کارگر
کاٹا سپر کو شاہ ولایت کے ہاتھ پر
اب تک جو زلزلے سے زمیں کانپ جاتی ہے
گاو زمیں کو ضرب وہی یاد آتی ہے

میر انیس کے مندرجہ ذیل بند سے بھی فطرت کا غم آشکار ہے۔ اور اس بند میں حسن تعلیل کا بھی استعمال کیا ہے۔

پہنچی جو گلستاں میں صبا خاک اڑاتی
پھولوں کے دھڑکنے لگے دل شق ہوئی چھاتی
تھی بلبل خوش نغمہ گلوں کو یہ سناتی
گلزار محمد پہ خزاں آج ہے آتی
باغی تبر و خنجر کیں لے کے چلے ہیں
لٹ جائیں گے وہ نخل کہ جو پھولے پھلے ہیں

کہیں کہیں ڈاکٹر سلام صاحب نے اس کتاب میں میر انیس مرحوم کے مراثی کے چند مخصوص بندوں کو پیش کر کے جذباتی تاویل کا محور صرف شاعر کی عقیدت مندی کو قرار دیا ہے۔ لیکن یہاں پر میرا ذہن میر انیس مرحوم کے مندرجہ ذیل شعر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

مری قدر کر اے زمینِ سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

اور یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ مراثی انیس میں جذباتی تاویل ان کی عقیدت مندی، ملکۂ زباں اور علم نفسیات کے مناسب میل کا نتیجہ ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تصنیف مذکور ڈاکٹر سلام سندیلوی کی اعلیٰ ادبی مہارت، سخن فہمی اور سخن سنجی کی ضامن ہے اور شائقین ادب اردو کی اعلیٰ لذت کے لیے نادر تحفہ ہے

مصنف نے پیش لفظ میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ کتاب بڑی کاوش کے بعد لکھی گئی اور اس میں کافی وقت صرف کیا گیا ہے۔ بلکہ میں یوں عرض کروں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی ساری قوت فکر و تلاش، قوتِ تصنیف و تالیف اور تاریخی معلومات کو صرف کر دیا ہے یہی سبب ہے کہ آج تک ایسی عمدہ اور مفید کتاب میر انیس کے مرثیوں میں جذباتی تاویل پر نہیں لکھی گئی ہے موضوع کی جدت اور ندرت نے ڈاکٹر سلام کی جدت طبع اور ندرت خیال کا تعارف کرایا ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کی یہ کتاب کتنی معیاری ہے، اس کا اندازہ آپ کو اس خط سے ہوگا جو پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے ان کو تحریر فرمایا ہے۔ وہ خط درج ذیل ہے۔ بقیہ صفحہ ۲۲ پر

قسط پنجم

سوانح حیات مانی جائسی

سید صفدر حسین عابدی

قیام دلّی :-

جناب مانی کو اکثر و بیشتر مشاعروں کے سلسلہ میں دلّی جانا ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ تو اسی طرح گذرا کیا کہ دلّی گئے، مشاعروں میں شرکت کی اور واپس آ گئے۔ مگر ضعیفی کے باعث زیادہ سفر دشوار تھا اس لئے دلّی میں حیات لکھنوی فرزند عزیز لکھنوی کے یہاں جو اُن سے سلسلۂ تلمذ بھی رکھتے تھے۔ قیام اختیار کر لیا کچھ دنوں تک سید محمد حسن تابش کے یہاں بھی رہے تھے۔

دلّی کے قیام میں مانی کے تعلقات کئی اعلیٰ سرکاری افسران اور یونین گورنمنٹ کے وزیروں سے قائم ہو گئے تھے۔ جن میں مولانا ابوالکلام آزاد، حافظ ابراہیم، جناب شنکر پرشاد صاحب آئی، سی، ایس چیف کمشنر دلّی اور شیو راج بہادر (آنجہانی) وغیرہ شامل ہیں۔ انھیں حضرات کی توجہ اور ہمدردیوں نے انھیں اپنی مالی مشکلات پر قابو پانے کی قوت عطا کی۔ خاص طور پر مولانا آزاد مرحوم اور حافظ ابراہیم مرحوم کی توجہ اور آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند کی ہمدردیوں کی بنا پر گورنمنٹ آف انڈیا سے ادبی خدمات کے صلہ میں ۱۵۰ ماہانہ کا وظیفہ مل گیا۔ مانی ہی کے لفظوں میں

> "۱۹۵۲ء کے تین چار مہینے گذر جانے کے بعد وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد بالقابہما کی خدمت میں ... ہوا اور ان کی توجہ سے حکومت ہند نے ایک سو پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ ستمبر ۱۹۵۲ء سے مقرر فرمادیا۔

جس کی تجدید ہر سال ہوتی رہتی ہے"

۱۳ر اگست ۱۹۵۲ء کے ایک خط کے ذریعہ کلب مصطفیٰ صاحب کو اطلاعاً تحریر فرماتے ہیں۔

> "سلمہ اللہ تعالیٰ۔ اس عرصہ میں تم اگر نیاز صاحب فتحپوری سے ملے ہو گے تو غالباً اُن سے تمھیں معلوم ہوا ہوگا کہ گورنمنٹ آف انڈیا سے میرا ۱۵۰ ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا ہے۔ محرم کا زمانہ ہے اور تہنیت کی کوئی بات بھی نہیں روزی کا معاملہ ہے۔ اطلاعاً تحریر کر رہا ہوں اللہ نے بڑا فضل و کرم فرمایا"

وظیفہ کے علاوہ ان دنوں مانی کی معاش کا ذریعہ مشاعروں اور ریڈیو پروگراموں میں شرکت اور اکثر رسالوں میں دی گئی غزلوں کا معاوضہ بھی تھا لیکن اس کے بعد بھی انھیں فارغ البالی نصیب نہ ہو سکی۔ مورخہ ۱۸ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کے ایک مکتوب سے ایسا ہی کچھ ظاہر ہوتا ہے۔

> "ستمبر کے مہینہ کا وظیفہ ۱۳ر ستمبر کو مل گیا اور متفرق قرضوں میں رل گیا۔ پھر وہی قرض پر گذر رہی ہے۔ ہوٹل میں کھانے اور چائے کا حساب چل رہا ہے۔ کسی نہ کسی طرح پیٹ پل رہا ہے"

اسی اثناء میں مشہور شاعر جوش ملیح آباد جو ان دنوں رسالہ "آجکل" کے چیف ایڈیٹر بھی تھے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کر گئے اور "آجکل" کے ایڈیٹر کی جگہ خالی ہو گئی۔ مانی نے "آجکل" کی ایڈیٹر شپ حاصل کرنے کی حتی المقدور سعی کوشش کی لیکن ناکام رہے اور وہ جگہ حضرت بال مکند عرش ملسیانی کو جو آجکل کے نائب مدیر

بھی ہفتے کے تقرر سے پر کر دی گئی۔ مورخہ ۲۰ر فروری ۵۱ء کے ایک خط میں کلب مصطفیٰ صاحب کو تحریر کرتے ہیں۔

"تسنیم کی جلدوں نے کچھ کام نہ دیا۔ انتظام
اُس جگہ کا ہوگیا۔ بال مکند عرش ملسیانی (سابق
سب ایڈیٹر) اب ایڈیٹر ہیں۔"

انھیں دنوں جبکہ ماتی رسالہ آجکل کی ایڈیٹرشپ کے لئے کوشاں تھے ریڈیو اسٹیشن دہلی پر ایک مشیر (HDVi SoR FoR URDU) کی ضرورت در پیش ہوئی۔ ماتی نے اس جگہ کے حصول کے لئے بھی بھاگ دوڑ کی مگر اس مقصد میں بھی وہ کامیاب نہ ہوئے۔

شاہ ایران کا ہندوستان میں ورود۔

فروری ۵۶ء میں شاہ ایران رضا شاہ پہلوی کا ہندوستان میں ورود ہوا۔ حکومت ہند کی جانب سے جناب ماتی کو شاہ ایران کی خدمت میں باریاب ہونے اور اپنا قصیدہ پیش کرنے کی اجازت دی گئی۔ شاہ کے حضور میں انھوں نے اپنا تو تصنیف فارسی قصیدہ پیش کیا۔ شاہ نے بقول ماتی بڑی توجہ اور خلوص کا مظاہرہ کیا۔ کچھ دیر تک فارسی زبان ہی میں ادھر ادھر کی باتیں کیں پھر رخصت کی اجازت ملی۔ کلب مصطفیٰ صاحب کو ۲۰ر فروری ۵۶ء کے ایک خط میں شاہ کی خدمت میں اپنی باریابی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"عزیز از جان سلمہٗ اللہ تعالےٰ ادعیہ واقیہ۔
تمھارا پوسٹ کارڈ ملا۔ شاہ ایران کے سامنے میں نے
نظم پڑھی۔ یہ خبر وہاں کیسے پہونچ گئی۔ غالباً مولانا سید
سلطان عباس صاحب (مشہور خطیب اور لکچرر بنارس
ہندو یونیورسٹی) نے لکھا ہوگا۔ ہاں یہ نظم ملفوف ہذا
ہے۔ اس کے کچھ شعر میں نے شاہ کی خدمت میں
پڑھے تھے۔ پڑھنے سے پہلے کہہ دیا تھا (فارسی میں)
کہ یہ نظم کس قدر طولانی ہے۔ میں اختصار کے لحاظ سے
چند شعر پڑھوں گا۔ شاہ نے نہایت توجہ سے اشعار
سنے۔ پھر یہ نظم جو (کتاب مجلد کی صورت میں
تھی) میں نے شاہ کی خدمت میں پیش کی۔
مصافحہ ہوا اور بہت اظہار پسندیدگی فرمایا
کچھ باتیں کیں۔ اسی حالت کی ایک تصویر
ایک مصور (غالباً فوٹوگرافر) نے کھینچ کی
جو اب ہے آؤں گا تو دکھاؤں گا۔"

یہ قصیدہ جسے انھوں نے قصیدہ نہیں بلکہ نظم کہا ہے کہ ماتی حد درجہ شخصیت پرست تھے۔ انھوں نے کبھی کسی امیر یا رئیس کی تعریف نہیں کی۔ اُن کے مجموعۂ قصائد "وادیٔ ایمن" میں صرف ائمہ طاہرین کی شان میں قصائد ملتے ہیں۔ بلہرا کے طویل ترین قیام میں جب کہ وہ راجہ صاحب محمود آباد کے ملازم تھے چند خمسوں کے علاوہ جو اُن کے مخصوص جذبات وکیفیات کے ترجمان ہیں۔ کوئی ایک شعر بھی مہاراجہ کی شان میں بطور مدح وستائش نہیں کہا۔ اسی طرح وہ پورنیہ (بہار) بھوپال اور رام پور اسٹیٹ سے بھی متعلق رہے مگر کسی بھی نواب یا امیر کی شان میں کوئی قصیدہ کبھی نہیں کہا۔ یہ انداز خودی قریب قریب تمام عمر برقرار رہا۔ مگر پھر حالات کے تقاضوں نے انھیں اپنا طریقہ بدلنے پر مجبور کیا لیکن اس کے بعد بھی وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ اس موقعہ پر قصیدہ کی عام روایت سے انحراف کرتے ہوئے مدح کا ایسا طریقہ نکالا کہ نہ تو قصیدہ کی روح پامال ہوسکی اور نہ اُن کی شخصیت ہی مجروح ہوئی۔ اس خیال سے کہ دعویٰ بے دلیل نہ ہو قصیدہ کے من وعن نقل کئے دے رہا ہوں۔

"نذر ارادت"

بحضرۃ نوشیرواں زماں خسرو ایران شہنشاہ محمد رضا ایدہ الرحمٰن۔

چہ خلوت طرب افزا چہ بزم راز و نیاز
گلاں ز بوئے بہ انفاس بلبلاں دمساز

بہ بیں معاملۂ حسن و عشق در گلشن
کہ بلبل است سراپا نیاز و گل ہمہ ناز
میانِ عاشق و معشوق چوں حجاب نیست
کدام سرِّ نہاں را صبا شود غماز
بہ ساز عیش و طرب نغمۂ نسیم بہار
خود نغمۂ میمونِ چمن آغاز
زلن ترانۂ گل بے نیاز مرغ چمن
کہ گشتہ بے ارنی جلوہ اش نگاہ نواز
چمن بہ رنگ طلسم فسوں گری است مگر
کرشمہ سازیٔ نرگس بہ چشم عشوہ طراز
فضائے دہر بہ ایں رنگ بارد نور فشاں
ز ارض بو قلموں تا بہ چرخ شعبدہ باز
دیار ما ہمہ وقف سرور دہم در ہند
بہ وجد حالیؔ رنگیں نواست زمزمہ ساز
زمین مملکت ماست آسماں تمثال
بیا کہ شرح دہم با تو معنیٔ ایں راز
طلوعِ نیر تاباں پس از غروب قمر
ورودِ خسرو ایراں پس از سقوط حجاز
بہ فیض یکجہتی ہیچ امتیاز نیست
میانے دولت ہندوستاں و فارس و ناز
ز عزم تو بود ملک ہند بر سر ناز
جہاں پناہ محمد رضائے ذرہ نواز

رخت ز عشق نبیؐ رشک گلشن رضواں
دلت ز حبِّ علیؑ ہمچو بیت حق ممتاز
ضمیر تست منور ز مہر مہر علیؑ
بگیر جام ز جمشید در دلے خاک انداز
جگر ز رعب و جلال تو آب آب شود
فتد اگر بہ غضنفر نگاہ زہرہ گداز

ہمائے اوج سعادت شود اگر بدہی
بہ مرغ بے پر و بال از نظر پرواز
سرت بلند بہ ہر دو جہاں کہ می داری
بر آستانۂ آل عبا جبین نیاز
بہ ہند اصغر حکمت ترا سفیر کبیر
چہ انتخاب کہ حکمت کند بر آں صد ناز
ہمیشہ از پئے ممدوح خود دعا گفتن
بود وظیفۂ مداح شاہ بعد نماز
شہا دوام تو بر تخت معدلت بادا
بہ عزم محکم و بخت سعید و عمر دراز
حکومت تو بود استوار تا در خلق
سحر ز شام و ز شب روز با بود ممتاز
پذیرد افسر شاہی سعادت از سر تو
بہ بام ہائے قدومت ہما کند پرواز

اس طرح دلّی کے دوران حالیؔ کی ادبی و شعری زندگی میں ایک ہما ہمی نظر آتی ہے لیکن ضعیفی اور بچوں کی جدائی اس بات کی متحمل نہ تھی کہ وہ دلّی میں زیادہ عرصہ تک قیام کر سکتے معاش کی طرف سے اگرچہ آسودہ تو نہ تھے لیکن وظیفہ کے جاری ہو جانے سے انھیں ایک گونہ سکون میسر آگیا تھا اور زندگی کے باقی دن کسی نہ کسی طرح کٹ جانے کی امید پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے دو ایک لڑکے برسرِ روزگار ہو چکے تھے اس لئے اور بھی انھیں زیادہ الجھنوں کا سامنا نہ تھا ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۔ اگست ۱۹۰۰ء میں تجدید وظیفہ کی استدعا کے ساتھ یہ استدعا بھی پیش کی کہ وظیفہ ...... خزانۂ رائے بریلی یو پی سے ملا کرے۔

وظیفہ کے رائے بریلی منتقل ہو جانے کے بعد حالیؔ خود انھیں کے لفظوں میں ایک طرح سے ۔ گوشہ گیر ہوگئے۔

اس زمانہ میں جبکہ وہ سجادہ نشین ہو چکے تھے ان کا زیادہ تر وقت ائمہ معصومین علیہم السلام کی شان اقدس میں قصائد نظم کرنے میں گذرتا تھا۔ اور یا تو ۱۹۵۲ء سے لے کر اُس وقت تک کی ادبی کاوشوں کو یکجا کرنے میں، آخر وقت حیات میں غزل کہنے سے سخت اجتناب تھا۔ تیسرا مجموعۂ کلام جس کا نام انھوں نے "ارژنگ ماؔنی" رکھا۔ ب ماؔنی نے خود ہی مرتب کر لیا تھا ساتھ ہی ساتھ اس کا مقدمہ بھی ۱۳ مئی ۱۹۶۱ء کو لکھ کر تمام کر لیا۔ ماؔنی کے تیسرے مجموعۂ کلام "ارژنگ ماؔنی" کا قلمی نسخہ کلب مصطفیٰ صاحب مرحوم کے پاس محفوظ تھا۔ اسی کی دوسری کاپی جو فاؤنٹن پن سے تیار کی گئی تھی ماؔنی کے صاحبزادے "دلاک" کے پاس موجود ہے۔

لیکن وادیٔ ایمن کی اشاعت کے بعد کے جملہ قصائد کو مرتب نہیں کر سکے۔ اور وہ سب کے سب اب تک بکھرے پڑے ہیں۔ اے کاش ان کے صاحبزادوں یا دیگر اعزا کو جن میں مشہور و معروف ادیب و خطیب بھی ہیں اس بات کی توفیق ہوتی کہ وہ ماؔنی کی تمام کاوشات کو منظر عام پر لا سکتے تاکہ اہل ذوق و نظر اس کی قدر قیمت کا اندازہ کر کے اردو ادب و شعر میں ماؔنی کے مقام کا تعین کر سکتے مگر اس بات کا اب تک تو کوئی امکان نہیں پیدا ہوا۔

ادھر کچھ عرصہ قبل اخبارات کے ذریعہ اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ جائس میں جناب ماؔنی کے نام پر کوئی انجمن قائم کی گئی ہے جس کے دائرہ عمل میں اُردو لائبریری کے قیام کے ساتھ ساتھ ماؔنی کے تمام کلام کی اشاعت بھی شامل ہے لیکن اب تک کسی باقاعدہ کوشش کا راقم الحروف کو کوئی علم نہیں ہو سکا۔

مرض کہ مرض الموت۔

جناب ماؔنی کی جسمانی تکالیف کا سلسلہ تو ان کے دلی کے قیام ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ ان دنوں انھیں اکثر و بیشتر بواسیر کی شکایت رہا کرتی تھی لیکن جائس میں مستقل قیام کے بعد اُن کے اس مرض میں کافی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ یوں بھی ان کی عمر کافی تھی اور ضعیفی بذات خود ایک مرض ہے۔ قویٰ میں انحطاط و اضمحلال کا پیدا ہو جانا یقینی بات تھی پھر بھی چلنے پھرنے اور ملنے جلنے کا سلسلہ آخری وقت تک جاری رہا۔ البتہ مرنے سے سات ماہ قبل شدید طور پر بیمار ہوئے۔ اس درمیان پیچش اور پیروں پر ورم کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اکثر اختلاج قلب کی شکایت بھی رہنے لگی ــــ اور جب انھیں اس بات کا قوی احساس ہو گیا کہ اُن کے مرض میں افاقہ ممکن نہیں تو وہ اپنے روحانی پیشوا کی درگاہ (نجف ہند، جوگی پورہ ضلع بجنور میں شبیہ روضۂ حضرت علی علیہ السلام) کی طرف چل پڑے۔

جناب ماؔنی کو حضرت علی علیہ السلام سے جس قسم کی قلبی و روحانی ارادت تھی اس کا اندازہ تو اُن کے محسوسات ہی سے کیا جا سکتا ہے مگر اُن کا زندگی کے آخری لمحات میں اس پایۂ اقدس پہ حاضری دینا، وہیں دم توڑنا اور اسی خاک کے سپرد کیا جانا اس حقیقت کی ابدالآباد تک کے لئے ضمانت ہو گئی۔

شوؔق ساہن پوری جو ماؔنی کے عزیز ترین شاگرد ہیں اپنے مراسلہ مورخہ ۸ر فروری ۱۹۶۳ء میں راقم الحروف کو مطلع کرتے ہیں۔

> "غالباً ۱۹ر جولائی ۱۹۶۳ء کو قبلہ ماؔنی صاحب
> نجیب آباد پہونچے اور تین دن ساہن پور قیام
> فرما کر امی کے تقاضوں اور مرض کی شدت سے
> گھبرا کر درگاہ تشریف لے گئے"

خود جناب ماؔنی مورخہ ۱۵ر اگست ۱۹۶۳ء کے ایک خط سے کلب مصطفیٰ صاحب کو مطلع فرماتے ہیں۔

> "میں بحمد اللہ خیریت سے پہونچ گیا اور ۲۱ر
> جولائی سے یہاں حاضر ہوں۔ ہر شعبہ مرض میں
> خدا کے فضل اور مولا کے کرم سے افاقہ ہو رہا
> ہے۔ اب دیکھیں کب واپسی کا حکم ہوتا ہے"

لیکن بچانے والے ۔ ۔ ز کر ۱۰۰ ۱۹،۳ ۔ حقیقۃ کا ۔۔

مراجعت کر گئے جس سے اقبال نے نہایت پرشوخ انداز میں کہا تھا ۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

نزع کی کیفیت :۔

شوق سانبھرپوری کے لفظوں میں "جناب مانی جب سانبھر تشریف لائے تھے اُس وقت بھی پاؤں پر ورم تھا۔ غالباً امی (اہلیہ مانی) نے بتایا تھا کہ سات ماہ سے علیل تھے مگر چلنا پھرنا آخر وقت تک بے سہارے رہا۔ صرف دو چار روز ہی سہارے کی حاجت رہی۔ درگاہ آنے سے قبل تو اختلاج قلب اور جگر سے متعلق شکایتیں تھیں مگر درگاہ کے قیام کے دوران کبھی اختلاج کا حملہ نہیں ہوا۔ پیچس کچھ دنوں تک پریشان کرتی رہی اور اس کے بعد اسہال نے پریشان کیا۔ دماغی کیفیت آخر تک درست رہی۔ موت کی منزل بھی قدرت نے آسان کر دی۔ یہاں تک کہ نہ سانس اکھڑی، نہ ہاتھ پاؤں میں لرزہ پیدا ہوا، نہ زبان لڑکھڑائی۔ جو کچھ کہنا چاہا آخر تک بالکل صاف سمجھ میں آیا۔ مرنے سے چند گھنٹے قبل مجھ سے جو گفتگو کی وہ تمام ہوش میں کی۔ مرنے سے ایک دو منٹ پہلے مجھے چاء پلانے کے لئے کہا میں چاء پلا ہی رہا تھا کہ روح پرواز کر گئی :

انا للہ وانا الیہ راجعون

کہتے کہتے عرصۂ محشر تک آیا ہوں مگر
نامکمل ہے غم ہستی کا افسانہ ہنوز

تجہیز و تکفین :۔

[illegible] ستمبر [illegible] کی صبح کو قریب ۸ بجے کا وقت تھا جب جناب مانی نے اس دار فانی سے اس عالم جاودانی کی طرف مراجعت کی۔ اُس وقت ان کے سرہانے ان کی اہلیہ، سب سے چھوٹا لڑکا دانش اور شوق سانبھرپوری شاگرد مانی موجود تھے فوراً ہی خاص خاص اعزا کو بذریعہ تار مطلع کیا گیا اور ان سب کے آنے کا انتظار بھی تقریباً ۲۴ گھنٹے تک کیا گیا۔ چنانچہ دوسرے دن یعنی ۱۴ ستمبر [illegible] کو غسل و کفن سے فراغت حاصل کر کے بابا گور درگاہ سید راجو کے داہنی جانب سپرد خاک کیا گیا۔ جناب مانی کا وطن سے دور اس عالم غربت میں انتقال کر کے وہیں کی خاک کے سپرد ہونے پر کلب مصطفیٰ صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ " بھائی جان نے واقعتاً اپنے اس قول کو سچ ثابت کر دکھایا :

دست یارانِ وطن سے نہیں مٹی درکار
دب رہوں گا میں کسی ریگ بیاباں کے تلے

اولادیں

زوجۂ اولیٰ :۔

۱۔ آفتاب احمد (عالم شباب میں انتقال کر گئے)
۲۔ رشید احمد
۳۔ اقبال احمد

زوجۂ ثانی :۔

۱۔ اقبال المظفر
۲۔ مومن المظفر
۳۔ فیاض احمد
۴۔ مشتاق احمد
۵۔ وصی احمد عرف نوشے
۶۔ فرقان احمد عرف نوشہ
۷۔ درویش احمد عرف دانش
۸۔ بی بی بٹیا
۹۔ اچھی بٹیا ۔

ماخوذ از رسالہ نقوش۔ لاہور۔ شخصیات نمبر جنوری و فروری [illegible]

[illegible]

تلامذہ آتی :-

آتی کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل نہیں ہے اور ان میں سے کسی کو بہت زیادہ شہرت ہی حاصل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آتی کے شخصی رکھ رکھاؤ نے ان کے شاگردوں کی تعداد میں اضافہ ہونے نہیں دیا۔ یوں بھی اصلاح نہ اُن کا پیشہ تھا اور نہ ہی ضرورت سے مرغوب۔ اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بمبئی کے قیام میں وقت اصلاح کو بطور پیشہ بھی استعمال کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان کے شاگردوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱ ۔ سید آل محمد تہر جائسی
۲ ۔ ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی بدایونی
۳ ۔ محمود حسین تابش لکھنوی
۴ ۔ مرزا محمد جعفر حیات لکھنوی پسر مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی
۵ ۔ مرزا محمد ظہیر صاحب وقار دہلوی
۶ ۔ محمد ذکریا صاحب مائل بھوپالی
۷ ۔ سید قوی حسن صاحب وفا جائسی
۸ ۔ سید مظاہر حسین صاحب مظاہر وکیل رائے بریلی
۹ ۔ سید فقیر شبیر صاحب رائے بریلی
۱۰ ۔ سید رضا محمد صاحب رضا جائسی
۱۱ ۔ سید مسیب حسین صاحب اتقا امروہوی
۱۲ ۔ مشتاق احمد خاں صاحب مشتاق گوالیاری
۱۳ ۔ عبدالرحمٰن صاحب شوق سابن پوری

"تصانیف"

آتی کا ادبی و غیر ادبی سرمایہ دو مطبوعہ اور ایک غیر مطبوعہ دیوان غزلیات و نظمیات، ایک مجموعۂ قصائد، چند متفرق مضامین و افسانے، شذرات و اداریٔ نوٹ، تبصرے اور کچھ خطوط پر مشتمل ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ "نقوشِ آتی"

۱۹۱۶ء سے لیکر ۱۹۳۱ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔
تعداد غزلیات ۹۸، نظمیات ۱۰، نغمیں ۷، قطعات تاریخ ۷، مسدس ۴ اور ایک چار بیتی نظم، کل تعداد اشعار ۱۱۴۴ علاوہ مسدس و مخمس۔

۲۔ "نگارستانِ آتی"

۱۹۳۲ء سے لیکر ۱۹۵۲ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔
تعداد غزلیات ۷۷، نظمیات ۴، نغمیں ۲، قطعات تاریخ ۱۴، مسدس ۲، کل تعداد اشعار ۱۲۶۷ علاوہ مسدس اور مخمس۔

۳۔ "ارژنگِ آتی" (غیر مطبوعہ دیوان غزلیات)

(لیکن دو غزلیں قلم زد کر دی گئی ہیں) نظمیات ۱۷، مسدس ۳، مخمس ۴، ۲ چار بیتی نظم، تین رباعیات اور ۹ قطعات تاریخ۔ کل تعداد اشعار ۱۰۴۱ علاوہ مسدس و مخمس کے۔

۴ "وادیٔ ایمن"۔ (مجموعہ قصائد)

ائمہ طاہرین کی مدح میں قصائد مخمس، مسدس اور نظم کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ چند رباعیات و قطعات بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ کل قصائد ۴۹، ایک نعتیہ غزل، پانچ قطعات اور گیارہ رباعیات کل تعداد اشعار ۱۱۲۲ علاوہ مسدس و مخمس کے

فردوسِ نظر کے مطالعے کے بعد

سیّد نواب افسر

حکیم شاؔئب لکھنوی ایک ذہین خوش فکر اور خوش بیان شاعر ہیں۔ ان کا شمار ملک کے اچھے شعراء میں ہے۔ ان کی شاعری زندگی اور زندگی کے مسائل کی ترجمان ہے۔ اُن کا وطن لکھنؤ ہے لہذا زبان کی صحت کا لحاظ اور اصول فن کی پابندی بھی ان کی خصوصیات شاعری میں شامل ہے۔ وہ رجائیت کے قائل ہیں وہ مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے دل کا حوصلہ دوسروں تک پہونچانا چاہتے ہیں۔ وہ جب ایک مبتدی کی حیثیت سے مشاعروں میں آتے تھے اسی زمانے میں جاذب توجہ ہو گئے تھے۔

ان کے مذاق سخن کی تعمیر و تشکیل جس دور میں ہوئی وہ دور نئے رجحانات قبول کر چکا تھا۔ اپنے مجموعے میں انھوں نے ۱۹۴۵ء سے اپنا کلام پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے اس سے دو چار سال پہلے شاعری شروع کر چکے ہوں گے۔ وہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا ہندوستان میں آزادی کی لڑائی نقطۂ عروج پر تھی۔ اشتراکیت کی تبلیغ بڑے شد و مد سے ہو رہی تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہو چکی تھی شاعری محض تفنن طبع اور صناعی کے حلقہ سے باہر آ چکی تھی۔ انقلابی نظمیں زور و شور سے کہی جا رہی تھیں۔ مقصدی شاعری کے علمبردار غزل کو ایک فرسودہ اور ناکارہ صنفِ سخن سمجھ کر ترک کرنے کا اعلان کر رہے تھے لیکن غزل اپنی لچک اپنی رمزیت اور اپنے دامن کی وسعتوں کی بدولت نہ صرف زندہ رہنے کی طاقت رکھتی تھی بلکہ بعض صورتوں میں مختصر اور موثر ترین اسلوب بیان ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔ ایسے ماحول میں شاؔئب کو کوئی نیا راستہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ نیا راستہ بن چکا تھا صرف اس پر چلنے کی صلاحیت درکار تھی۔ چنانچہ شاؔئب نے لکھنؤ کی ادبی سرگرمیوں کے زیر اثر غزل کو اپنایا اور عصری تقاضوں کے ساتھ چلے۔

خیالات اور مضامین کی نقالی ان کے یہاں بہت کم ہے وہ اپنی شاعری کے لیے براہ راست زندگی سے مواد حاصل کرتے ہیں۔ عمر کے ساتھ بڑھتا ہوا مطالعہ حالات اور حالات کی اثراندازی سے پیدا ہونے والے مسائل زیادہ تر اُن کا موضوع سخن بنتے ہیں ان کی شاعری میں مسلسل حوصلہ مندی اور خود اعتمادی ملتی ہے وہ کسی منزل پر سپر اندازی کے قائل نہیں ہوئے۔ ان کے ابتدائی دور کا مطلع جس نے مجھے بہت متاثر کیا تھا آج بھی اپنی توانائی اور تاثیر کے اعتبار سے اردو کے بہترین اشعار میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

زور بازو آزما شکوہ نہ کر صیّاد سے
آج تک کوئی قفس ٹوٹا نہیں فریاد سے

عزم و ہمّت کا یہ پیغام انھوں نے بار بار دیا ہے

مقام آشیاں کی جستجو میں
گزر جا بجلیوں کے درمیاں سے

خیال ہی یہ چھوڑ دے اگر قدم بڑھائے ہیں
کہاں کہاں پہ دھوپ ہے کہاں کہاں پہ سائے ہیں

خود اپنی دوا ڈھونڈ بیمار غم
کوئی آج کل ابن مریم نہیں

ان کی حوصلہ مندی صرف فکری نہیں ہے بلکہ ان کی ساری زندگی اسی محور پر گردش کرتی رہی ہے۔ وہ بغیر کسی موثر وسیلہ

کے خود اپنے شوق سے پڑھے اور برسوں حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے تعلیم کو جاری رکھا یہاں تک کہ تکمیل الطب کالج سے طبابت کی سند حاصل کی پھر بغیر کسی مربی کے سرکاری ملازمت تک پہونچے شاعری کا ملکہ فطری تھا۔ گھر میں شعر و شاعری کا ماحول نہ ہونے پر بھی شعر کہنے لگے اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ اصول فن سے واقفیت حاصل کی اور ترقی کی منزلیں طے کیں۔

وہ شاعری کے میدان میں ترقی پذیر ذہنیت لے کر آئے تھے لہذا بعض دوسرے شعراء کی طرح انھوں نے بھی بعض اشعار میں اپنی امنگ بلکہ ترنگ ظاہر کی۔ مثلاً

گذر رہا زمانہ جدھر سے لے شارب
خدا کا شکر کہ وہ راہ چھوڑ دی میں نے
بنانا ہے مجھے خود اپنی منزل
الگ ہوں نقش پائے کاروال سے
بنانا ہے نئے جامے ادب کے واسطے شارب
اڑاتا ہیں خیالات کہن کی دھجیاں جھکلو

لیکن جب تک مطالعہ محدود رہتا ہے صرف اسی وقت تک یہ خوش فہمی رہتی ہے کہ ہم اپنا الگ کوئی راستہ بنارہے ہیں حالانکہ عصری تقاضے خود ہی نیا راستہ بنا دیتے ہیں۔ دراصل انقلابی رجحانات اور تاثر حالات کا ایک دھارا ہوتا ہے جو فنکار کو اپنے ساتھ لے چلتا ہے راستہ نیا ضرور ہوتا ہے لیکن اپنا انفرادی نہیں ہوتا۔ جماعت کی جماعت شریک سفر ہوتی ہے شارب نے بھی تین چار سال میں اس حقیقت کو محسوس کر لیا چنانچہ ابتدائی غزلوں کے بعد وہ اپنی شاعری کے متعلق کچھ دوسرے انداز میں اظہار خیال کرتے ہیں

کچھ ہم نے لہو دے کے سنوارے ہے غزل کو
اور کچھ اثر گیسو و رخسار ہوا ہے
شارب وہ سنا دیتے ہیں پردہ میں غزل کے
جو بات بہ انداز دگر کہہ نہیں سکتے
پسند خاطر احباب ہو تو کیو نکر ہو
غم حیات سے شارب کی شاعری کیلئے

ایک بات یہ بھی قابل توجہ ہے کہ اوّل اوّل جب شارب خیالات کہن کی دھجیاں اڑانے کی بات کر رہے تھے اسی زمانہ میں وہ ایسے شعر بھی کہہ رہے تھے جن پر رنگ قدیم کی چھاپ ہے۔

تم ہنسے آنسو مری آنکھوں میں آ کر رہ گئے
چاند نکلا اور ستارے جھلملا کر رہ گئے
خود بخود عالم دل زیر و زبر ہوتا ہے
نیچی نظروں میں قیامت کا اثر ہوتا ہے
تھوڑی سی رات ہے کوئی دامن کشاں نہ ہو
بیمار غم سحر کو کہاں ہو کہاں نہ ہو
فنا ہے سب کو آبادیوں پہ ناز نہ کر
زبان حال سے یہ کہہ رہے ہیں ویرانے
یہ میری زندگی میں دو انقلاب آئے
اک میرا آہ کرنا اک ان کا مسکرانا

میں سمجھتا ہوں کہ شارب نے جان بوجھ کر اپنے مجموعہ میں ایسے شعر بھی پیش کیے تاکہ عہد بہ عہد ترقی اور مذاق کی یکسوئی کا اندازہ ہو سکے بہرحال زمانہ آگے بڑھتا رہا۔ نئے مسائل میں زندگی الجھتی گئی، شاعری جشن آزادی کی منزلوں سے گذرتی ہوئی "جشن آزادی" اور "ماتم آزادی" تک پہونچی۔ پرانے اور نئے مذاق کے درمیان حد فاصل زیادہ واضح اور زیادہ مستحکم ہوگئی شارب بھی ان ہنگاموں سے دوچار ہوئے۔ قدیم مذاق سخن کے اثرات محو ہونے لگے اور شاعری "ادب برائے زندگی" کے دائرہ میں آتی گئی۔ چنانچہ ایک اچھے فن کار کی حیثیت سے انھوں نے غزل کے مزاج اور لطافت کو قائم رکھتے ہوئے حقیقی تاثرات کا اظہار کیا۔

عجیب کام مشیت نے ہم کو سونپ دیا
ہم آدمی کو بتائیں کہ آدمی کیا ہے
بچانا ہے شعلوں سے دنیا کا دامن
اگر ہاتھ جلتا ہے جل جانے دیجئے

جو بھی پیاسا آئے اُس کی پیاس بجھنا چاہیئے
بندشیں کیسی در میخانہ کھل جانے کے بعد

کیا فائدہ زباں سے نکل جائے کوئی بات
تعریف میکدہ نہ کرو تشنہ کام سے

اے اہل چمن آؤ جو سننا ہو تو سن لو
مرجھائے ہوئے پھول اک افسانہ کہیں گے

میں یہ سمجھوں کہ بڑا ساتھ دیا دنیا نے
اک تبسم بھی جو دنیا کو گوارہ ہوجائے

خون پی کر جو غریبوں کا ابھی روشن ہے
ان چراغوں کو بجھا دو تو اجالا ہوجائے

ہماری رات ہوئی ہے ہمیں سمجھتے ہیں
کہ نیند آنکھوں میں کس کس جتن سے آئے گی

ہم بھول گئے گھر کو چراغوں سے سجا کے
دنیا میں کہیں اور اندھیرا تو نہیں ہے

شاکب نے عام مطالعہ حالات میں بھی گہری نظر سے کام لیا ہے اور اپنے محسوسات کی ترجمانی کی ہے۔ درحقیقت ایک فطری شاعر اور غیر شاعر میں دو خاص باتیں مابہ الامتیاز ہوتی ہیں ایک یہ کہ شاعر کی حس نسبتاً تیز ہوتی ہے اور اس کی نظر متجسس ہوتی ہے دوسری بات یہ کہ شاعر کے دل میں اپنے محسوسات بیان کرنے کی خواہش بھی زیادہ ہوتی ہے۔ صلاحیت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ایک غیر شاعر جن چیزوں کو سرسری نظر سے دیکھتا ہوا گذر جاتا ہے۔ شاعر کی نظر ان چیزوں کی گہرائی تک جاتی ہے اور جزئیات کی گرفت کرتی ہے۔ شاکب نے حالات کے مطالعہ سے جو تاثر پایا اور جو نتائج اخذ کئے ان کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا۔

توازن دیکھ کر طاقت کا دنیا سر جھکاتی ہے
اِدھر کم لوگ جاتے ہیں جدھر کو لوگ جھکتے ہیں

کوئی رُکے کہ چلے گر پڑے کہ تھک جائے
گذرتا وقت ٹھہرتا نہیں کسی کے لیے

ہنس کے ٹال لیتے ہو احباب یہی کافی ہے
کس کو فرصت کہ کسی کا غم پنہاں سمجھے

زباں کہہ دے تو اک ہنگامہ ہوجائے
نظر کیا جانے کیا کیا دیکھتی ہے

شاکب نے اپنے مجموعہ میں غزلیات کے ساتھ نظموں کا بھی اک حصہ شامل کیا ہے۔ لیکن شاکب مشق و مہارت کے اعتبار سے غزل کے شاعر ہیں۔ نظمیں بہت اچھی کہی ہیں پھر بھی وہ ضمنی حیثیت رکھتی ہیں۔ بعض مختصر نظمیں کافی خوبصورت ہیں۔ اصلاحی نظموں میں خلوص تنقید نے تاثیر پیدا کردی ہے۔ زیادہ طویل نظمیں نہیں ہیں لہذا وہ داخلیت کھلی نہیں ہے جس سے طویل نظموں کا معیار بلند ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی نظموں میں ذرا مختلف طرز کی فن کاری ہوتی ہے۔ نظم کا اسٹائل نظم کا تدریجی ارتقاء اور ایک خاص قسم کی ٹکنیک یہ تمام چیزیں شاعر کے فطری رجحان اور مہارت کی آئینہ دار ہوتی ہیں شاکب کی نظمیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ان کا خالق ایک غزل گو شاعر ہے۔ ان کی نظموں میں کسی نئے فارم اور نئے اسلوب کا تجربہ نہیں کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کی نظموں کو اوسط درجہ میں رکھا جاسکتا ہے۔

دیانت تنقید کا حق ادا نہیں ہوگا۔ اگر نقائص کی طرف اشارہ نہ کیا جائے۔ کسی شاعر کا مجموعۂ کلام "بھرتی" اور نقائص سے یکسر پاک نہیں ہو سکتا۔

شاکب نے اگرچہ اپنی غزلوں کا اچھا انتخاب کیا ہے پھر بھی بعض کمزوریاں رہ گئی ہیں اور بعض مقامات محل نظر ہیں لیکن ایسے چند نقائص ہے جن میں گنجائش تاویل بھی ہو کبھی اچھی پیشکش پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

خطبۂ صدارت

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
نائب صدر اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ

حاضرینِ جلسہ!

حضرات! میرے لیے پہلے ہی اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ میں بہ حیثیت نائب صدر اردو اکاڈمی آپ سے مخاطب ہوں۔ سابق صدر محترمہ بیگم حامدہ حبیب اللہ صاحبہ، جنھوں نے اردو اکاڈمی کے قیام اور استحکام کی حد سے زیادہ یعنی بالواسطہ اور بلاواسطہ سعیِ بلیغ فرمائی اور دامے درمے قدمے، ہر صورت سے اردو اکاڈمی کی مدد کی، وزارت سرکار یوپی کے مستعفی ہو جانے کے باعث، مطابق دستور اردو اکاڈمی اگرچہ صدر نہیں رہیں پھر بھی ہم ان کی بیش بہا معاونت کو کبھی نہ فراموش کر سکیں گے۔ اردو اکاڈمی ان کی پر خلوص سابقہ کوششوں کو بہ نظرِ [illegible] دیکھتی ہے اور امید کرتی ہے کہ ان کی دلچسپی بدستور اکاڈمی سے برقرار رہے گی۔

اردو اکاڈمی کی کاؤنسل کی یہ میٹنگ اب سے پہلے ہو جانا چاہیئے تھی لیکن ہمیں افسوس ہے کہ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر، جن کا ذکر سکریٹری صاحب اپنی رپورٹ میں کریں گے یہ میٹنگ اس سے پیشتر طلب نہ کی جا سکی۔

اردو اکاڈمی کو قائم ہوئے ابھی صرف ڈیڑھ سال کا عرصہ گزرا ہے لیکن اس مختصر عرصے میں بھی اس نے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے عزائم بلند ہیں اور اس کے پروگرام وسیع۔ لائبریریوں اور مصنفین کو انعام دینے کے علاوہ مستحق طلبا کو ایک محدود تعداد میں وظائف دینا، ایک مستقل عمارت حاصل کر کے اس میں لائبریری قائم کرنا، تاریخ اردو کی ایک نمائش لگوانا، اپنا ایک اشاعتی پروگرام بنا کر مستند ادیبوں سے کتابیں لکھوانا اور ممکن ہوا تو اپنی کتابوں کی طباعت کے لیے اپنا پریس قائم کرنا، یہ سب مقاصد اس کے پیش نظر ہیں۔

تعلیم کے معاملے پر بھی وہ خاص توجہ صرف کر رہی ہے اور اس کی کوششوں کا نتیجہ بھی برآمد ہو رہا ہے۔ اکاڈمی کی اس قلیل مدت کی کارکردگی اور سرگرمی کا اندازہ آپ کو سکریٹری صاحب کی رپورٹ اور بجٹ کے ملاحظے سے ہو سکے گا۔ بہر حال، ہمیں امید ہے کہ اگر آپ حضرات کا تعاون حاصل رہا اور آپ اپنے مفید مشوروں سے ہمیں نوازتے رہے تو اکاڈمی اپنے صوبہ ہی میں نہیں، ملک میں اردو کا ایک اہم ادارہ ثابت ہو کر رہے گا۔

حضرات!

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اردو کی طرف سے بے اعتنائی جو گذشتہ پچیس برسوں میں ہم نے مختلف سرکاروں کی طرف سے دیکھی ہے اب رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہے اور برف پگھل چکی ہے۔ اس سلسلے میں ناسپاسی ہوگی اگر ہم وزیر اعظم اندرا گاندھی اور سابق وزیر اعلیٰ کملا پتی ترپاٹھی جی کی کوششوں کو نہ سراہیں جن کی توجہ خاص کی بدولت یوپی میں اردو اکاڈمی کا قیام ممکن ہو سکا۔ عالیجناب میر اکبر علی خاں صاحب گورنر یوپی بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کیونکہ وہ وزیر اعظم صاحبہ کے ارادوں اور پنڈت کملا پتی جی کی سابقہ حکومت کے فیصلوں پر جلد از جلد عمل در آمد کے سلسلے میں خاص دلچسپی

رپورٹ سکریٹری اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ

جناب صدر اور معزز اراکین:۔

آپ حضرات کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں سب سے پہلے اپنی اور آپ سب کی جانب سے اُردو کے اُن چند قدآور ادیبوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنا فرض سمجھتا ہوں جن کا انتقال اردو اکادمی کی کاؤنسل کے گزشتہ اجلاس سے اب تک ہو چکا ہے۔ ان حضرات میں پروفیسر سید احتشام حسین، جناب غلام احمد فرقت، جناب ضیا احمد بدایونی، جناب الیشوری پرشاد نگر اور جناب سید سجاد ظہیر شامل ہیں۔ ان کے انتقال سے اردو ادب کو جو نقصان پہنچا ہے وہ ناقابلِ تلافی ہے۔ یہ حضرات اردو ادب کے ستون تھے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی اردو ادب کی خدمت کی اور ان کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا مشکل ہے۔ اترپردیش اردو اکادمی کے لئے پروفیسر احتشام حسین کی ناوقت موت اس لیے اور بھی ایک الم ناک حادثہ ہے کہ وہ اکادمی کی کاؤنسل اور مجلس انتظامیہ کے ایک فاضل اور سرگرم رکن تھے اور اکادمی اُن کے مفید مشوروں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی ہے۔

۲۔ مجھے افسوس ہے کہ اردو اکادمی کی کاؤنسل کا یہ اجلاس تاخیر سے منعقد ہو رہا ہے اصل میں یہ اجلاس مارچ ۷۳ء میں طلب کیا جانے والا تھا لیکن حکومت اترپردیش کا اسی زمانے میں بجٹ سشن ہو رہا تھا اس لیے صدر اردو اکادمی، وزیر اعلیٰ اور بعض دیگر اراکین اکادمی غیر معمولی طور سے مصروف تھے لہٰذا اس مصروفیت کے باعث صدر کی ہدایت پر مئی کے لیے یہ اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ سابق وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی نے بھی اس اجلاس میں شرکت کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کی تھی لیکن عین وقت پر اسی زمانے میں انھیں کچھ ایسی غیر معمولی سرکاری مصروفیتیں درپیش ہو گئیں کہ یہ اجلاس بھی صدر کی ہدایت پر ملتوی کرنا پڑا۔ اس کے بعد جون کے مہینے میں میٹنگ طلب کرنے کا ارادہ کیا گیا لیکن اسی زمانے میں وزارت کے مستعفی ہو جانے کی وجہ سے یہ ارادہ بھی بدلنا پڑا۔ بہر حال وجہیں کچھ بھی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ کاؤنسل کے معزز اراکین کے مشوروں کا موقع اس سے قبل نہیں مل سکا۔ امید ہے کہ آئندہ اکادمی کے دستور العمل کے مطابق کاؤنسل کا اجلاس وقت پر منعقد ہوتا رہے گا۔ اترپردیش میں وزارت کے مستعفی ہو جانے کے بعد کچھ ایسی صورت درپیش ہوئی کہ مجلس انتظامیہ نے اکادمی کے دستور العمل میں تبدیلی ضروری سمجھی۔ چونکہ یہ تبدیلی کاؤنسل کے خصوصی اجلاس میں ہی ہو سکتی ہے اس لیے نومبر میں یہ خصوصی اجلاس طلب کیا جا رہا ہے۔ اراکین کو اس کی اطلاع بھیج دی گئی ہے۔ صحیح تاریخ سے انھیں جلد ہی مطلع کیا جائے گا۔

۳۔ قبل اس کے کہ میں اکادمی کے بجٹ کے متعلق کچھ عرض کروں، میں محترمہ بیگم حامدہ حبیب اللہ کی اُن خدمات کا اعتراف کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جو انھوں نے اترپردیش اردو اکادمی کے سلسلے میں انجام دی ہیں۔ بیگم صاحبہ اترپردیش اردو اکادمی کی صدر ہی نہیں تھیں بلکہ اکادمی کے قیام سے اب تک اُسے اُردو کا ایک با اثر، مفید اور مستحکم ادارہ بنانے کی جو کوششیں کیں اور جس لگن کے ساتھ اُس کے کاموں میں دلچسپی لی، آپ حضرات کو بھی اس کا اعتراف ہوگا اور مجھے تو سکریٹری کی حیثیت سے اس بات کا خاص طور سے احساس ہے۔ مجھے وہ دن یاد ہے، جب

میں نے بیگم صاحبہ کو ایک رات نو بجے ٹیلی فون کیا کہ اردو اکاڈمی کا کام سنبھال لینے کے بعد، محکمۂ اطلاعات میں میری جگہ اب ایک صاحب کا تقرر ہوگیا ہے اور کل سے میرے پاس اکاڈمی کا کام کرنے کے لئے کوئی جگہ نہ رہ جائے گی. بیگم صاحبہ نے اسی وقت مجھ سے یہ کہا کہ آپ پریشان کیوں ہیں، میں اپنے مکان کے تین کمرے آپ کے دفتر کے لیے اسی وقت خالی کرنے کا انتظام کر رہی ہوں، کل سے آپ یہیں کام کیجئے اور جب آپ کے اسٹاف کا تقرر ہو جائے تو وہ بھی دفتر کے لیے کوئی دوسرا مکان ملنے تک یہیں کام کرے اس طرح اکاڈمی کا دفتر کسی کرائے کے بغیر پانچ مہینے تک بیگم صاحبہ کی کوٹھی پر ہی رہا۔ اسی دوران بیگم صاحبہ نے دفتر کے لیے کرسی، میز وغیرہ بھی اپنی جانب سے پیش کردیں اور بجلی اور پنکھوں کا بھی کوئی خرچ نہیں لیا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بیگم صاحبہ نے صدر اور وزیر دونوں حیثیتوں سے اکاڈمی کے کاموں کے لیے اتنا وقت دیا اور اس کے کاموں میں اتنی زیادہ دلچسپی دکھائی کہ شاید ہی کوئی اور اتنی سرگرمی دکھاتا. بیگم صاحبہ کی اس دلچسپی کا سلسلہ آخر تک قائم رہا اور مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ وزارت سے مستعفی ہو جانے کے بعد بھی اکاڈمی کے کاموں میں وہ پہلے کی طرح ہی دلچسپی لے رہی ہیں۔ مجھے اس امر کی بھی مسرت ہے کہ بیگم صاحبہ اب بھی اکاڈمی اور مجلس انتظامیہ کی ممبر ہیں اور مجھے امید ہے کہ اکاڈمی سے ان کا تعلق مستحکم تر ہوتا جائے گا اور ان کے مفید مشورے اور ہدایتیں مجھے اور اردو اکاڈمی کو پہلے کی طرح ہمیشہ حاصل رہیں گی.

۴. جیسا کہ میں اپنی گزشتہ رپورٹ میں بتا چکا ہوں، حکومت اتر پردیش نے اپنے ۱۹۷۱-۷۲ء کے بجٹ میں اتر پردیش اردو اکاڈمی کے لیے ۵،۱۰،۰۰۰ روپے کی رقم مخصوص کردی تھی. چونکہ اتر پردیش اردو اکاڈمی کی تشکیل جنوری ۱۹۷۲ء کے آخر میں ہوئی۔ اس لیے ۳۱ مارچ ۱۹۷۲ء تک صرف ۹۲،۰۹۵ روپے صرف ہو سکے اور مالی سال ۱۹۷۱-۷۲ء کے بجٹ میں ۵،۰۰،۰۰۵ روپے اکاڈمی کے پاس بچ گئے۔ یہ رقم سوخت یا لیپس نہیں ہوئی کیونکہ ساری رقم یو۔ پی۔ کو آپریٹیو بینک میں جمع کردی گئی تھی. مالی سال ۱۹۷۲-۷۳ء میں اکاڈمی کو حکومت نے ۵،۰۰،۰۰۰ روپے کی مزید رقم خصوصی طور پر دے دی اس طرح ۱۹۷۳-۷۴ء کے مالی سال کے شروع میں اتر پردیش اردو اکاڈمی کے پاس ۱۰،۱۸،۵۰۶ روپے جمع تھے. اس مالی سال میں اکاڈمی کی مختلف اسکیموں پر ۳،۴۴،۷۰۶ روپے خرچ ہوئے اور سو روپے کے راؤنڈ میں ۶،۷۴،۰۰۰ روپے (جس میں بینک کا سود بھی شامل ہے) مالی سال ۱۹۷۳-۷۴ء کے آخر میں بچ رہے.

۵. گزشتہ مالی سال میں اکاڈمی کے پاس رقم بچ جانے کی کئی وجہیں تھیں. سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ اکاڈمی کا پہلا سال تھا. اس کے دفتر کو قائم ہونے ہوتے اور ایک مختصر اسٹاف کی تقرری کرتے کرتے چند مہینے لگ گئے. اکاڈمی کے دفتر کے لیے ایک الگ مکان ملنے میں اور بھی وقت صرف ہوا. ۱۹۷۳-۷۴ء کے مالی سال میں اکاڈمی کی سرگرمیاں زیادہ تر اردو کے تعلیمی امور کی طرف مرکوز رہیں اور حکومت کو اردو تعلیم سے متعلق تجاویز بھیجنے، حکومت کے ذمے داروں سے اسی سلسلے میں ملنے اور میمورنڈم وغیرہ تیار کرنے میں اکاڈمی نے کافی وقت صرف کیا۔ ہمیں یہ کہتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ ہماری ان کوششوں کا نتیجہ مل رہا ہے جس کا تفصیل سے ذکر آگے کیا جائے گا. تعلیمی امور میں مصروف رہنے کے باوجود اگرچہ ہم نے اپنی زیادہ تر اسکیموں پر عمل درآمد شروع تو کردیا لیکن تقریباً ایک سال تک اسٹاف کی قلت اور دفتر کے لئے علاحدہ مکان نہ ہونے کی وجہ سے چند اسکیمیں مکمل طور سے بروئے کار نہ آسکیں مثلاً اشاعت کتب کا پروگرام یا اکاڈمی کی لائبریری کا قیام. اب ان اسکیموں پر بھی پوری توجہ کی جارہی ہے جیسا کہ آپ پیش کردہ بجٹ میں ملاحظہ فرمائیں گے.

۶. گزشتہ مالی سال ۱۹۷۳-۷۴ء کے بجٹ کی جن مدوں پر ایک معقول رقم خرچ ہوئی ہے اُن کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے:-

(۱) یکم جنوری ۱۹۶۹ء سے ۳۱ر نومبر ۱۹۷۱ء تک شائع

شدہ کتابوں پر ان کے مصنفین کو انعامات ... ۰۰۰۵۰ ر ۹۶ روپے۔

(ب) یکم دسمبر ۱۹۷۱ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کی مدت میں شائع شدہ کتابوں پر ان کے مصنفین کو انعامات ... ۰۰۰۵۰ر ۵۹ روپے۔

(ج) اترپردیش کے کتب خانوں دارالمطالعوں کو اردو کتابیں، اخبارات اور رسائل خریدنے کے لیے مالی امداد ... ۰۰۰۵۰ ر ۳۰ر۱ روپے۔

(د) اترپردیش کے اردو مصنفین کو ان کے مسودات کی طباعت کے لیے مالی امداد ... ۰۰۰ر۲۰ ر ۶ روپے

(ھ) اترپردیش کے معمر، بیمار اور حاجت مند ادیبوں اور شاعروں کو مالی امداد ... ۰۰۰ر۴ ر ۹ روپے۔

اخراجات کی باقی تفصیلات پیش کردہ بجٹ میں دی ہوئی ہیں۔ مختصر طور سے یہ اخراجات ٹائپ رائٹروں، سائیکلو اسٹائل مشین، ٹیلیفون، دفتر اور کیبٹ روم کے لیے فرنیچر کی خریداری اور اکاڈمی کے پمفلٹوں اور خبرناموں کی طباعت، دفتر کے عملے وغیرہ پر ہوئے ہیں۔

۷۔ اب میں آپ سے ۱۹۷۲-۷۳ء کے اکاڈمی بجٹ کی بابت کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت سو کے راؤنڈ میں ۰۰۰ر۳۰ ر ۱۸ ر ۶ روپے (بینک کا سود ملاکر) اردو اکاڈمی کے کھاتے میں جمع ہیں۔ توقع ہے کہ ۱۹۷۲-۷۳ء کے لیے حکومت سے ہمیں ۰۰۰ر۰۰ر۱۰ ر ۵ روپے مالی سال رواں میں اور مل جائیں گے اور اس طرح ہمارے پاس کل ملاکر ۰۰۰ر۳۰ر۹۱ ر ۱۱ روپے ہو جائیں گے۔ یہ رقم ابھی حکومت کی طرف سے اکاڈمی کو نہیں ملی ہے کیونکہ قاعدے کے بموجب ہمیں پہلے موجودہ تحویل کو خرچ کر کے اُس کا یوٹیلائزیشن سرٹیفیکیٹ حکومت کو دینا ضروری ہے۔ مگر مجھے امید ہے کہ اس کاؤنسل میں بجٹ کی منظوری کے بعد معزز اراکین کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے حکومت گذشتہ سال کی طرح ۱۹۷۲-۷۳ء کی گرانٹ بھی بہ طور خصوصی ہمیں جلد عنایت کر دے گی۔ ہمیں امید ہے کہ مالی سال رواں کے ختم

ہونے تک اس روپے کو ہم مصرف میں لے آئیں گے۔

بہرحال ۱۹۷۲-۷۳ء کا اکاڈمی بجٹ آپ کے سامنے ہے تفصیلات آپ اُس میں دیکھ سکتے ہیں۔ میں مختصر طور سے اُس کی بعض خصوصیات اور اخراجات کے بارے میں ذکر کرنا چاہتا ہوں:۔

(الف) اردو اکاڈمی، اترپردیش کے عوامی کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو اردو کتابیں، رسالے اور اخبارات خریدنے کے لیے ہر سال مالی امداد دیتی ہے۔ ہماری اسکیم سے اردو کے کتب خانے اور دارالمطالعے تو فائدہ اٹھا ہی رہے ہیں، خوشی کی بات ہے کہ ہندی کے کتب خانے اور دارالمطالعے بھی اردو کتابیں رسالے اور اخبارات خریدنے کے لیے ہمارے پاس درخواستیں بھیجتے ہیں اور اردو اکاڈمی اس نیک مقصد کے لئے انھیں بھی بغیر کسی تفریق کے مالی امداد دیتی ہے۔ اس سے ایک طرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی کے اداروں میں بھی اردو سے دلچسپی لی جا رہی ہے اور دوسری طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کتابیں رسالے اور اخبارات پڑھنے کا شوق بڑھتا جاتا ہے۔ اردو اکاڈمی اس سال ابھی تک ۱۱۳ کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو ۰۰۰ر۸۵ر۱۷ روپے کی امداد دے چکی ہے۔ ہم کچھ دنوں کے بعد اکاڈمی کے فارم پر مزید امداد کے لیے نئی درخواستیں بھیجنے کا اعلان کرنے والے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ مالی سال رواں کے اندر ہم اردو پڑھنے والوں کی سہولت کے لیے اترپردیش کے عوامی کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو کل ملاکر ۰۰۰ر۰۰ ر۸۰ر۲ روپے کی گرانٹ دے سکیں گے۔

(ب) اترپردیش اردو اکاڈمی ہندوستان بھر میں شائع شدہ اردو کتابوں کے نسخے نئے سال کے شروع تک اُن کے مصنفین سے مانگتی ہے اور مارچ کے آخر تک منتخب کتابوں کے مصنفین کو ہمت افزائی کے طور پر انعام دیتی ہے۔ اترپردیش اردو اکاڈمی کو یہ کتابیں ملک کے ہر گوشے سے موصول ہوتی ہیں اور جو انعامات وہ دیتی ہے اُن کی ادبی حلقوں میں ایک خاص قدر ہوتی ہے۔

اکاڈمی ۱۹۷۱ء میں شائع شدہ کتابوں پر انعام دے چکی ہے۔ ۱۹۷۲ء شائع شدہ کتابیں جنوری ۱۹۷۳ء کے شروع تک منگا لی جائیں گی اور ان پر بھی مارچ ۱۹۷۳ء تک انعام دے دیا جائے گا۔ اس طرح اس مد میں ہم مالی سال رواں کے اندر ۶۰٫۰۰۰ روپیہ خرچ کریں گے۔

(ج) اترپردیش اردو اکاڈمی نے اپنے زیر اہتمام مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ فی الحال اس نے چار کتابوں کی کتابوں کی اشاعت منظور کی ہے۔

ایک کتاب "ادب جدید — منظر و پس منظر" پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم کے بعض غیر مطبوعہ مضامین کا انتخاب ہے۔

دوسری کتاب جناب علی جواد زیدی کی "قصیدہ نگاران اترپردیش" ہے۔

تیسری کتاب جناب نازش پرتاپ گڑھی کی قومی نظموں کا مجموعہ "نیا ساز، نیا انداز" ہے۔

چوتھی کتاب ڈاکٹر محمد حسن کی ہے جس کا نام ہے "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" ہے۔

ان کے علاوہ ۱۹۴۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۹۷۲ء تک اردو کی تعلیم کے بارے میں حکومت اترپردیش نے جو احکام جاری کیے ہیں انھیں حاصل کر کے ان کا ترجمہ بھی اردو کے کارکنوں کی معلومات کے لیے اکاڈمی نے شائع کر دیا ہے۔ چند دوسرے مسودے اس کے زیر غور ہیں۔ ان کتابوں کی طباعت، رائلٹی، کاغذ وغیرہ کے لیے اکاڈمی کے بجٹ میں ۵۰,۰۰۰ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اکاڈمی تیسرے درجے سے انٹرمیڈیٹ تک اردو کی درسی کتابوں کی تیاری اور اشاعت کے لیے بھی ہر طرح سے حصہ لینے کے لیے تیار تھی مگر چونکہ محکمۂ تعلیم اپنے قواعد و ضوابط کے ماتحت یہ کتابیں پبلشروں اور چھاپے خانوں سے اپنے انتظام میں تیار کراتا اور چھپواتا ہے اس لیے اس مد میں اکاڈمی کے کوئی اخراجات نہ ہو سکیں گے۔

(د) اپنے زیر اہتمام کتابیں شائع کرنے کے علاوہ اترپردیش اردو اکاڈمی اترپردیش کے مصنفین کو ان کے مسودات کے چھپے ہوئے نسخوں کی لکھو سے طباعت کے لیے اخراجات کے پچاس فی صدی تک امداد دیتی ہے۔ اس وقت تک اردو اکاڈمی تقریباً دو سو مسودات پر غور کر چکی ہے اور ۴۱ لکھنے والوں کو ۳۴,۷۰۰ روپے کی مالی امداد منظور کر چکی ہے۔ اس امداد میں ۱۹۷۲ء ۲۰,۶۰۰ روپے دیے جا چکے ہیں مالی سال رواں کے دوران اس مد میں پندرہ ہزار روپے خرچ ہونے کی توقع ہے۔

(ہ) اترپردیش اردو اکاڈمی نے اس سال اردو تعلیم کی ہمت افزائی کے لیے نویں درجے سے لے کر اردو میں اعلیٰ تحقیق کرنے والے والے اسکالروں تک کو اسکالرشپ یا وظائف دینے کی ایک اسکیم مرتب کی ہے۔ اس اسکیم کے ماتحت اس سال، نویں درجے، گیارھویں درجے، انڈر گریجویٹ درجات پوسٹ گریجویٹ درجات کے اہل اور مستحق طالب علموں اور ریسرچ اسکالروں کو ایک محدود تعداد میں بعض شرائط کے ماتحت ماہانہ وظائف دیے جائیں گے۔ اکاڈمی کے فراکلٹ کے فارم تیار ہو رہے ہیں اور یہ فارم اکاڈمی کے دفتر سے طلب کیے جا سکتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ اس سال اس مد میں اکاڈمی کل ملا کر ۴۵,۰۰۰ روپے صرف کرے گی۔

(و) اترپردیش اردو اکاڈمی نے اپنی نوعیت کی واحد ایک اور اسکیم وضع کی ہے اور یہ ہے۔ تاریخ اردو نمائش کی تیاری۔ یہ نمائش ایک جدید قسم کی نمائش ہوگی جس میں نقشوں، چارٹوں، ڈرائنگ، رنگین اور سیاہ و سفید تصویروں، گھومنے والے کیاسک، ماڈلوں، پلائی ووڈ کے پتلوں وغیرہ پر اردو ہندی تحریروں کے ذریعے نمائش کا سامان تیار کرا کے اسے ایک خوبصورت پویلین میں سجایا جائے گا۔ اس نمائش کا ایک مقصد ان ذرائع سے اردو زبان کی پیدائش سے لے کر اب

تک کی تاریخ اردو کو پیش کرنا اور دوسرا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اردو نے حب وطن اور قومی یکجہتی کے جذبات کو فروغ دینے اور ہندوستان کے رہنے والوں میں آزادی کا جوش اور ولولہ پیدا کرنے میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس نمائش کے سامان کی تیاری پر ۴۰،۰۰۰ روپے کے اخراجات کی توقع ہے۔ سامان تیار ہو جانے کے بعد مختلف شہروں میں اس کی نمائش کی جائے گی اور یہ نمائشیں لگانے پر ۲۰،۰۰۰ روپے صرف ہونے کا تخمینہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ تیار ہو جانے پر یہ نمائش اپنی قسم کی واحد نمائش ہو گی اور ہندوستان کے مختلف شہروں سے اس کے دکھانے کی مانگیں آئیں گی۔ اردو کے سلسلے میں بعض حلقوں میں اگر ایماندارانہ سے کوئی غلط فہمی پائی جاتی ہے تو اس نمائش سے وہ یقیناً دور ہو جائے گی۔ اور اس طرح ہم اردو کی ایک بڑی خدمت انجام دے سکیں گے۔

(ز) اردو اکاڈمی شہر لکھنؤ میں اُردو کا ایک عظیم الشان کتب خانہ اور دارالمطالعہ قائم کرنے کی اسکیم تیار کر رہی ہے۔ اصل میں یہ اسکیم اس کے ذہن میں شروع دن سے تھی۔ لیکن اکاڈمی کے پاس کتب خانہ اور دارالمطالعہ قائم کرنے کے لیے چونکہ کوئی اتنا بڑا مکان نہ تھا جس میں ہال وغیرہ بھی ہوں اس لیے یہ اسکیم ابھی تک عملی جامہ نہ پہن سکی۔ امید ہے کہ یہ وقت اسی سال کے اندر اندر رفع ہو جائے گی اور ہم ایک ایسا اردو کتب خانہ اور دارالمطالعہ قائم کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے جو رفتہ رفتہ ملک کا سب سے بڑا اردو کتب خانہ اور دارالمطالعہ ثابت ہوگا ہمارا ارادہ ہے کہ اس کتب خانہ میں آہستہ آہستہ اُردو کے سارے مطبوعات اکٹھا کر دیں اور غیر مطبوعہ نسخوں کے، خواہ وہ انڈیا آفس لندن میں ہوں، مائکروفلم تیار کر لیں۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر اس مد میں اکاڈمی کے بجٹ میں ۱۰،۰۰۰ روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

(ح) اس سے قبل یہ بتایا گیا ہے کہ اترپردیش اردو اکاڈمی کے پاس کوئی بڑا مکان نہ ہونے کی وجہ سے اس کی بعض اسکیمیں ابھی بروئے کار نہیں آسکی ہیں مثلاً کتب خانے اور دارالمطالعے کا قیام، آڈیٹوریم وغیرہ کی تعمیر۔ اکاڈمی اپنی ضروریات کے مطابق ایک ایسی عمارت بھی تیار کرنے پر غور کر رہی ہے جس میں اکاڈمی کے دفتر کے علاوہ، اکاڈمی کے کتب خانے اور دارالمطالعے، آڈیٹوریم، دفتر وغیرہ کی عمارتیں اور ہال بھی ہوں۔ اس بڑی عمارت کے لیے شہر کے کسی مرکزی حصے میں زمین تلاش کی جا رہی ہے اور زمین ملتے ہی اُسے خرید کر اکاڈمی کی تعمیر کا کام شروع کر دینے کی تجویز ہے۔ اس مقصد کے ماتحت اکاڈمی کے ۷۴-۱۹۷۳ء کے بجٹ میں ایک لاکھ روپیہ زمین کی خریداری کے لیے اور ایک لاکھ پچاسی ہزار روپیہ مجوزہ عمارت کا ایک حصہ تعمیر کرانے کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اگر "اُردو گھر" کی یہ اسکیم جلد عمل میں نہ آسکی تو ایک بڑا اور مناسب مکان خریدنے پر غور کیا جائے گا تاکہ ہماری فوری ضروریات پوری ہو سکیں۔

(ط) اردو کے بہت سے ایسے ادیب اور شاعر ہیں جن کی ساری عمر اردو کی خدمت کرتے گزری مگر اب وہ کافی ضعیف ہو چکے ہیں اور بیمار یا پریشان حال ہیں۔ ایسے ادیبوں اور شاعروں کے علاج معالجے کے لیے اترپردیش اردو اکاڈمی وقتاً فوقتاً مالی امداد دیتی رہتی ہے ۷۳-۱۹۷۲ء میں اکاڈمی اس مد میں ۳۴،۰۰۹ روپیہ صرف کر چکی ہے اور امید ہے کہ مالی سال کے اندر دس ہزار روپیہ اس مد میں صرف ہو جائے گا۔

(ی) اترپردیش اردو اکاڈمی کا ایک مقصد اردو کی ترقی و ترویج کے لیے سمپوزیم، سمینار وغیرہ کا اہتمام کرنا بھی ہے۔ اردو اکاڈمی اس وقت تک اردو کے تین مذاکرات کا اہتمام کر چکی ہے اور دوسرے مذاکرات کا اہتمام کر رہی ہے۔ اس مد کے لیے مالی سال رواں کے بجٹ میں ۲۴،۰۰۰ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

۸۔ مذکورۂ بالا تبصرے سے اترپردیش اُردو اکاڈمی کی سرگرمیوں اور اس کے بجٹ کا کچھ اندازہ ہو جائے گا لیکن اس کی سب سے بڑی سرگرمی جس کا میں اب ذکر کروں گا، تعلیمی امور کے

سلسلے میں ہے۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی کی مجلس انتظامیہ نے اپنی پہلی میٹنگ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۷۱ء میں یہ طے کیا تھا کہ اردو کی تعلیم اور چلن کے بارے میں اُسے سب سے زیادہ توجہ دینا ہے۔ چنانچہ اپنے اس فیصلے کے مطابق وہ اُس وقت سے اب تک مختلف سطحوں پر اردو کی تعلیم کے مختلف مسائل کے بارے میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کر رہی ہے، حکومت کو تعلیم کے ہر پہلو کے بارے میں تجویزیں بھیجتی ہے، ان کے بارے میں ذمے داروں کو یاد دہانی کراتی ہے، اُن سے بات چیت کرتی ہے اور انھیں اپنے میمورنڈم پیش کرتی ہے۔ ایک میمورنڈم، سابق وزیر اعلیٰ پنڈت کملا پتی ترپاٹھی کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے اور دوسرا میمورنڈم جناب اکبر علی خاں صاحب گورنر اتر پردیش کی خدمت میں۔ کاؤنسل اور مجلس انتظامیہ کی تجاویز اور میمورنڈموں کے علاوہ، اکاڈمی کا دفتر تعلیم کے مختلف مسائل کے سلسلے میں حسب ضرورت، اپنی طرف سے حکومت یا محکمۂ تعلیم کے ذمے داروں کی توجہ برابر منعطف کراتا رہتا ہے۔ میمورنڈم کی نقلیں، اراکین اکاڈمی کی خدمت میں بھیجی جا چکی ہیں۔ گزشتہ سال کاؤنسل میں تعلیم کے بارے میں جو تجویزیں پیش کی گئی تھیں انھیں بھی حکومت کے پاس بھیج دیا گیا تھا اور مجلس انتظامیہ نے جن تجاویز پر خاص طور سے زور دیا تھا، وہ سب حکومت کے پاس بھیج دی گئی تھیں۔ یہ تجاویز اور اکاڈمی نے مختلف امور کے سلسلے میں جو قواعد و ضوابط وغیرہ تیار کیے ہیں وہ اس رپورٹ کے آخر میں ضمیموں کے طور پر شامل کر دیے گئے ہیں۔

ابھی حال ہی میں پرائمری اسکولوں کے اردو ٹیچروں کی تقرری کے مسئلے میں اس نے جو غیر معمولی دلچسپی دکھائی ہے اُس کی تفصیل اکاڈمی کے خبرنامے میں دی گئی ہے اور متعدد اخبارات نے بھی اس پر روشنی ڈالی ہے۔ اکاڈمی کے دفتر میں ویسے بھی اگر تعلیم کے بارے میں کسی ضلع سے بھی کوئی شکایت موصول ہوتی ہے یا کوئی ایک فرد بھی کسی مسئلے کی طرف توجہ دلاتا ہے تو حکومت کے ذمے داروں سے فوراً رجوع کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اگر کسی اخبار میں کوئی شکایت اردو کے بارے میں شائع ہوتی ہے تو اُس کی طرف بھی ذمے داروں کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔ البتہ ایسی شکایتوں کے سلسلے میں ہمیں دقت اُس وقت پیش ہوتی ہے جب وہ مبہم ہوتی ہیں یا اُن میں کوئی تفصیل نہیں دی جاتی عام بات کہہ دی جاتی ہے مثلاً ہمارے شہر میں اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں ہے یا اس اسکول میں باوجود کوشش کے اردو نہیں پڑھائی جاتی وغیرہ۔ اگر اس سلسلے میں تمام باتیں واضح طور سے لکھ دی جایا کریں تو اکاڈمی کو مزید کارروائی کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور حکومت بھی اُن کی طرف جلد توجہ کر سکتی ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ ہمیں جو واضح شکایات موصول ہوئیں اور ہم نے ارباب حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو اُس پر فوری کارروائی بھی کی گئی اور اُس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا۔

یہ تو روزمرہ کی شکایتوں کے بارے میں تھا لیکن اکاڈمی نے اپنے میمورنڈموں کے ذریعہ جو مطالبات اردو کی تعلیم اور چلن کے بارے میں سابق وزیر اعلیٰ اور گورنر صاحب کی خدمت میں پیش کیے ان پر ان دونوں حضرات نے خاص طور سے توجہ کی اور مختلف احکام اس سلسلے میں جاری کیے جس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔ اتر پردیش میں صدر راج قائم ہو جانے کے بعد وزیر اعظم اندرا گاندھی اور سابق وزیر اعلیٰ اتر پردیش کے فیصلوں پر بغیر کسی تاخیر کے عمل درآمد کرانے کے لیے جناب میر اکبر علی خاں صاحب، گورنر اتر پردیش نے کئی موثر قدم اٹھائے۔ ٹیچروں کی تقرری کے سلسلے میں انھوں نے یہ حکم دیا کہ ان تقررات میں کوئی بے ضابطگی نہ ہونے پائے۔ متعلقہ افسروں کو انھوں نے یہ حکم بھی دیا کہ اردو کے دیگر مسائل کی طرف بھی حکومت کی منظور شدہ پالیسیوں پر صدق دل سے عمل درآمد کیا جائے۔ اردو کے معاملے میں وزیر اعظم اندرا گاندھی، سابق وزیر اعلیٰ اتر پردیش پنڈت کملا پتی ترپاٹھی، جناب میر اکبر علی خاں صاحب گورنر اتر پردیش کی دلچسپی اور ہمدردی کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اتر پردیش اردو اکاڈمی کے معروضات کی روشنی میں اردو کی تعلیم اور چلن کے بارے میں اس طرف متعدد سرکاری احکام جاری ہوئے اور ان پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا ہے۔

۹۔ مناسب ہوگا کہ ادھر چند مہینوں کے اندر اردو تعلیم اور چلن کے سلسلے میں حکومت اتر پردیش نے جو اقدام کیے ہیں انھیں بھی یہاں مختصر طور سے بیان کر دیا جائے۔

(الف) ہر شہر میں میونسپلٹی کے حلقوں کے تمام پرائمری اسکولوں میں اردو پڑھانے کے لیے تین ہزار آٹھ سو تیس اردو ٹیچر مقرر کرنے کا حکم دیا گیا اور یہ ہدایت کی گئی کہ جولائی ۷۰ء سے ایسے ہر پرائمری اسکول میں ایک اردو ٹیچر ضرور مقرر ہونا چاہیے چاہے وہاں اردو پڑھنے والا کوئی طالب علم ہو یا نہ ہو۔

اس سلسلے میں اردو اکاڈمی کو جو اطلاعیں ملی ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ اس اسکیم کی مالی منظوری ملنے میں کچھ تاخیر ہو جانے سے ۳۱ جولائی کو ان ٹیچروں کے تقرر کے لیے ڈائرکٹر بیسک تعلیمات نے ہر ضلع کے شکشا ادھیکاری، اتر کت شکشا ادھیکاری (مہیلا) کو احکام جاری کر دیے ہیں۔ اس سے قبل کے ایک گشتی مراسلے میں ریاست کے ہر میونسپل حلقے میں تقرر کیے جانے والے اردو ٹیچروں کی تعداد بھی متعین کر دی گئی تھی۔ ان اساتذہ میں سے ۱۵ ستمبر ۷۰ء تک تقریباً ۱۲۴۰ اساتذہ کے تقرر ہو چکے ہیں۔ اس تاریخ تک ۲۰ ضلعوں سے مکمل اطلاع نہیں مل سکی تھی۔ بہرحال، سبھی بیسک ادھیکاریوں کو حال میں تار بھیج کر دوبارہ یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ ۵ ستمبر ۱۹۷۰ء تک اپنے اپنے شہروں میں تمام اردو ٹیچروں کی تعیناتی کر لی جائے۔ یہ تاخیر افسوس ناک ضرور ہے اور اس سے اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد پر بھی اثر پڑنا لازمی ہے لیکن بہرحال امید ہے کہ اس وقت تک اتر پردیش کے عام شہروں میں پرائمری اسکول اردو ٹیچر مقرر ہو گئے ہوں گے۔ اس سلسلے میں بعض ضلعوں کے بیسک شکشا ادھیکاریوں نے ڈائرکٹر بیسک تعلیمات کو یہ اطلاع دی تھی کہ ضلع میں مقررہ اہلیت کے مطابق پوری تعداد میں اردو ٹیچر نہیں مل سکے ہیں۔ اس اطلاع پر ڈائرکٹر بیسک تعلیمات نے یہ ہدایت جاری کی ہے کہ جن ضلعوں میں مقررہ اہلیت رکھنے والے ٹیچر مل سکتے ہیں وہاں سے یہ ٹیچر بلا کر یہ کمی پوری کی جائے۔

(ب) پرائمری اسکولوں کے علاوہ گورنمنٹ جونیئر ہائی اسکولوں میں بھی ایک ہزار اردو ٹیچروں کے مقرر کیے جانے کے احکام جاری کیے جا چکے ہیں اور ان ٹیچروں کی تعیناتی کا کام تیزی سے ہو رہا ہے۔

(ج) اردو ٹیچروں کی تقرری کے لیے پہلے ۱۸ سے ۲۴ سال تک عمر مقرر کر دی گئی تھی لیکن اب تربیت یافتہ ٹیچروں کے لیے عمر کی حد چالیس برس کر دی گئی ہے اور غیر تربیت یافتہ کے لیے ۳۵ برس۔

(د) امدادی اردو میڈیم اسکولوں اور اردو مکتبوں کی گرانٹ بڑھانے کا مسئلہ بھی حکومت کے زیر غور ہے۔ ہر ضلع میں شکشا ادھیکاری کو یہ ہدایت بھیج دی گئی ہے کہ وہ ان اسکولوں اور مکتبوں کے بارے میں مکمل اعداد و شمار فراہم کر کے ڈائرکٹر بیسک تعلیمات کو جلد اطلاع دیں۔ امید ہے کہ یہ اطلاع فراہم ہو جانے کے بعد ان اسکولوں اور مکتبوں کی گرانٹ بڑھ جائے گی۔

(ہ) جونیر ہائی اسکول کی طرح ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی "ایڈوانس انرولمنٹ رجسٹر" رکھے جانے کے احکام جاری کر دیے گئے ہیں تاکہ ہائی اسکولوں میں اردو پڑھنے کے خواہشمند طالب علموں کا اندازہ لگایا جا سکے اور ان کے لیے بھی اردو پڑھانے کا مناسب انتظام کیا جا سکے۔

(و) ہندوستان کی سرحد سے ملے ہوئے پہاڑی ضلعوں کو چھوڑ کر اتر پردیش میں ۲۲۴ گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ۴۴ گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکولوں میں پہلے ہی سے اردو پڑھانے کا انتظام تھا۔ باقی ۱۸۰ گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی اردو ٹیچر مقرر کرنے کے احکام جاری کر دیے گئے ہیں اور ان ٹیچروں کی تقرری میں عجلت برتی جا رہی ہے۔

(ز) ڈگری کالجوں میں ڈگری کے درجات میں اردو زبان پڑھنے والے طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے حکومت [illegible]

فیصلہ کیا ہے کہ جو ڈگری کالج اپنے یہاں اردو کے درجے کھولیں انہیں پہلے ہی سال سے "مین ٹیننس گرانٹ" (maintenance grants) دی جایا کرے گی، حالانکہ دوسرے مضامین کی تعلیم دینے کے لیے یہ گرانٹ تیسرے سال ملتی ہے۔ اردو زبان کی تعلیم دینے کے سلسلے میں یہ رعایت ابھی تک ریاست کے چار، پانچ ضلعوں تک محدود تھی۔ اب ریاست کے ہر ڈگری کالج میں یہ سہولت دی جا رہی ہے۔

(ح) اتر پردیش اردو اکاڈمی نے سابق وزیر اعلیٰ سے اپنے میمورنڈم میں یہ مانگ کی تھی کہ اردو کی درسی کتابوں سے ایسے سبق ہٹا دیے جائیں جن سے قومی یک جہتی کے جذبات کو فروغ ملنے کے بجائے اُن کو دھکا پہنچ رہا ہے۔ اس کے علاوہ ان کتابوں کی زبان بھی غلط ہے۔ وزیر اعلیٰ نے اردو اکاڈمی کے وفد کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کتابوں کے بارے میں تفصیل سے اپنی رائے حکومت کو لکھ کر بھیج دے۔ اردو اکاڈمی نے ان کتابوں کے بارے میں حکومت کو یہ رائے دی کہ ان درسی کتابوں کو دوبارہ لکھوانے کی ضرورت ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے محکمۂ تعلیم کو یہ ہدایت کی ہے کہ اردو کی نئی درسی کتابیں تیار کی جائیں۔ "شکشا سنستھان، الہ آباد" (اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن) کی نگرانی میں ان نئی کتابوں کی تیاری کا کام شروع ہو گیا ہے۔

(ط) گزشتہ سال کی طرح حکومت نے اس سال بھی یہ ہدایت جاری کر دی ہے کہ غیر تربیت یافتہ اردو ٹیچروں کو ملازمت سے علاحدہ نہ کیا جائے۔

(ی) اس سال کافی تعداد میں اَن ٹرینڈ اردو ٹیچروں کی تقرری ہوئی۔ ایسے سبھی غیر تربیت یافتہ ٹیچروں کو رفتہ رفتہ ٹریننگ دی جائے گی اور اس کا بندوبست جولائی [illegible] سے ہو جانے کی امید ہے۔

(ک) محکمۂ تعلیمات اس سال بھی یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ گزشتہ سال کی طرح برسر ملازمت اردو ٹیچروں کے لیے "حسن کارکردگی سرٹیفکیٹ [illegible]" اور "ترغیبی بھتہ" جاری رکھا جائے۔ اس امتحان میں اوّل درجے میں پاس ہونے والے کو دو سو اور دوسرے درجے میں پاس ہونے والے سبھی ایسے ٹیچروں کو ایک [illegible] دیا جاتا ہے۔

(ل) ٹریننگ میں چنے جانے کے لیے اردو میں پاس ہونے والے طلبا کو ۱۵ فی صد نمبروں کا "ویٹیج" دیا جائے گا۔

(م) اس امر کے نہایت سختی سے احکام جاری کر دیے گئے ہیں کہ اگر کوئی افسر یا اُن کے ماتحت اردو میں لکھی ہوئی درخواستیں قبول نہ کریں گے تو ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔

(ن) یہ احکام بھی جاری کر دیے گئے ہیں کہ اتر پردیش کا پورا گزٹ اردو میں بھی شائع ہوا کرے گا۔ ابھی تک ہندی گزٹ کے صرف کچھ حصے اردو گزٹ کی شکل میں شائع ہوتے تھے۔

۱۔ ان احکام سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حکومت اتر پردیش اردو کی تعلیم اور چلن کے بارے میں کافی توجہ کر رہی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اردو کی تعلیم کے سلسلے میں اب کوئی مسئلہ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ بہت سے مسئلے اب بھی حل ہونے ہیں لیکن اتنا تو تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ اس فضا اور اب سے چند برس پہلے پائی جانے والی فضا میں ایک خوشگوار تبدیلی ہو گئی ہے۔ میں نہ صرف یہ کہ قنوطیت پسند نہیں ہوں بلکہ رات کی تاریکی سے بھی مایوس نہیں ہوتا ہوں اور اس بات کا قائل ہوں کہ؎

کہ از خاکِ سیہ گلہائے رنگیں می شود پیدا

اس لیے مجھے یقین ہے کہ اردو زندہ رہے گی، پھلے گی، پھولے گی اور اس کے پھولوں کی خوشبو سے چمنستانِ ہند ایک بار پھر مہک اٹھے گا۔ یہ ضرور ہے کہ اردو کا ماہتاب گہن میں آ گیا تھا۔ لیکن وہ اس گہن سے اب نکل گیا ہے اور اگر ہم خلوص، لگن اور باہمی تعاون کے ساتھ اردو کی خدمت میں اسی طرح منہمک رہیں تو سپیدۂ سحر بھی نمودار ہو جائے گا۔

یہاں میں اردو دوستوں سے یہ بھی عرض کروں گا کہ حکومت اردو پڑھنے والوں کے لیے جو سہولتیں فراہم کر رہی ہے اُن سے وہ اسی وقت فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

جب ان کے بچے زیادہ سے زیادہ تعداد میں اسکولوں میں اردو پڑھیں۔ اگر انھوں نے اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم نہیں دلائی تو اُس سے اردو کو جو نقصان پہنچے گا اُس کا ذمے دار اور کوئی نہیں ہوگا بلکہ ہم خود ہوں گے۔ اس لیے میں اکاڈمی کے تمام معزز اراکین سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اُردو کے درجات میں اپنے بچوں کا بھی داخلہ کرائیں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیں۔

۱۱۔ اترپردیش اردو اکاڈمی کی کارگزاریوں کا ایک مجمل خاکہ آپ کے سامنے ابھی پیش کیا گیا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اکاڈمی نے اپنی ارتقاء کی ساری منزلیں طے کرلی ہیں۔ لیکن یہ عرض کرنے کی ضرور اجازت چاہوں گا کہ اپنی ڈیڑھ سال کی عمر میں اُس نے کچھ کیا ہے، جو کر رہی ہے، اور آئندہ جو کرنے والی ہے، وہ ایسا نہیں کہ اُسے نظر انداز کیا جاسکے۔ اردو اکاڈمی کے پاس اس وقت جتنا کام ہے اُس کا اندازہ اُن سب کمیٹیوں کی تعداد سے ہو سکتا ہے جو اس وقت اکاڈمی کے مختلف شعبوں کا کام دیکھ رہی ہیں۔ ان کمیٹیوں کے نام درج ذیل ہیں:۔

(۱) تعلیمی سب کمیٹی
(۲) لائبریری سب کمیٹی
(۳) انعامی سب کمیٹی
(۴) مسودات سب کمیٹی
(۵) اشاعت کتب سب کمیٹی
(۶) امداد مصنفین سب کمیٹی
(۷) نصابی سب کمیٹی
(۸) اسکالرشپ سب کمیٹی
(۹) تاریخ اردو و نمائش سب کمیٹی
(۱۰) تقریبات سب کمیٹی
(۱۱) رابطۂ عوام سب کمیٹی
(۱۲) اکاؤنٹس سب کمیٹی
(۱۳) تقرریات سب کمیٹی

ان سب کمیٹیوں کے ناموں سے اکاڈمی سے متعلقہ کاموں کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اردو اکاڈمی ان سبھی کاموں کو دیکھتی ہے۔ ہر شعبے میں جو کام کرنا ہوتا ہے اس سلسلے میں پہلے متعلقہ سب کمیٹی کی میٹنگ کی جاتی ہے اور سب کمیٹی جو سفارش کرتی ہے اسے مجلس انتظامیہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر سب کمیٹی کی پہلے میٹنگ کرلی جاتی ہے اور اس کی کارروائی سائیکلو اسٹائل کرا کے مجلس انتظامیہ کے اراکین کے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ مجلس انتظامیہ ان سفارشوں پر غور کرکے ہر معاملے پر فیصلہ کرتی ہے۔ مجلس انتظامیہ کی ساری کارروائی اور فیصلے رجسٹر میں درج کر لیے جاتے ہیں۔ اگر صرف اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ اردو اکاڈمی اپنے فیصلوں کے لیے کتنے مرحلوں سے گزرتی ہے تو ایک طرف یہ اندازہ ہوگا کہ اکاڈمی کے دفتر کے پاس کتنا کام ہے اور دوسری طرف یہ بھی احساس ہو جائے گا کہ اکاڈمی کی مجلس انتظامیہ اپنے فیصلوں میں کتنی احتیاط اور کتنا ضابطہ برتتی ہے۔ ان کاموں کے علاوہ اکاڈمی کے پاس روزانہ اردو کے سلسلے میں جو ڈاک آتی ہے اور اکاڈمی کے دفتر کو ان خطوط کے جوابات کے علاوہ حکومت سے جو مراسلت کرنا پڑتی ہے اگر اُس کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ آپ کی یہ اترپردیش اردو اکاڈمی کس تندہی اور خلوص کے ساتھ اردو کی خدمت کر رہی ہے۔ غالباً اُس کی اسی بے لوث خدمت کا نتیجہ ہے کہ سارے ملک میں اگر صرف "اردو اکاڈمی" کا نام لے لیا جائے تو اُس سے مراد "اترپردیش اردو اکاڈمی" ہوتی ہے۔

۱۲۔ آخر میں ایک بار پھر میں بیگم حامدہ حبیب اللہ صاحبہ کا، پنڈت آنند نرائن ملا، چیرمین مجلس انتظامیہ کا جن کی رہنمائی میں مجلس انتظامیہ انتہائی غیر جانب داری اور قواعد و ضوابط کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلے کرتی ہے، نائب صدر اُردو اکاڈمی اور اس اجلاس کے صدر ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کا، تمام اراکین مجلس انتظامیہ کا اور کاؤنسل کے سبھی ممبروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں

اُن کے مشوروں اور تعاون سے مجھے اور اکاڈمی کو ہمیشہ تقویت ملتی رہی اور مجھے یقین ہے کہ یہ مشورے اور تعاون آئندہ بھی مجھے حاصل رہیں گے۔

اِسی کے ساتھ میں اکاڈمی کے ٹریژرر جناب شیام بہاری مُگل کا شکریہ ادا کروں گا۔ اُن کا تعاون مجھے قدم قدم پر حاصل ہوتا رہا۔ اُنھیں اردو اور اُردو اکاڈمی دونوں سے محبت ہے اور اُن کی اِسی محبت کا نتیجہ ہے کہ سرکاری سطح پر اردو اکاڈمی کو کبھی کوئی وقت محسوس نہیں ہونے پائی۔ ان کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ مجھے اپنے دفتر کے رفیقوں کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ کثرتِ کار کی وجہ سے شاید ہی کوئی تعطیل ایسی گزری ہو جب اکاڈمی کا دفتر کھلا نہ ہو اور میرے تمام ساتھی میری درخواست پر دفتر نہ آئے ہوں۔

۱۳۔ میں آپ کے سامنے اترپردیش اُردو اکاڈمی کی رپورٹ اور ۷۴-۱۹۷۳ء کا بجٹ پیش کرتا ہوں۔

لکھنؤ۔ ۱۲ر ستمبر ۱۹۷۳ء — صباح الدین عمر
سکریٹری
اترپردیش اُردو اکاڈمی

بقیہ ، خطبۂ صدارت ، صفحہ ۴۳ کا

لے رہے ہیں اور ہدایتیں دے رہے ہیں۔

اکاڈمی کی مجلس عاملہ کے ایک رکن ہونے کی حیثیت سے نیز اس کی کئی سب کمیٹیوں کے ممبر ہونے کی حیثیت سے اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر عرض کرسکتا ہوں کہ پنڈت آنند نرائن مُلّا صاحب جس سوجھ بوجھ، فہم و فراست اور پامردی کے ساتھ اُردو اکاڈمی کی رہنمائی کر رہے ہیں وہ لائقِ صد تحسین ہے۔ ساتھ ہی مجھے یہ دیکھ کر بھی بڑا اطمینان اور مسرت ہوتی ہے کہ اردو اکاڈمی کے سکریٹری جناب صباح الدین عمر صاحب اور ان کا مختصر عملہ نہایت تندہی اور لگن کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔ اوقات تو یہ سب لوگ رات کے نو، دس بجے تک مصروفِ کار نظر آتے ہیں۔ میں ان لوگوں کی اس محنت و مشقت کی دل سے قدر کرتا ہوں اور اردو اکاڈمی کے مستقبل کے لیے فالِ نیک تصوّر کرتا ہوں۔

آخر میں میں تمام حاضرینِ جلسہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس مجلس میں شرکت کرنے کی زحمت فرمائی ساتھ ہی یہ وعدہ کرتا ہوں کہ کاؤنسل کا آئندہ اجلاس جلد از جلد طلب کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے گی۔

(تبصرے کیلئے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہے)

صحیفۂ بشارت

صحیفۂ بشارت۔ بشیر علی صدیقی ایم اے سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج بریلی۔
ناشر اور ملنے کا پتہ:۔ سردار ہربنس سنگھ تھاپر منیجر رہنمائے تعلیم دریا گنج دلی
قیمت:۔ چار روپے
ضخامت:۔ ۲۴۰ صفحات بہ ۲ $\frac{18 \times 22}{1/16}$

اخلاق حسین عارف

جناب بشیر علی صدیقی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ موصوف ایک مشاق ادیب اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کے اعلیٰ عہدہ پر عرصۂ دراز تک فائز رہ چکے ہیں اور اب ریٹائر ہو کر ہمہ وقت علمی و ادبی کاوش میں منہمک رہتے ہیں۔ آپ ایک مشہور ادیب کی طرح سے کافی مشہور ہیں اور آپ کی متعدد تصانیف "ادبی مقالات" "پنکھڑیاں" "تنقیدی آئینے" اور "ادبی تجزیے" منظر عام پر آکر کافی مقبول ہو چکی ہیں: زیر تبصرہ کتاب میں موصوف نے ادب کے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے اور سوداؔ، حالیؔ، اکبرؔ، نذیر احمد، شررؔ، جگرؔ، مجازؔ، نریش کمار شادؔ، سجاد حسین وغیرہ پر مشتمل چودہ مضامین اور چند مشہور و معروف تصانیف اور ان کے مصنفین پر بصیرت افروز مقالے قلم بند کئے ہیں جو اساتذہ اور طلباء کے لئے یکساں مفید ہیں اور ان کی افادیت اپنی جگہ مستحکم ہے راقم الحروف کو جب موصوف نے کتاب تبصرہ کے لئے مرحمت فرمائی تو جس وقت اس کا مطالعہ شروع کیا جب تک پوری کتاب پڑھ نہ لی اسے چھوڑنے کو جی نہ چاہا انھوں نے اپنے مضامین میں بے حد توازن برقرار رکھا ہے اور بے لاگ اور بے باک طریقے سے قلم اٹھایا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان مضامین کی تکمیل میں انھوں نے کافی مطالعہ کیا ہے جیسا کہ حوالہ جات سے مترشح ہوا اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب آپ نے کمال دیدہ وری اور جگر کاوی کے بعد معرض وجود میں آیا ہے۔

نسیم بہار

نسیم بہار (مجموعہ رباعیات) مصنف اے۔ سی۔ بہارؔ
صفحات ۱۰۴۔ قیمت سات روپے پچاس پیسے۔
ملنے کے پتے:۔ مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ نئی دلی۔ اور پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

نسیم بہار، جناب امیر چند بہارؔ کی ساڑھے تین سو رباعیات کا خوبصورت سا مجموعہ ہے ۲۶ × ۲۰ کے سائز پر عمدہ کتابت اور طباعت سے آراستہ و پیراستہ یہ کتاب لائق مطالعہ ہے۔
شاعری کے دیگر اصناف میں رباعی کا بھی اپنا ایک مقام ہے۔ یہ تیسری صدی ہجری کی پیداوار ہے اور مشہور محقق و مورخ علامہ شبلی نعمانی نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف شعر العجم میں اس کی دریافت یوں فرمائی ہے کہ شعرائے متقدمین ایران کے دور میں خاندان طاہریہ کے آخری فرماں روا محمد بن طاہر کو یعقوب صفار نے ۲۵۹ ہجری میں گرفتار کیا۔ یعقوب صفار ذات کا ٹھٹیرا تھا مگر شاہانہ دل و دماغ کا مالک تھا عہد خلافت عباسیہ میں اس نے علم بغاوت بلند کیا فارس و خراسان پر قابض ہوا اسی خاندان صفاریہ کے سر رباعی کی ایجاد کا سہرہ ہے، یعقوب کا ایک کمسن بچہ اخروٹوں سے کھیل رہا تھا ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے گڑھے میں جا گرا بچہ کی زبان سے بیساختہ نکلا "غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو" یعقوب نے یہ موزوں کلام بہت پسند کیا چونکہ اس وقت تک اس بحر میں شعر نہیں کہے جاتے تھے اس لئے اس نے شعراء کو بلا کر دریافت کیا یہ کیا بحر ہے انھوں نے کہا "ہزج" اور تین مصرعے لگا کر رباعی کر دی اور دو بیتی نام رکھا۔ ایک مدت بعد اسے رباعی کے نام سے موسوم کیا گیا فارسی میں خیام سے بہت سی رباعیات

منسوب ہیں۔ اس کے علاوہ عطار، رومی، سعدی، حافظ، جامی، ابوالخیر وغیرہ نے بھی رباعیات کہیں اسی طرح اردو کے اساتذہ ولی، سراج، سودا، انشاء وغیرہ نے عمدہ رباعیاں کہیں۔ دور حاضر میں جوش ملیح آبادی اور اختر انصاری رباعیات کے میدان میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔

بہار صاحب نے اپنے ماحول کا مشاہدہ اور مطالعہ بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ کیا ہے ان کے کلام میں دور حاضر کے وہ تمام عوامل پائے جاتے ہیں جو ہماری آپ کی روزمرہ کی زندگی میں موجود ہیں انھوں نے ان تمام چیزوں کا بحیثیت ایک انسان اور ایک حساس شاعر جائزہ لیا ہے اور انھیں اپنے تأثرات کے روپ میں ہوبہو پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنے ملکی مسائل کے علاوہ بین الاقوامی مسائل سے بھی بحث کی ہے اور عالم انسانیت کے تمام گوشوں کو اپنے قلم کے احاطہ میں لے آئے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام اردو ادب کے ذخیرۂ شعری میں یقیناً ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

پیکر خیال — اختر بستوی

ناشر۔ مکتبۂ دین و ادب نمبر۱ لاٹوش روڈ لکھنؤ
ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

مندرجہ بالا مجموعہ جناب محمد اختر حسن صدیقی کے قطعات کا مجموعہ ہے۔ جو شعری دنیا میں اختر بستوی کے نام سے مشہور ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان کے فکری قطعات پر مشتمل ہے جس کا عنوان ہے۔ دامن عقل و ہوش۔ اور جو حصہ رومانی قطعات پر مشتمل ہے وہ۔ کف گل فروش۔ عنوان کے تحت ہیں پہلے حصہ میں ان کے تفکر کی گہرائی اور گیرائی کارفرما ہے تو دوسرے حصہ میں ان احساسات و جذبات کی ترجمانی پائی جاتی ہے جس کا تعلق دل سے ہے جو کہیں پس پردہ اور کہیں کھل کر عقل و ہوش پر چھا جاتی ہے۔

شاعری کی اصناف میں غزل، نظم، مسدس، مخمس اور رباعی کی طرح قطعات کی بھی ایک صنف ہے۔ قطعے کی صنف عصر حاضر کی اردو شاعری میں جس اہمیت اور حیثیت کی حامل ہے وہ اپنی جگہ پر مسلم ہے اور شاعر نے پورے حسن و دلکشی، رعنائی و توانائی کے ساتھ ساتھ زندگی کے مسائل، دور حاضر کے رجحانات اور وقت کے تقاضوں کے نقوش خلاقانہ اور فنکارانہ طریقے سے اجاگر کئے ہیں، اس سے ان کی بلندی فکر و نظر اور ادبی بصیرت کی نشان دہی ہوتی ہے۔

جنبش لب — سید حسین بلگرامی ایاز

تابع و ناشر۔ سید اخلاق حسین ۳۹۳/۲ حسن پوریہ لکھنؤ
ضخامت ۱۷۶ صفحات تقطیع ۲۰ × ۲۶/۱۶
قیمت:۔ چار روپے۔

مندرجہ بالا شعری مجموعہ جواں سال ایاز بلگرامی صاحب کی غزلیات، نظموں، قطعات اور متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ موصوف کو شعر کہنے کا سلیقہ ہے اور انھوں نے ردیف و قافیہ میں پابند بحروں میں طبع آزمائی کی ہے اور اس قید و بند سے آزاد ہو کر بھی خامہ فرسائی کی ہے اور ان کے اپنے الفاظ میں غالب یا حالی بننے کے لئے نہیں صرف غم بھلانے کے لیے یہ راہ اختیار کی ہے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ شاعری زندگی سے کتنی قریب ہے، زندگی شاعری سے کس حد تک عبارت ہے جس طرح بہت سے لوگ اپنی دل بستگی کے لیے مختلف مشاغل میں اپنے تئیں منہمک کر لیتے ہیں ایاز صاحب نے اپنی دل بستگی کے لیے شعر و سخن کا انتخاب کیا ہے اور اس دلبستگی کو اگر وہ برقرار رکھ سکے تو کیا عجب یہ شعری شغل رنگ لائے اور وہ مستقبل قریب میں ایک کہنہ مشق ممتاز شاعر کہلائیں۔

سفینۂ زرگل ـــــــ فضا ابن فیضی

دانش کدہ پبلیکیشنز مئو ناتھ بھنجن (یوپی) مکتبۂ جامعہ لمٹیڈ اردو بازار دلّی۔ دانش محل امین آباد لکھنؤ۔

ضخامت ۲۰۲ صفحات قیمت بارہ روپے
کتابت و طباعت دیدہ زیب کاغذ دبیز اور عمدہ

دس سال ادھر میں نے فضا ابن فیضی کو ملک کے مشہور ادبی جرائد کے ذریعہ "نظم کا شاعر" جانا اس کے کچھ ہی دنوں بعد میدان تغزل میں دیکھا اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ موصوف نظم عمدہ کہتے ہیں یا غزل میرا خیال ہے کہ دونوں اصناف پر وہ حاوی ہیں مگر ان کی بابت میرا یہ کہہ دینا کافی نہیں کیونکہ میرا علم محدود ہے اس کا تجزیہ کرنا کسی گراں مایہ تنقید نگار کا کام ہے۔ میرے پیش نظر ان کی کتاب "سفینۂ زرگل" ہے جو دو حصوں میں منقسم ہے غزلیات "بوئے پیرہن" کے تحت ہیں اور رباعیات "تار پیرہن" کے تحت کتاب کے مطالعہ سے مترشح ہوا کہ شاعر نے ردیف و قافیہ میں پابند ہو کر طبع آزمائی ہے اور "فری لانسنگ" سے اپنا دامن بچایا ہے۔

علم عروض کی اصطلاح میں کلام موزوں کو شعر کہتے ہیں اور منطق کی اصطلاح میں شعر اس کلام کا نام ہے جو انبساط یا انقباض نفس کا باعث ہو۔ شمس العلماء مولوی امداد امام اثر غزل کی تعریف میں لکھتے ہیں: "اصطلاح میں اس (غزل) سے وہ صنف شاعری مراد ہے۔ جس میں ایسے مضامین جو اعلیٰ درجے کے واردات قلبیہ اور ارفع درجے کے امور ذہنیہ سے خبر دیتے ہیں حوالۂ قلم کئے جائیں۔"

ماضی میں اردو غزل کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ اس کا میدان بہت تنگ ہے اس میں گل و بلبل کی کچھ کہانیاں ہیں، کچھ عشق و محبت کی واردات، ہجر و وصال کی داستانیں، کچھ اس عالم رنگ و بو کی بے ثباتی کچھ فلک کج رفتار کا شکوہ اور بس۔ یہ کسی حد تک صحیح ہے مگر بیسویں صدی کے اوائل میں غزل نے اپنا دامن وسیع کیا اور ایسے شعرا پیدا کئے جنھوں نے دلّی اور لکھنؤ کی تنگ تاریک گلیوں سے نکال کر اسے سنوار نا شروع کیا اور ملک کے طول و عرض میں پہنچانا شروع کر دیا کوئی منفی جہت ہو، رواں کی زبان میں بولا سہ

بلبل و گل پر ہی موقوف نہیں شان غزل

تو ان میں سے کسی نے غالب کا شعر پڑھا ہے

بیاد رید کہ ایں جا بود زباں دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

ان کی تقلید خوش فکر اور خوش گو فنکاروں نے کی اور صنف غزل کو قدیم روایات سے ہٹ کر آگے بڑھاتے رہے انھیں نوجوانوں کی صف میں فضا دکھائی دیتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کا باسعان مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فضا شاعری کے جلال و جمال، اصول و روایت، رموز و کنایات پر گہری نظر رکھتے ہیں ان کے تغزل میں ہمہ گیری ہے، رس ہے، شیرینی ہے اور نشہ ہے، موسم گل اور قوس قزح کا حسن، واردات قلب و نظر کی روشن تصویریں ہیں۔ ان کے یہاں خلوص اور بانکپن ہے، کلام میں سحر آفرینی کے ہمراہ تجربہ اور مشاہدہ کی گہرائی ہے جو جمالیاتی شعور، ندرت و رفعت سے مزین ہے۔

جو حضرات اردو غزل کو محض تقلیدی سمجھتے ہیں انھیں میں "سفینۂ زرگل" کے مطالعہ کا مشورہ دیتا ہوں۔ فضا کے کلام میں زور ہے انھوں نے مطالب کی توضیح اور بیان کی تزئین اس ڈھنگ سے کی ہے کہ نہ بہت دقیق اور شاندار لغات استعمال کئے ہیں نہ بہت سادہ اور سلیس عبارت آرائی بلکہ بین بین اپنے کلام کو الفاظ کے ان سانچوں میں ڈھالا ہے کہ جو شاعر دکھانا چاہتا ہے وہ کیفیت پورے طور پر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے جو منظر وہ پیش کرنا چاہتا ہے اس کے نقش و نگار اجاگر ہو جاتے ہیں جس جذبہ کو وہ ابھارنا چاہتا ہے وہ پورے طور پر ابھر آتا ہے جو چیز تخیل و تصور کو تحریک میں لاتی ہے وہ شعر کے الفاظ اور ان کی بندش ہی میں موجود ہو جاتی ہے اسی قوت تحریک کا نام "زور" ہے۔ یہ قوت شعر میں جتنی زیادہ ہوگی شعر اتنا ہی زور دار ہوگا۔ اور یہ چیز ان کے کلام میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

Approved by the Government of Jammu & Kashmir for Libraries

ماہنامہ ترنم لکھنؤ

Editor:
Najma Akhlaque



JAMHOORIAT NUMBER

Price Re one
Annual Rs. 10/-

ماہنامہ

ترنم لکھنؤ

جلد ۳ —— شمارہ ۱

جمہوریت نمبر

۱۹۷۳ء

مدیرہ:- نجمہ اخلاق

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

سالانہ دس روپے

حکومت جموں کشمیر کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ

ممبر آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس

عنوانات

• پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر • کتابت • طباعت • مقام اشاعت •

• نجمہ اخلاق • این ایچ لائق • نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۳ • ۱۵- احتشام نگر لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱ •

سوز و ساز

امسال ۲۶ر جنوری ۱۹۷۴ء کو ہم ستائیسواں یوم جمہوریت منا رہے ہیں۔ پچھلے برسوں میں انڈین نیشنل کانگریس کے عظیم رہنما آنجہانی جواہر لعل نہرو کی قیادت میں ملک نے ہر شعبۂ حیات میں ترقی کی ہے۔ ان کے بعد قیادت کی ذمہ داری ان کی صاحبزادی شریمتی اندرا گاندھی نے سنبھالی اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ مجموعی حیثیت سے انھوں نے ملک کو اقتصادی، معاشی، معاشرتی اور صنعتی دور میں ترقی کی راہوں پر لگایا ہے اور اپنے دور میں دوسرے تعمیری اور تنظیمی کام کئے ہیں جو لائق ستائش ہیں۔

چند ہی ہفتوں بعد یوپی اور چند دوسرے صوبوں میں عام چناؤ کا وقت آ رہا ہے جس کی تیاریاں ہر پارٹی بڑے زور و شور سے کر رہی ہے۔ ان میں مختلف خیال اور عقائد و اصول پر مبنی پارٹیاں ہیں بعض بے اصولی، ابن الوقتی، اقتدار کی بھوکی عوام کو گمراہ کرنے والی فریب کار ہیں جو حکومت اور اقتدار پر حاوی ہونا چاہتی ہیں کچھ عوامی خدمت چھوٹے بڑے کا فرق مٹانے، ہر قوم کی عزت افزائی کرنے اور ملک میں جمہوریت سیکولرزم اور سوشلزم لانے کا جذبہ لئے میدان میں آئی ہیں عوام کو ان میں سے بہتر کا انتخاب کر کے اسے اپنا قیمتی ووٹ دینا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عوام میں آزادی کے بعد اتنا سیاسی شعور ضرور آگیا ہے کہ وہ اچھے برے کی تمیز کرتے ہوئے اچھی پارٹی کا انتخاب کر کے اپنے اپنے حلقہ سے اسی کے امیدوار کو کامیاب بنائیں تاکہ صوبہ اور ملک میں مستحکم حکومتیں بنیں جو ملک کو ترقی کرنے میں ممد و معاون بنیں۔

• ہم نے اپنے پچھلے اداریوں میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے حوالہ سے مرکزی اور صوبائی حکومت کے ارباب اقتدار سے چند مطالبات کئے تھے منجملہ ان میں ایک صوبہ کے اردو ماہناموں کو صوبہ کے مختلف محکموں سے دئے جانے والے اشتہارات کا مطالبہ تھا تاکہ چھوٹی پونجی کے یہ جرائد جن کی پہنچ بڑے بڑے کمرشل اشتہارات تک نہیں ہے کیونکہ ان پر کثیر تعداد میں چھپنے والے بڑے بڑے پونجی پتیوں کے اخبارات چھائے ہوئے ہیں، زندہ رہ سکیں اور اپنا چھوٹا کاروبار چلا سکیں۔ اداریہ کے علاوہ ہم نے نومبر ۱۹۷۳ء میں صوبہ کے نوجوان وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا سے بذریعہ درخواست اس امر کی استدعا بھی کی تھی ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کا جواب بہت مایوس کن اور غیر جمہوری ہمیں ان کے خط ۳ر جنوری ۱۹۷۴ء کے ذریعہ موصول ہوا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "ماہناموں کو باقاعدہ اشتہارات دینے کے کوئی احکامات نہیں ہیں" یہ جواب مایوس کن اس لئے ہے کہ صاحب اقتدار ہوتے ہوئے بھی اس بے بسی کا اظہار ہمارے لئے مضرت رساں ہے جبکہ وہ ہماری بقا کے لئے اپنے امکانات پر بہت کچھ کر سکتے ہیں اور غیر جمہوری اس لئے کہ مرکزی سرکار کے محکمۂ اشتہارات میں کوئی تخصیص نہیں برتی جاتی بلکہ تمام اخبارات کو چاہے وہ روزنامے ہوں، ہفت روزہ ہوں یا ماہنامے ایک مقررہ شیڈول کے مطابق اشتہارات دئے جاتے ہیں جبکہ صوبہ میں روزناموں اور ہفت روزہ اخبارات کو تو باقاعدہ اشتہارات ملتے ہیں اور ماہناموں کے لیے باقاعدہ کوئی گنجائش نہیں ہیں کبھی کبھار اشتہار مل جاتے ہیں وہ بھی افسران کی نظر عنایت کی بنا پر حق کے طور پر نہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ محترم وزیر اعلیٰ اس غیر جمہوری طریقہ کو ختم کر کے سب ... اخبارات کو یکساں حقوق دئے جانے کا حکم نافذ کریں گے۔

نجمہ اخلاق

بشیر فاروقی

"جشن جمہور"

اے مرے دیس کے زندہ دل ساتھیو
گیت گاؤ ہنسو جشن جمہور ہے

ہنس رہی ہیں بہاریں چمن در چمن　　سج گئی ہر طرف سرزمین وطن
آج ادا نئی اور نئی ہے لگن　　چاند تارے نئے ہیں نیا ہے گگن

اے مرے دیس کے زندہ دل ساتھیو
گیت گاؤ ہنسو جشن جمہور ہے

روح کو اک نئی تازگی مل گئی　　ذہن و حالات کو روشنی مل گئی
زندگی کو نئی زندگی مل گئی　　ایک نعمت ہے صہبائے حب وطن

اے مرے دیس کے زندہ دل ساتھیو
گیت گاؤ ہنسو جشن جمہور ہے

برف سے اپنی چوٹی سجائے ہوئے　　مست جھرنوں کا جھومر لگائے ہوئے
حسن کا اپنے جادو جگائے ہوئے　　یہ ہمالہ کی نگری بنی ہے دلہن

اے مرے دیش کے زندہ دل ساتھیو
گیت گاؤ ہنسو جشن جمہور ہے

ہند ساگر کا اپہار ہے بے مثال　　اے وطن تیرا گلزار ہے بے مثال
اور ہر گل کی مہکار ہے بے مثال　　مثل روح صنم روح گنگ و جمن

اے مرے دیس کے زندہ دل ساتھیو
گیت گاؤ ہنسو جشن جمہور ہے

شمع امن و اخوت فروزاں کریں　　آج گھر گھر میں جشن چراغاں کریں
ذرہ ذرہ کو اپنے درخشاں کریں　　اپنے بھارت کا مشہور ہے بانکپن

اے مرے دیس کے زندہ دل ساتھیو
گیت گاؤ ہنسو جشن جمہور ہے

پانی کا تاج محل

شفیع جمال

سُنو ـــــ!!
کہ درد کی محفل ابھی جگائی ہے،
ابھی تو دل کو جلایا ہے روشنی کی ہے.
ابھی نہ آؤ ـــــ ابھی رات بہت باقی ہے.
ستارے روشنی کھوکر مٹا دیں اپنی ہستی کو،
یہ چندا تھک کے سو جائے کسی مشرق کے آنچل میں،
وہ سورج لاکھ نیزے باندھ کے جب نکلے چھاتی پر،
پرندے مار کر کلکاریاں برگد سے اُڑ جائیں،
یہ شمع آخری لو دے، تڑپ کر جان دے ڈالے،
دھواں کمرے میں بھر جائے،
نشیمن حبس ہو جائے،
پپیہا "پی" کہے، تب تم......،
بدن کو توڑ کر انگڑائی لینا، اُٹھ کھڑی ہونا،
ادائے ناز سے پاؤں بڑھانا، اور چل پڑنا،
کہ جیسا سامر تعش کرتی ہوئی پازیب کی لے سے.
نشیمن پر میرے آنا،
ذرا دروازہ وا کرنا
نظر اپنی جھکا دینا.

اِسی صورت، اسی صورت،
تمہارے وعدے اور قسمیں،
"کہ مجھکو آخری سانسوں میں بھی نزدیک پاؤ گے"
میری وہ آخری خواہش کہ جب مرتا رہوں تب بھی
میرے ہی سامنے تم ہو،
سبھی تکمیل پائیں گے.

احساسِ حقیقت

ساغر اعظمی

جس سمت نظر آئے اک خاک سی اڑتی ہے
یہ دامنِ صحرا ہے یا گلشنِ ہستی ہے

ہر ایک حقیقت پر اک خواب کا پردہ ہے
گلشن کو بہاروں نے اس طرح نوازا ہے

کردار کے محلوں میں الفاظ کا پہرہ ہے
ہر شاخ کے کاندھے پر کلیوں کا جنازہ ہے

احساس کے آنگن کی دیوار بھی ٹوٹی ہے
ہر پھول میں اک غم کی تصویر جھلکتی ہے

یہ دامنِ صحرا ہے یا گلشن ہستی ہے
یہ دامن صحرا ہے یا گلشن ہستی ہے

آنکھوں میں ہے مایوسی چہروں پہ اداسی ہے
اک آتشِ پنہاں سے ہر جسم سلگتا ہے

ہر صبح یہاں پیاسی ہر شام بھی پیاسی ہے
پروائی کے جھونکوں سے احساس بھی جلتا ہے

صہبائے محبت تو کہنے کو چھلکتی ہے
ساون کی پھواروں سے اک آگ برستی ہے

یہ دامنِ صحرا ہے یا گلشن ہستی ہے
یہ دامن صحرا ہے یا گلشن ہستی ہے

جھرنوں کے ترنم کی لے درد میں ڈوبی ہے
کیا پیاس بجھے دل کی اس شبنمِ گریاں سے

تپتا ہے ہر اک سایہ ہر جھیل بھی سوکھی ہے
ہر پھول پشیماں ہے انجامِ بہاراں ہے

ہر ابر کے ٹکڑے میں اک پیاس جھلکتی ہے
طوفان کی آمد ہے ہر شاخ لرزتی ہے

یہ دامنِ صحرا ہے یا گلشن ہستی ہے
یہ دامن صحرا ہے یا گلشن ہستی ہے

ہر شام کے ہونٹوں پر اک گیت ادھورا ہے
کچھ لوگ چلے آئے یہ لو تپتے گھبرا کر

ہر صبح کے دامن میں اک خواب شکستہ ہے
کیا غم کا مداوا ہو اس دور میں اے ساغر

ہر رات امیدوں کے بستر پر گزرتی ہے
ہر سمت جب اپنی ہی تصویر جھلکتی ہے

یہ دامن صحرا ہے یا گلشن ہستی ہے
یہ دامن صحرا ہے یا گلشن ہستی ہے

سنگِ لفظ

حیات وارثی

جو میکدے میں بہکتے ہیں لڑکھڑاتے ہیں
مرا خیال ہے وہ تشنگی چھپاتے ہیں
ذرا سا وقت کے سورج نے رخ جو بدلا ہے
مرے وجود پہ کچھ سائے مسکراتے ہیں
طلسمِ ذات کی پھیلی ہے تیرگی اتنی
کہ وسعتوں کے اجالے سمٹتے جاتے ہیں
ستم ظریفیِ حالات کا کرشمہ ہے
بھٹکنے والے ہمیں راستہ بتاتے ہیں
دلوں کی سمت یہ لفظوں کے سنگ مت پھینکو
ذرا سی ٹھیس سے آئینے ٹوٹ جاتے ہیں
جنھیں حیات متاعِ شعور حاصل ہے
فریب دیتے نہیں ہیں فریب کھاتے ہیں

غزل

رئیس الشاکری

آپ کی بات غزل میں جیسے
روشنی شیش محل میں جیسے
حسن وارفتہ ہوا جاتا ہے
کوئی یوسف ہو بغل میں جیسے
قطرۂ رشک ہے تاریخِ الم
ذکر صدیوں کا ہو پل میں جیسے
غم کے آنچل میں خوشی کا ٹکڑا
فرق ہے ذوقِ عمل میں جیسے
منکہ حیراں یہ ہجومِ جلوہ
آئینہ روپ محل میں جیسے
لذتِ زخمِ جگر کیا کہنا
ذائقہ صبر کے پھل میں جیسے
حسرتیں قتل ہوئیں ہیں کیا کیا
خون ہو جنگ و جدل میں جیسے
آرزوؤں کی یہ ہاتھا پائی
فلسفی عقدۂ حل میں جیسے
دل کا ہر داغ لپکتا ہے رئیس
تازگی تازہ کنول میں جیسے

غزلیں

نگار اناوی

کمال ضبط نے دردِ نہاں کی آبرو رکھ لی
اسی عنواں نے میری داستاں کی آبرو رکھ لی

حرم کیا، دیر کیا، ہر آستاں کی آبرو رکھ لی
محبت نے جبیں سائی جہاں کی آبرو رکھ لی

جوانی ہی کے دم سے زندگانی زندگانی ہے
بہار چند روزہ نے خزاں کی آبرو رکھ لی

فرشتوں نے جھکائے ہیں سر اپنے پائے آدم پر
زمیں کی عظمتوں نے آسماں کی آبرو رکھ لی

بھٹک جاتا نہ جانے ذوق میرا کس دوراہے پر
غزل نے مرے حسن بیاں کی آبرو رکھ لی

ہزاروں راہزن تھے ہر قدم پر راہِ الفت میں
جنوں کی رہبری نے کارواں کی آبرو رکھ لی

نگار اس کو بھی اک طرزِ فغاں سمجھا زمانے نے
خموشی ہی نے کب مجھ بے زباں کی آبرو رکھ لی

معصوم شیر گڈھاوی

ہمارے گھر سے کبھی دور تیرگی نہ ہوئی
چراغ دل تو جلایا تھا روشنی نہ ہوئی

ہزار دور جام پہ بھی ہم کو بیخودی نہ ہوئی
ہمارے بس میں ہماری ہی زندگی نہ ہوئی

یہ کون کہتا ہے ہر شب سحر پہ ڈھلتی ہے
ہمیں تو نورِ سحر سے بھی آگہی نہ ہوئی

نظام گلشن ہستی بدل دیئے تو سہی
ثمر گلوں کے مصائب میں کچھ کمی نہ ہوئی

پہنچتی بات کہاں سے کہاں مرے منہ سے
چلو یہ خوب ہوا دور خامشی نہ ہوئی

ہزار کوشش ایثار پر بھی اے معصوم
شگفتہ دل کی مرے آج تک کلی نہ ہوئی

غزل

سعید اختر نظامی

ہم کو یارو کیوں ڈراتے ہو خدا کے قہر سے
ہم تو پہلے ہی پریشاں ہیں ہوائے دہر سے

اب یہ سوچا ہے نکل جائیں گے کوسوں دور ہم
خود سے ملنے کی تمنا میں تمھارے شہر سے

رفتہ رفتہ دل کی زندہ دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ
مر گیا احساسِ غم بھی ضبطِ غم کے زہر سے

ہو گیا آئینۂ شب کا سکوں بھی پاش پاش
اس طرح ٹکرا گیا تھا درد دل کی لہر سے

دل میں آتے ہی کسی کے روئے روشن کا خیال
پھوٹ پڑتے ہیں اجالے حسرتوں کی نہر سے

میرے دل کو پھونک دے اے شعلۂ آوارگی
پھر پیاماتِ حسیں آئے ہیں اُسکے شہر سے

قتل گاہِ دل ہے وہ بزمِ سخن بھی ان دنوں
خودکشی کر لیجے اخترؔ خامشی کے زہر سے

چند مطلعے

پرکاش ناتھ پرویز

پھول جو واقفِ آدابِ بہاراں ہوں گے
چاکِ دل، چاکِ جگر، چاکِ گریباں ہوں گے

نہ اہلِ دل سے نہ اہلِ نظر سے ملتا ہے
شعورِ ذات فقط اپنے در سے ملتا ہے

یادگارِ غمِ اُلفت تن تنہا ہوں میں
جس کو سب چھوڑ چکے ہیں وہی دنیا ہوں میں

حدودِ ہوش سے باہر قدم بڑھا نہ سکے
مقامِ عشق خرد مند لوگ پا نہ سکے

شعورِ ہوش و خرد سے ہوں لاکھ بیگانے
تری نگاہ کو پہچانتے ہیں دیوانے

دِل میں سوزِ غمِ الفت کے سوا کچھ بھی نہیں
حاصلِ عشق ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں

شاملِ حال تری ذات کہاں تھی پہلے
رنج و غم پر بسر اوقات کہاں تھی پہلے

کیا تیری محبت میں عالم نظر آتا ہے
کونین کا ہر ذرہ برہم نظر آتا ہے

گھبرا گئے ہیں تیرگیٔ زندگی سے ہم
جلوؤں کی بھیک مانگ رہے ہیں کسی سے ہم

خود اپنی ذات کا ملتا نہیں نشاں مجھ کو
تری تلاش نے گم کر دیا کہاں مجھ کو

ساحر لکھنوی

غزل میں عروض کا معجزہ

غزل عروس حسنِ بیان، صداقت کو دلکش الفاظ کے زیورات سے آراستہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ زبان کی ابتدا، نشو و نما اور انتہائی مدارج تک پہونچنے تک، غرض ہر دور میں اس صنف سخن کو شاعری کی دیگر اصناف پر ہمیشہ فوقیت اور اولیت حاصل رہی ہے۔ ابتدا میں غزل روایات کی چار دیواری میں مقید تھی لیکن جوں جوں زبان ترقی کرتی گئی، انقلابات رونما ہوتے گئے اور زمانے کے نشیب و فراز ذہنوں پر تجربات کی چھاپ لگاتے گئے، غزل کا دامن بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، اس کی ہمہ گیری بڑھتی گئی، اثر انگیزی میں اضافہ ہوتا رہا اور غزل دل کی شگفتگی روح کی بیداری اور اخلاق کی استواری کا پیغام بن گئی۔ اساتذہ سخن نے ذہن و دماغ کی معجز نگاریوں اور سحر کاریوں سے ایسے ایسے گلدستے سجائے کہ آج اہل فارس کے سامنے جن کی تقلید میں ہماری غزل نے جنم لیا اردو غزل کے نمونے ہم فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔

اس وقت میرا مقصد غزل کی مدح سرائی قطعاً نہیں ہے بلکہ یہ عرض کرنا ہے کہ شاعر کو خیالات لطیف اور افکار جمیل کو شعر کا لباس عطا کرنے میں جن پابندیوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ انتہائی نزاکت اور اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ وہ قیود اور پابندیاں جن کے احاطے میں رہ کر فکر و احساس الفاظ کا لباس پہن کر غزل کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں، علم عروض کہلاتا ہے۔ اس علم کے موجد خلیل بن احمد نحوی تھے۔

ہندوستان کے شعراء نے تقلید غزل گوئی میں جہاں اہل فارس کا اتباع کیا وہاں عروضی پابندیوں کو بھی اپنا لیا اور اس فن کو بھی غزل گوئی کی طرح عروض کی اس بلندی پر پہونچا دیا جہاں سخنوران عرب و عجم بھی انگشت بدنداں نظر آتے ہیں۔ فن عروض پر اردو گو ہندی نژاد شعراء کی کامل دسترس کے ثبوت میں ایک عجیب و غریب غزل درج ذیل کی جا رہی ہے جس کو اگر دنیائے شعر کا معجزہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ غزل تین بحروں میں موزوں ہوتی ہے اور بقول حضرت علامہ عبدالباری آسی: "عرب و عجم کے زبردست سے زبردست شاعر کے ہاں بھی کوئی غزل ایسی نہیں پائی جاتی جو تین بحروں میں موزوں ہو بلکہ کوئی شعر بھی اس نوعیت کا نہیں ہے۔"

مجھ کو یہ غزل علامہ عبدالباری آسی کے زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامے "سخنور" میں نظر آئی تھی چنانچہ میں نے اس غزل کو اس وقت (غالباً ۵۸ء میں) ماہنامہ "پاسبان" چنڈی گڑھ میں شائع کرا دیا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ ادب دوست اس شعری معجزے سے محظوظ ہو سکیں۔ حالات زمانہ کے ہاتھوں میرا کافی ادبی سرمایہ خرد برد ہو گیا چنانچہ یہ غزل بھی کچھ نامکمل سی حالت ہی میں محفوظ رہ سکی جو پیش خدمت ہے۔

اس غزل کے خالق حضرت ضیغم رامپوری تھے۔ ریختی میں تخلص مہمان تھا، طب یونانی اور ویدک وغیرہ کے ماہر تھے اور علم عروض میں قطعی دستگاہ رکھتے تھے آخر عمر میں ڈھاکہ میں سکونت اختیار کی اور ۱۲۸۶ھ میں وہیں انتقال فرمایا۔

یہ غزل جس تذکرے سے ماخوذ ہے، صاحب تذکرہ

نے آسانی کے لئے ہر بحر اور اس کی تقطیع بھی کر دی ہے۔ جو قارئین دلچسپی کے لئے [illegible] بحور میں تقطیع کی گئی ہے ان کے علاوہ دوسری بحروں میں بھی یہ موزوں ہے۔

غزل کا مطلع یہ ہے۔

جان تیرے غم میں دے دی اب تو جو کچھ ہو سو ہو
شوخی پہ ہم نے بھی کی اب تو جو کچھ ہو سو ہو

ساقی [illegible] ہے اور گل کی بھی آتی ہے فصل
[illegible] اب تو جو کچھ ہو سو ہو

بحر منسرح مثمن مطوی موقوف یا مکشوف

ارکان: مفتعلن فاعلات مفتعلن فاعلن یا فاعلات

تقطیع: ساقی ہے [illegible] (فاعلات)
گل کی بھی آ (مفتعلن) تی ہے فصل (فاعلات)

بحر متقارب اثرم ابتر مثمن [illegible]

ارکان: فعلن فعلن فعلن فع فعلن فعلن فعلن فع

[illegible]

پھر [illegible] میری جان
[illegible] اب تو جو کچھ ہو سو ہو

بحر مشاکل مثمن محذوف ارکان: فاعلاتن مفاعیلن فاعلاتن فعلن
تقطیع [illegible] (فاعلاتن) [illegible] (مفاعیلن) [illegible] (فاعلاتن) [illegible] (فعلن) بحر مقتضب مطوی مکشوف

ارکان فاعلن مفتعلن فاعلن مفتعلن

تقطیع [illegible] (فاعلن) [illegible] (مفتعلن) اب تو جو (فاعلن) کچھ ہو سو ہو (مفتعلن)

جیسے یہ جام ہے شوق ویسے ہی دل ہے میرا
چیریں گے سینے کو بھی اب تو جو کچھ ہو سو ہو

بحر وافر مثمن اعضب معصوب

ارکان مفتعلن [illegible] مفعولن

تقطیع۔ جیسے یہ جام (مفتعلن) مہ ہے شوق (مفعولن) ویسے ہی دل (مفتعلن) ہے میرا (مفعولن)

بحر مجتث مثمن مقطوع

ارکان: مفعولن فاعلاتن مفعولن فاعلاتن

تقطیع۔ چیریں گے (مفعولن) سینے کو بھی (فاعلاتن) اب تو جو (مفعولن) کچھ ہو سو ہو (فاعلاتن)

ملتے ہیں تو لوگوں کے صنم کوئی بچتا ہے جی
سر پہ یہ جو کھوں ہے لی اب تو جو کچھ ہو سو ہو

بحر منسرح مثمن مطوی مجنون مکشوف۔

ارکان: مفتعلن فعولن مفتعلن فعولن

تقطیع۔ ملتے ہیں تو (مفتعلن) لوں کے صنم (فعولن) کوئی بچ (مفتعلن) تا ہے جی (فعولن)

بحر مقتضب مثمن مکشوف

ارکان: مفعولن مستفعلن مفعولن مستفعلن

تقطیع۔ سر پہ یہ جو (مفعولن) جو کھوں ہے لی (مستفعلن) اب تو جو (مفعولن) کچھ ہو سو ہو (مستفعلن)

اسکے علاوہ بحر مجتث مثمن مجنون مقصور۔

ارکان: فاعلاتن فعولن فاعلاتن فعولن میں اسی غزل کے شعر اول کی تقطیع۔

جان تیرے غم (فاعلاتن) میں ہے دی (فعولن)
اب تو جو کچھ (فاعلاتن) ہو سو ہو (فعولن)

بحر عمیق مثمن سالم یا مسبغ۔

ارکان: فاعلن فاعلاتن فاعلن فاعلاتن یا فاعلاتن میں میں مصرع اول کی تقطیع۔

جان تیرے (فاعلن) غم میں ہے دی (فاعلاتن)
اب تو جو (فاعلن) کچھ ہو سو ہو (فاعلاتن)

ایس۔ ایس۔ احمد

وہ شرمندہ نہیں تھی

میں اُس روزانہ جریدے کا نمائندہ ہوں جس کے کارکنوں کو ہم پیشہ حضرات حسرت و یاس کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ میری ہر جگہ عزت ہوتی ہے لہذا بڑی سے بڑی شخصیتوں کے یہاں میری رسائی ہے اور جلسوں اور جشنوں میں معززین اور عزت مآب مہمانوں تک بلا جھجک پہنچ جاتا ہوں [illegible] دوسرے جرائد کے نمائندے مجھے عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور کسی تقریب کے دوران میری ملاقات کے متمنی رہتے ہیں تاکہ وہ اپنے تخیلات کا وہ انمٹ نقش تعمیر کر سکیں۔ معتبر خبروں کے علاوہ میرے طرز بیان کے بھی قارئین عاشق ہیں لہذا صنف صحافت میں مجھ [illegible] ہماری نمائندے کے لئے ایک مشکل [illegible]

لوں تو بہت سے موضوعات میرے دماغ میں تھے جن پر [illegible] مضامین لکھنے کی [illegible] خواہش میرے دل میں تھی لیکن ایک مشہور و معروف [illegible] تنقید) اور [illegible] میں اکثر [illegible] حالات میں بھی [illegible] ماحول میں کسی قسم کی کرب و اذیت کا شائبہ ہوتا ہے۔ کیا اپنے پیشے سے خوش ہیں [illegible] وغیرہ وغیرہ

میں ایک قابل صحافی کی حیثیت سے بڑے حکام سے اور ان سے گفتگو کرنے کے آداب سے قطعی واقف تھا۔ ایک مشہور و معروف طوائف سے ہم کلام ہونے کا یہ پہلا موقع تھا مینا بائی کا خادم مجھے اعلیٰ سے اعلیٰ حکام اور [illegible] کے چپراسیوں سے کہیں زیادہ ہوشیار اور سلیم الطبع نظر آیا پہلے دن جب وہ [illegible] پیش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کے تمام سوالات صرف اسی حقیقت کے متلاشی تھے کہ میری جیب میں کتنی رقم ہے اور جب میں نے اسے بتلایا کہ میں ایک اخبار والا ہوں تو شاید اس کے لیے یہ ایک نئی بات تھی اور میرے پیشہ کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے اس نے کم از کم مجھ کو پولیس داروغہ سے کم نہیں سمجھا اور اس طرح مینا بائی تک شرف باریابی نصیب ہوا۔

مینا بائی ان عام پیشہ ور عورتوں میں سے نہیں تھیں جن کے یہاں ہر کس و ناکس کے لئے خوش آمدید کا بورڈ آویزاں ہو [illegible] سرد مہری سے پیش آئیں اور انھوں نے برجستہ میرا مدعا دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں کسی اخبار کی مدیرہ نہیں ہوں نہ ہی مجھے سیاسیات میں کوئی دلچسپی ہے۔ میں تو ایک [illegible] ہوں اتنا کہہ کر وہ مجھے غور سے دیکھنے لگیں۔

مینا بائی کا پروقار [illegible] ہو چکا تھا۔ وہ تیس بتیس سال کی ایک [illegible] خوبصورت [illegible] بڑے بڑے مدبر اور سیاست داں [illegible] اثر و نفوذ میں [illegible] تھے اس قدر متاثر نہ کر پائے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری خاموشی ان کے تیور میں مزید بل ڈال دے گی لہذا گھبرا کر [illegible] سوال ایک ہی جھٹکے میں میری زبان سے نکل آئے میں نے پوچھا کیا آپ اس پیشہ سے مطمئن ہیں اور

اسی پیشہ میں رہنا پسند کریں گی جب تک آپ جسمانی طور سے اپاہج نہ ہو جائیں اور آپ کے گرویدہ خریدار آپ میں کوئی جاذبیت نہ پاکر آپ سے کنارہ کش ہو جائیں۔

منّا بائی غصہ سے کانپنے لگیں اور انھوں نے گرجدار آواز میں پوچھا! آپ کو کس نے میرے یہاں آنے کو کہا ہے؟ میں نے بہت ہی لجاجت سے کہا کہ میں خود آپ کے پاس آیا ہوں لیکن میری نیت کو آپ ہرگز غلط نہ سمجھئیے گا۔

منّا بائی نے کسی قدر اپنے جذبے پر قابو پا لیا تھا اور انھوں نے سنجیدگی سے کہا کہ میرے یہاں کوئی اچھی نیت سے نہیں آتا۔ میرے گرویدہ اس لیے آتے ہیں کہ میں انھیں تباہ و برباد کر دوں۔ میرے غیظ و غضب کے عادات انھیں پسند ہیں۔ میری اس کیفیت سے انھیں تقویت پہنچتی ہے اور ہر شخص بجائے دور بھاگنے کے میرے زیادہ قریب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر میں حلیمی سے پیش آؤں تو میری جاذبیت میں یقیناً کمی نظر آئے گی لیکن آخر میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔

میں منّا بائی کو بغور دیکھتا رہا۔ ان کے یاقوتی ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کے مانند آپس میں ملے ہوئے تھے۔ مجھے وہ بہت اچھی اور بلا کی حسین نظر آ رہی تھیں۔ میری خاموشی پر انھوں نے کہا کہ آپ کچھ بولتے کیوں نہیں۔ کیا آپ میرے خد و خال کا موازنہ اپنی نیک سیرت اہلیہ سے کر رہے ہیں میں نے گھبراہٹ میں جواب دیا کہ آپ میری بیوی سے کہیں زیادہ حسین ہیں اور حق تو یہ ہے کہ آپ سے زیادہ حسین عورت میری نظروں سے آج تک نہیں گزری۔ مجھے اسی وقت یہ احساس ہوا کہ دنیا کی ہر عورت خوشامد پسند ہوا کرتی ہے اور اپنی تعریف اسے ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔ لہٰذا میرے یہ جملے جو حقیقتاً میں نے دل سے کہے تھے کا حیرت انگیز اثر ہوا اور منّا بائی نے قدرے مسکرا کر مجھے پان پیش کیا۔ اب ہم دوستانہ گفتگو کر رہے تھے ۔۔ منّا بائی نے میرے لیے خوش ذائقہ ناشتہ اور چائے بھی منگوائی ناشتہ کے بعد وہ اپنی کہانی سنانے پر آمادہ ہو گئیں۔

میرا نام حسرت جہاں ہے میری پیدائش ایک بہت ہی غریب گھرانے میں ہوئی تھی سن بلوغ کو پہنچتے ہی میری شادی رضی احمد نام کے ایک شخص سے ہوگئی جو احمد آباد کے ایک کارخانہ میں مزدور کی حیثیت سے ملازم تھا۔ مزدوروں کی یہ بستی اوباش قسم کے لوگوں سے بھری پڑی تھی جب بھی میں گھر سے کام کاج کے سلسلہ سے باہر نکلتی آوارہ نظریں میرا تعاقب کرتیں جب میرے شوہر کی رات ڈیوٹی ہوتی تو اکثر دروازے پر دستک کی ہلکی ہلکی آوازیں آتیں میں کچھ دنوں تک اس حرکت سے بہت پریشان رہی لیکن بعد میں بے نیازی سے مسکرا کر ٹال جاتی اور یہ ناشائستہ حرکات مجھ پر قطعی اثر انداز نہ ہوتے تنخواہ کے دنوں میں دروازے کے زینوں پر دس اور پانچ کے نوٹ نظر آتے جب میں کنویں سے پانی لینے جاتی تو کوئی منچلا دو چار روپیہ وہاں چھوڑ آتا۔ لیکن غربت اور تنگ دستی کے باوجود میں نے کبھی ان روپیوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

میں نے اپنے نیک شوہر سے ان ناشائستہ واردات کا تذکرہ کبھی نہیں کیا۔ وہ بیچارے آٹھ دس گھنٹہ کے سخت مشقت کے بعد زیادہ تر او قات آرام ہی کرتے رہتے اور معاشی پریشانیوں کی وجہ سے ہر گھڑی مضمحل رہتے تھے۔ میں ہر طرح ان کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرتی اتفاقیہ کہ منّا بائی نے ملازم سے ایک گلاس پانی لانے کو کہا پانی پینے کے بعد تھوڑی دیر تک نہ معلوم کن خیالات میں ڈوبی رہیں۔ پھر انھوں نے کہنا شروع کیا۔ ایک شب جب میرے شوہر کام پر گئے ہوئے تھے میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی۔ سینے میں شدید درد اٹھا اور جب بے چینی حد سے زیادہ بڑھ گئی تو میں نے پڑوسیوں کو خبر دی منٹوں میں وہ لوگ جو میرے شوہر کی شدید علالت کے دوران خیریت تک پوچھنے نہیں آئے تھے میری مدد کو آ پہنچے۔ بہت سے ہوس ناک ہاتھ میرے جسم پر پھرنے لگے جو بظاہر میرے درد کو بھانپنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور پھر میں بیہوش ہوگئی۔

جب میں ہوش میں آئی تو سوائے ایک رحم دل نرس کے میرے پاس کوئی دوسرا نہیں تھا۔ نرس نے مجھے بتلایا کہ میرے شوہر کو چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے اور یہ کہ میرے بہت سے بہی خواہ ہر روز شام کو میری خیریت پوچھنے آجاتے ہیں۔ میں عالم سکتہ میں نرس کو دیکھتی رہی۔ میں کیسے یقین کر لیتی کہ مسرانیک شوہر جو حد درجہ متقی اور پرہیز گار تھا چوری کر سکتا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کسی نے میرے شوہر کو غلط الزام لگا کر جیل بھجوا دیا ہے۔ میں بہت کمزور تھی لیکن اب میرا دل ایک منٹ بھی ہسپتال میں نہیں لگ رہا تھا میں اسی نقاہت کی حالت میں وہاں سے گھر کے لئے روانہ ہو گئی۔ ہسپتال کے صدر دروازے پر ہی مجھے ایک لڑکا نظر آیا جو میرا ہمسایہ تھا۔ اس نے بکہ پر ساتھ چلنے کی پیش کش کی اور میں بخوشی رضامند ہو گئی۔ اور یہیں سے میری بربادی کے دن شروع ہو گئے۔

میں بہت بری طرح برباد ہوتی رہی اور ایک دن مجھے اسی بالاخانہ کی سابق معینہ کے یہاں پہنچا دیا گیا اس وقت میری عمر تقریباً اٹھارہ انیس سال کی تھی۔ میرے شوہر کا بہت زمانہ تک کوئی سراغ نہیں ملا بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ میرے عاشق پولیس کے سپاہیوں نے انھیں جھوٹے الزام میں قید کرا دیا تھا۔ تقریباً پانچ سال کے بعد ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ ایک شخص کئی دنوں سے میرے یہاں ملازمت کی تلاش میں آرہا ہے میں نے یہ بھی سنا کہ وہ جرائم پیشہ ہے اور کئی مرتبہ جیل جا چکا ہے منابائی نے مجھے دیکھا اور کہنے لگیں کہ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارے یہاں اس پر توجہ نہیں دی جاتی کہ کسی کا ماضی کیا رہا ہے یا یوں سمجھئے کہ ایسے کردار کے لوگوں کی زیادہ قدر و منزلت ہمارے یہاں ہوتی ہے لہذا میں نے اس کو بلوایا۔ لیکن یہ زندگی کا عجیب وغریب موڑ تھا جب میں نے دیکھا کہ وہ شخص کوئی دوسرا نہیں بلکہ میرا شوہر ہی تھا۔ ہم دونوں کے دلوں میں فطری محبت کا جذبہ موجزن ہوا لیکن اسی وقت شہر کے رئیس کے صاحبزادے تشریف لے آئے جو مجھے جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ اب ہمارا اور میرے شوہر کا مقام مختلف ہو چکا ہے اور اب ہم کبھی ایک دوسرے کے بہت قریب نہیں ہو سکیں گے

اتنا کہہ کر منابائی نے رومال سے آنسوؤں کو خشک کیا۔ پاندان سے دو گلوری پان نکال کر ایک مجھے دی ایک خود کھائی ان کا خوبصورت چہرہ [illegible] سے خالی نظر آرہا تھا۔ انھوں نے میری جانب دیکھ اور ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے کہا کہ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اس دن سے رئیس صاحب نے ملازم کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ مجھے ان سے اب کسی اور قسم کا رشتہ [illegible] وہ خاموش ہو گئیں۔ ان کی پھیکی مسکراہٹ سے [illegible] صاف جھلک رہی تھی۔ انھوں نے غور سے مجھے دیکھا اور کہنے لگیں کہ بس یہی میری کہانی ہے۔ میری خواہش تھی کہ کسی نہ کسی معقول شخص کو بھی نہ کبھی اپنے دل کی بات [illegible] آج میں نے آپ کو بتلا دی۔ اب میری اصلاح [illegible] اگر آپ اس مسئلہ پر [illegible] کر رہے ہیں تو میری گزارش ہے کہ میری جیسی بے شمار عورتیں جہاں آج بھی کارناموں کے [illegible] جالوں میں پڑی ہوئی ہیں جو میری ہی طرح ہوسناکی کا شکار ہو کر بالاخانوں کی زینت بن جائیں گی۔ اگر ان کی اصلاح آپ کر سکے تو ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔ منابائی زار و قطار رونے لگیں۔ میرا بھی دل بھر آیا میں نے ملازم کو دیکھا جو مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ تم سبھوں سے مجھے شدید نفرت ہے۔

خلیق نگرامی

بدلا ہوا انسان

زندگی انسانی کرب و اضطراب کا دوسرا نام ہے۔ میرے دل و دماغ میں ایک حساس کیفیت جنم لے رہی ہے اس سے پہلے میں نے زندگی کو خوبصورت و حسین تمناؤں کا مرکز کہا تھا۔ جب زندگی کے تمام دکھ درد، تمام آہیں، کرب و اضطراب سمٹ کر شہلا کی آنکھوں میں سما گئے تھے۔

میرے دوست شہلا کو دیکھ کر کہا کرتے تھے "یار تم بہت لکی ہو" "اتنی اچھی بیوی پائی ہے" "سنگ مرمر کا ٹکڑا ہو جیسے" "ٹھیک کسی ناول یا افسانے کی خوبصورت ہیروئن کی طرح" میں اُن کے اس ریمارک پر بہت خوش ہوتا لیکن اتنا ضرور کہتا کہ میں نہیں سمجھتا کہ شہلا کسی افسانے یا ناول کی خوبصورت ہیروئن ہے۔ میں تو صرف یہ سمجھتا ہوں کہ وہ میری زندگی کی حسین ساتھی۔ میری غم خوار، میرے تمام دکھوں کا مداوا افسانے یا ناول کی ہیروئن تو بدصورت بھی ہو سکتی ہے لیکن میری یہ زندگی جو ایک ناول کی طرح ہے اُس ناول کی خوبصورت ہیروئن شہلا ہی ہے۔

آج مجھے شہلا کے ساتھ گذرے ہوئے وہ لافانی لمحات یاد آرہے ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ اس کہانی کو کہاں سے شروع کروں سوالات کا سلسلہ آج کا بکھراؤ ذہن پر بُری طرح مسلط ہے۔

"کیا وہاں سے" جب میں رمیش کو لے کر اُس رات اپنے گھر پہونچا تھا۔

ہاں ٹھیک !

[illegible]

جیسے ماضی کے لافانی خواب میری آنکھوں کے سامنے رقص کر رہے تھے۔ میرے دل و دماغ کی فضاؤں میں گردش کر رہے ہیں۔

آج [illegible] سوالات کے بکھراؤ کیوں جنم [illegible] آج سے پہلے کیوں نہیں ہوا؟

بس [illegible] آج میرے اندر کی خودغرضی دوبارہ جنم لے رہی ہے آج میرا انتم سنسکار ہو رہا ہے۔

کیا میں اس جنم لینے والی خودغرضی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں؟

نہیں۔

میں اس خودغرضی کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کر سکتا؟ میں اس خودغرضی کو کسی بھی قیمت پر اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ میری اس خودغرضی سے میرے ماضی اور ماضی سے مستقبل کی تمام تر امیدیں وابستہ ہیں۔ ماضی کا مستقبل سے بہت گہرا رشتہ ہے ماضی کے اُن عظیم ترین لافانی لمحات کو دوبارہ جنم لینا ہی چاہئے۔

اسی میں زندگی کا راز مضمر ہے

اُس رات جب میں رمیش کو لیکر اپنے گھر گیا تو شہلا کو گھر میں نہ پاکر اور ایک خط جو وہ میرے نام چھوڑ گئی تھی پڑھ کر میرا دل بیٹھ گیا تھا میری تمام امیدوں پر شہلا نے پانی پھیر دیا تھا آج بھی میں اپنا منھ پیٹ رہا ہوں۔ لگاتار تھپیڑوں کا سلسلہ جاری ہے اور اُن تھپیڑوں کی آواز سے ایک کہانی جنم لے رہی ہے میرے [illegible] میرا انتم سنسکار

ہو رہا ہے اور دوسرا جنم ہو رہا ہے۔ میرا دوسرا جنم ہونا ہی چاہیئے۔ مجھے اُس خط کا ایک لفظ آج بھی یاد ہے جو شہلا میرے نام چھوڑ گئی تھی۔ اُس نے لکھا تھا۔

ڈیئر۔

"آج میں تم کو چھوڑ کر اپنے گھر جا رہی ہوں"

کیوں؟

یہ تم خود اپنے اندر کے انسان سے پوچھو۔ مجھے امید ہے کہ جب تم یہ سوال اپنے آپ سے پوچھو گے تو تم کو اس کا جواب خود بخود مل جائے گا۔ اور اگر نہیں پوچھو گے تو لو مجھ سے سنو۔

تم نے اپنا ضمیر فروخت کر دیا ہے۔ یہ میری ایک ایسی تھی جو میں تمھارے جال میں نہیں پھنسی ورنہ آج میں جس شان سے زندہ ہوں نہ رہتی اور ٹھیک ویسا اُسی طرح خودکشی کر لیتی جس طرح اور شریف لڑکیاں کر لیتی ہیں۔ مجھے زندگی سے پیار ہے اور اپنی زندگی سے زیادہ تمھاری زندگی سے کیوں کہ تمھاری زندگی میری زندگی ہے

تم کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ ایک بار جب تم میرے لئے اعلیٰ درجے کی قیمتی ساریاں، زیورات کے سیٹ اور نہ معلوم کتنے قیمتی ملبوسات لائے تھے تو میں تم پر کتنی ناراض ہوئی تھی۔ تم کو یاد ہوگا کہ میں نے کہا تھا کہ ہماری مختصر تنخواہ اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنی حد سے آگے بڑھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے ایک مالدار گھرانے میں اپنی زندگی کے دن گزارے اچھے لباس زیب تن کئے۔ اعلیٰ کھانے کھائے لیکن تب اور اب میں فرق ہے۔ اب میری شادی تمھارے ساتھ ہو چکی ہے۔ ہم کو آنے والی زندگی میں نہ معلوم کتنے اہم مسائل سے نپٹنا پڑے گا۔ انسان کی جتنی چادر ہو اُتنا ہی پیر پھیلانا چاہیئے۔ تم میرے ماضی میں مت جھانکو۔ اپنی آمدنی کو دیکھو وہ اس حساب سے زندگی کو گزارنے کا طریقہ بتاؤ۔ لیکن تم نے ہمارے اس خلوص کو محض بکواس سمجھا اور اپنی من مانی

[illegible] تم [illegible] آگے [illegible] اس موضوع [illegible] تم ایک ہنگامہ [illegible] اپنی [illegible]

[illegible] پہلے کی [illegible] پندرہ کے بعد [illegible] پہنچی کہ دس اور پانچ تاریخوں تک پہنچ گئی۔ تم نے [illegible] سے غبن کیا [illegible] دیکھا کہ تمھارے [illegible] تمھارے [illegible]

[illegible]

وہ جسم ایک بیمار [illegible] اور [illegible] تمھارے دوستوں کے لئے [illegible] تھی ایک [illegible] چہرے پر سیاہی پھیل گئی [illegible] عورت [illegible]

[illegible] ہو گئے تو تم نے [illegible] یہ کہ آج مجھے [illegible] زندگی [illegible] زبردستی [illegible] آج تم نے اپنے دوست [illegible] رات بھر کے لئے فروخت کر دیا تھا

جب تم گھر [illegible] مجھ [illegible] اٹھانا [illegible] کے لئے [illegible] ہے کہ تم ایک دن [illegible] واپس آؤ گے۔

[illegible]

خلیق نگرامی

بدلا ہوا انسان

زندگی انسانی کرب و اضطراب کا دوسرا نام ہے میرے دل و دماغ میں ایک حساس کیفیت جنم لے رہی ہے اس سے پہلے میں نے زندگی کو خوبصورت وحسین تمناؤں کا مرکز کہا تھا۔ جب زندگی کے تمام دکھ درد تمام آہیں، کرب و اضطراب سمٹ کر شہلا کی آنکھوں میں سما گئے تھے۔

میرے دوست شہلا کو دیکھ کر کہا کرتے تھے "یار تم بہت لکی ہو" "اتنی اچھی بیوی پائی ہے" "سنگ مرمر کا ٹکڑا ہو جیسے" "ٹھیک کسی ناول یا افسانے کی خوبصورت ہیروئن کی طرح"۔ میں اُن کے اس ریمارک پر بہت خوش ہوتا لیکن اتنا ضرور کہتا کہ میں نہیں سمجھتا کہ شہلا کسی افسانے یا ناول کی خوبصورت ہیروئن ہے۔ میں تو صرف یہ سمجھتا ہوں کہ وہ میری زندگی کی حسین ساتھی۔ میری غم خوار، میرے تمام دکھوں کا مداوا افسانے یا ناول کی ہیروئن تو بدصورت بھی ہو سکتی ہے لیکن میری یہ زندگی جو ایک ناول کی طرح ہے اُس ناول کی خوبصورت ہیروئن شہلا ہی ہے۔

آج مجھے شہلا کے ساتھ گذرے ہوئے وہ لافانی لمحات یاد آرہے ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ اس کہانی کو کہاں سے شروع کروں سوالات کا سلسلہ اُن کا بکھراؤ ذہن پر بُری طرح مسلط ہے۔

"کیا وہاں تھے؟" ہاں جب میں رمیش کو لے کر اُس رات اپنے گھر پہونچا تھا۔

ہاں ٹھیک !

... ...

جیسے ماضی کے لافانی لمحات میری آنکھوں کے سامنے رقص کر رہے ہیں۔ میرے دل و دماغ کی فضاؤں میں گردش کر رہے ہیں۔

آج ... ذہن ... سوالات کے ٹکراؤ کھول ...

جنم ... آج سے پہلے کیوں نہیں ہوا ؟

... آج میرے اندر کی خودغرضی دوبارہ جنم لے رہی ہے آج میرا ... سنگار ہو رہا ہے

کیا میں اس جنم لینے والی خودغرضی کے ٹکڑے ٹکڑے کردوں ؟

نہیں۔

... اس خودغرضی کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کر سکتا ؟

میں اس خودغرضی کو کسی بھی قیمت پر اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ میری اس خودغرضی سے میرے ماضی اور ماضی سے مستقبل کی تمام تر اُمیدیں وابستہ ہیں۔ ماضی کا مستقبل سے بہت عمیق رشتہ ہے ماضی کے اُن عظیم ترین لافانی لمحات کو دوبارہ جنم لینا ہی چاہیئے۔

اسی میں زندگی کا راز مضمر ہے

اُس رات جب میں رمیش کو لیکر اپنے گھر گیا تو شہلا کو گھر میں نہ پاکر اور ایک خط جو وہ میرے نام چھوڑ گئی تھی پڑھ کر میرا دل بیٹھ گیا تھا میری تمام امیدوں پر شہلا نے پانی پھیر دیا تھا آج بھی میں اپنا منھ پیٹ رہا ہوں۔ تھپڑوں کا سلسلہ جاری ہے اور اُن تھپڑوں کی آواز سے ایک کہانی جنم لے رہی ہے میرے ... مسز انتم سنگار

ہو رہا ہے اور دوسرا جنم ہو رہا ہے۔ میرا دوسرا جنم ہونا ہی چاہیئے۔ مجھے اُس خط کا ایک لفظ آج بھی یاد ہے جو شہلا میرے نام چھوڑ گئی تھی۔ اُس نے لکھا تھا۔

ڈیئر۔

" آج میں تم کو چھوڑ کر اپنے گھر جا رہی ہوں!"

کیوں؟

یہ تم خود اپنے [illegible] سے پوچھو۔ مجھے امید ہے کہ جب تم یہ سوال اپنے آپ سے پوچھو گے تو تم کو اس کا جواب خود بخود مل جائے گا۔ اور اگر نہیں پوچھو گے تو لو مجھ سے سنو۔

تم نے اپنا ضمیر فروخت کر دیا ہے۔ یہ میری ایک پالیسی تھی جو میں تمہارے جال میں نہیں پھنسی ورنہ آج میں جس شان سے زندہ ہوں نہ رہتی اور ٹھیک میں اُسی طرح خودکشی کر لیتی جس طرح اور شریف لڑکیاں کر لیتی ہیں۔ مجھے زندگی سے پیار ہے اور اپنی زندگی سے زیادہ تمہاری زندگی سے کیونکہ تمہاری زندگی میری زندگی ہے

تم کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ ایک بار جب تم میرے لئے اعلیٰ درجے کی قیمتی ساریاں، زیورات کے سیٹ اور نہ معلوم کتنے قیمتی ملبوسات لائے تھے تو میں تم پر کتنی ناراض ہوئی تھی۔ تم کو یاد ہوگا کہ میں نے کہا تھا کہ ہماری تنخواہ اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنی حد سے آگے بڑھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے ایک مالدار گھرانے میں اپنی زندگی کے دن گذارے اچھے لباس زیب تن کئے۔ اعلیٰ کھانے کھائے لیکن تب اور اب میں فرق ہے۔ اب میری شادی تمہارے ساتھ ہو چکی ہے۔ ہم کو آنے والی زندگی میں نہ معلوم کتنے اہم مسائل سے نپٹنا پڑے گا۔ انسان کی جتنی چادر ہو اُتنا ہی پیر پھیلانا چاہیئے۔ تم میرے ماضی میں مت جھانکو۔ اپنی آمدنی کو دیکھو اور اس حساب سے زندگی کو گزارنے کا طریقہ بناؤ۔ لیکن تم نے ہمارے اس خلوص کو محض بکواس سمجھا اور اپنی من مانی

کرتے رہے [illegible] آگے [illegible] اس موضوع [illegible] تم ایک ہنگامہ [illegible] اپنی [illegible] خاموشی اور [illegible]

[illegible] کی جس تاریخ کے بعد [illegible] پھر پندرہ کے بعد [illegible] پہنچی کہ دس اور پانچ تاریخوں تک پہونچ گئی [illegible] سے غبن کیا تم [illegible] دیکھا کہ تمہارے آپ [illegible] تمہارے [illegible] دونوں [illegible]

میرا [illegible]

وہ جسم ایک [illegible] اور [illegible] تمہارے دوستوں کے لئے [illegible] تھی ایک [illegible] بھرے [illegible] پھسل گئی [illegible] عورت [illegible]

[illegible] ہو گئے تو تم نے ان [illegible] یہ کہ آج مجھے ایک گمنامی کی زندگی سے [illegible] زہر [illegible] آج تم [illegible] رات بھر کے لئے فروخت کر دیا تھا

[illegible] تم گھر [illegible] سمجھ کر [illegible] کے لئے نہیں [illegible] ہے کہ تم ایک دن ضرور واپس آؤ گے

[illegible]

نہ معلوم ہوگا کہ میں اس واقعہ کے پس منظر میں تم کو چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ کیونکہ میں تمھاری بیوی ہوں۔ اور تمھاری زندگی ہوں

فقط

تمھاری شہلا

میں نے خط پڑھ کر بے دلی میں رمیش کی طرف بڑھا دیا۔ رمیش نے خط پڑھ کر مجھے نفرت سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے ٹپک رہے تھے اس نے ایک زور کا تھپڑ میرے منھ پر مارا اور خط پھینک کر باہر چلا گیا۔ یہ میری دوسری شکست تھی اس دن مجھے یہ شارت ... ہوا کہ برائی بھی ... برائی پر اس طرح فتح پا سکتی ہے۔

شہلا کے بعد میں تنہا ہو گیا۔ میرا کوئی ساتھی نہیں ہے خلوص و محبت سے بھرے ہوئے مشورے دینے والا کوئی نہیں اب کوئی نہیں ہے جو میرے معاملات میں دخل اندازی کرے لیکن میں نے اس سے پہلے اس پر کیوں نہیں غور کیا۔ میں نے اس وقت اس بات پر کیوں نہیں غور کیا تھا جب میرے دل میں ایک گندے اور گھناؤنے خیال نے جنم لیا تھا جب میں نے شہلا کو رمیش کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔

آج مجھے شہلا صرف اس لئے یاد آ رہی ہے کہ آج ہی میں ایک حادثے سے دوچار ہوا ہوں میں کتنا خود غرض انسان اندر سے کتنا خود غرض ہو گیا ہے!

شہلا سے پہلے میں کبھی جنس لطیف کے پاس نہیں گیا تھا اس لئے شہلا ہی میری زندگی کی وہ پہلی عورت تھی جس نے میری خواہشات کی تکمیل کی تھی۔

میں آج جنسی طور پر مضطرب ہو گیا تھا۔ جنس لطیف کی تلاش میں میرے قدم غیر ارادی قوت کے ساتھ اس پیشہ ور لڑکی کے دروازے پر پہونچ گئے تھے جس نے ایک عجیب سی جادوئی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا تھا۔ جو بے حیائی کے ساتھ سگرٹ کے کش لے رہی تھی۔ جو میرے سامنے نیم برہنہ ... کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ جب کہ میرے ... سے شراب کی بو آ رہی تھی۔

میرا دماغ شراب اور ناپاک جسم کی بدبو سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں برائی اور غلاظت کے گہرے غار میں اترتا چلا جا رہا تھا کہ ایسے میں شہلا میرے ذہن پر روشنی کا مجسم پیکر بن کر اتری مجھے اس کے ساتھ گذری ہوئی حسین راتیں یاد آنے لگیں۔ جس کے منھ اور جسم سے لطف و خوشگوار خوشبو آتی تھی جو میرے دل و دماغ کی رگوں کو ... کرتی تھی۔ لیکن یہاں تو اس کے برعکس۔ یہ ... ناپاک جسم کی ناپاک غلاظت اپنے ننگے پن کا مظاہرہ کر رہی ... منظر بھی میرے لئے نیا تھا اور پہلا واقعہ تھا ... اس منظر کو برداشت نہ کر سکا۔ ... نے جیب سے ... کا ایک نوٹ نکال کر اس لڑکی کے ننگے جسم پر ڈال دیا اور باہر چلا آیا۔

اب میں شہلا کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں ... تاریکیوں کے عمیق غار سے جنگ کر کے نکل آیا ہوں شہلا واقعی روشنی کا پیکر ہے۔ میں اس لئے شہلا کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں کہ مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔ کیوں کہ وہ ہی میری برائیوں کا انتم سنسکار کرے گی

سیّد نواب حیدر نقوی

ننھّا مصوّر

لتا نے جھانک کر دیکھا.

پرکاش اسٹوڈیو میں کینوس پر برش اور رنگوں سے الجھا ہوا تھا۔ کمرہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ دسمبر کی سرد اور خون منجمد کر دینے والی شام تھی۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ لتا نے مفلر کو کانوں میں لپیٹا اور آہستہ سے اسٹوڈیو میں داخل ہوگئی۔ کمرہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

کھٹ کی آواز نے پرکاش کو چونکا دیا لتا ہیٹر کے سوئچ کے پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

پرکاش نے مسکراتے ہوئے برش ڈلس پلیٹ میں رکھ دیا اور انگڑائی لینے کے انداز میں دونوں ہاتھ پھیلا دئے۔ لتا پھولوں سے لدی ٹہنی کی طرح لچکتی ہوئی اس کی آغوش میں سما گئی۔

ایسی بھی خود فراموشی کیا کہ آپ نے ہیٹر تک روشن نہیں کیا۔ دیکھئے باہر کتنی سردی پڑ رہی ہے۔ لتا اس کے گاؤن کے بٹن بند کرتے ہوئے بولی۔

سردی! پرکاش نے مسکرا کر کہا کیسی سردی! کیا باہر سردی پڑ رہی ہے!

لتا نے اسے چھو کر دیکھا۔ پرکاش کا جسم گرم تھا۔

کمال ہے، لتا نے کہا واقعی آپ کو چھو کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سردی پڑ ہی نہیں رہی ہے!

پرکاش نے اسے آغوش میں کھینچ لیا۔

ڈارلنگ اس تصویر کی طرف دیکھو، اس نے کینوس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جانتی ہو میں کیا بنا رہا ہوں۔ یہ ہماری اور تمہاری اس وقت کی یادگار ہے جب ہم اور تم پہلی بار ملے تھے۔

پرکاش کی آواز میں ارتعاش تھا۔

اس لمحہ کی جاں سوز گرمی آج بھی میری رگ رگ میں رچی ہوئی ہے کل چغتائی آرٹ ایسوسی ایشن کی جانب سے تصاویر کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ مجھ سے بھی ایک تصویر بھیجنے پر اصرار کیا گیا تھا سو چا کیوں نہ اسی یادگار کو بھیجوں۔ اب رہی ٹھنڈک کی بات پرکاش کی آنکھوں میں نشہ تھا۔ ٹھنڈک تو وہ محسوس کرے جس کو تمہاری ایسی رفیق حیات کی محبت کی گرمی نہ میسر ہو۔

پرکاش کے ہاتھوں کی گرفت کی سختی کو لتا نے اپنے شانوں پر محسوس کیا۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا بجلی کی ایک لہر تھی جو اسے پرکاش کی آنکھوں سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے سردی کا کبھی وجود ہی نہیں تھا۔

شام کی چائے کے بعد پرکاش پھر تصویر مکمل کرنے میں مشغول ہوگیا وہ ایک کامیاب مصور تھا نہ صرف ایک کامیاب مصور بلکہ ایک کامیاب انسان بھی۔ روپیہ۔ اولاد۔ خوبصورت و خوب سیرت رفیقۂ حیات، شہرت و دلی سکون۔ ان ہی چیزوں کو تو حاصل کر کے ایک انسان کامیاب انسان کہلاتا ہے۔

ڈیڈی! اس نے پلٹ کر دیکھا، اس کا پانچ سالہ بچہ آکاش کھڑا تھا۔

کھوگڈ ے کیا بات ہے؟ پرکاش نے پیار سے کہا

ہم کو بھی ایک اچھی سی تصویر بنا دیجئے۔ کل میرے فرینڈ شیام کا برتھ ڈے ہے۔ میں اسے پریزنٹ کروں گا۔

اچھی بات ہے بیٹے۔ لیکن دیکھو آج تو میں مشغول ہوں۔

کل صبح میں تمھیں ایک اچھی سی تصویر بنادوں گا۔ پرکاش نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا

'نہیں'، گڈو نے ٹھنکتے ہوئے کہا۔ ہمیں ابھی بنادیجئے کل تو میں اسے پریزنٹ کردوں گا۔

'دیکھو بیٹے۔ کل مجھے یہ تصویر نمائش میں بھیجنی ہے اور اگر کل یہ نہ جاپائی تو جانتے ہو کیا ہوگا؟

'کیا ہوگا۔ گڈو نے معصومیت سے پوچھا

'پھر ہم کو بہت سے روپے نہ مل پائیں گے اور تمھیں بھی بہت سی ٹافیاں نہ مل سکیں گی۔ پرکاش نے اسے لالچ دیا۔

'نہیں'، گڈو نے ضد کی۔ 'ہمیں ٹافیاں نہیں چاہیئے' مجھے تصویر چاہیئے۔ ابھی ابھی اس نے زمین پر پیر پٹختے ہوئے کہا۔

'بری بات بیٹے ضد نہیں کرتے کل بنادیں گے ہم ضرور۔

'اچھی بات ہے' گڈو روٹھ گیا۔ ہم خود بنائیں گے۔

'ہاں ہاں یہ ٹھیک ہے۔ یہ لو برش اور رنگ اور اس اسٹینڈ پر جاکر بناؤ۔ پرکاش نے ایک گوشے میں رکھے ہوئے اسٹینڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن تم بناؤ گے کیا۔

آپ سے کیا مطلب' گڈو نے کہا۔ ہم خود سے بنائیں گے۔ اور وہ بگڑ کر اسٹینڈ کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب پرکاش نے گڈو کی طرف دیکھا تو اس کے سامنے ڈرافٹ پیپر پر ایک گلاب کا پھول بنا ہوا رکھا تھا اور وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے کینواس پر گراف بنانے میں مشغول تھا۔ گڈو نے اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ لیا۔

'جائیے ہم یہ نہیں بنائیں گے۔ گڈو نے روٹھے ہوئے لہجہ میں کہا۔ آپ نے اسے کیوں دیکھا' اور گلاب کے پھول کا کاغذ پھینک دیا۔

پرکاش ہنسنے لگا۔ پھر کیا بناؤ گے' اپنی شکل؟

جی ہاں۔ آپ سے مطلب جائیے آپ اپنی تصویر بنائیے۔ گڈو اس کو دونوں ہاتھوں سے چھپاتے ہوئے بولا۔

پرکاش ہنستا ہوا اپنے اسٹینڈ کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے تصویر کو کاغذ میں لپیٹتے ہوئے جب گڈو کی طرف دیکھا تو اسے کینوس پر برش اور رنگوں سے کوئی تصویر بنانے میں منہمک پایا۔

'کہو دوست کیا بنارہے ہو'

ہم نہیں دکھاتے گڈو نے جلدی سے تصویر کینوس اسٹینڈ پر سے اتارلی۔ پھر اس نے اسے کاغذ میں لپیٹ لیا۔

لاؤ بھئی میں بنادوں پرکاش نے کہا۔

نہیں نہیں۔ آپ رہنے دیجئے۔ گڈو کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ 'مجھے نہیں چاہئے' اور پھر وہ اپنی تصویر لیکر اسٹوڈیو کے باہر بھاگ گیا۔

پرکاش مسکرانے لگا۔

دوسرے دن جب شام کو چغتائی ہال پہونچا تو انجمن کے سکریٹری نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ پرکاش صاحب آپ کی تصویر نہیں آئی!

'اچھا! پرکاش نے متعجب ہوکر کہا۔ بات یہ ہے سکریٹری صاحب میں صبح سے گھر سے باہر نکلا ہوا ہوں۔ نوکر سے کہہ دیا تھا کہ تصویر پہونچادینا۔ معلوم ہوتا ہے اس کے ذہن سے اتر گیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں ابھی ٹیلی فون کئے دیتا ہوں۔

تھوڑی دیر میں پورا ہال شہر کے معززین اور آرٹسٹوں سے بھر گیا۔ سکریٹری نے مقررہ کارروائی کے بعد ججوں کے نام پڑھ کے سنائے۔ یہ پانچ چیدہ آرٹسٹ تھے جن کی (تجریدی آرٹ) پر اتھارٹی مسلم تھی۔ انھوں نے اپنی اپنی کرسیاں سنبھالیں اور میز پر مقابلہ کے لئے آئی ہوئی تقریباً پچاس تصویروں کا ڈھیر لگ گیا۔

ایک کے بعد ایک تصویر فلم کے فیتہ کی طرح سرکتی گئی۔ سب کی نظریں ججوں پر مرکوز تھیں۔ آخر کار ان تصویروں میں سے تین تصویریں منتخب کرلی گئیں۔ ججوں نے ایک بار پھر ان تینوں تصویروں کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر ایک تے دوسرے سے کھسر پھسر

کی۔ پھر کچھ نوٹ کرتے ہوئے صدر کھڑا ہوگیا۔

ہال میں خاموشی چھاگئی۔

"معزز حاضرین" جیسا کہ اس نے نپے تلے لہجے میں کہا "سب سے پہلے میں اپنی طرف سے اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے منتظمین کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ہمیں اس مقابلہ کا جج مقرر کرنے کی عزت بخشی۔ اب میں آپ کے سامنے وہ تین تصویریں پیش کرنا چاہتا ہوں جو میرے اور میرے ساتھیوں کے فیصلے کے مطابق اس مقابلہ میں اول دوم و سوم انعام پانے کے مستحق ہیں۔

اس نے تیسرے نمبر کی تصویر حاضرین کو دکھاتے ہوئے کہا "یہ شری خالد کی بنائی ہوئی ہے"

"یہ دوسری تصویر آرٹ اسکول کے پرنسپل شری شرما کی بنائی ہوئی ہے۔ اور یہ پہلی تصویر" انھوں نے تصویر دکھاتے ہوئے کہا "شری پرکاش کی بنائی ہوئی ہے۔ جن کے تعارف کی آپ لوگوں سے ضرورت نہیں ہے وہ محتاج تعارف نہیں ہیں۔"

سارا ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔

پرکاش کا سر چکرا گیا اور وہ کرسی سے گرتے گرتے بچا سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئیں جج نے بڑی نفاست سے گڈو کی بنائی ہوئی تصویر پکڑ رکھی تھی۔ ٹیڑھے میڑھے خانوں پر تین خطوط مختلف رنگوں میں کھنچے تھے۔ اس کے علاوہ دو آنکھیں تھیں جن میں سے ایک کے نیچے روشنائی کا ایک بڑا دھبہ پڑا تھا۔

"میں اور میرے ساتھیوں کے فیصلہ کے مطابق پہلے انعام کی مستحق تصویر۔" انھوں نے ڈرامائی انداز میں حاضرین کی جانب دیکھا۔

"ہمارے ججمنٹ کے مطابق،" پرکاش کو جج صاحب کی آواز دور کسی کنویں سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ "شری پرکاش کی تصویر اس مقابلہ میں پہلا انعام پانے کی مستحق ہے۔"

پورا ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔

"دیکھیے،" جج صاحب نے تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔ "اس تصویر میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آرٹسٹ نے کم سے کم خطوط میں فنا اور حیات کا فلسفہ سمو دیا ہے"

پرکاش کرسی پر آگے کھسک آیا

"یہ سرخ رنگ سے کھنچا ہوا خط حیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور یہ درمیانی کئی رنگوں سے کھنچا خط زندگی کی کشمکش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور یہ خانے :"

پرکاش نے دونوں ہاتھوں سے کرسی کے ہتھوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"اور یہ ٹیڑھے بکڑے خانے، حیات سے قبل اور فنا کے بعد کی ان گتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کو ذہن انسان آج بھی حل کرنے سے قاصر ہے یہ آنکھیں اسی حیرانی کو تعبیر کرتی ہیں میں شری پرکاش کو ان کی اس کامیاب تخلیق پر مبارکباد دیتا ہوں اور ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ یہاں آکر پہلے انعام کی رقم پانچ ہزار روپیہ کا چیک قبول فرمائیں۔"

تالیوں کے شور میں پرکاش پسینہ میں بھیگا لڑکھڑاتا ہوا ڈائس کی جانب جا رہا تھا تو فوٹوگرافر اپنے کیمرے درست کر رہے تھے!!

ڈاکٹر سلام سندیلوی

پریم چند کے ناول "گئودان" پر ایک نظر

"گئودان" (تصنیف ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۵ء) پریم چند کا آخری ناول ہے۔ اس کے بعد انھوں نے "منگل سوتر" لکھنا شروع کیا تھا مگر وہ ادھورا رہ گیا۔ کیونکہ ۸ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ان کا انتقال ہو گیا ایسی صورت میں "گئودان" ہی کو ہم ان کی آخری تخلیق قرار دیں گے۔ یہی نہیں کہ زمانے کے اعتبار سے "گئودان" پریم چند کا آخری ناول ہے بلکہ فن کے اعتبار سے بھی یہ ان کی آخری منزل ہے۔ پریم چند نے اس سے بہتر کوئی ناول نہیں لکھا۔ یہ حقیقت ہے کہ پریم چند نے اس ناول میں اپنی ساری زندگی کا مشاہدہ اور تجربہ سمو دیا ہے۔ "میدان عمل" اور "گئودان" دونوں ان کی آخری عمر کی کاوشات ہیں۔ مگر "میدان عمل" کے پلاٹ کا تعلق دتی شہر سے ہے اگرچہ اس میں بھی کسانوں کے مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے مگر "گئودان" کا پلاٹ تو بالکل گاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ گاؤں لکھنؤ کے گرد و نواح میں آباد ہے۔ "گئودان" میں دیہات کی اس قدر واضح جھلکیاں ملتی ہیں کہ ہم اس ناول کو ہندوستان قرار دے سکتے ہیں۔ اگر کوئی پریم چند کے ہندوستان کا مطالعہ کرنا چاہے تو اس کو "گئودان" کے مطالعہ سے کافی مدد ملے گی۔ اور اگر کوئی "گئودان" کا مطالعہ کرے تو اس کی نظروں میں پریم چند کے عہد کا ہندوستان رقص کرنے لگے گا

پلاٹ

"گئودان" کے پلاٹ کی تعمیر ایک گاؤں کے سنگ و خشت سے ہوئی ہے۔ جس کا نام بیلاری ہے۔ اس ناول کا ہیرو ہوری اس گاؤں کا باشندہ ہے، جو اپنی بیوی دھنیا اور اپنے لڑکے گوبر اور اپنی دو لڑکیوں سونا اور روپا کے ساتھ رہتا ہے وہ ایک غریب کسان ہے جس کی بساط میں صرف تین بیگھے زمین ہے۔ یہی اس کا ذریعہ معاش ہے۔ اگرچہ وہ گاؤں کے زمیندار رائے صاحب امرپال سنگھ کا منظورِ نظر ہے۔ تاہم اس کی زندگی بڑی مصیبت سے کٹتی ہے

ہوری کی ایک دلی تمنا یہ ہے کہ وہ اپنے دروازے پر ایک گائے باندھے مگر اس کے خریدنے کے لیے اس کے پاس روپے نہیں ہیں۔ اس لیے بھولا اہیر سے وہ اس کی گائے ۸۰ روپے میں ادھار خرید لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں وہ بھولا کا دوسرا بیاہ کرا دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ بھولا اپنی گائے ہوری کے حوالے کر دیتا ہے مگر اس کا بھائی ہیرا اس سے حسد کرنے لگتا ہے اور گائے کو زہر کھلا دیتا ہے جس کی بنا پر گائے مر جاتی ہے۔ پھر ہیرا گاؤں چھوڑ کر کہیں بھاگ جاتا ہے

بھولا کے یہاں سے گائے لانے کا کام گوبر کے سپرد تھا گوبر اس لین دین میں بھولا کی بیوہ لڑکی جھنیا سے آنکھ لڑاتا ہے اور پھر اس کو اپنے گھر لے آتا ہے۔ مگر اس کو یہ خوف ہے کہ ہوری اور دھنیا اس کی جان کھا جائیں گی۔ اس لیے وہ طے کر لیتا ہے کہ وہ لکھنؤ جا کر جب کافی روپیہ پیدا کرے گا تو اپنے گھر آئے گا۔ اس وقت اس کے ماں باپ اس کی خطا کو معاف کر دیں گے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی دولت دیکھ کر اس کی پوجا شروع کر دیں گے۔

جھنیا جب ہوری کے گھر آئی تو ہوری اور دھنیا نے پہلے تو اس کو برا بھلا کہا۔ مگر پھر اپنے گھر میں رکھ لیا۔ یہ بات اس کی برادری کے لوگوں کو ناگوار معلوم ہوئی۔ چنانچہ جھنگری سنگھ، داتا دین، پٹیشوری پرشاد

جھوری لکھے رلسم وغیرہ نے پنچایت کی اور اس سے تاوان وصول کیا۔
اس طرح ہوری کی ساری فصل پنچوں کے یہاں پہنچ گئی۔ اب ہوری
دھنیا، جھنیا، سونا اور روپا دوسرے کسانوں کے کھیت میں کام
کر کے روزی کماتی ہیں اسی دوران میں جھنیا کے یہاں بچہ بھی
ہو جاتا ہے۔

چونکہ گوبر بھولا کی بیوہ لڑکی جھنیا کو بھگا لایا ہے اس لیے بھولا
اپنی بے عزتی محسوس کرتا ہے اور ہوری سے گائے کے روپے
طلب کرتا ہے۔ روپے نہ ملنے پر وہ اس کے بیل کھول لے جاتا ہے
اب ہوری کسانی سے بھی مجبور ہو جاتا ہے

کچھ عرصہ کے بعد گوبر لکھنؤ سے روپیہ کما کر بیلاری آتا ہے
اور گھر بھر کے لیے کپڑے اور تحفے لاتا ہے۔ سب خوش ہو جاتے ہیں
جب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں کے لوگوں نے اس کے باپ کو
بہت تنگ کیا تو وہ روپے کے نشہ میں چور ہو کر ہر ایک سے باز پرس
کرتا ہے۔ ہولی کے موقع پر سوانگ بنا کر پنچوں سے انتقام لیتا ہے
ہے۔ کچھ دن رہنے کے بعد گوبر اپنی بیوی اور بچے کو لیکر لکھنؤ واپس
جاتا ہے اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ ہوری کی پہلی لڑکی جوان ہوگئی اب ہوری کو
اس کی شادی کی فکر تھی۔ ہوری نے قرض لیکر سونا کی شادی سوناری
گاؤں کے کسان متھرا سے کردی۔ اس بار سے وہ سبکدوش تو ہو گیا
مگر اس پر قرض کا بوجھ اور بڑھ گیا۔

کچھ دنوں کے بعد روپا بھی جوان ہوگئی اور ہوری کو اس
کی شادی کی فکر بھی ستانے لگی مگر اب ہوری کو قرض ملنا بھی مشکل
تھا۔ کیونکہ پچھلا قرض ادا نہیں ہوا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس پر تین
سال کا لگان باقی تھا۔ اس لیے اس کی تین بیگھہ زمین کی بے دخلی
ہونے جا رہی تھی۔ ایسے موقع پر داتا دین نے صلاح دی کہ
روپا کی شادی رام سیوک سے کردی جائے تو وہ دو سو روپیہ
پیشگی دے دے گا۔ اس روپے سے وہ کھیتوں کا لگان دے کر بے
تاکہ پرکھوں کی نشانی بچ جائے۔ رام سیوک بڑا با اثر اور مالدار شخص
تھا مگر ہوری کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ رام سیوک اس سے چند
ہی سال چھوٹا تھا اس لیے روپا کا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔
لیکن روپا کی شادی بھی ضروری تھی مجبوراً اس نے روپا کی شادی
رام سیوک سے کردی اور اپنی زمین بے دخل ہونے سے بچالی۔

اب ہوری تمام کاموں سے فرصت پا چکا ہے۔ اس کی زمین
اس کے قبضہ میں ہے تاہم کوئی گائے اس کے پاس نہیں ہے۔
وہ اسی تمنا کو پوری کرنے کے لیے دن رات مزدوری کرتا ہے
مگر بدقسمتی سے گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں ہوری کو لو لگ
جاتی ہے اور دھنیا کی تمام کوششوں کے باوجود اس کی روح اس
کے جسم سے پرواز کر جاتی ہے "گئودان" میں ہوری کی یہی دکھ
بھری کہانی ہے جو ۶۹۷ صفحات پر لکھی ہوئی ہے۔

دراصل "گئودان" کے پلاٹ کا تعلق بیلاری گاؤں سے
ہے۔ اور اس ناول کی ساری کہانی اسی کے گرد گھومتی ہے۔
مگر ہوری کی داستان نامکمل رہے گی اگر اس کے تعلق اس کے زمیندار
سے ظاہر نہ کیا جائے حقیقت یہ ہے کہ "گئودان" کے پلاٹ کو
آگے بڑھانے میں رائے صاحب اگر پال سنگھ کا بھی ہاتھ ہے
رائے صاحب سیمری گاؤں کے بڑے جاگیردار ہیں۔ انھوں نے
کونسل کی ممبری ترک کرکے ستیہ گرہ میں حصہ لیا تھا۔ اس لیے گرد و نواح
میں بہت مقبول ہو گئے تھے چونکہ بہت فراخ دل اور رئیسانہ مزاج
کے مالک تھے۔ اس لیے مختلف لوگ ان کی تعریف میں لگے رہتے
تھے مثلاً اونکارناتھ ایڈیٹر "بجلی" شیام بہاری تنکھا وکیل مسٹر بی،
مہتا پروفیسر یونیورسٹی، مسٹر کھنا بینک منیجر، مس مالتی لیڈی ڈاکٹر
اور مرزا خورشید وغیرہ ان کے یہاں دعوت میں مدعو رہتے تھے۔
دسہرے کے زمانے میں ہوری بھی رائے صاحب کے یہاں جشن کے
موقع پر مالی کا کام کرتا تھا غرضیکہ رائے صاحب کی زندگی بہت
عیش و عشرت کے ساتھ گزرتی تھی۔ رائے صاحب کو بعد میں محسوس
ہوا کہ ان کے احباب مخلص نہیں ہیں بلکہ مطلب کے [illegible]
لوگ ہیں کیونکہ جب ان پر مصیبت پڑی [illegible] کا ساتھ
نہیں دیا۔

رائے صاحب کے سامنے تین اہم مسائل تھے لڑکی کی شادی

کرنا جس میں ایک لاکھ کا خرچ تھا۔ دوسرے کونسل کی ممبری کے لیے الیکشن لڑنا۔ اب کی ان کا مقابلہ راجا سورج پرتاپ سنگھ سے تھا، جو اُن سے زیادہ باحیثیت اور باوقار تھے۔ تیسرے اپنے سالے کی ریاست پر قبضہ کرنا۔ ان تینوں کاموں کے لیے کافی روپے کی ضرورت تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنے دوست کھنا بینک مینیجر سے قرض مانگا مگر انھوں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ اسی دور ان میں کھنا کی مل میں آگ لگ گئی اور وہ تباہ ہو گئے۔

رفتہ رفتہ رائے صاحب کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ انھوں نے دھوم دھام سے لڑکی کی شادی بھی کی کونسل کے ممبر بھی ہو گئے۔ اور مقدمہ بھی جیت گئے مگر بڑھاپے میں ان کی قسمت میں ایک اور دکھ لکھا تھا۔ وہ اپنے لڑکے رودر پال کی شادی راجا سورج پرتاپ سنگھ کی لڑکی سے کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ راجا صاحب آپ کے بعد ان کے مطیع ہو گئے تھے مگر رودر پال نے اس شادی سے انکار کر دیا۔ وہ مالتی کی بہن سروج سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ سروج کو لے کر انگلینڈ چلا گیا۔ اور رائے صاحب اپنا سر پیٹ کر رہ گئے۔

اس کے بعد رائے صاحب پر ایک اور مصیبت آئی۔ ان کی لڑکی مینا کشی اور اس کے شوہر دگ وجے سنگھ میں تعلقات خراب ہو گئے۔ ان صدمات کو رائے صاحب برداشت نہ کر سکے اور وہ بیمار ہو گئے۔

پریم چند نے "گئودان" کے پلاٹ کی تعمیر میں دیہات سے مدد لی ہے۔ اور اس میں ہوری کی غم زدہ داستان پیش کی ہے۔ مگر اس داستان کو تلخ تر بنانے کے لیے انھوں نے رائے صاحب کی عیاشانہ اور رئیسانہ زندگی کا بھی نقشہ کھینچا ہے۔ ایک طرف تو ہوری دانے دانے کو محتاج ہے۔ دوسری طرف رائے صاحب اور ان کے احباب مس مالتی کی صحبت میں شراب پی رہے ہیں۔ اور روپیہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔ اس تضاد نے "گئودان" ناول میں اثر اور زور پیدا کر دیا ہے۔ پریم چند نے "گئودان" میں کسانوں اور تعلقداروں کے حالات کی بے مثل عکاسی کی ہے۔

کردار نگاری

ہوری

"گئودان" کا ہیرو دراصل ...... ہوری ہے۔ ہوری قدیم داستانوں کے ہیرو کی طرح تمام خوبیوں سے آراستہ نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سی خامیاں بھی ہیں۔ پریم چند کی حقیقت پسندی کا یہ رجحان قابلِ تحسین ہے۔ انھوں نے ہوری کو نہ رحمن بنا کر پیش کیا ہے اور نہ شیطان کے روپ میں دکھایا ہے بلکہ وہ اس کو ایک انسان بنا کر منظرِ عام پر لائے ہیں۔ جس میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی۔ ...... طرزِ منفی، پریم چند کا ہیرو پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ہیرو سے جدا ہے۔

ہوری تنگی اور مفلسی کی زندگی گزار رہا ہے۔ اس لیے وہ اپنی زندگی سے مایوس ہے۔ وہ زمیندار کے یہاں جاتے وقت اپنی بیوی دھنیا سے لاٹھی سنبھالتے ہوئے کہتا ہے

"ساٹھ تک پہنچنے کی نوبت نہ آئے گی دھنیا۔ اس سے پہلے ہی چل دیں گے"

یہ جملہ ہوری کی مایوسی پر مکمل طور سے روشنی ڈالتا ہے اور اس کے دل کی گہرائیوں کا دکھ ظاہر کرتا ہے۔

ہوری غریب ہونے کے علاوہ ایک سیدھا سادا کسان ہے۔ گاؤں والے بھی اس کو بہت سیدھا سمجھتے ہیں۔ جب بھولا اس کے بیل لے کر چلا تو داتا دین اور پٹیشوری نے کہا کہ سیدھا آدمی سمجھ کر بیل کھول لیے اگر وہ فوجداری میں دعویٰ کر دے تو پھنس جاؤ گے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہوری گاؤں والوں کی نظر میں ایک نیک سیرت انسان تھا۔

ہوری رام ایک نہایت غریب کسان ہے وہ ادھیڑ عمر کا ہے۔ پریم چند کا ایک بیان اس کی عمر پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

" ہوری نے اپنے جھری پڑے ماتھے کو سکیڑ کر کہا، تجھے سربت پانی کی پڑی ہے، تجھے یہ پھکر ہے کہ دیر ہو گئی تو مالک سے بھینٹ نہ ہوگی۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہوری کے ماتھے پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ ہوری جب زمیندار کے یہاں جا رہا تھا تو اس نے اپنی بیوی سے مذاق کیا۔ اس وقت لفوا، بہر بم چند " ہوری کے گہرے، سانولے، پچکے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی" یہ جملہ بھی اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ مفلسی اور پیری کی بنا پر ہوری کے گال پچک گئے تھے۔

اگرچہ ہوری پر اب پیری کا دھندلکا چھا گیا ہے مگر عہد جوانی میں وہ ایک بانکا اور رنگین انسان تھا وہ گاؤں کی ایک عورت دلاری پر عاشق تھا۔ چنانچہ ہوری سے دلاری خود کہتی ہے۔

" تم کیا کسی سے کم نٹ کھٹ تھے۔ دن میں پچاسوں بار کسی نہ کسی بہانے سے میری دکان پر آیا کرتے تھے۔ پر بن نے تاکا تک نہیں؟"

ہوری جواب دیتا ہے۔

" یہ تو تم جھوٹ بولتی ہو بھابھی، میں بنا کچھ رس لئے تھوڑا ہی آتا تھا۔ چڑیا ایک بار پرچ جاتی ہے تبھی دوسرے آنگن میں آتی ہے۔"

ہوری اور دلاری کے عشق کی خبر اس کی بیوی دھنیا بھی ہے۔ جب ہوری دلاری سے اپنی لڑکی سونا کے لیے قرض لینے آیا تو دھنیا نے ہوری سے کہا " یہ کیوں نہیں کہتے کہ بہانے دو گال ہنسنے بولنے گیا تھا۔ بوڑھے ہو گئے پر بات نہ گئی؟" یہ سن کر ہوری نے جواب دیا۔ " تو تو دھنیا ماں کی سی باتیں کرنے لگتی ہے، میرے جیسے پھٹے حالوں سے ہنسے بولے گی۔ سیدھے منہ بات تو کرتی نہیں؟"

ان سارے مکالموں سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہوری کا رجحان دلاری کی طرف تھا اگرچہ کہ یہ رجحان کبھی باقاعدہ محبت اور عشق میں تبدیل نہیں ہو سکا

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہوری ایک بھولا بھالا کسان ہے۔ مگر اس نے اتنے مصائب برداشت کیے ہیں کہ وہ تجربہ کار، ہوشیار اور جہاں دیدہ ہو گیا ہے۔ اسی بنا پر وہ نفسیات کا ماہر بھی ہے وہ بھولا سے گائے خریدنا چاہتا تھا۔ جو اس کی دیرینہ خواہش تھی۔ بھولا کی عورت ایک سال قبل لو لگنے سے مر گئی تھی۔ ہوری نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا اور بھولا سے کہا کہ اس کی سسرال میں ایک عورت ہے، وہ اس سے بھولا کی شادی کرا دے گا۔

اب بھولا، جو پہلے گائے دینے پر تیار نہیں تھا، کہنے لگا کہ " یہ گئو گائے لے لو، روپے ادھار رہے جب ہوں دے دینا۔" ہوری یہ بخوبی سمجھتا ہے کہ جب لوہا گرم ہو تو اسی کو پیٹنا چاہیئے ہوری کی تحلیل نفسی کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے دھنیا بھولا کو بھوسا دینے کے لیے تیار نہیں ہو رہی تھی۔ ہوری نے ایک ترکیب نکالی اس نے دھنیا سے کہا کہ بھولا ہر وقت تمہاری تعریف کیا کرتا ہے "عورت نہیں لچھمی ہے۔" یہ سنکر دھنیا بھوسا دینے پر تیار ہو گئی اور جب بھولا دروازے پر آیا تو دھنیا نے شربت پلایا، چلم پلائی اور جب بھولا نے دھنیا کی تعریف شروع کی تو وہ خوشی سے پھول گئی اور ہوری سے کہا کہ دو من کے بجائے اس کو تین من بھوسا دو۔ دھنیا نے یہ بھی کہا کہ بھولا کو بار بار نہ آنا پڑے اس لیے ایک کھانچا تم اس کے گھر پہنچا آؤ۔ ایک کھانچا اس کا لڑکا گوبر لے جائے۔

ہوری کو یہ معلوم ہے کہ عورت اپنی تعریف سے خوش ہوتی ہے اسی لیے اس نے جو دھنیا کی تعریف کر دی تو وہ پھولے نہ سمائی۔ دراصل ہوری نے دھنیا کی دکھتی ہوئی رگ پکڑ لی۔

اگرچہ ہوری ایک سیدھا سادہ کسان ہے۔ اس کے باوجود وہ دنیاوی معاملات میں ہوشیار ہے وہ دنیا کو اپنی مخصوص عینک سے دیکھتا ہے۔ وہ دغابازی کا ایک نیا تصور رکھتا ہے وہ خود سے کہتا ہے۔ کہ جو بھولا کی شادی اگر نہ کرا دی تو اس کی

کاٹ تو میں واپس نہیں کروں گا۔ زیادہ سے زیادہ وہ روپیوں کا تقاضا کرتا رہے گا۔ اگرچہ یہ دغا تھی مگر یہ دغا اس کے خیال میں دغا نہ تھی۔ یہ صرف اپنا مطلب گانٹھنا تھا اور یہ کوئی بری بات نہ تھی ایسی دغا تو وہ دن رات کرتا رہتا تھا گھر پر دو چار روپے پڑے رہنے پر بھی مہاجن کے سامنے قسمیں کھا جاتا تھا کہ ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔

دراصل زمینداروں کے دور میں کسانوں کا یہی نظریہ تھا زمیندار اور مہاجن سختی کے ساتھ کسانوں سے روپیہ وصول کرتے تھے۔ اب اگر وہ ایمانداری کے ساتھ روپیہ ان لوگوں کو دے دیں تو وہ خود اور ان کے گھر والے فاقہ کریں ایسی صورت میں جھوٹ بولنا اور دغا دینا کسانوں کے نزدیک جائز تھا۔ یہی تصور ہوری کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

ہوری بہت سی خامیوں کے باوجود دیانتدار ہے جب وہ کوئی غلط کام کرتا ہے یا غلط کام کرنے کے لیے سوچتا ہے تو دل میں پچھتاتا بھی ہے۔

جب اس کو چودھری نے ڈھائی روپیہ بانس کے دیے تو اس نے ڈھائی روپے اور مانگے چودھری نے کہا کہ پندرہ روپے سیکڑے طے ہوئے تھے۔ ... بانس کے ڈھائی روپے ہوئے۔ ہوری نے کہا کہ ڈھائی روپے دبا کر راجا نہ ہو جاؤ گے۔ تو چودھری بولا "اور تم کیا بھائیوں کے تھوڑے سے پیسے دبا کر راجا ہو جاؤ گے ڈھائی روپے پر ایمان بگاڑ رہے تھے۔ اس پر مجھے اپدیش دینے چلے ہو۔ ابھی پردہ کھول دوں تو سر نیچا ہو جائے"

ہوری پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ چودھری تو روپے سامنے زمین پر رکھ کر چلتا بنا مگر وہ نیم کے نیچے بیٹھا ہوا بڑی دیر تک پچھتاتا رہا کہ وہ کتنا لالچی اور مطلبی ہے۔

ہوری ایک حقیقت پسند انسان بھی ہے۔ ایکبار سوبھا نے سوچا کہ ایکھ کے روپے جھنگری سنگھ مہاجن کو نہ ملیں، اسی لیے اس نے ہوری سے کہا کہ ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے۔ میں اب کی ان سب کو جھکمہ دوں گا۔ جمعدار کو کچھ دے دلا کر اس بات پر راضی کروں گا کہ روپے کے لیے ہم خوب دوڑائیں۔ جھنگری کہاں تک دوڑیں گے۔ ہوری نے یہ بات سنی تو ہنس کر کہا "یہ سب کچھ نہ ہوگا بھیا۔ کسل اسی میں ہے کہ جھنگری سنگھ کے ہاتھ پاؤں جوڑو۔ ہم جال میں پھنسے ہوئے ہیں جتنا ہی پھڑپھڑائیں گے اتنا ہی پھنستے جائیں گے"

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہوری بے ایمانی کا سراپا تھا اس کے قلب میں ایمان کی بھی روشنی موجود تھی اس کا ثبوت ایک واقعہ سے دیا جاسکتا ہے۔ بھولا شادی کے لالچ میں آکر گائے بیچنے پر رضامند ہوگیا تھا۔ اس نے ہوری سے کہا کہ وہ مالک کے ہاتھ گائے نہ بیچے گا چاہے وہ نقد ہی روپے دیں۔ مگر وہ ہوری کے ہاتھ ادھار بیچ دے گا اگرچہ اس کو روپیوں کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اس کے پاس بھوسا نہیں تھا۔

ہوری نے کہا بھوسا مجھ سے لے لو مگر بھولا نے کہا کہ بھوسے کے بجائے دس بیس روپے دے دو تاکہ کام چل سکے اس موقع پر ہوری نے بھولا کی مصیبت سمجھی کہ وہ بھوسے کی وجہ سے گائے بیچنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے گائے خریدنے سے انکار کر دیا۔ اس نے سوچا کہ اس کی کمزوری سے اس کو فائدہ نہ اٹھانا چاہیئے۔ یہی نہیں بلکہ آگے چل کر اس نے یہ بھی سوچا کہ بھولا کے روپیے دے دینا چاہیئے۔ گائی کے ڈھکوسلے میں اسے کیوں ڈالو جو آدمی اپنے اوپر اتنا بسواس کرے اسے دھوکا دینا نیچوں کا کام ہے

ہوری کے کردار کی نمایاں خصوصیت ہمدردی اور انسان دوستی ہے۔ گئودان میں متعدد واقعات اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں جب جھنیا حاملہ ہوکر ہوری کے گھر آئی تو پہلے اس کو غصہ آیا مگر دھنیا کے سمجھانے سے وہ نرم ہوا۔ پھر جھنیا کے رونے دھونے سے وہ بالکل پانی ہوگیا اور اس کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہوری کی ہمدردی پر دلالت کرتا ہے۔ جب ماتادین نے سلیا کو نکال دیا تو دھنیا اور ہوری اس اپنے گھر لے آئے اور اس کو اپنے خاندان کے ایک فرد کی طرح رکھا

یہ ہوری کی ہمدردی کی ایک سنہری مثال ہے۔

ہوری ایک مفلس کسان ہے مگر وہ جذبات کا پتلا ہے اس کی ایک زبردست خواہش ہے کہ وہ اپنے گھر میں گائے پالے۔ یہ ارمان وہ [illegible] جب اس کی امید کا غنچہ کھل اٹھا۔ دوسرے دن گھر [illegible] آنے والی تھی اس کے جذبات کی ترجمانی پریم چند ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ہوری کو رات بھر نیند نہیں آئی، نیم کے پیڑ تلے اپنی بانس کی چارپائی پر پڑا ہوا بار بار تاروں کی طرف دیکھتا تھا۔ گائے کے لیے ایک ناند گاڑنی ہے اس کی ناند بیلوں سے الگ رہے تو اچھا ہے۔ ابھی تو رات کو باہر ہی رہے گی لیکن چوماسے میں اس کے لیے کوئی دوسری جگہ ٹھیک کرنا ہوگی۔ باہر لوگ نظر لگا دیتے ہیں، کبھی کبھی تو ایسا [illegible] گائے کا دودھ ہی سوکھ جاتا ہے"

گائے کی آمد [illegible] ہوری کی لڑکیوں کو بھی ہے صبح کے وقت یکایک سونا اور روپا دونوں دوڑی ہوئی آئیں اور ایک ساتھ بولیں "بھیا گائے لا رہے ہیں۔ آگے آگے گائے ہے پیچھے پیچھے بھیا ہیں۔"

پہلے روپا نے گوبر کو آتے ہوئے دیکھا تھا یہ خبر سنانے کی [illegible] چاہیے تھی۔ سونا برابر کی ساجھے دار ہوئی جا [illegible] اس سے کیسے سہا جاتا اس نے آگے بڑھ کر کہا "پہلے میں نے دیکھا تھا تبھی دوڑی بہن نے تو پیچھے سے دیکھا" ان سطور میں دیہات کی خوشیاں مچل رہی ہیں۔ سونا اس دعوے کو تسلیم نہ کر سکی۔ "تو نے بھیا کو کہاں پہچانا، تو تو کہہ رہی تھی کہ کوئی گائے بھاگی آرہی ہے، میں نے ہی کہا تھا کہ بھیا ہیں"۔

ہوری اپنے بھائیوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ "گئودان" میں [illegible] مقامات پر ہوری نے اس محبت کا ثبوت دیا ہے۔ خصوصاً ہوری کو ہیرا سے بڑی محبت تھی۔ جب ہیرا نے ۱۵ روپے سیکڑہ میں بانس بیچ دئے تو ہوری خاموش رہا مگر دھنیا نے طعنہ دیا "کیوں نہ ہو بھائی نے ۱۵ روپے کہہ دئے تو تم کیسے ٹوکتے۔ ارے رام رام، لاڈلے بھائی کا دل چھوٹا ہو جاتا"

جب ہوری نے گائے خریدی تو سارا گاؤں دیکھنے گیا مگر ہیرا اور سوبھا نہیں آئے۔ ہوری نے دھنیا سے شکایت کی۔ نہ سوبھا آیا نہ ہیرا۔ دھنیا نے کہا تو ان کو بلانے کون جاتا ہے۔

ہوری کہتا ہے۔ "اپنے بھائی لاکھ بُرے ہوں، پھر بھائی ہی ہیں۔ اپنے حصے بخرے کے لیے سبھی لڑتے ہیں مگر اس سے خون تھوڑے ہی بدل جاتا ہے دونوں کو بلا کر دکھا دینا چاہیے ورنہ کہیں گے کہ گائے لائے اور کہیں بتایا تک نہیں"

اس کے بعد ہوری کہتا ہے "یہی گائے تین سال پہلے آئی ہوتی تو سبھی کو اس پر برابر کا حق ہوتا اور کل کو یہی گائے دودھ دینے لگے تو کیا وہ بھائیوں کے گھر دودھ نہ بھیجے گا کیا دہی نہ بھیجے گا؟"

مگر ہیرا ہوری کا دشمن تھا۔ رات میں ہوری ہیرا اور سوبھا کو بلانے گیا کہ گائے دکھائے۔ جب ہوری ان کے گھروں کے قریب پہنچا تو ہیرا سوبھا سے کہہ رہا تھا۔

"جب تک ایک میں تھے ایک بکری بھی نہ لی۔ اب پچھائیں گائے لی جاتی ہے۔ بھائی کا حق مار کے کسی کو پھولتے پھلتے نہ دیکھا"

مگر سوبھا نے کہا، "تم انیائے کر رہے ہو، بھیا نے ایک ایک پیسے کا حساب کر دیا۔ یہ میں کبھی نہ مانوں گا کہ انھوں نے پہلے کی کمائی چھپا رکھی تھی"

مگر ہیرا کا دل صاف نہ ہوا۔ ہوری نے جب یہ سنا تو وہ پلٹ آیا۔ ہوری نے ایک جگہ اور بھائی سے محبت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

جب پولیس کا داروغہ ہیرا کے گھر کی تلاشی لینے آیا تو

ہوری نے سوچا۔ اس کے بھائی ہیرا کے گھر کی تلاشی ہوگی، اور ہیرا گھر میں نہیں ہے تو پھر ہوری کے جیتے جی اور اس کے دیکھتے یہ تلاشی نہ ہونے پائے گی اور دھنیا سے اب اس کا کوئی ناتا نہیں ہے۔ جہاں چاہے جائے۔ جب وہ اس کی آبرو بگاڑنے پر آگئی ہے تو اس کے گھر میں کیسے رہ سکتی ہے جب گلی گلی ٹھوکر کھائے گی تب پتا چلے گا۔"

ہیرا نے ہوری کی گائے کو زہر دینے کے بعد روپوشی اختیار کی، ہوری نے ہیرا کی تلاش کی مگر [illegible] ناکام رہا۔ [illegible] اب ہوری کو اپنی کھیتی سے زیادہ ہیرا کی [illegible] تھی۔ ہوری نے اپنے دھان نہیں بوئے۔ [illegible] رات گئے تک کام کر کے ہیرا کے دھان لگائے۔ وہ کہتا تھا کہ اگر دھنیا کو کوئی تکلیف ہوگی تو دنیا اسی پر تو ہنسے گی نتیجہ یہ ہوا کہ ہوری کو خریف کی فصل میں بہت تھوڑا اناج ملا اور [illegible] دھان رکھنے کی جگہ نہ تھی۔

ہوری ایک بہادر انسان تھا۔ اس نے اپنی جرأت اور شجاعت کا مظاہرہ رائے صاحب کے یہاں [illegible] موقع پر کیا تھا۔ جب رائے صاحب کے یہاں بگیہ کی رات [illegible] بندوق [illegible] ایک ہزار روپیہ طلب کرنے لگا [illegible] کسی کی ہمت نہیں پڑی کہ [illegible] کا مقابلہ کرے۔ رائے صاحب [illegible] خورشید [illegible] اور کھنا وغیرہ موجود تھے مگر سب دم بخود [illegible] آگیا وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ [illegible] شروع [illegible] ہے مگر رائے صاحب نہیں [illegible] ہیرا دیکھا تو آغا [illegible] کمر میں ہاتھ ڈال کر پٹک دیا اور سینے پر چڑھ بیٹھا۔ اور [illegible] کے بعد اس کی ڈاڑھی نوچ لی۔ اب تو پروفیسر مہتا کو [illegible] ہو گیا۔ وہ آغا کے روپ میں رائے صاحب اور دیگر [illegible] کو مرعوب کرنا چاہتے تھے مگر ہوری نے ان کا سب [illegible] کر دیا۔ اس کے بعد [illegible] رائے صاحب [illegible] ہوری کی بہادری کی [illegible] تعریف [illegible]

غرضیکہ ہوری میں مجموعی طور پر خوبیاں زیادہ ہیں اس میں اگر کچھ خامیاں بھی ہیں تو وہ معمولی ہیں۔ وہ عام کسانوں سے بہتر ہے۔ ہوری اپنے عہد کے کسانوں کی نمائندگی مکمل طور سے کرتا ہے۔ ہوری کی بے بسی، مفلسی، ایمانداری اور بہادری نے اس کی شخصیت میں دلکشی پیدا کر دی ہے

دھنیا

دھنیا ہوری کی بیوی ہے اگر ہم ہوری کو "گئودان" کا ہیرو قرار دیں گے تو دھنیا ضرور ہیروئن کا روپ اختیار [illegible] دھنیا ایک محنتی عورت ہے پریم چند نے "گئودان" کی ابتدا ہی [illegible] دھنیا کو [illegible] اٹھاتے ہوئے دکھایا [illegible] کام اس کی محنت و مشقت پر دلالت کرتا ہے۔

چونکہ دھنیا ایک غریب [illegible] کی بیوی ہے۔ اس لئے اس کو کبھی اس کے گھر میں سکون نہیں ملا۔ اسی بنا پر وہ کچھ بددل رہتی ہے پریم چند دھنیا کے خیالات و جذبات کی ترجمانی اسی طرح کرتے ہیں

"کبھی تو [illegible] دائمی خستہ حالی نے اس کی خودداری کو [illegible] میں تبدیل کر دیا تھا جس گرہستی میں پیٹ کی [illegible] اس کے لیے اتنی خوشامد کیوں"

دھنیا مفلسی کی بنا پر بہت لاغر ہوگئی ہے۔ وہ ۳۶ سال کی ہے مگر اس کے سر کے سارے بال پک گئے ہیں۔ چہرے پر جھریاں ہیں۔ جسم ڈھل گیا ہے۔ خوبصورت گندمی رنگ سانولا پڑ گیا ہے اور آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا ہے۔ یہ سب کچھ پیٹ کی فکر ہی کے سبب ہے۔

[illegible] کے مرنے کے بعد دھنیا بہت مغموم ہو جاتی ہے اس کے علاوہ ہوری اس کو مارتا بھی ہے۔ دھنیا [illegible] جذبات کو پریم چند یوں پیش کرتے ہیں۔

[illegible] گھر میں آکر اس نے کیا کیا دکھ [illegible] نہیں جھیلا

کس کس طرح اپنا پیٹ تن نہیں کاٹا کس کس طرح ایک ایک لتّے کو ترسی۔ کس کس طرح ایک ایک پیسہ جان کی طرح بچا کر رکھا۔ کس کس طرح گھر بھر کو کھلا کر اور آپ پانی پی کر سو رہی۔"

پریم چند کا یہ بیان دھنیا کی مفلسی اور بے بسی کی ایک پُردرد داستان ہے۔

دھنیا اگرچہ مفلس اور دکھ کی ماری ہے مگر وہ بڑی گرہست عورت ہے۔ وہ اپنے گھر کو بہت سلیقے سے چلاتی ہے اور ایک ایک پیسے پر نظر رکھتی ہے۔ چنانچہ جب ہوری نے بانس ۱۵ روپے سیکڑہ بیچے تو وہ ہوشیار ہو جاتی ہے دھنیا کو دیے تب وہ بگڑی کہ بانس تو بیس روپے سیکڑے ہیں اس نے کم دام میں کیوں بیچے۔

دھنیا کی مفلسی زندگی میں بھی خوشیوں کی کرن بھی پھوٹتی ہے۔ جب اس کے گھر میں گائے آئی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ گائے کے لیے اس نے آٹا اور گڑ گھول کر ... رکھا تھا اس کو کھلایا ... گائے کے ...

دھنیا ایک دیہاتی عورت ہے اور دیہاتی عورتوں کی خصوصیات ہوتی ہیں وہ اس میں بھی ہیں۔ جب ہوری اپنے بھائیوں کی بڑائی کرتا تو اس کو برا معلوم ہوتا۔ جب گائے آئی تو گاؤں کے سب لوگ دیکھنے آئے ہیرا اور سوبھا ... ہے۔ ہوری نے روپا سے کہا کہ وہ دونوں کو بلا لائے دھنیا نے روک دیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے دیوروں سے حسد کرتی ہے۔

جب ہیرا نے سوبھا سے کہا کہ جب تک ایک ایک بکری بھی نہ لی۔ اب پچھائیں گائے لی جاتی ہے ... کا حق ... کسی کو کھیتے چھوتے نہیں دیکھا۔ ہوری یہ بات دھنیا سے کہی۔ دھنیا لڑنے کے لئے رات ... ہیرا سے بات بڑھ گئی۔ سارا گاؤں جمع ہو گیا۔

دھنیا اعلیٰ کردار کی حامل ہے۔ اس میں ہمدردی کا جذبہ نمایاں طور پر موجود ہے۔ اس نے جب جھنیا کو گھر میں رکھا تو سارا گاؤں کہتا تھا کہ اس کو نکال دو مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ ... جرمانہ ... جرمانے میں ادا کیا تاہم اس نے جھنیا کو اپنے گھر سے نہیں نکالا۔ خود بھولا نے کہا کہ جھنیا کو نکال دو ورنہ تمہارے بیل لے جائیں گے مگر دھنیا بھولا کی دھمکی میں نہیں آئی اور اس نے جھنیا کے ساتھ اپنی بہو کی طرح برتاؤ کیا۔

دھنیا اگرچہ مفلس ہے مگر وہ نیک چلن ہے۔ اس کی نیک چلنی کی تعریف خود ہوری ... کرتا ہے ہوری ... ہے

... تنباکو کی دیوی زبان کی تیز ... رکھنے والی ہے ... کے لیے جان دینے ... کے لیے اپنا سب کچھ دے دینے کو تیار۔ جوانی میں وہ کم سندر نہ تھی ... تھی۔ جو دیکھتا تھا دیکھتا ہی رہ جاتا ... دونوں ... دروازے کے سو سو چکر لگاتے تھے۔ ---------- قحط کے زمانے ... دھنیا گھر میں اکیلی رہتی تھی مگر کبھی کسی نے اس کو کسی ... کی طرف تاکتے نہیں دیکھا۔"

دھنیا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ بہت ... وہ خطرات کا مقابلہ کرتی ہے گائے ... نے کھانے ... لی۔ حقیقت ... گاؤں ... آیا ہوری ... بیان ہوا۔ اس نے کہا کہ گائے اپنی موت مری ہے بوڑھی ہو گئی تھی۔ دھنیا نے کہا کہ ہیرا نے زہر دے دیا ہے۔ ہوری نے لڑکے کی قسم کھائی کہ دھنیا جھوٹ بول رہی ہے دھنیا نے کہا کہ بھائی کو بچانے کے لیے یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ داروغہ نے کہا کہ ہیرا کے گھر کی تلاشی ہوگی۔ مگر ہوری نے سوچا اس

میں اس کے بھائی کی بے عزتی ہے اس لیے داروغہ کو رشوت دے کر ٹالا جائے۔ وہ جھنگری سے ۳۰ روپے قرض لایا مگر دھنیا نے وہ مال چھین لیا اور داروغہ اور مکھیا سب کو ڈانٹ بتائی کہ میری سو روپے کی گائے مری۔ پھر میں رشوت بھی دوں۔

دھنیا کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ شوہر پرست ہے جب ہوری زمیندار کے یہاں جارہا تھا تو اس نے کہا۔ "ارے کچھ شربت پانی تو کر لو، ایسی جلدی کیا ہے؟" دھنیا کا یہ جملہ ثابت کرتا ہے کہ وہ کتنی شوہر پرست ہے۔ ہوری دھنیا کو پیٹتا بھی ہے پھر بھی وہ وفا پرستی کا مظاہرہ کرتی رہتی ہے گائے کے مرنے کے بعد پولیس کے تھانیدار گاؤں میں تحقیقات کے لیے آرہے تھے۔ دھنیا نے کہا کہ میں سارا واقعہ صاف صاف بتادوں گی اور کہہ دوں گی کہ ہیرا نے گائے کو زہر کھلا دیا ہے۔ یہ بات ہوری کو پسند نہیں تھی۔ مگر وہ اپنی ضد پر اڑی تھی۔ اس لیے ہوری نے اس کو بہت مارا۔ اس مار پیٹ کے بعد کچھ دنوں تک دونوں میں بول چال بند رہی مگر جب ہوری بیمار پڑا تو دھنیا نے اس کی جان توڑ خدمت کی۔

دھنیا میں عام عورتوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں اس میں عورت کی ایک کمزوری خاص طور سے موجود ہے۔ وہ اپنی تعریف سے بہت خوش ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ پہلے وہ بھولا کو بھوسا دینے کے لیے تیار نہیں تھی مگر جب ہوری نے کہا کہ بھولا تمہاری تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ عورت نہیں لچھمی ہے تو وہ دو کے بجائے تین کھانچا بھوسا دینے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ بھولا جب اس کے دروازے پر آتا ہے تو اس کو شربت پلاتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہوری اور گوبر کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ دونوں ایک ایک کھانچہ بھوسا بھولا کے گھر لے جائیں تاکہ اس کو تین بار آنا جانا نہ پڑے۔ بہر حال دھنیا کی شخصیت میں بھی کشش ہے وہ ہوری کی زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔

ہوری اور دھنیا کے علاوہ "گئودان" میں دیگر کردار بھی ہیں مگر وہ زیادہ اہم نہیں ہیں۔ مثلاً گوبندی کھنا کی بیوی ہے اس کے بارے میں پریم چند لکھتے ہیں۔

"گوبندی خوبرو نہ ہو مگر خوبصورت ضرور ہے۔ گندمی رنگ، شرمیلی آنکھیں، جو سامنے ایک بار اُٹھ کر پھر جھک جاتی ہیں، رخساروں پر سرخی نہ ہو مگر چکناہٹ ہے۔"

اسی طرح "گئودان" میں مس مالتی بھی جلوہ افروز ہے۔ وہ رائے صاحب کی محفل کی شمع ہے اسی کے دم سے ان کے حلقۂ احباب میں روشنی ہوتی ہے۔ وہ خوبصورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہنس مکھ بھی ہے۔ پریم چند نے اس میں قومی خدمت کا جذبہ بھی دکھایا ہے۔ جس میں تصنع کی جھلک موجود ہے۔ مس مالتی ایک خوبصورت عورت ہے یہی کیا کم ہے اس کو قومی لیڈر بنانے کی کیا ضرورت تھی۔

ماحول

جب ہم "گئودان" پر غور کرتے ہیں تو ہم کو اس ناول سے یوپی کا ایک گاؤں ابھرتا ہوا نظر آتا ہے "گئودان" کا ماحول خالص طور پر دیہاتی ہے۔ پریم چند بذات خود گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اس لیے ان کے دیہی تجربات نہایت صحیح، درست، پختہ اور وسیع تھے انھوں نے بیلاری گاؤں کے جو مناظر پیش کئے ہیں وہ صداقت پر مبنی ہیں۔ اور انھوں نے بیلاری کے باشندوں کے جن جذبات کی عکاسی کی ہے ان میں حقیقت کی جھلک موجود ہے۔ "گئودان" کی دیہی عکاسی میں ایک رنگ بھی ایسا نہیں ہے جس میں تصنع ہو۔ اس کا ہر رنگ پختہ ہے۔ جس کو زمانے کے طوفان و تلاطم کی موجیں دھندلا نہیں کرسکتیں۔

"گئودان" میں پریم چند نے دیہات کے کسانوں کی حالت پیش کی ہے۔ ہوری اپنی مفلسی پر اس وقت روشنی ڈالتا ہے جب وہ بھوسا لینے بھولا کے گھر جارہا ہے۔ وہ بھولا سے کہتا ہے۔

"... ناج تو سب کا سب کھلیان میں تل گیا۔ جمیندار نے اپنا لیا۔ مہاجن نے اپنا لیا۔ میرے لیے پانچ سیر اناج بچ رہا۔ بھوسا تو میں نے راتوں رات ڈھو کر چھپا دیا تھا۔ نہیں تنکا بھی نہ بچتا۔ جمیندار تو ایک ہی ہے پر مہاجن تین تین سیتھانی الگ، منگرو الگ اور داتا دین پنڈت الگ۔"

ان سطور سے واضح طور پر کسانوں کی بے کسی پر روشنی پڑتی ہے۔ "گئودان" میں بہت سے ایسے مقامات ہیں جو ہوری کی مفلسی کی داستان پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ہوری نے ایکھ بیچی اور جب تولنے کے لیے کھنا کی مل کے پھاٹک پر لے گیا تو وہاں پہلے ہی سے جھنگری موجود تھا۔ جھنگری نے کھنا سے طے کر رکھا تھا کہ وہ سارے کسانوں سے اپنا قرضہ وصول کرے گا۔ ایکھ کی فروخت کرنے سے ہوری کو ۱۲۰ روپے ملے۔ ان میں سے جھنگری نے اپنا قرضہ لیکر ۲۵ روپے ہوری کو دئے۔ اتنے میں نوکھے رام نے للکارا، ہوری نے ۲۵ روپے اس کو دے دیا اور خود خالی ہاتھ گھر واپس آیا۔

دھنیا نے پوچھا کتنے روپے ملے۔ ہوری نے کہا ملے تھے مگر سب وہیں لٹ گئے دھیلا نہ بچا دھنیا نے کہا "تم جیسے بدھو آدمی کو بھگوان نے کیوں بنایا۔ کہیں ملتے تو ان سے پوچھتی۔ تمہارے ساتھ ساری جندگی متی ہو گئی۔ بھگوان موت بھی نہیں دیتے کہ اس جنجال سے جی چھوٹے۔ اٹھا کر سب روپے اپنے بہنوئیوں کو دے دئے۔ اب کون آمدنی ہے جس سے گوئی تھوے گی۔ ہل میں کیا مجھے جوتوگے یا آپ جتو گے میں کہتی ہوں کہ تم بوڑھے ہوئے اور تمہیں اتنی اکل بھی نہیں آئی کہ گوئی بھر کے روپے تو نکال لیتے۔ کوئی تمہارے ہاتھ سے چھین تھوڑے ہی لیتا۔ پوس کی یہ سردی ہے اور کسی کے تن پر لتا نہیں ہے۔ لے جاؤ سب کو ندی میں ڈبا دو۔ رو رو کر مرنے سے تو ایک دن مر جانا اچھا ہے۔ کب تک پوال میں گھس کر رات کاٹیں گے اور پوال میں گھس بھی رہیں تو پوال کھا کر رہا تو نہ جائے گا۔ تمہاری اچھا ہو گھاس ہی کھاؤ پر ہم سے گھاس نہ کھائی جائے گی۔"

اس عبارت میں ہوری اور دھنیا دونوں کی آہیں اور آنسو بستے ہیں۔ ہوری ایک مقام پر بھولا کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس کے یہ خیالات بھی کسانوں کی بے کسی کا اظہار پیش کرتے ہیں۔ وہ خود سے کہتا ہے کہ بھولا گائے کے روپیوں کے لیے بار بار تقاضا کرے گا گالیاں دے گا تو اس کا کیا بگڑے گا۔ وہ اسی برتاؤ کا عادی ہو گیا تھا۔ آخر میں وہ کہتا ہے "کسان کی زندگی کا تو یہ چڑھاوا ہے۔"

بھولا کے خیالات بھی کسانوں کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ ہوری سے کہتا ہے "اس گائے کے مالک نے نوے روپے دے تھے۔ پر ان لوگوں کے یہاں گؤوں کا کیا گزر۔ مجھ سے لے کر کسی حاکم حکام کو دے دیتے۔ حاکموں کو گؤسیوا سے کیا مطلب۔ وہ تو کھون چوسنا جانتے ہیں۔"

گوبر کے خیالات سے بھی کسانوں کی حالت واضح ہوتی ہے۔ گوبر ہوری سے کہتا ہے۔

"یہ تم روج روج مالکوں کی کھوشامد کرنے کیوں جاتے ہو۔ لگان نہ چکے تو پیادہ آکر گالیاں سناتا ہے۔ بیگار دینی پڑتی ہے۔ نجر نجرانہ سب تو ہم سے بھرایا جاتا ہے پھر کسی کی کیوں سلامی کرو؟"

اس وقت یہی خیالات ہوری کے دل میں بھی تھے مگر لڑکے کے باغیانہ جذبے کو دبانا ضروری تھا۔ اس لیے وہ بولا۔ "سلامی کرنے نہ جائیں تو رہیں کہاں۔ بھگوان نے جب گلام بنا دیا ہے تو اپنا کیا بس ہے"

"گئودان" کا مطالعہ یہ بات بھی واضح کرتا ہے کہ زمینداروں کی نظر میں کسانوں کی کوئی بھی وقعت نہیں تھی۔ ایک بار ہوری اپنے زمیندار رائے امر پال صاحب سے ملنے گیا۔ وہ ہوری کو کوٹھی کی طرف لے چلے وہیں ایک گھنے پیڑ کے سائے میں وہ خود کرسی پر بیٹھ گئے اور ہوری کو زمین پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ۱۳۱ [illegible]

مجھے دسہرے کے سلسلے میں بیس ہزار روپے کی ضرورت ہے تم اس کا انتظام کر دو۔

پریم چند نے نہ صرف دیہات کے کسانوں کی مفلسی پیش کی ہے۔ بلکہ وہاں کا کلچر، رہن سہن اور مشاغل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ بھولا ہوری سے کہتا ہے۔

"بڑا لڑکا کامتا سودا لیکر بازار جاتا ہے تو آدھے پیسے غائب۔ پوچھو تو کوئی جواب نہیں۔ چھوٹا جنگی ہے وہ سنگت کے پیچھے متوالا رہتا ہے۔ سانجھ ہوئی اور ڈھول مجیرا لیکر بیٹھ گیا۔" آگے چل کر بھولا کہتا ہے "لڑکی ہے جھنیا وہ بھی نصیبے کی کھوٹی ...... اس کا آدمی بمبئی میں دودھ کی دکان کرتا تھا۔ ان دنوں وہاں ہندو مسلمانوں میں دنگا ہوا تو کسی نے اس کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا۔ گھر ہی چوپٹ ہو گیا اب لڑکی کا وہاں نباہ نہ تھا جا کر لے آیا کہ دوسری سگائی کر دوں گا۔ پر وہ مانتی نہیں اور دونوں بھاوجیں ہیں کہ رات دن اسے جلاتی رہتی ہیں۔ گھر میں تب کہرام مچا رہتا ہے"۔

یہ عبارتیں گاؤں کے لڑکوں کی تباہی کو واضح کرتی ہیں۔ ان سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ دیہاتوں میں بھاوج اور نند میں کس طرح جھگڑا ہوتا ہے

پریم چند نے "گئودان" میں یہ بھی دکھایا ہے کہ وہاں کے باشندے معمولی معمولی باتوں پر کس طرح آپس میں جھگڑا کرتے ہیں۔ مثلاً ہوری اور گوبر میں جھگڑا ہوا، وہ گھر سے نکل کر لکھنؤ چلا گیا اور وہاں کمانے لگا اسی طرح جب بھولا کی نئی بیوی آئی تو اس سے اور کامتا سے جھگڑا ہوا۔ کامتا نے بھولا کو ٹھیک کر کئی لاتیں جمائیں اور اس کو گھر سے نکال دیا۔

پریم چند نے "گئودان" میں دیہات کے میل جول، آؤ بھگت اور خاطر مدارات کے بھی نقشے کھینچے ہیں۔ چنانچہ جب گوبر کسی کے گاؤں پہنچا تو کوئی نے اپنے گھر سے کھاٹ نکالی اور اس پر ایک دری بچھا دی۔ پھر تھوڑی دیر میں لا لا اس کی بہو لوٹے میں شربت لے کر آئی۔ جب گوبر رخصت ہوا تو کودئی کی ماں نے کھانڈ اور ستو ملا کر اس کو کھانے کو دیا۔ یہ واقعہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ دیہات میں کس طرح خاطر مدارات ہوتی ہے۔

ایک بار پنڈت داتا دین ہوری کے گھر پہنچے — ہوری نے ان کے پیر چھوئے اور الاؤ کے سامنے ماچی رکھ دی تاکہ وہ اس پر بیٹھیں۔ جن لوگوں نے دیہات کی زندگی نہیں گزاری ہے وہ غالباً "ماچی" نہیں سمجھ سکیں گے پرانے زمانے میں ماچی کرسی کا کام کرتی تھی۔

دیہاتوں میں عام طور سے لوگ تمباکو چلم میں رکھ کر پیتے ہیں ایک دن دھنیا کے یہاں آگ لینے گئی۔ دھنیا نے پوچھا آگ کیا کرے گی اس نے جواب دیا۔ دادا تماکو پئیں گے :

دیہات کے لوگ تاڑی بھی پیتے ہیں جب گردھر نے ایکھ بیچی۔ جھنگری سنگھ نے اس کو بیس روپے ذمہ دار بے تھے۔ اس نے ۱۶۰ روپے ایکھ کے مع سود گردھر سے وصول کر لیے۔ اب گردھر کے پاس صرف ایک اکنی بچی۔ جس کی اس نے تاڑی پی لی۔

پریم چند نے "گئودان" میں یہ بھی دکھایا ہے کہ دیہاتوں میں پنچایت کس طرح من مانا فیصلہ کرتی ہے اور کس طرح جرمانہ وصول کرتی ہے۔ جب ہوری نے جھنیا کو گھر سے نہ نکالا تو داتا دین، لالہ پٹیشوری، جھنگری سنگھ اور نوکھے رام کی بیٹھک ہوئی۔ نوکھے رام نے کہا کہ میں سو روپے تاوان کئے دیتا ہوں اور لگان ادا نہ کرنے کی وجہ سے بید کھلی کا دعویٰ دائر کرتا ہوں۔ مگر پٹیشوری پٹواری نے کہا کہ وہ لگان تو ادا کر چکا ہے۔ جھنگری سنگھ نے تائید کی کہ وہ اس لگان کے لیے مجھ سے تیس روپے قرض لے گیا ہے۔ مگر نوکھے رام نے کہا کہ لگان تو ادا کر دیا مگر میں نے رسید کب دی، کیا ثبوت کہ لگان ادا کیا۔

دوسرے ... داتا دین جھنیا کو ... ا ... ا ... [illegible]

پنچایت ہوئی۔ ہوری پر سو روپے نقد اور تیس من غلہ جرمانہ ہوا۔ دھنیا نے انکار کیا مگر ہوری نے منظور کرلیا۔ اب وہ کھلیان سے غلہ ڈھوکر جھنگری سنگھ کے گھر پہنچانے لگا۔ ہوری جتنا جھنگری سنگھ کے یہاں لے گیا تھا۔ گیہوں مٹر اور تلہن وغیرہ وہ بیس روپے کا تھا۔ اب ۸۰ روپے کے لیے اس کو اپنا مکان رہن رکھنا پڑا اس کے بعد ہوری کے گھر پر مکمل طور سے مفلسی چھا گئی اور گھر کے لوگ فاقہ کرنے لگے۔ اس برے وقت میں رو پا کچی امیا کھا کر گزارا کرتی تھی۔ یہ پریم چند کے عہد کی ایک سچی تصویر ہے۔

"گئودان" میں قدم قدم پر دیہات جھلک اٹھتا ہے پریم چند نے دیہات کے معاشرے کی بھرپور عکاسی کی ہے انھوں نے یہ بھی دکھایا ہے کہ دیہات میں عورتیں کس طرح ماری پیٹی جاتی ہیں۔ چودھری دمڑی بانس والا پنیا سے بانس لے آیا ہے۔ چودھری نے چلم کا دم لگا کر کھانستے ہوئے کہا کہ ہیرا کبھو کبھی اپنی بیوی پنی کی مرمت کر دیتا ہے۔ ابھی حال ہی میں اتنا مارا تھا کہ وہ کئی دن تک کھاٹ سے نہ اٹھ سکی تھی۔ پنی کے مار کھانے کا ایک اور واقعہ پریم چند نے پیش کیا ہے۔ پنی جب چودھری دمڑی سے لڑی تو ہیرا اس کو گھسیٹتا ہوا لے گیا اور لاتیں مارنے لگا اور کہا تو چھوٹے آدمیوں سے کیوں لڑتی ہے اس پر پنی ہیرا کو گالیاں دینے لگی۔ "پنی ہائے ہائے کرتی جاتی تھی۔ تیری مٹی اٹھے، تجھے مرگی آوے، دیبی میّا تجھے لیل جائیں، بھگوان کرے تو کوڑھی ہو جائے، ہاتھ پاؤں کٹ کر گریں"

ہوری کی بیوی دھنیا بھی مار کھاتی ہے۔ گائے کے مرجانے کے بعد ہوری دھنیا کو مار رہا تھا۔ اور دھنیا اسے گالیاں دے رہی تھی۔ دونوں لڑکیاں باپ کے پاؤں سے لپٹی ہوئی چلا رہی تھیں اور گوبر ماں کو بچا رہا تھا۔ یہ دیہات کی ایک سچی تصویر ہے۔

عورت کے مار کھانے کا نقشہ ایک اور جگہ موجود ہے گوبر لکھنؤ بھاگا جا رہا تھا تاکہ وہاں سے کما کر گاؤں لوٹے اس نے راستے میں دیکھا کہ دو میاں بیوی لڑ رہے ہیں۔ عورت کہتی تھی کہ میں گھر نہ جاؤں گی۔ مرد زبردستی لے جانا چاہتا تھا۔ اس لیے مرد نے اس کے بال پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا۔ عورت زمین پر لیٹ گئی۔ مرد نے اس کے بال چھوڑ دیے اور تھک کر زمین پر بیٹھ گیا۔ جن لوگوں نے گاؤں میں زندگی گزاری ہے، وہ محسوس کر سکتے ہیں کہ اس تصویر میں کتنی صداقت ہے۔

غرضیکہ "گئودان" کا ماحول مکمل طور سے دیہاتی ہے اس ناول میں دیہات کی مخصوص پرچھائیاں ہم کو جابجا نظر آتی ہیں۔ پریم چند نے دیہاتی ماحول کو اجاگر کرنے کے لیے اس ناول کے بہت سے نام بھی دیہاتی رکھے ہیں۔ جیسے ہوری جو اصل میں ہولی کا بگڑا ہوا روپ ہے۔ اس کا ہیرو ہے۔ ہولی کی اہمیت جس قدر دیہات میں ہوتی ہے شہروں میں اتنی نہیں ہے۔ ہولی کے موقع پر دیہاتوں میں خاص طور سے گالیاں گائی جاتی ہیں۔ بعض دیہاتی لوگ جا چر باندھ کر ہولی کو آگ لگانے جاتے ہیں تو نہایت فحش گالیاں بکتے ہیں۔

اس ناول کی ہیروئن دھنیا ہے۔ دھنیا دیہات میں اگائی جاتی ہے [illegible] پانڈوں کے ساتھ دھنیا کی کیاریاں ہوتی ہیں اس لیے ان کو دھنیا نام رکھنے میں سہولت ہوتی ہے۔ ہوری کے لڑکے کا نام گوبر ہے۔ گاؤں اور گوبر کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے گوبر بھی بہت موزوں نام ہے۔ دیہات میں جھینگروں کی کثرت ہوتی ہے اس لیے جھینگر نام بھی دیہاتی نقطۂ نظر سے بہت مناسب ہے۔ کودوں دیہات میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے پریم چند نے ایک کردار کا نام کودئی رکھا ہے۔ اس کے علاوہ سلیا، [illegible] وغیرہ بھی دیہاتی نام ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ "گئودان" ناول میں شہر کے مناظر بھی پیش کئے گئے ہیں مگر ان کی حیثیت ضمنی ہے۔ مثلاً رائے صاحب کا وجود صرف ہوری کی وجہ سے ہے۔ ہوری کی پتا کو واضح کرنے کے لیے رائے صاحب کا وجود ضروری تھا۔ بہرحال "گئودان" کا شہری ماحول زیادہ اہم نہیں ہے اس ناول کا دیہاتی ماحول ہی اس کی جان ہے۔

منظر نگاری

"گئودان" میں پریم چند نے مناظر قدرت کے بھی مختلف نقشے کھینچے ہیں لیکن ان کے یہاں منظر نگاری ضمنی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے وہ زیادہ اہم نہیں ہے جس طرح کرشن چندر منظر نگاری کی بنا پر اپنے افسانوں میں حسن پیدا کرتے ہیں [illegible] مناظر قدرت سے فائدہ [illegible] اٹھاتے ہیں لیکن چونکہ "گئودان" کے پلاٹ کا تعلق دیہات سے ہے۔ اس لیے پریم چند نے دیہاتی مناظر پیش کئے ہیں۔ ان کے یہاں منظر نگاری زیادہ تر پس منظر کا کام رتی ہے۔ مثلاً ہوری جب رائے صاحب کے یہاں سے گھر واپس آرہا تھا، اس وقت کا منظر پریم چند ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"لو چل رہی تھی بگولے اٹھ رہے تھے۔ زمین جل رہی تھی۔ جیسے قدرت نے ہوا میں آگ بھر دی ہو۔"

یہ منظر ہوری کی مصیبت میں اور اضافہ کرتا ہے اور ہماری ہمدردی اس سے بڑھ جاتی ہے

چونکہ پریم چند نے دیہات کے مناظر اپنی آنکھوں سے بذات خود دیکھے ہیں۔ اس لیے ان کے بیانات میں صداقت کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایک جگہ وہ گاؤں کا منظر یوں پیش کرتے ہیں۔

[illegible]

نشیب میں آگیا جہاں برساتی پانی بھر جانے کے سبب کچھ نمی رہتی تھی۔ قریب کے گاؤں کی گائیں وہاں چرنے آیا کرتی تھیں اس اُمس میں بھی وہاں کی ہوا میں کچھ تازگی اور ٹھنڈک تھی۔"

پریم چند کی منظر نگاری بعض وقت ہم کو محظوظ بھی کرتی ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ پریم چند حسن فطرت سے لطف اندوز ہونے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں۔

"پھاگن اپنی جھولی میں نئی زندگی کی پونجی لے کر آپہنچا تھا آم کے پیڑ دونوں ہاتھوں سے بور کی مہک بکھیر رہے تھے اور کوئل آم کی ڈالیوں میں چھپی ہوئی اپنے راگوں کی خفیہ خیرات تقسیم کر رہی تھی۔"

مگر اس [illegible] کے بیانات پریم چند کے یہاں بہت کم ملتے ہیں۔

جزئیات نگاری

پریم چند کا مشاہدہ کافی عمیق ہے۔ اس لیے وہ مختلف مواقع کی تصویروں کا احاطہ مکمل طور سے کرتے ہیں اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ان کو جزئیات نگاری میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ مثلاً وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"گوبر کو اتنی دیر میں گھر کی پست حالت کا اندازہ ہوگیا تھا دھنیا کی ساڑی میں کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ سونا کی ساڑی سر پر پھٹی ہوئی تھی اور اس میں سے بال دکھائی دے رہے تھے۔"

سر پر ساڑی کا پھٹا ہونا اور اس سے بال دکھائی دینا عمیق نگاہی کا زبردست ثبوت ہے۔

مندرجہ ذیل عبارت بھی ملاحظہ فرمائیے اور پریم چند کے عمیق مشاہدے کی داد دیجئے۔

"دھنیا چار بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ سایہ پیر سے [illegible] نکال نکال کر اُسا رہی تھی۔ [illegible] دوسری طرف میٹھا

ہوا اپنی لاٹھی پر تیل مل رہا تھا۔"

یہ بھی دیہات کی ایک حسین تصویر ہے۔ دیہات کے باشندوں کو لاٹھی بہت عزیز ہوتی ہے۔ کیونکہ خطرات کے موقع پر وہ ان کی حفاظت کرتی ہے۔ دیہات کے لوگ لاٹھی کو مضبوط کرنے کے لیے اس میں سرسوں کا تیل لگاتے ہیں۔ ماتا دین بھی اپنی لاٹھی میں تیل مل رہا تھا۔

پریم چند ہوری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"بوائی پھٹے پیروں کو پیٹ میں ڈال کر اور ہاتھوں کو رانوں کے بیچ دبا کر اور کمبل میں منہ چھپا کر اپنے ہی گرم سانسوں سے اپنے کو گرمی پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

دیہاتوں میں عام طور سے کسانوں کے پیر میں بوائی ہوتی ہے۔ غرضیکہ پریم چند نے ہر کسان کو، ہر کھیت کو اور ہر باغ کو بغور دیکھا ہے اور اس کی صحیح جزئیات نگاری پیش کی ہے

مرقع نگاری

پریم چند کا قلم مرقع نگاری میں بھی ماہر ہے۔ انھوں نے "گئودان" میں مختلف کرداروں کے صحیح خط و خال کھینچے ہیں ان کے بیانات سے کرداروں کی صحیح تصویر ہماری نظروں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔

مندرجہ ذیل سطور میں پریم چند نے سونا اور روپا کی شکل و صورت بیان کی ہے۔

"بڑی لڑکی سونا شرمیلی لڑکی تھی۔ سانولی، سڈول، تیز اور خوش گاڑھے کی سرخ ساڑی ہے۔ وہ گھٹنوں سے موڑ کر کمر میں باندھے تھی۔ اس کے ہلکے بدن پر کچھ لدی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ چھوٹی لڑکی روپا پانچ چھ سال کی چھوکری تھی۔ میلے سر پر بالوں کا ایک گھونسلہ سا بنا ہوا۔ ایک لنگوٹی کمر میں لگی ہوئی۔"

پریم چند بھولا کی لڑکی کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"جھنیا چوکھٹ پر کھڑی تھی، اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور ناک کے سرے پر بھی سرخی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ابھی رو کر اٹھی ہے۔ اس کے بھرے ہوئے تندرست اور سڈول اعضا میں گویا شباب انگڑائیاں لے رہا تھا۔ چہرہ بڑا اور گول تھا گال پھولے ہوئے۔ آنکھیں چھوٹی اور اندر دھنسی ہوئیں۔ ماتھا تنگ مگر سینے کا ابھار اور جسم کا گدگدا پن آنکھوں کو کھینچ لیتا تھا۔ اس پر چھپی ہوئی گلابی ساڑی اور بھی زینت بڑھا رہی تھی۔"

اس عبارت سے جھنیا کی شکل و شباہت ہمارے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔ پریم چند دمڑی بانس والے کی صورت یوں بیان کرتے ہیں۔

"دمڑی بانس والا سامنے کھڑا ہے۔ ناٹا، کالا، توند، موٹا، چوڑا منہ، بڑی بڑی مونچھیں، سرخ سرخ آنکھیں کمر میں بانس کاٹنے کی کٹار کھونسے ہوئے۔"

سلیا کے باپ کی بھی شکل ملاحظہ فرمائیے۔

"سلیا کا باپ ہرکھو ساٹھ سال کا بوڑھا تھا۔ کالا، دبلا اور سوکھی مرچ کی طرح پچکا ہوا۔"

بہر حال پریم چند نے مختلف کرداروں کی تصویر ایک مصور کی طرح کھینچ دی ہے۔ انھوں نے اس قسم کی مصوری میں مکمل طور سے کامیابی حاصل کی ہے۔

نفسیاتی جھلکیاں

پریم چند کو نفسیاتی تجزیہ میں ملکہ حاصل ہے۔ انھوں نے مختلف کرداروں کے دل کے اندر جھانک کر دیکھا ہے اور ان کے جذبات کی صحیح عکاسی کی ہے۔ پریم چند کا تجربہ بہت وسیع اور پختہ ہے۔ اس لیے وہ نفسیاتی تحلیل میں کامیاب حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً وہ روپا کے جذبات کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں۔

"سونا کی شادی کا ذکر چل رہا ہے۔ روپا کے بیاہ کا کوئی چرچا نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ خود اپنے بیاہ کے لیے ضد کرتی ہے۔ اس کا دولہا کیسا ہوگا۔ وہ کیا کیا لائے گا۔ اسے کیسے رکھے گا۔ اسے کیا کھلائے گا۔ کیا پہنائے گا۔ اس کا وہ بڑا مفصل بیان کرتی ہے"

پریم چند کے اس بیان میں بڑی حقیقت ہے واقعی کمسن بچیاں اپنے بیاہ کا ذکر بہت معصومیت سے کرتی ہیں۔

پریم چند نے عورت کی نفسیات کا مطالعہ بھی گہرائی کے ساتھ کیا ہے مثلاً جھنیا گوبر سے کہتی ہے۔

"مرد دوسری عورت کے پیچھے دوڑے گا تو عورت بھی دوسرے مرد کے پیچھے دوڑے گی مرد کا ہرجائی ہونا عورت کو بھی اتنا ہی برا لگتا ہے جتنا عورت کا مرد کو"

اس بیان میں حقیقت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ عورت بے زبان ہوتی ہے اس لیے وہ اظہار نہیں کرتی ہے مگر اس کو مرد کا ہرجائی ہونا واقعی ناگوار معلوم ہوتا ہے۔

مکالمہ نگاری

"گئودان" ناول کے مکالمے نہایت فطری انداز میں ملتے ہیں۔ چونکہ پریم چند نے اپنی زندگی دیہات میں گزاری تھی اس لیے انھوں نے بذاتِ خود دیہات کے باشندوں کے مکالمے سنے تھے۔ اسی بنا پر انھوں نے جو مکالمے پیش کیے ہیں وہ فرضی نہیں ہیں بلکہ ان پر اصلیت کی چھاپ موجود ہے۔

"گئودان" میں مکالمہ نگاری کی ایک حسین مثال اس وقت ملتی ہے جب جھنیا اور سونا میں گفتگو ہوتی ہے ـــ داتا دین ہوری کے گھر آتا ہے اور جھنیا کو پھانسنے کی کوشش کرتا ہے۔ سونا نے پوچھا داتا دین کیا کرنے میرے گھر آیا تھا اور تم سے کیا باتیں کر رہا تھا۔ جھنیا ٹال گئی اور اس کو بہلانے لگی۔

سونا۔ "میرے گھر میں پھر آئے گا تو دھتکار دوں گی"

جھنیا۔ "اور جو اس سے تمھارا بیاہ ہو جائے"

سونا شرما گئی۔ "تم تو بھابھی گالی دیتی ہو"

جھنیا۔ "اور جو کسی بڈھے کے ساتھ بیاہ ہو گیا"

سونا ہنسی۔ "میں اس کے لیے نرم نرم روٹیاں بناؤں گی اس کی دوائیاں کوٹوں چھانوں گی۔ اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھاؤں گی اور جب مر جائے گا تو منہ ڈھانک کر رو دوں گی"

جھنیا۔ "اور جو کسی جوان کے ساتھ ہوا"

سونا "تب تمھارا سر، ہاں نہیں تو"

اس موقع پر سونا کی جھنجھلاہٹ فطری ہے کیونکہ وہ کھسیا گئی ہے۔ اسی لیے کہتی ہے "تب تمھارا سر" اس سے زیادہ دلکش ٹکڑا ہے۔ "ہاں نہیں تو" اس کا تو جواب ہی نہیں ہے۔ اگرچہ "ہاں نہیں تو" ایک مہمل فقرہ ہے مگر جب کوئی لاجواب ہو جاتا ہے تو وہ اس کا استعمال کرتا ہے۔ کم از کم لکھنؤ کے دیہاتوں میں اس طرح سے ضرور بولا جاتا ہے۔

ہوری اور دھنیا کی محبت آمیز گفتگو ملاحظہ فرمائیے۔

دھنیا کہتی ہے "ارے کچھ سربت پانی تو کر لو۔ ایسی جلدی کیا ہے"

ہوری جواب دیتا ہے۔ "تجھے سربت پانی کی پڑی ہے مجھے یہ فکر ہے کہ دیر ہو گئی تو مالک سے بھینٹ نہ ہوگی۔ اسنان دھیان کرنے لگیں گے تو پہروں بیٹھے بیت جائے گا"

یہ میاں بیوی کی بے تکلف گفتگو ہے جو بہت فطری ہے۔

بھولا اور ہوری میں گفتگو ہو رہی ہے۔

بھولا۔ "اس کبرن گائے پر جی للچا ہو تو لے لو"

ہوری۔ "یہ گائے میرے بس کی نہیں دادا۔ میں تمھیں نکسان

تمہیں پہنچانا چاہتا. اپنا مرم یہ نہیں کہ دوسروں کا گلا دبائیں جیسے اتنے دن بیتے ہیں اور بھی بیت جائیں گے۔"

بھولا۔ "تم تو ایسی باتیں کرتے ہو جیسے ہم تم دو ہیں. گائے لے جاؤ دام جو جی چاہے دے دینا۔"

ہوری نے بھولا کی شادی کا وعدہ کیا ہے. اس لیے بھولا نرم ہے اور گائے دینے کے لئے تیار ہے اور یگانگت کی مصنوعی گفتگو کر رہا ہے.

اخلاقی جھلکیاں

"گئودان" میں کہیں کہیں اخلاقی نکات بھی ملتے ہیں. پریم چند کے اخلاقی اصولوں کی بنیاد اعلیٰ قدروں پر قائم ہے. وہ ان اصولوں کی تبلیغ کرتے ہیں جن کی صداقت میں کوئی شک نہیں ہے. مثلاً کھنا کی بل جل جانے کے بعد گوبندی کھنا سے کہتی ہے.

"اب تمھارے لڑکے انسان بنیں گے خود غرض اور غرور کے پتلے نہیں. زندگی کا سکھ دوسروں کے سکھی رکھنے میں ہے لوٹنے میں نہیں برا نہ ماننا اب تک تمھاری زندگی کا مطلب تھا خود پروری اور عیش کوشی. ایشور نے تمھیں ان ذرائع سے محروم کر کے تمھارے لیے زندہ، بلند اور پاک زندگی کا راستہ کھول دیا ہے۔"

اس عبارت میں انسانی ہمدردی کی تلقین کی گئی ہے جس کی افادیت اور بلندی سے انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

اسلوب

اس میں کوئی شک نہیں کہ "گئودان" موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے. مگر اس کا اسلوب بھی قابل توجہ ہے. چونکہ "گئودان" کے پلاٹ کا تعلق دیہات سے ہے اس لیے پریم چند نے جہاں کہیں دیہات کے باشندوں کی گفتگو دکھائی ہے. اس کی زبان بڑی حد تک دیہاتی ہے. اس لب ولہجہ سے خیالات میں تاثیر پیدا ہوگئی ہے اور جذبات میں صداقت جھلک اٹھی ہے.

ایک موقع پر بھولا ہوری سے کہتا ہے.

"میں نے تم سے ناحق بھوسے کی چرچا کی تھی"

ہوری جواب دیتا ہے.

"تم نہ کہتے اور پیچھے سے مجھے معلوم ہوتا تو بڑا رنج ہوتا کہ تم نے مجھے اتنا گیر سمجھ لیا. موکے پر بھائی کی مدد نہ کرے تو کام کیسے چلے"

اس گفتگو میں ناحک (ناحق) گیر (غیر) اور موکے (موقع) کے الفاظ دیہاتی زبان کی نمائندگی کر رہے ہیں.

مندرجہ ذیل جملے بھی ملاحظہ فرمائیے.

(۱) ہوری دھنیا سے کہتا ہے. "کیا سسرال جانا ہے جو پانچوں پوساک (پوشاک) لائی ہے۔"

(۲) ہوری کہتا ہے "بھگوان کہیں ٹھیک بر کھا کر دیں اور پیڑ بھی ٹھیک سے رہیں تو ایک گائے جرور (ضرور) لے گا۔"

(۳) بھولا کہتا ہے۔ "مالک کیا کھا کے لیں گے. بھینٹ نجرانے (نذرانے) میں مل جائے تو بھلے ہی لے لیں۔"

(۴) ہوری بھولا سے کہتا ہے "دھنیا، تمھارے سبھاؤ سے بڑی کھس (خوش) رہتی ہے۔"

(۵) ہوری ہیرا کے بارے میں کہتا ہے. "گسیدر (غصہ ور) ہے پر دل کا ساپھ (صاف) ہے."

(۶) دلاری ہوری سے کہتی ہے۔ "پہلے میرے رو پیے دو تب اکھ کاٹنے دوں گی. میں جتنا گم (غم) کھاتی ہوں اتنا ہی تم سیر (شیر) ہوتے ہو۔"

پریم چند نے "گئودان" میں جابجا ہندی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں. جو نہایت مناسب معلوم ہوتے ہیں

ایک جگہ ہوری کہتا ہے۔

"کوئی سوارتھی (خود غرض) زمیندار ہوتا تو کہتا گائیں جائیں بھاڑ میں ہمیں روپیے سے۔ ہم کیوں چھوڑیں"

بھولا کہتا ہے۔ "جو دشٹ (ظالم) کسی عورت کو تاکے اسے گولی ماردینی چاہیئے۔"

"گئودان" میں کہیں کہیں طنز و ظرافت کے بھی چھینٹے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ پریم چند کوئی طنز نگار مصنف نہیں ہیں مگر وہ اس آرٹ سے واقف ہیں اور اس سے حسب ضرورت کام لیتے ہیں۔

پریم چند تنخا صاحب پر طنز کا وار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"تنخا صاحب بڑے کاٹ پیچ کے آدمی تھے۔ سودا پٹانے میں، معاملہ سلجھانے میں، اڑنگا لگانے میں، بالو سے تیل نکالنے میں، گلا دبانے میں اور دم جھاڑ کر نکل جانے میں بڑے ہوشیار تھے۔ کہیے تو ریت میں ناؤ چلادیں۔ پتھر پر دوب اگادیں۔"

پریم چند نے طنز و ظرافت کے پھول ایک اور موقع پر کھلائے ہیں۔

گوبر کے دروازے پر گردھر جھنگری سنگھ کی نقل اتارتا ہے۔ جھنگری سنگھ کھانا کھارہے ہیں اور پہلی ٹھکرائن پنکھا جھل رہی ہیں۔ ٹھاکر نے ان سے کہا اب بھی تمھارے دیپر وہ جوبن ہے کہ کوئی جوان دیکھ لے تو وہ تڑپ جائے ٹھکرائن نے کہا کہ اسی لیے نئی نویلی دلھن لائے ہو۔ ٹھاکر نے جواب دیا وہ تمھاری سیوا کے لیے ہے۔

جب چھوٹی ٹھکرائن نے یہ سنا تو وہ روٹھ گئی۔ ٹھاکر نے پوچھا کیوں روٹھی ہو لاڈلی۔ اس نے کہا جہاں تمھاری بی ہو وہاں جاؤ۔ میں تو دوسروں کی سیوا ٹہل کرنے کے لئے آئی ہوں۔

ٹھاکر نے کہا نہیں تم میری رانی ہو اور تمھاری سیوا ٹہل کرنے کے لیے وہ بڑھیا ہے۔ بڑھیا نے سنا تو وہ جھاڑو لیکر دوڑی، ٹھاکر گھر سے باہر بھاگے۔

ایک اور نقل میں ٹھاکر صاحب کی دھجیاں اڑائی گئی ہیں۔ ایک کسان نے ٹھاکر صاحب سے دس روپے قرض لیے۔ ٹھاکر صاحب نے تمسک دس روپے کا لکھوایا اور ہاتھ پر پانچ روپے رکھے۔ حساب یوں سمجھایا۔ ایک روپیہ نذرانے کا۔ دوسرا روپیہ لکھائی کا۔ تیسرا روپیہ کاگد کا۔ چوتھا روپیہ دستوری کا۔ پانچواں روپیہ سود کا۔ باقی بچے پانچ روپے۔ وہ نقد لو۔ کسان نے وہ پانچوں روپے واپس کردے اور کہا۔ "ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائن کا نذرانہ۔ دوسرا روپیہ بڑی ٹھکرائن کا نذرانہ۔ تیسرا روپیہ چھوٹی ٹھکرائن کو پان کھانے کو۔ چوتھا روپیہ بڑی ٹھکرائن کو پان کھانے کو۔ پانچواں روپیہ تمھارے کریاکرم کے لیے۔"

غرضیکہ "گئودان" میں کہیں کہیں طنز و ظرافت کے اسی قسم کے شگوفے کھلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

[illegible] کوئی شک نہیں کہ پریم چند اسلوب کی طرف خاص طور سے توجہ نہیں کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی توجہ کا خاص مرکز موضوع ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ان کے یہاں بعض مقامات پر انشائیہ کا حسین رنگ جھلک اٹھتا ہے۔ ان کی انشائیہ نگاری میں خاص طور سے رمزیت شامل ہوتی ہے۔ پریم چند ہوری اور دھنیا کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

"ازدواجی زندگی کی صبح میں تمنّا اپنے گلابی نشے کے ساتھ طلوع ہوتی ہے اور دل کے آسمان کو پورے طور پر اپنی سنہری کرنوں سے رنگ دیتی ہے۔ پھر دوپہر کی تیز تپش کا وقت آتا ہے۔ دمبدم بگولے اٹھتے ہیں۔ اور زمین کانپنے لگتی ہے۔ تمنّا کا سنہرا پردہ ہٹ جاتا ہے اور اصلیت اپنی عریاں [illegible] آگے آکھڑی ہوتی ہے۔ اس کے بعد آرام [illegible] آتی ہے۔ مسرور اور سکون افزا۔ جب ہم تھکے ہوئے

مسافروں کی طرح دن بھر کی مسافت کا حال کہتے اور سنتے ہیں۔ بے غرضانہ انداز سے گویا ہم کسی اونچی چوٹی پر جا بیٹھے ہیں۔ جہاں نیچے کا شور و غل ہم تک نہیں پہنچتا۔"

ہم کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ انشائیہ کا یہ ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ پریم چند کی انشائیہ نگاری کا ایک اور حسین نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ گوبر اور جھنیا کی محبت کے بارے ہوری کہتا ہے۔

"جس روئی کے گالے کو نیلے آسمان میں ہوا کے جھونکوں سے اڑتا دیکھ کر وہ صرف مسکرایا تھا وہی سارے آسمان میں پھیل کر اس کے راستے کو اتنا تاریک بنا دے گا جو تو کوئی دیوتا بھی نہ جان سکتا تھا۔"

گوبر جب کمسن تھا اسی وقت سے اس سے گاؤں کی بھاوجیں تفریحاً مذاق کر لیتی تھیں۔ اس بات کو پریم چند یوں لکھتے ہیں۔

"ان کی نگاہوں میں ابھی اس کے شباب میں صرف پھول لگے تھے۔ جب تک پھل نہ لگ جائیں ڈھیلے پھینکنا بے کار تھا۔"

مندرجہ ذیل رمزیہ انداز بھی قابل توجہ ہے

جھنیا گوبر سے کہتی ہے۔ "اب تم کاہے کو یہاں آؤ گے۔"

گوبر جواب دیتا ہے۔ "اگر بھکاری کو ملنے کا آسرا ہو تو وہ دن بھر اور رات بھر داتا کے دروازے پر کھڑا رہے۔"

ایک موقع پر جھنیا گوبر سے کہتی ہے۔ "منہ سے جان دینے والے بہتوں کو دیکھ چکی۔ بھونروں کی طرح پھول کا رس لے کر اڑ جاتے ہیں۔ تم بھی اسی طرح نہ اڑ جاؤ گے؟"

پریم چند تشبیہات کا استعمال بھی حسین انداز میں کرتے ہیں ان کی مندرجہ ذیل تشبیہات ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) "گائے من مارے اداس بیٹھی تھی جیسے کوئی بہو سسرال سے آئی ہو۔"

(۲) "جیسے پھیلا ہوا پانی ایک سمت میں ہو کر تیزی سے بہنے لگتا ہے وہی حالت ہوری کی ہو رہی تھی۔"

(۳) "مہتا انھیں خیالات میں غرق تھے کہ وہ لڑکی مس مالتی کو ساتھ لیے آ پہنچی۔ ایک جنگلی پھول کی طرح دھوپ میں کھلی ہوئی۔ اور دوسری گملے کے پھول کی طرح دھوپ کے زرد اور مرجھائی ہوئی۔"

پریم چند تضاد سے بھی کام لیتے ہیں۔ مثلاً گوبر باغ میں نوکر ہے اور سخت محنت کر رہا ہے۔ پریم چند لکھتے ہیں

"وہ خود سوکھا جاتا تھا مگر باغ ہرا ہو رہا تھا۔"

پریم چند اپنی عبارت میں تجنیس کا بھی استعمال کرتے ہیں

"سب سے پہلے ایک پچھائیں گائے لے گا جو چار پانچ سیر دودھ دے گی۔ اور دادا سے کہے گا کہ تم گئو ماتا کی سیوا کرو۔ جس سے تمہارا لوک بھی بنے گا اور پرلوک بھی۔"

اس عبارت میں لوک اور پرلوک میں تجنیس ناقص کی خوبی ہے اور لطف دے رہی ہے۔

بہرحال "گئودان" کا اسلوب بہت اہم نہیں ہے۔ اس کے باوجود اُن کے اس ناول میں اسلوب کی حسین جھلکیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔

فلسفۂ حیات

پریم چند کا ناول "گئودان" مقصدی ہے۔ وہ ہندوستان میں سوشلزم لانا چاہتے تھے۔ وہ بڑی حد تک کمیونزم سے بھی متاثر تھے۔ خصوصاً روس کے انقلاب سے انھوں نے تأثرات حاصل کیے تھے۔ اس کے باوجود ہم ان کو مکمل طور سے کمیونسٹ نہیں کہہ سکتے ہیں مگر پریم چند اتنا ضرور چاہتے تھے کہ ہندوستان میں کسانوں کی حالت درست ہو۔ ان کی مفلسی دور ہو اور وہ خوشحالی کی زندگی بسر کریں۔

"گئودان" میں مختلف مقامات پر سوشلزم اور کمیونزم پر بحث ملتی ہے۔ پریم چند نے اپنے نظریات کو ان مباحث کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ رائے صاحب ہوری سے کہتے ہیں۔

"علامات سے ظاہر ہے کہ ہمارا طبقہ بہت جلد مٹ جانے والا ہے۔ میں اس دن کا خیر مقدم کرنے کو تیار بیٹھا ہوں ایشور وہ دن جلد لائے وہ ہمارے اودھار کا دن ہوگا۔ ہم موجودہ حالتوں کے شکار بنے ہوئے ہیں۔ وہی ہمارا ستیاناس کر رہی ہیں۔ اور جب تک پونجی کی یہ بیڑیاں ہمارے پیروں سے نہ نکلیں گی تب تک یہ نحوست ہمارے سر پر منڈلاتی رہے گی۔ ہم انسانیت کا وہ درجہ نہ پا سکیں گے جس پر پہنچنا زندگی کا انتہائی مقصد ہے۔"

ان سطور میں رائے صاحب اشتراکیت کی ترویج کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ ترویج بڑی حد تک مصنوعی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفے کے پروفیسر مہتا دھنش یگیہ کے دن رائے صاحب اور دیگر معاصرین سے کہتے ہیں۔

"بھئی میں سوالوں کا قائل نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری زندگی ہمارے اصولوں کے مطابق ہو۔ آپ کسانوں کے بہی خواہ ہیں۔ انھیں انواع و اقسام کی مراعات دینا چاہتے ہیں۔ زمینداروں کے اختیارات چھین لینا چاہتے ہیں۔ بلکہ انھیں آپ سماج کی نحوست کہتے ہیں۔ مگر پھر بھی آپ ہیں ویسے ہی زمیندار جیسے ہزاروں اور ہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ کسانوں کے ساتھ رعایت ہونی چاہیئے تو پہلے آپ خود شروع کریں۔ کسانوں کو نذرانہ لیے بغیر پٹے لکھ دیں۔ بیگار بند کر دیں۔ اضافہ لگان سے درگزر کریں۔ چراگاہیں چھوڑ دیں۔ مجھے ان لوگوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے۔ جو باتیں تو کرتے ہیں کمیونسٹوں کی سی مگر زندگی ہے رئیسوں کی سی۔ اتنی ہی عیش پسندی اور خود غرضی سے معمور"

"رائے صاحب مہتا کو جواب دیتے ہیں۔ میں اچھا خیال رکھتے ہوئے بھی اپنا سوار تھ نہیں چھوڑ سکتا اور چاہتا ہوں کہ ہمارے طبقے کو حکومت کی طاقت اور طرز عمل کے ذریعہ سے اپنا سوارتھ چھوڑ دینے کے لیے مجبور کر دیا جائے۔ آپ اسے بزدلی کہیں گے میں مجبوری کہتا ہوں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ کسی کو بھی دوسروں کی محنت پر موٹے ہونے کا حق نہیں ہے دوسروں کے بل پر جینا انتہائی بے عزتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نظام نے ہم زمینداروں میں کتنی عیش پسندی، کتنی بدچلنی، کتنی غلامی اور کتنی بے شرمی بھر دی ہے یہ میں خوب جانتا ہوں۔۔۔ ۔ ۔ اس شان کو نبھانے کے لیے ہمیں اپنے ضمیر کا اتنا خون کرنا پڑتا ہے کہ ہم میں خود داری کا نام نہیں رہ گیا ہے۔ ہم اپنے اسامیوں کو لوٹنے کے لیے مجبور ہیں۔ اگر افسروں کو قیمتی ڈالیاں نہ دیں تو باغی کہے جائیں۔ اور شان و شوکت سے نہ رہیں تو کنجوس کہلائیں انقلابی تحریک کی ذرا سی آہٹ پر ہم کانپ اٹھتے ہیں اور وزیروں کے پاس فریاد لے کر دوڑتے ہیں"

رائے صاحب کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا رجحان کمیونزم کی طرف ہے۔ مگر ان کے سامنے کچھ مجبوریاں ہیں جو درست ہیں۔ پروفیسر مہتا بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

"میرا اس نظام پر اعتقاد نہیں ہے۔۔۔ ۔۔۔۔ میں اس اصول کا حامی ہوں کہ دنیا میں چھوٹے بڑے ہمیشہ رہیں گے۔ اور انھیں ہمیشہ رہنا چاہیئے۔ اسے مٹانے کی کوشش کرنا بنی نوع انسان کو تباہی کا موجب ہوگا۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھ میں آپ میں فرق اتنا ہے کہ میں جو کچھ مانتا ہوں اس پر عمل کرتا ہوں اور آپ لوگ مانتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ۔۔۔ ۔۔۔۔۔ ۔۔۔ دولت کو آپ کسی بے انصافی کے ذریعہ برابر پھیلا سکتے ہیں۔ مگر عقل، کردار، خوبصورتی، دیانت، طاقت کو برابر پھیلا دینا تو آپ کی سکت سے باہر ہے۔"

پروفیسر مہتا آگے چل کر کہتے ہیں۔

" رائے صاحب میں تو اتنا جانتا ہوں کہ جو اوزار کو سے لوہار کام کرتا ہے ان اوزاروں سے سنار نہیں کرتا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آم بھی اسی حالت میں پکے پھولے جیسے ببول یا تاڑ۔"

دراصل پریم چند کے عہد میں کمیونزم اور سوشلزم کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ مگر اس پر عمارت تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ لیکن پریم چند ان جدید خیالات سے آگاہ تھے۔ وہ خود مساوات کے قائل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسان کو اپنی محنت کا پھل ملنا چاہیئے مگر اس کی محنت سے فائدہ زمیندار، پٹواری، تھانیدار اور مہاجن وغیرہ اٹھاتے ہیں۔ اس لیے کسان محنت کے ثمرہ سے محروم رہتا ہے۔

پریم چند ایک ذہین انسان تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں آتے ہوئے انقلاب کے قدموں کی آہٹ کو سن لیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے کسانوں کو ایک دن پیدا ہوتا ہے۔ اور حالات کو بدلتا ہے۔ "گئودان" کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ پریم چند کے ذہن میں سوشلزم کے خیالات پروان چڑھ رہے تھے۔ "گئودان" نئے انقلاب کی ایک علامت ہے اور نئے نعرے کی ایک گونج ہے۔

نئی تشکیل شدہ حکومت

اُتر پردیش کا مستقبل

سنوارنے کے لئے پوری طرح کمربستہ

پسماندہ اقوام کی طرف خاص توجہ

○ ملازمتوں میں ہریجنوں کو ۱۸ فی صدی حصہ فوراً دیا جائے گا۔

○ پچاس فی صد پولیس کانسٹبل کی خالی جگہیں ہریجنوں کے لئے محفوظ۔

○ چار لاکھ ہریجن خاندانوں کو مکان بنانے کے لئے زمین جلد ہی الاٹ کی جائیں گی۔

○ مارچ تک ۷۸۰۰ گاؤں میں ہریجنوں کے لئے ۷۸۰۰ مکان تیار کر دیئے جائیں گے۔

○ ہریجنوں کو پریشان کرنے کے معاملات میں مقامی پولیس اور سول عہدیداروں سے جواب طلب کیا جائے گا۔

○ ریاست کے سرکاری اور غیر سرکاری ڈگری کالجوں کے ہوسٹلوں میں ۱۸ فی صد جگہیں ہریجن طالب علموں کے لئے محفوظ۔

ذخیرہ اندوزی اور چوربازاری کے خلاف سخت اقدامات

غلے کی ذخیرہ اندوزی، چوربازاری اور ملاوٹ کی روک تھام کے لیے سخت سزا کا بندوبست۔

○ ضلع افسروں اور ڈویژنل کمشنروں کے ذریعہ راشن کی دکانوں کی مسلسل جانچ۔

○ مٹی کے تیل، ڈیزل اور کھاد کی سپلائی میں اضافہ

(الف) مٹی کے تیل پر کنٹرول ختم۔

(ب) گیہوں کا راشن دوگنا۔

○ شکر ملیں اگر اپنی صلاحیت کے مطابق پیداوار اور سپلائی نہ کریں گی تو انھیں تومیا لیا جائے گا۔

کسانوں کو سینچائی کی سہولت بجلی کی سپلائی ملوں کی تعمیر آمد و رفت کا مناسب بندوبست

○ کسانوں کو اب روزانہ ۱۸ گھنٹے بجلی مہیا کی جائے گی۔
○ ٹیوب ویل والے علاقوں کے کسانوں کو پاس بک کا انتظام۔
○ بجلی کی پیداوار پہلے کے مقابلے میں ڈیوڑھی۔
○ بجلی سے چلنے والے کولھوؤں کو فوراً بجلی ملے گی۔
○ صنعتی اداروں میں مزید ۹ گھنٹے کی شفٹ۔
○ ڈلا (مرزا پور) سیمنٹ کارخانے کی توسیع شروع
○ شہری گرھوال میں سیمنٹ اور گھڑی کے کارخانے جلد ہی قائم کئے جائیں گے۔
○ سیلاب سے متاثر ضلعوں کے ایک ایکڑ تک کی جوت سے کسانوں کو مفت بیج۔
○ ۲۲ چھبیس قلت زدہ اضلاع میں ٹسٹ ورک دوبارہ شروع۔
○ کاشت کار مزدوروں کو زیادہ مزدوری
○ چھوٹے کسانوں کو کھاد کی سپلائی میں ترجیح۔

پروجیکٹ جن کی بنیادیں رکھی جاچکی ہیں

● کتائی ملیں:۔ سندیلہ بارہ بنکی جھانسی اکبر پور اور مئو ناتھ بھنجن۔
● چینی ملیں:۔ قائم گنج (فرخ آباد) ہردوا گنج (علی گڑھ) سیٹھیاؤں (اعظم گڑھ) اور رسڑا (بلیا)
● پُل:۔ فتح گڑھ، باندہ، جھانپل، کین پل (چترکوٹ باندہ) گنگا پل (بجنور) رام نگر۔ وارانسی گنگا پل، جل سیتو، لکھنؤ۔
● ریل:۔ رام پور۔ ہلدوانی۔
● نہر:۔ سون پمپ نہر، مرزا پور

○ بجلی [illegible] تھانسی ۱۱۰ میگاواٹ بجلی کا سامان ہردوا [illegible] (مرزا پور) آپ بجلی گھر نردیا (بلند شہر)
○ ڈلا سیمنٹ کارخانے کی توسیع۔
○ چھوٹی فولاد کی بھٹی ہلدھر پور (بلیا)

پروجیکٹ جن کا افتتاح ہوچکا ہے

○ شاردا سہائک منصوبہ براج لکھیم پور کھیری
○ بھارت الکٹرانکس کارخانہ غازی آباد
○ پاٹھا پینے کے پانی کی [illegible] اسکیم کرو، باندہ)
○ ہرن پورا باندہ، نینی تال۔
○ زرعی یونیورسٹی فیض آباد۔

ٹیچرس اور سرکاری ملازمین کو راحت

● ثانوی اسکولوں کے اساتذہ اور غیر تدریسی ملازمین کی تنخواہ اور مہنگائی بھتہ سرکاری اسکولوں کے ملازمین کے برابر۔
● یونیورسٹیوں کی مالی مشکلات حکومت حل کرے گی۔
● کمایوں اور گڑھوال میں دو نئی یونیورسٹیاں۔
● فیض آباد میں زرعی یونیورسٹی۔
● یونیورسٹیوں میں نئے ہوسٹلوں کی تعمیر اسی سال سے شروع۔
● سرکاری ملازمین جن کی مدت ملازمت جنوری ۱۹۷۴ء کو تین سال پوری ہوگئی ہو ان کو مستقل کر دیا جائے گا۔

مکان کرایہ الاؤنس ۵۰۰ روپئے تک تنخواہ پانیوالے ملازمین کو دیا جائے گا دفتروں میں دہلی کونسل کی طرح جوائنٹ مصالحتی کمیٹیوں کی تشکیل آئندہ ۳۱ مارچ تک کر دی جائے گی۔

محکمہ اطلاعات اتر پردیش کی جانب سے جاری کردہ

کیا آپ اُتّر پردیش میں صنعت قائم کر رہے ہیں

براۓ کرم درج ذیل مقاصد کیلئے ہم سے رابطہ قائم کیجئے

۱۔ کم شرح سود اور آسان قسطوں کی بنیاد پر سکندر آباد، وارانسی، ہردوار، بریلی، سندیلہ، لکھنؤ، آناؤ، کانپور، راۓ بریلی، نینی (الہ آباد) میں صنعتی پلاٹوں کی دستیابی۔

۲۔ پبلک لمیٹڈ کمپنیوں کو ان کے حصہ کی پونجی کی انڈر رائٹنگ کے ذریعہ مالی امداد۔

تفصیلات کے لئے رجوع کیجئے

مینیجنگ ڈائرکٹر

یو۔پی۔ اسٹیٹ انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن لمیٹڈ

پوسٹ باکس نمبر ۱۳۴، جی. ٹی. روڈ

کانپور

فون:۔ ۶۲۸۵۷/۶۶۹۱۲

انسانو! تم شیر کے سامنے جاکر خوف زدہ نہ ہونا، وہ تمہاری ہمت کا امتحان ہے۔ تم تلوار کے نیچے سر جھکانے سے خوف زدہ نہ ہونا، وہ قربانی کی کسوٹی ہے۔ تم بڑھتی ہوئی آگ سے نہ گھبرانا وہ سونے کی آزمائش ہے۔ پر شراب سے ہمیشہ خوف زدہ رہنا، کیونکہ وہ گناہ اور برائیوں کی خالق ہے۔

بھگوان بدھ

قوم کی ترقی کے لئے شراب بندی ہمارا مقدس فریضہ ہے

مدیہ نشیدھ لوک سماج استھان وبھاگ اتر پردیش نے جاری کیا

کیا آپ جانتے ہیں؟

۱۔ زندہ رہنے کیلئے صاف پانی اور تازہ ہوا نہایت ضروری ہے۔

۲۔ انسان اناج کے بغیر تو کچھ دن زندہ رہ سکتا ہے لیکن پانی یا ہوا کے بغیر نہیں۔

۳۔ پینے کے صاف پانی کی کمی دور کرنیکے لئے اتر پردیش کی حکومت صوبہ کے ہرگاؤں میں پانی کا مناسب انتظام کرنیکے عزم کی پابند ہے

۴۔ آپ کی ذراسی لاپرواہی کے باعث ٹونٹیاں کھلی رہ جانے سے ہر سال واٹر ورکس کے شعبہ کو کروڑوں روپیہ کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ہر نل کا ۴ سے ۵ فیصد پانی ذراسی لاپرواہی کے باعث ضایع ہو جاتا ہے۔

صاف پانی اور پینے کا محفوظ پانی آپکی اپنی ملکیت ہے
اسکی حفاظت آپ کا فرض ہے
پانی کو ضایع ہونے سے بچایئے۔

سوایت شاسن ابھینترن وبھاگ
(ایل۔ ایس۔ جی۔ اے۔ ڈی) اتر پردیش

بڑھتی ہوئی آبادی اور کارخانوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ

درخت لگایئے

محکمہ جنگلات اترپردیش کے ذریعہ شائع کیا گیا۔

(تبصرے کے لئے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

آوازوں کی صلیب ـــ کوثر چاندپوری

اخلاق حسین عارف

ناشر۔ حلقۂ فکر و شعور ۱۲۳۱ بلیماراں دلی ۶
سائز ۱۸×۲۲/۱۶ صفحات ۲۸۸۔ قیمت مجلد بمعہ ڈسٹ کور بارہ روپے

کوثر چاندپوری کہنہ مشق کہانی کار ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ناول، تحقیق و تنقید اور نثر کے دوسرے اصناف پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور وہ اس میں کامیاب رہے ہیں۔

اگر میرا حافظہ درست ہے تو میں وثوق کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ موصوف کو میں گذشتہ تیس پینتیس سال سے برابر پڑھ رہا ہوں ان کے افسانے ہند اور پاکستان کے چوٹی کے ادبی جرائد میں برابر شایع ہوتے رہے ہیں موصوف اب لکھتے لکھتے بزرگ صورت ہو گئے اور میں پڑھتے پڑھتے بوڑھا ہو گیا مگر زیر نظر مجموعہ کے افسانوں کا مطالعہ کر کے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کا قلم اب تک جوان ہے۔ موصوف کی تخلیقات میں مشاہدہ کی گہرائی اور شعور میں تابندگی و لطافت ہے۔ انھوں نے عصر حاضر کی لئے میں پرانے اقدار کو بڑے فنکارانہ انداز میں سمویا ہے زبان و بیان پر پوری قدرت کے ساتھ مسائل حیات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ اس انداز سے لیا ہے کہ اس میں فنی تکنیک کے ساتھ تمام وہ پہلو آ گئے ہیں جو آج کل معاشرہ میں انسانوں کو درپیش ہیں اور بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ افسانوی فن کی بلندی پر بلند تر دکھائی دے رہے ہیں۔

زیر نظر مجموعہ کی کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہے۔ کاغذ بھی اچھا اور دبیز ہے آج کل کے کاغذ کے بحران کو دیکھتے ہوئے قیمت بھی معقول ہے اور مواد کے اعتبار سے کتاب لائق مطالعہ ہے۔

آہنگ خیال۔ مصنف حیات وارثی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۸۰ قیمت پانچ روپے مجلد بمعہ سرورق

جناب حیات وارثی آپ کے جانے پہچانے شاعر اور قلمکار ہیں کیونکہ آل انڈیا ہندی اردو سنگم کے روح رواں ہونے کی وجہ سے ان کی شخصیت سارے ہندوستان کے ادبی اور ثقافتی حلقوں پر محیط ہے۔ موصوف عرصۂ دراز سے مشق سخن کر رہے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ کئی کتابوں کے مولف اور مترجم بھی ہیں۔

حیات وارثی ایک خوش فکر اور خوش گو شاعر ہیں ان کا کلام عرصہ سے ملک کے صف اول کے ادبی جرائد میں شایع ہوتا رہا ہے اور وہ خود ہندوستان میں منعقد ہونے والے بڑے بڑے مشاعروں میں مدعو کئے جاتے ہیں اور اپنے کلام سے ہزارہا تشنگان شعر و سخن کو سرشار کرتے رہتے ہیں یہ تمام باتیں ان کے ایک اچھے اور کامیاب شاعر ہونے کی دلیل ہے۔

حیات وارثی کے کلام میں قدیم و جدید کا سنگم ہے جس میں تمام صحت مند عناصر حسن و عشق کی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ سموئے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے اشعار نقد حیات کا پہلو لئے ہوئے ان تمام معاشرتی اور ثقافتی نابرابریوں کی طرف بھی طنز ملیح کے تیر و نشتر چبھوتے ہیں جو ہمارے معاشرہ میں ایک گھناؤنی شکل میں موجود ہیں۔
شاعر حساس دل رکھتا ہے جس میں خلوص اور صداقت

کی ضیا ہوتی ہے وہ انسان کی عظمت کا خواہاں ہوتا ہے جس کا ظاہر و باطن ایک ہو اس میں ذرا سا بھی تفاوت دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتا ہے جیسا کہ ذیل کے شعر سے واضح ہے ؎

خدا شاہد ہے ایسی زندگی سے موت بہتر ہے
محبت میں اگر سود و زیاں تک بات آ پہنچی

شاعر گداز دل بھی ہوتا ہے محبوب سے ملنے کے بعد جو تاثر اس پر ہوتا ہے اس کا اظہار وہ اس طرح کرتا ہے ؎

ان سے ملتے ہی نگاہیں دل کا یہ عالم ہوا
جس طرح شیشہ کوئی پتھر سے ٹکرا جائے ہے

گدازیٔ دل تو شاعر کا حصہ ہے مگر بسا اوقات حالات سے دوچار ہونے پر اس کا کلیجہ پتھر جیسا ہو جاتا ہے اور اس میں بلا کی ہمت، بے انتہا عزم آ جاتا ہے اور وہ چلا اٹھتا ہے ؎

ہے ہمت پرواز بڑی چیز اسیرو
مایوس نہ ہونا غم بے بال و پری سے

یہ چند اشعار نمونتاً دیئے گئے ہیں ورنہ حیات کا کلام ان تمام تاثرات سے مملو ہے جس کی عصر حاضر میں اشد ضرورت ہے

یہ تو ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور اوصاف کا ہلکا سا خاکہ ہے اس رخ کے علاوہ موصوف قومی یکجہتی کے علم بردار ہیں انھوں نے اسی لئے عرصہ ہوا چند مخلص اور عزم و استقلال رکھنے والے ساتھیوں کے ساتھ آل انڈیا ہندی اردو سنگم کے نام سے ایک انجمن کی تشکیل کی اور اس کے ذریعہ سے انھوں نے ملک و قوم اور ہندی اردو ادب کے لیے گراں بہا خدمات انجام دیں اور یہ سلسلہ بڑی لگن کے ساتھ اب تک جاری بلکہ روز افزوں ترقی پذیر ہے۔

سناٹے کی آواز ـــــ بشیر فاروقی

سائز ۲۰x۳۰/۱۶ صفحات ۱۱۲ قیمت مجلد بمعہ سرورق پانچ روپے

بشیر فاروقی کا یہ پہلا شعری مجموعہ ہے۔ جو تخاب کلام کے بعد منظر عام پر آیا ہے۔ اس سے قبل ہی کلام ہندوستان کے طول و عرض میں منعقد ہونے والے بڑے بڑے شعری اجتماعات میں پڑھا جا چکا ہے۔

بشیر فاروقی کی شہرت اس لئے بہت جلد سارے ہندوستان میں پھیل گئی کہ ان کے کلام میں عصری فکر و آہنگ ہے۔ صالح نظریات اور پاکیزہ خیالات ہیں ساتھ ہی ساتھ جدید تشبیہات و استعارات اور رموز و نکات سے انھوں نے اپنے کلام کو سنوارا ہے۔ ان میں فکری جرأت و بیباکی ہے۔ وہ نئی نسل کے ان معدودے چند شعرا میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی فکری صلاحیتوں کی بناء پر بہت مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ ان کے کلام میں قدیم و جدید کا امتزاج ہے۔ بقول مجروح سلطانپوری "یہ نوجوان شاعر نگاہ روشن اور قدم استوار رکھتا ہے" اسی لیے جدید نسل کے ابھرتے ہوئے شعراء میں بشیر فاروقی کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔

ذیل کے چند اشعار سے اس امر کی نشان دہی ہوتی ہے کہ شاعر کے کلام میں غم جاناں کے ہمدوش غم دوراں کس لطیف انداز میں سمویا ہوا ہے جو ان کے تابناک مستقبل اور ہمہ گیری کی ضمانت ہے ؎

چھیڑ ہے حسن کی ہر ایک ادا
عشق کی ہر نظر جوانی ہے

ہونٹ اس کے ہیں رباعی کی طرح
آنکھ اس کی میر کا دیوان ہے

زندگی کا نصیب جاگ اٹھا
آپ دل سے کچھ اس طرح گزرے

تیری زلفوں کی بہاراں اثری بھول گئے
[illegible]

کسی حسین کے وعدوں پہ شام وقف کریں
کسی خیال کی چھاؤں میں دن گذر جائیں

—

میں اپنی فکر کے خاکوں میں رنگ بھر لوں بغیر
بس اتنی دیر مرے پاس وہ ٹھہر جائیں

—

ہمیں کو ہے یہ سلیقہ کہ ذکر مئے کی طرح
مسائل غم ہستی بیان کر جائیں ۔

—

اس لئے میں تری سمت بڑھتا گیا
تو مجھے میرے محبوب جیسا لگا

—

ابھی درکار ہے صبح تمنا کو لہو دل کا
اندھیرے مٹ نہیں سکتے فقط آنسو بہانے سے

—

قدرداں قیمت بازار سے آگے نہ بڑھے
فن کی دہلیز پہ فنکار نے دم توڑ دیا

—

یہ مسئلہ نہیں ہے کہ فن کار کیا کہے
یہ مسئلہ ہے آج کہ فن کار کیا کریں

—

کس کو مفر ملا ہے غم روزگار سے
اے جان نوازئ نگہ یار کیا کریں

—

فرصت نوحہ گری شوق ملاقات نہیں
عشق اب بھی ہے مگر شدت جذبات نہیں

—

ستاروں سے بھی کچھ آگے مصنفہ لیلیٰ لکھنوی

پبلشر اقبال پبلیکیشنز ۴۲ کاشانۂ زکیہ گولا گنج۔ لکھنؤ
سائز ۲۰×۲۶/۱۶ صفحات ۱۶۰ قیمت مجلد مع گرد پوش
چار روپے پچاس پیسے ۔

محترمہ لیلیٰ لکھنوی کا یہ افسانوی مجموعہ چودہ کہانیوں پر مشتمل ہے جو ہماری، آپ کی اور موجودہ معاشرہ میں پیدا شدہ مختلف مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے۔ کہ موصوفہ کا یہ پہلا افسانوی مجموعہ ہے مگر اس کے برعکس وہ عرصۂ دراز سے لکھ رہی ہیں اور مختلف مشہور ادبی رسائل میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے ہیں میرا خیال ہے کہ متذکرۂ بالا مجموعہ ان کی نگارشات کا انتخاب ہے مگر بہت خوب ہے۔ ان کے ہر افسانہ میں کوئی نہ کوئی مفید پہلو ہے جسے انھوں نے بڑے فنکارانہ طریقے سے نبھایا ہے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی چابکدستی سے الفاظ کے پیکر میں بڑے خوبصورت اور لطیف انداز سے سمویا ہے۔ وہ قاری کو ماضی کے ویران کھنڈروں میں بھی لے گئی ہیں، حال کے پرخار جزیرے میں بھی اور مستقبل کی حسین و تابناک وادیوں میں بھی جہاں "ستاروں سے بھی کچھ آگے" جاکر اسے اک جہان تازہ کا پیغام ملتا ہے۔

زیر نظر مجموعہ کی کتابت و طباعت اور کاغذ بہت عمدہ ہے۔ گٹ اپ بہت شاندار ہے اور افسانے لائق مطالعہ ہیں۔

"اردو" اور "تاریخ" کیسے پڑھائیں!

ان موضوعات پر اگر آپ کو کچھ ٹھوس معلومات حاصل کرنا ہے تو جناب مبشر علی صدیقی کی کتاب "اردو اور تاریخ کیسے پڑھائیں" کا بغور مطالعہ فرمائیے اور اس سے استفادہ کیجئے کیونکہ یہ مضامین ایک ایسے تجربہ کار اور کہنہ مشق مفکر اور ادیب کے قلم سے نکلے ہیں جس کی عمر کا بیشتر حصہ درس و تدریس میں گذرا اور جو اس کے علم اور مادہ کا

نچوڑ ہیں جو صفحۂ قرطاس پر بکھر گئے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں اُردو پڑھانے کے طریقوں پر مدلل رائے زنی کی گئی ہے اس کے بعد تاریخ پڑھانے کے طریقوں کو بتایا گیا ہے۔ یہ کتاب ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے جسکی قیمت غالباً تین روپیہ ہے اور سردار ہربھجن سنگھ تنہا پرو منیجر رسالہ رہنمائے تعلیم دریا گنج دلی نمبر۲ نیز بشیر علی صدیقی ایم، اے، بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج گلی وحید بخش محلہ سوتھہ بدایوں یوپی سے دستیاب ہو سکتی ہے

"کلیات قمر"

ڈاکٹر سلام سندیلوی

قمر مراد آبادی اردو کے ایک مشہور و معروف شاعر ہیں۔ وہ ایک مدت سے عروس سخن کے گیسو سنوارنے میں مصروف ہیں۔ ان کی شاعری میں پختگی اور پختہ مشقی پائی جاتی ہے۔ وہ ایک کلاسیکل شاعر ہیں جو مختلف ادبی تحریکات کے اثرات سے مبرا ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری میں دوامی قدریں پائی جاتی ہیں۔

قمر مراد آبادی کی شاعری میں ایک نمایاں خصوصیت یہ پائی جاتی ہے کہ وہ فرسودہ اور پامال مضامین کو ایک نئے انداز سے باندھتے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری میں جدت اور ندرت پیدا ہوئی ہے۔ ان کی شاعری نئے نئے خیالات کی کلیاں چٹکاتی ہے جس سے دل و دماغ معطر ہوتے ہیں۔

قمر مراد آبادی کی غزلوں میں بحر روانی اور سلاست موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دریا کی موجیں ہیں جو ترنم ریزی کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ ان کی غزلیں حشو و زوائد سے پاک ہیں۔ ان کی غزل کا ہر مصرع ایک تیر معلوم ہوتا ہے جو دل کے پار ہو جاتا ہے۔ مگر اپنی خلش گوشۂ دل میں چھوڑ جاتا ہے۔

قمر صاحب نے اپنے ماحول کا بھی جائزہ گہرائی کے ساتھ لیا ہے۔ وہ چشم بینا رکھتے ہیں۔ ان کے تجربات وسیع ہیں — انھوں نے حیات و کائنات کے مختلف مسائل پر حسین انداز میں تبصرہ کیا ہے اس لحاظ سے ان کی غزل کا دائرہ محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس میں حسن و عشق کی داستان، تصوف و فلسفہ کی گہرائی، اخلاق و مذہب کے اصول، ماحول کی حقیقی عکاسی اور دور حاضر پر بھرپور معروضات ہے۔ ان کے کچھ چند حسین اشعار درج ذیل ہیں جو ان کے کلام کی نمائندگی کرتے ہیں۔

بے ربط خیالوں میں الجھ جائیں گے ہم اور
سلجھے گی تری زلف تو پڑ جائیں گے خم اور

اللہ رے احساس محبت کی نزاکت
جب ان کا خیال آیا تو گھبرا گئے ہم اور

بجلیاں اپنے نشیمن پہ گرا لیں میں نے
تاکہ شعلہ نہ کوئی صحن چمن تک پہونچے

مرے دل کی خاک میں ہیں ابھی کچھ شرارے پنہاں
ابھی مطمئن نہ ہوتا مجھے پائمال کرکے

ہم نے مجبوریوں سے کام لیا
اختیارات جب نہ کام آئے

چرچے مرے جنون و وفا کے کدھر نہیں
یہ اتفاق ہے کہ تمہیں کچھ خبر نہیں

پھولوں پہ رک گئی تھی ذرا دیر چشم شوق
دل نے کہا کہ یہ کوئی مقام نظر نہیں

پھول سے خون تمنا کوئی ابھر آئے گا
ان بہاروں کو ذرا اور نکھر آنے دو

ان چند اشعار سے قمر مراد آبادی کے کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے ان اشعار میں نسرین و نسترن کی مہک اور لعل و گہر کی چمک موجود ہے۔ میرے نقطۂ نظر سے "کلیات قمر" اردو شاعری میں ایک حسین اضافہ ہے۔

اخلاق حسین عارف

صہبائے غزل ـ ایس. این سنہا

سائز کتاب ۲۲ × ۱۸ ـ صفحات ۲۵۶
قیمت مجلد بمعہ گرد پوش آٹھ روپے۔
ملنے کا پتہ: سی ۵ دلکشا کالونی لکھنؤ۔
کاغذ اعلیٰ۔ کتابت طباعت عمدہ۔

متذکرہ بالا تصنیف شاعر کی ۵۲ غزلوں پر مشتمل ہے جس میں چار ہندی کی غزلیں بھی شامل ہیں۔ بقول مصنف، یہ ان کے کلام کا انتخاب ہے۔ اس میں انھوں نے دوسرے اصناف سخن کو جگہ نہ دیتے ہوئے غزلیں ہی شامل کی ہیں توقع ہے کہ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام نظم اور دوسرے اصناف سخن پر مشتمل ہوگا۔

فرانس کا سب سے بڑا نقاد سین بیو کہتا ہے کہ "میں جب کسی شاعر کا مطالعہ کرتا ہوں تو پہلے اس کے ادبی و فنی اور فکری محاسن پر نظر نہیں ڈالتا بلکہ یہ دیکھتا ہوں کہ ... مصنف کتنا اچھا آدمی ہے۔"

پروفیسر آل احمد سرور کا تعارف جو کتاب کے اولین صفحات میں ہے۔ اس کے مطالعہ سے مترشح ہوا کہ سنہا صاحب بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ان کے والد گرامی علی گڑھ کے چوٹی کے وکیل تھے یہی نہیں بلکہ وہ انسان دوست اور وسیع المشرب بھی تھے۔

میں جتنی بار سنہا صاحب سے ملا ہر بار یہی تأثر لیکر اٹھا کہ وہ کتنے خلیق، کتنے شریف النفس واقع ہوئے ہیں نیکی اور شرافت جو زندگی کے سب سے بڑے جوہر ہیں ادب و شاعری کے بھی سب سے قیمتی جوہر و عناصر ہیں۔ حقیقی ادبی تخلیق حقیقت میں ایک اخلاقی عمل ہے سنہا صاحب کی شخصیت او ... دونوں میں جو صفت سب سے زیادہ [illegible] ہے۔ جس میں تصنع کا شائبہ تک نہیں۔ زندگی کا یہی خلوص میرے خیال میں ان کی شاعری کا محرک اور اخلاق ہے۔ ان کے خیالات اور ان کے لہجے میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ ایک طرف اعلیٰ ترین مغربی ادبیات وعلوم سے بہرہ ور دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف فارسی اور اردو ادب پر حاوی نظر آتے ہیں اور اس کے انھوں نے شاعری کے قدیم روایتی اور رچے ہوئے ایسے ماحول میں تربیت پائی ہے جو مشرقی تہذیب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی اس فضا اور ماحول کے اثرات نے انھیں اپنی زندگی سنوارنے اور متوازن بنانے میں بڑی مدد دی اور اسی وجہ سے ان کے تغزل کا رنگ دل نشیں اور روح گیر ہوگیا جس میں متانت اور بصیرت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

سنہا صاحب کے کلام کا غائر مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا انداز بیک وقت نرم، متوازن، سنجیدہ اور حساس ہے احساس میں گہرائی اور لہجے میں توانائی کے ساتھ مشاہدہ، خلوص اور زندگی کی ہمہ گیری نمایاں ہے۔ خیالات وجذبات قلب و نظر اس تربیت و تہذیب کا پتہ دیتے ہیں جو انھیں ورثہ میں ودیعت ہوئی ہے۔ ان کے کلام میں قابلِ رشک شستگی و شگفتگی ہے۔ اشعار میں ان کا پورا کردار جھلک رہا ہے جس میں ادبی توازن، سادگی، پرکاری اور بے حد دلکشی ہے جو ان کے ایک خوشگوار اور ممتاز شاعر ہونے کی دلیل ہے۔

جناب سید صفدر حسین عابدی نے یکایک اپنا مضمون جو مانی جائسی پر قسط وار شائع ہو رہا تھا موقوف کر دیا اس لئے ہمیں افسوس ہے کہ یہ سلسلہ بند ہوگیا۔

Approved by the Government of Jammu & Kashmir for Libraries

ماہنامہ

ترنم

لکھنؤ



Editor
Najma Akhlaque

3(3)

Sub-Editor
IQBAL AKHTER

Price
Re. 1-00

ANNUAL
Rs 10-00

حکومت جموں و کشمیر کی لائبریریوں کیلئے منظور شدہ

ممبر آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس

ماہنامہ ترنم لکھنؤ

جلد نمبر ۳ .... شمارہ نمبر ۳

مدیرہ ۔ نجمہ اخلاق
نائب مدیر ۔ اقبال اختر

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

سالانہ دس روپے

فون نمبر ۲۹۲۵۰

• پرنٹر پبلشر پروپرائٹر ۔ نجمہ اخلاق
• کتابت ۔ ایس۔ این۔ ایچ نقوی
• طباعت ۔ نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۳
• مقام اشاعت ۔ ۱۵/۱ احتشام نگر لکھنؤ
۲۲۶۰۰۱

عنوانات

سوز و ساز

اُردو کسی کی مادری زبان نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی دین ہے اسکی آبیاری ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بنگالی، پارسی اور دوسرے معتقدات رکھنے والے حضرات کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہ ہندوستان کے کسی مخصوص خطہ کی بھی زبان نہیں ہے بلکہ پورے برصغیر پر بسنے والوں کی میٹھی لطیف اور لچک دار بولی ہے اس سے سبھی لوگ محبت کرتے ہیں ہندوستان کے چاہے جس علاقہ میں چلے جایئے اگر آپ اس زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو ہر شخص بلا تامل آپ کے مفہوم سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

گذشتہ سال نومبر میں لکھنؤ میں ایک آل انڈیا غیر مسلم مصنفین کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے مندوبین نے شرکت کر کے اس بات کو ثابت کر دیا جس کا اظہار اوپر کے کالم میں کیا گیا۔ اس کے چند ہی روز بعد اسی لکھنؤ میں کل ہند اُردو ایڈیٹرس کانفرنس کا تین روزہ اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں بھی ملک کے طول و عرض سے بزرگ، کہنہ مشق اور نوجوان صحافیوں کی کئی سو کی تعداد نے شریک ہو کر اس بات پر مہر توثیق ثبت کی آخر الذکر کانفرنس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور دیگر معتقدات کے صحافی شریک تھے۔ ہماری خوش قسمتی سے اس اجلاس میں ملک کی ہوش مند، ترقی پسند اور مایۂ ناز وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے بھی شرکت فرمائی ان کے علاوہ جناب اندر کمار گجرال، گورنر اتر پردیش، وزیر اعلیٰ اتر پردیش، جناب ہیم وتی نندن بہوگنا، جناب کملا پتی ترپاٹھی، جناب شیخ عبداللہ، مرکزی حکومت کے اعلیٰ افسران نیز صوبائی حکومت کے افسران و محکمہ اطلاعات و نشریات کے اعلیٰ افسران اور دیگر افسران و عملہ اُردو شائقین کی کثیر تعداد میں شرکت اس بات کا ثبوت تھی کہ اُردو ایک ہمہ گیر زبان ہے یہ مذہب و ملت کے دامن سے وابستہ نہیں بلکہ عوام کے دلوں میں جاگزیں ایک زندہ زبان ہے۔

ایسی ہمہ گیر، لچکیلی، لطیف اور میٹھی بولی کے خلاف ابھی حال میں مہاراشٹر اسمبلی میں اس وقت خاصی گرما گرمی اور سرکاری حلقہ اور شیو سینا میں جھڑپ ہوئی جبکہ اُردو پندرہ روزہ سرکاری پرچہ "قومی راج" کا اجراء کیا گیا۔ ہمیں شیو سینا کی اس گندی ذہنیت کے اظہار پر سخت افسوس ہے جس کی ہم کھل کر مذمت کرتے ہیں اور ہمارے ساتھ ہمارے وہ تمام ساتھی صحافی، افسانہ نگار، شاعر، تنقید نگار، سبھی شریک ہیں جو اُردو سے محبت کرتے ہیں اور اردو میں لکھتے ہیں ہمیں ان تنگ نظر سیاست دانوں کا ہر محاذ پر ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے تاکہ اردو کی مخالفت میں جس گوشہ سے بھی آواز اُٹھے اس کا ہم منہ توڑ جواب دیں۔

نجمہ اخلاق

جاوداں

پریم وار برٹنی

میں نے کھولے جب ترے بند قبا
کھل گئے لاکھوں شبستانوں میں پھول
تو نے چھیڑی جب مری تازہ غزل
چاندنی میں کھو گئی راہوں کی دھول
دو دلوں کے زخم لَو دینے لگے
ظلمتوں میں جام روشن ہو گئے
ہم اگر رسوا ہوئے تو کیا ہوا
منزلوں کے نام روشن ہو گئے
ہم گنہگارِ محبت ہیں، اسی الزام میں
ہم کو زخموں کے سلگتے تاج پہنائے گئے
ہم صلیبوں پر ہزاروں بار لٹکائے گئے
ہم بدلتے وقت کے ہر باب کا عنواں رہے
تو تھی جوئے شیر تو میں تیشۂ فرہاد تھا
ہر ستم ہر حادثے ہر امتحاں کے باوجود
اپنے گیتوں سے محبت کا نگر آباد تھا
ہم نئے نغمے، پرانے ساز پر گاتے رہے
آئینہ ہر دور کی عظمت کو دکھلاتے رہے
مختلف لفظوں کے گاتے گنگناتے روپ میں
ہم کو حسن و عشق کی تاریخ دہراتی رہی
دھیرے دھیرے ہر صدی آتی رہی جاتی رہی

ہم جہاں میں مثلِ مہر و ماہ تابندہ رہے
گردشِ افلاک کے ہر دور میں زندہ رہے
گنگناتے آبشاروں سے جنم ہم نے لیا
حسنِ فطرت کی بہاروں سے جنم ہم نے لیا
ہم پگھلتے برف زاروں کا مقدس روپ ہیں
ہم ہی رخسارِ دو عالم کی سنہری دھوپ ہیں
آنسوؤں کی آگ بن کر ہم چناروں میں رہے
کہکشانی راگ بن کر لالہ زاروں میں رہے
دلہنوں کے روپ میں سجنے لگیں تنہائیاں
ہم ملے تو ہر طرف بجنے لگیں شہنائیاں!!
میکدوں سے رقص گاہوں تک ہمارا ذکر ہے
جگمگاتے خواب زاروں کی جوانی ہم سے ہے
کل بھی ہم نکلے تھے سورج کو ہتھیلی پر لئے
آج بھی رفتارِ عالم میں روانی ہم سے ہے
زندگی کے ہاتھ میں کل بھی ہمارا ہاتھ تھا
آج بھی زندہ محبت کی کہانی ہم سے ہے
حسنِ دو عالم کی راہوں سے نمایاں کون ہے!
اے مری ہمدم، مرے شام و سحر کی رازداں
آ اجنتا کے پرانے مندروں سے پوچھ لے
ان پرانے مندروں سے مصر کے اہرام تک
آج بھی روشن ہیں تیرے میرے قدموں کے نشاں
ہم ہیں دونوں جاوداں

ہم ہیں دونوں جاوداں!!

"ایک خط"

(۸۶)

محترمی جناب اخلاق صاحب

سلام مسنون

امیر خسرو کے شعر کا مطلب جو میں سمجھا ہوں وہ آپ کو لکھ رہا ہوں۔ اب یہ جانے ہے صحیح ہو یا غلط۔ امیر خسرو کا شعر ہے۔

بردرِ بے نیازیت، صد چوں حسینؑ کربلا
تشنہ بماند ہر گزر، تا بہ زلال کے رسد

یہ شعر تصوف کا ہے۔ صوفی شعراء نے سلوک و معرفت کے مختلف مدارج قائم کئے ہیں۔ مثلاً خواجہ عطار نے "منطق الطیر" مثنوی میں تصوف کی سات وادیاں پیش کی ہیں (۱) وادیٔ طلب (۲) وادیٔ عشق (۳) وادیٔ معرفت (۴) وادیٔ استغنا (۵) وادیٔ توحید (۶) وادیٔ حیرت (۷) وادیٔ فنا۔

میرا خیال ہے کہ امیر خسرو کے اس شعر کا تعلق وادیٔ استغنا یا منزل بے نیازی سے ہے۔ وادیٔ استغنا کے بارے میں عطار فرماتے ہیں کہ اس منزل میں آکر صوفی بے نیاز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

می جہد از بے نیازی صرصرے
می زند بر ہم زیکدم کشورے
ہفت دریا یک شمر این جا بود
ہفت اختر یک شرر این جا بود

خواجہ عطار کا یہ بھی قول ہے کہ خدا کی ذات انسان سے بالاتر ہے اور اس کو انسان کیا پیغمبروں سے بھی بے نیازی کی ادا پسند ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

صد ہزاراں سبز پوش از غم بسوخت
تا کہ آدم را چراغ بر فروخت
صد ہزاراں جسم خالی شد ز روح
تا دریں حضرت دردگر گشت نوح
صد ہزاراں پشہ در لشکر فتاد
تا براہیم از میاں بر سر فتاد
صد ہزاراں طفل سر ببریدہ گشت
تا کلیم اللہ صاحب دیدہ گشت
صد ہزاراں خلق در زنار شد
تا کہ عیسیٰ محرم اسرار شد
صد ہزاراں جان و دل تاراج یافت
تا محمدؐ یک شبے معراج یافت

عطار کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ سارے پیغمبران بہت باعظمت ہیں اور ان کا وجود اشیائے کائنات کی بہت سی قربانیوں کے بعد ہوا ہے۔ تاہم خدا ان پیغمبروں کی ذات سے بھی بے نیاز ہے۔ اس کو کسی پیغمبر کی عبادت اور شہادت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

خواجہ عطار کے ان اشعار کی روشنی میں امیر خسرو کے شعر کا مطلب سمجھئے۔ وہ کہتے ہیں کہ اے خدا! تیری بے نیازی کے در پر حضرت امام حسین علیہ السلام کے جیسے سیکڑوں برتر و بزرگ لوگ تشنہ لب رہے ہیں۔ جب ان لوگوں کا یہ حال ہے تو کوئی عام انسان زلال معرفت سے کیونکر فیض یاب ہو سکتا ہے۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ میں انشاء اللہ یکم جون کو لکھنؤ آجاؤں گا۔ تب آپ سے ملاقات ہوگی۔

خلوص کیش
(ڈاکٹر) سلام سندیلوی

نوٹ:۔ خواجہ امیر خسرو کا شعر اوپر مندرج ہے۔ اس سلسلہ میں صاحب ذوق حضرات کو دعوت عام ہے اگر اظہار رائے مقصود ہو تو بصد شوق ترنم کے صفحات حاضر ہیں۔

(ادارہ)

معاشی خوشحالی اور سماجی انصاف کیلئے ضروری ہے

- پرامن ماحول
- سخت محنت اور
- ایمانداری

ہم ایسا کام نہ کریں جس سے

- پیداوار میں رکاوٹ ہو
- چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ ہو
- چور بازاری اور منافع کو فروغ ہو
- غریبی برقرار رہے۔

حکومت اترپردیش مزدوروں کے مسائل سے پورے طور پر باخبر ہے

- ریاست کے ۵۴ لاکھ سے زیادہ زرعی مزدوروں کی اجرت میں یکم دسمبر ۱۹۷۳ء سے ۱۲۰ روپیہ تک کا اضافہ
- نوے ہزار شکر مزدوروں کے مہنگائی بھتہ میں یکم دسمبر ۱۹۷۳ء سے ۲۸ روپے سے لیکر ۳۸ روپے تک کا اضافہ
- تقریباً... ۵ غیر ہنرمند شکر مزدوروں کو آف سیزن پابندی خدمت بھتہ کی ادائیگی کے لئے۔ اب اس کے بعد کے موسم میں دو ماہ کے بجائے صرف ایک ماہ کام کرنے کی پابندی۔
- بھتے کی ادائیگی کے لئے شکر مل کے ۱۶۰ دن تک چلتے رہنے کی شرط ختم
- ڈیری مویشیوں کی افزائش نسل کی، شہد کی مکھیاں پالنے اور مرغیاں پالنے کے کام میں لگے ہوئے مزدوروں کے لئے ریاست میں پہلی بار کم سے کم اجرت۔
- ریاست کی شیشہ سازی اور چوڑی کی صنعت کے مختلف زمروں کے تقریباً... ۱۲ ملازمین کیلئے بھی پہلی بار تنخواہ کی شرحیں متعین۔
- کانپور کے چمڑہ کی صنعت کے مزدوروں کو یکم جولائی ۱۹۷۳ء سے ۲۰ روپے سے ۲۷ روپیہ ماہانہ تک کی عبوری امداد۔
- یکم دسمبر سے ریاست کی انجینئرنگ صنعتوں سے وابستہ... ۵۴ مزدوروں کو مہنگائی بھتہ کی شکل میں ۲۰ روپیہ سے لیکر ۴۰ روپیہ ماہانہ تک عبوری امداد
- ریاستی سڑک نقل وحمل کارپوریشن کے تیس ہزار سے زیادہ ملازمین کو ان کی تنخواہ کے ۹ فیصد کے برابر ایکس گریشیا بونس۔

محکمہ اطلاعات اترپردیش نے جاری کیا۔ اشتہار نمبر-۱

تمثیلچہ

آوارہ

"پکڑے گئے"

عورت:۔ "اچھا یاد آیا۔ سچ سچ بتایئے تو ایک بات پوچھوں"

مرد :۔ "کبھی سچ بتانے کی بھی ایک ہی ہوئی۔ نہ جانے تم اتنی شکی کیوں ہو؟ جھوٹ اور وہ بھی تم سے؟ چلو الٹی باتیں نہ کرو۔ پوچھو کیا پوچھتی ہو؟"

عورت:۔ "کہنا یہ ہے کہ آج کئی دن سے آپ چپ چپ کیوں رہتے ہیں۔ آگے تو جتنی دیر گھر میں رہتے تھے زبان کترنی کی طرح چلتی رہتی تھی باتوں کے مارے گھر گونج گونج اٹھتا تھا، چپ بیٹھنا پاپ سمجھتے تھے۔"

مرد :۔ ہنس کر۔۔ "کیا خوب! پوچھی بھی تو کیا بات پوچھی۔ اس میں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت۔ بات کچھ بھی نہیں۔ موسم ہی کچھ ایسا ہے۔ بولنے کو جی نہیں چاہتا پھر کچھ چھوٹی موٹی فکریں بھی ہیں۔ اور کوئی بات نہیں۔"

عورت:۔ "یہ تو اس سے کہئے جو آپ کو جانتا نہ ہو آج چار برس سے۔ آپ شاید بھول گئے کہ میں آپ کی بیوی ہوں۔ میں پوچھتی ہوں کہ آپ کی لائبریری میں کاغذ میں لپٹی میز پر ساڑی کس کی رکھی ہے؟"

مرد :۔ جیسے یاد کر کے۔ "ساڑی! اوہو! دیکھا تم نے دو ایک دن سے نہ جانے کیا ہو گیا ہے دماغ کو۔ دھیان ہی نہیں رہا۔ اب تم نے کہا تو یاد آیا، میں سمجھتا ہوں کئی دن سے کھانا جیسا چاہیئے نہیں پچ رہا۔ کھٹی ڈکاریں آتی ہیں۔ معدے میں گندی گیس بنتی ہے اور دماغ پہ چڑھتی ہے جس سے یاد بھی نکمی ہو گئی ہے۔ اوہ۔۔"

عورت:۔ "لیجئے پھر چپ سادھ لی۔ بات تو پوری کی ہوتی۔"

مرد :۔ "ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ یہ کہہ رہا تھا کہ دیکھا تم نے، بات کہتے کہتے کیسی دھیان سے اتر گئی۔"

عورت:۔ "میں یاد دلاؤں، ساڑی کی بات ہو رہی تھی۔ رہا کھانا تو آپ جیسے کھاتے تھے، برابر ویسے ہی کھا رہے ہیں آج سے پہلے آپ نے ایسی شکایت کبھی نہیں کی۔ ہاں تو وہ ساڑی؟"

مرد:۔ "بھئی پیچھے پڑ جاتی ہو تم تو ہر بات کے۔ ایک دوست کی فرمائش سے لایا تھا۔ ان کی گھر والی کو رنگ نہیں پسند آیا شاید۔ لوٹا دی۔ مجھے اپنی الجھنوں میں یاد نہیں رہا۔ لائبریری کی میز پہ رکھ کے بھول گیا۔ آج واپس کر دوں گا۔"

عورت:۔ "ہاں، ساتھ ہی وہ لال مخمل کی ڈبیہ بھی واپس کر دیجئے گا جس میں جڑاؤ کرن پھول رکھے ہیں۔ یہ بھی کسی کی فرمائش ہوگی جو شاید ناپسند ہونے پر واپس کرنا پڑے۔"

مرد :۔ جھینپ کر ہنستے ہوئے۔ "اچھا وہ بھی دیکھ لئے تم نے؟ نہ کہوگی کیسے کانٹے کے بنے ہیں اور یہ کسی کی فرمائش کیوں ہونے چلی۔ میرے دوست شمیم کو تو جانتی ہو نہ؟ اس نے خریدے تھے۔ مجھے اچھے لگے۔ میں نے کہا، شاید تمہیں پسند ہوں۔ چلو اچھا ہوا، دکھائے بغیر ہی تم نے دیکھ لئے۔"

عورت:۔ "اور مجھے پسند نہیں آئے میرے پاس اپنے ہی بہت جڑاؤ

پڑے ہیں۔ وہ بہت ہیں"

مرد :۔ "ٹھیک ہے۔ لانے کو تو میں لے آیا تھا، مگر یہ سوچ کر تمہیں نہیں دکھائے تھے کہ سونے سے اونچی گڑھائی مال تھوڑا، دام بہت"

عورت :۔ "اور کیا۔ اب ایسا کیجئے کہ ساڑی اور کرن پھول پھیرنے جائیے تو ڈاکٹر سے بھی ملتے آیئے۔ دو چار دن کوئی دوا سوا پی ڈالئے۔ (مسکرا کے) آپ کے دماغ کی یہی حالت رہی تو نہ جانے اور کیا کیا لے آئیں گے؟"

مرد :۔ "ہاں بھئی یہ تو کرنا ہی ہوگا!"

عورت :۔ "وہی تو میں نے کہا۔ بے شک آپ کے معدے کی حالت اچھی نہیں۔ کھانا تو چلو کیسے نہ کیسے پچ ہی جاتا ہے، مگر اور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ آپ سوتے میں بڑبڑاتے رہتے ہیں، اور....."

مرد۔ گھبرا کے :۔ "تم نے بھی سن لیا نہ۔ میں کوئی جھوٹ تھوڑا ہی کہہ رہا تھا۔ ہے نہ وہی معدے کی خرابی اور گیس..."

عورت :۔ بات کاٹ کے۔ "جی اور یہی گیس سوتے میں پریتما پریتما بن کر آپ کے منھ سے نکلتی ہے؟"

مرد۔ (ہنستے ہوئے) :۔ "پریتما! ایں، ارے بھئی دیکھو، وہ..... یعنی اوہ! اس کا تو میں نے تم سے ذکر ہی نہیں کیا۔ ارے بھئی تم کو پتہ نہیں، ان دنوں کلکتے میں بہت بڑی گھڑ دوڑ ہوتی ہے۔ دور دور سے شوقین لوگ آتے ہیں۔ لاکھوں روپئے کی شرطیں لگتی ہیں۔ دوستوں کے دباؤ میں آ کے اب کے مجھے بھی ایک ٹکٹ خریدنا پڑا۔ جانتا وانتا کچھ ہوں نہیں آنکھ بند کر کے ایک گھوڑی پر شرط لگا بیٹھا ہوں جس کا نام اس کے مالک نے پریتما رکھ چھوڑا ہے؟"

عورت :۔ "اور دن رات من میں بسے رہنے سے یہی نام آپ سوتے میں بھی..."

مرد :۔ بات کاٹ کر۔ "خوب سمجھیں، یہی تو ہے" (ٹیلی فون کی گھنٹی) "بھئی کاہلی کے مارے اس وقت جگہ سے ہلنے کو جی نہیں چاہتا۔ ذرا تم بات کر کے دیکھو تو کون ہے۔ کیا کہتا ہے"

عورت :۔ "اچھا ـــ ہلو! کون ؟ ـــ جی کہئے۔ بہت اچھا۔ ابھی" (قہقہہ لگاتی ہے)

مرد :۔ کون تھا؟"

عورت :۔ (تیکھی ہو کر) "کون تھا۔ جی وہ گھوڑی پریتما۔ جس پر آپ نے کلکتے میں شرط لگا رکھی ہے! سن لیا آپ نے"

بقیہ.... ساحل نہیں ملتا صفحہ کا

پر چمکتے ہوئے چاند کو دیکھ کر اُسے اپنی باہوں میں لینے کے لئے ہمکتا ہے۔ اُسی طرح میرا دل بھی سنگ مرمر کے اُس جیتے جاگتے حسین بت کو حاصل کرنے کے لئے مچل اٹھا! لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے ہی میری وفا شعار شریک حیات فاہدہ کا مسکراتا ہوا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے ابھرا میں نے کمزور اور بہکے ہوئے خیالات کو ذہن کے پردے سے جھٹک ڈالا۔ مچلتی ہوئی آوارہ خواہشوں کا طوفان تھم گیا۔ اور میں نے اُسی وقت اُسی بچے کے ذریعے صبا کی تصویر واپس کر دی۔

رات تو کسی طرح گزر گئی لیکن صبح میرے لئے بڑی دھماکہ خیز ثابت ہوئی۔

آنگن میں عورتوں کی بھیڑ دیکھ کر مجھے بے حد حیرت ہوئی دوسرے ہی لمحے جب میرے اوپر حقیقت کا انکشاف ہوا تو اچانک ایسا لگا جیسے میں نے انجانے میں بجلی کا ننگا تار چھو دیا ہو۔

صبا بھاگ گئی۔ اپنے ناآسودہ جذبات کی آسودگی کے لئے! اور میں سوچ رہا ہوں کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ صبا کے والدین جنھوں نے ایک نوخیز کلی کو ایک عمر رسیدہ بوڑھے سے بیاہ کر اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لی یا وہ معاشرہ جس میں پلا بڑھا ہوا نوجوان غربت اور افلاس میں پلی ہوئی کسی لڑکی کو دلہن بنانے کیلئے تیار نہیں ہوتا لیکن اُس کے جذبات کو اُبھار کر اُسے بھگا لے جانے میں فخر محسوس کرتا ہے!!

......ساحل نہیں ملتا

عابد ضمیر

اُس دن پھر صبح سویرے ہی عورتوں کے درمیان تکرار ہو رہی تھی!

رات دیر سے سونے کی وجہ سے میری پلکیں نیند سے بوجھل تھیں۔ گرمی سے در و دیوار بھی تپ گئے تھے۔ الیکٹرک فین سے گرم ہوا نکل رہی تھی اور کمرے میں حبس تھا میں نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن نیند نہیں آئی۔ اس وقت عورتوں کی چیخیں کانوں میں گونجیں تو میں کچی نیند سے جاگ پڑا اور آنکھیں ملتا ہوا آنگن کی طرف بڑھا۔ سامنے کنویں پر عورتیں جمع تھیں اور اُن میں پانی کے لیے جھگڑا ہو رہا تھا۔

"تم نے تو پورا کنواں ہی خالی کر دیا۔ اب باقی عورتیں کیا سرکاری نل سے پانی لینے جائیں گی!؟"

میری خالہ نے مکان کی مالک کی حیثیت سے سخت اور طنز آمیز لہجے میں کہا۔

"پانی تو میں نے دو ہی بالٹی بھرا ہے دراصل آج کنویں میں پانی جمع ہی نہیں ہوا!"

نئی کرایہ دار نے شائستہ لہجے میں جواب دیا۔ آنگن کی دوسری کرایہ دار عورتوں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر وہ گھبرائی ہوئی تھی اور اُن کے درمیان تماشہ بن جانے پر روہانسی سی ہو رہی تھی۔

"خالہ جان! آپ بھی کیا صبح صبح پانی کا حساب لینے بیٹھ گئیں۔ بے چاری کو پانی کی ضرورت تھی، اگر ایک آدھ بالٹی زیادہ لے لیا تو اُس سے کیا بگڑ گیا۔ دیکھیے گھٹا چھا رہی ہے۔ بارش ہو جائے تو ہر طرف پانی ہی پانی ہو گا!"

میں نے [illegible] کو [illegible] نے کر خیالی سے کہا۔

"تو جا! [illegible] کر بڑا آیا [illegible] کرنے!"

خالہ جان نے میری [illegible] ادھیڑ [illegible] سے کہا اور میں نادم سا ہو کر باہر چلا گیا!

نئی کرایہ دار [illegible] کا [illegible] اُس کا جسم حُسن کے سانچے میں ڈھلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اُس کی رنگت ایسی تھی جیسے مکھن میں ہلکا سا گلابی رنگ گھول دیا گیا ہو۔ اُس کی چال میں بلا کی مستی تھی۔ جب وہ چلتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس کے جسم کا ایک [illegible] وہ اُس کے انگ انگ سے حسن و شباب کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں۔

میرے خالہ زاد بھائی خالد نے مجھے بتایا تھا کہ جب صبا نئی کرایہ دار کے جانے والے نئے آئے ایک بے جان کھلونے کی طرح ٹھکرا کر ایک امیر زادی اور تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کر لی تو اُس کے غریب والدین نے اُسے ایک بے زبان گائے کی طرح اُس کی عمر سے تین گنی زیادہ عمر کے بوڑھے کے کھونٹے سے باندھ دیا تاکہ عشق میں ناکامی کے بعد کوئی دوسرا نوجوان غلط طور پر اُس کی ہمدردی نہ حاصل کر لے اور کہیں اُس کے قدم بہک نہ جائیں!

صبا کی دکھ بھری داستان سُن کر مجھے اُس سے ہمدردی سی محسوس ہوئی اور کسی انجانے جذبے کے تحت میں نے اپنے آپ کو اُس کی طرف کھنچتا ہوا محسوس کیا۔

اُس دن شام کو جب میں دفتر سے واپس آنے کے بعد منہ ہاتھ دھونے کے لیے کنویں پر گیا تو صبا وہاں پہلے سے

موجود تھی اور برتن مانج رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کے خوبصورت لبوں پر دلفریب مسکراہٹ کھل اٹھی اور جھیل جیسی گہری آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے۔

"آج صبح والے واقع پر آپ کی ہمدردی کا شکریہ!"
اُس نے اپنی ریشمی پلکیں اٹھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا بڑے میاں آپ کے شوہر ہیں!؟"
میں نے دانستاً اُس کے بوڑھے شوہر کا ذکر چھیڑ کر اُس کے چہرے پر اُبھرتے ہوئے دلی جذبات کو پڑھنا چاہا۔ لیکن میرا سوال سن کر اس کے حسین چہرے پر دھواں سا چھا گیا اور اُس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ اُس کی ریشمی پلکوں پر دو آبدار موتی لرز اُٹھے اور وہ دھوئے ہوئے برتن سمیٹ کر وہاں سے چلی گئی۔

سامنے سے خالہ جان کو آتے ہوئے دیکھ کر میں جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔

"نسیم! تم اسے زیادہ منہ نہ لگاؤ۔ شاید تم نہیں جانتے کہ یہ کس قسم کی لڑکی ہے!"
خالہ جان نے پیار بھرے لہجے میں مجھے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

"روزانہ شام ہوتے ہی اس کے سر پھرے عاشق لڑکی کے سامنے منڈلانے لگتے ہیں۔ اگر مجھے پہلے ہی یہ معلوم ہوتا تو میں اسے ہرگز کرایہ پر کمرہ نہ دیتی۔"

"خالہ جان! اگر کچھ اوباش نوجوان اس کی کھڑکی کے سامنے منڈلایا کرتے ہیں تو اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے!؟"
میں نے صبا کی وکالت کرتے ہوئے کہا

"نسیم! تم خواہ مخواہ اس 'بے چاری' سے ہمدردی نہ جتاؤ۔ میں نے اس کے شوہر سے کہہ دیا ہے کہ میری بہو آرہی ہے۔ اس لیے وہ جلد سے جلد کمرہ خالی کر دے۔"

"بہو—!؟ لیکن ابھی تو خالد بھائی کی شادی بھی نہیں ہوئی!؟" میں نے متحیر لہجے میں کہا۔

"میں نے تمہاری بیوی کو یہاں آنے کے لیے لکھ دیا ہے!"

انھوں نے آنگن میں بندھی ہوئی الگنی پر سے سوکھے ہوئے کپڑے اُتارتے ہوئے کہا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ صبا دُور ہی سے میرے اوپر اپنی مسکراہٹوں کے جال پھینکتی رہی اور میں اُس جال میں ایک بے بس مچھلی کی طرح مچلتا رہا۔ اُس کی مسکراہٹوں کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہ آسکی۔ لیکن میں نے یہ محسوس کیا کہ اُس کے ناآسودہ جذبات ہی نے اُسے میری طرف مائل کیا ہوگا!

ایک دن میں برآمدے میں لیٹا ہوا ایک رسالہ دیکھ رہا تھا کہ ایک چھوٹے سے بچے نے ایک رقعہ لا کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ لکھا تھا۔

"حامل رقعہ کے بدست رسالہ بھیج دیں۔
پڑھ کر واپس کر دوں گی"

"یہ رقعہ تمھیں کس نے دیا!؟" میں نے حیرت زدہ لہجے میں بچے سے سوال کیا۔
اُس نے منھ سے کچھ نہ کہا لیکن سامنے کی طرف انگلی اُٹھا کر مسکرانے لگا۔ میں نے نگاہیں اُٹھا کر دیکھا۔ سامنے صبا کھڑی تھی۔ غالباً کچھ ہی دیر پہلے وہ غسل کر کے اٹھی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال شانوں پر ناگن کی طرح لہرا رہے تھے۔ اُس کا اُمڈتا ہوا شباب دیکھ کر اچانک میرے جذبات میں ہلچل سی مچ گئی اور میں شاخ سے ٹوٹے ہوئے ایک خشک پتے کی طرح اندر ہی اندر کانپنے لگا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رسالہ بچے کے حوالے کر کے میں نے اُس رہزن ہوش کی طرف سے رُخ پھیر لیا۔

دوسرے دن جب میں دفتر سے واپس آکر کپڑے تبدیل کرنے لگا تو وہ بچہ رسالہ لے کر آگیا۔ میں رسالہ اُس کے ہاتھ سے لے کر یونہی ورق گردانی کرنے لگا تو یکایک اُس کے اندر سے پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر نکل آئی۔ تصویر اُسی رہزن ہوش و تمکین کی تھی۔ بے حد حسین — سنگ مرمر کا حسین مجسمہ!
میرا دل دھڑک اُٹھا۔ کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں اور نگاہوں کے سامنے خوشنما رنگ بکھر گئے۔ جس طرح ایک ننھا منا بچہ آسمان

بقیہ صفحہ پر

ارشاد امروہوی

شکست

یہ اس کی دوسری تصویر تھی جس کو اس کے فن جذبات، احساسات اور محسوسات کا نچوڑ کہا جا سکتا تھا۔ فن کی ایک ایسی معراج کہا جا سکتا تھا جس کی مثال مشکل ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس بار کی عالمی نمائش میں اس کی تصویر کو ایک نمایاں مقام ملا ہوا تھا، کسی وقت بھی اس کے اطراف سے دیکھنے والوں کی بھیڑ کم نہیں ہوتی۔ جو بھی اسے دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا۔ یوں تو اس کی پہلی تصویر بھی ایک مقامی نمائش میں کم و بیش اسی انداز سے پسند کی گئی تھی۔ اس کو بھی اس کا ایک عظیم شاہکار قرار دیا گیا تھا لیکن خود وہ اپنی اس تصویر سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس تصویر میں اس نے ایک انسانی ہاتھ میں انگور کا خوشہ بنایا تھا جس پر نمائش کے وقت ایک چڑیا نے آ کر کئی مرتبہ اپنی چونچ ماری تھی ۔۔۔ اور اس منظر کو دیکھ کر لوگوں کی حیرت و تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی لیکن خود اس نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

"آپ حضرات یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ چڑیا انگوروں نے خوشے کو اصلی انگور سمجھ بیٹھی ورنہ وہ کبھی بھی خوشہ پر چونچ نہ مارتی لیکن میں اپنی جگہ اس تصویر سے اس لیے مایوس ہوں کہ میں انسانی ہاتھ بنانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اگر انسانی ہاتھ بھی چڑیا کو حقیقی معلوم ہوتا تو چڑیا کسی حالت میں چونچیں نہ مارتی ———"

مجمع اس کی بیان کردہ اس حقیقت پر خاموش ہو گیا تھا۔

اور پھر اس نے ایک ایسی کہانی کو تصویر میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا جو اس کی عمر کی طرح اس کی زندگی کی ہم سفر بنی ہوئی تھی ۔۔۔ اور جس کی تکمیل کے بعد اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس میں رنگوں کی آمیزش نہ ہو بلکہ اس کے جذبات اور حالات کا عکس تخلیقی ابھر آیا ہو، اس کے خیالات اور تمنائیں تصویر کے خدوخال میں بدل گئے ہوں، اس کی کبھی کی تحریروں نے تاثرات کی جگہ لے لی ہو اور اس کی زندگی کے کئی دور اس ایک تصویر میں سمٹ آئے ہوں ——— یہی وجہ تھی کہ اس تصویر کی عالمی نمائش میں خود وہ بھی کبھی کبھی اس تصویر کے ارد گرد نظر آتا تھا ——— تصویر کے مقام سے کچھ فاصلہ پر کھڑے ہو کر اس سے متعلق لوگوں کے فقرے سنا کرتا بالکل اس انداز سے جیسے اسے کسی کی تلاش ہو، وہ کسی ایسے وجود کا تعاقب کرتا ہو جس نے اسے تنہائیوں کے سلگتے لمحوں میں جھلسنے کے لئے مدت سے چھوڑ دیا ہو ——— اسی مقصد کے لئے شاید تصویر کے نیچے اپنا نام بھی تحریر نہیں کیا تھا جیسے وہ کسی قاتل کی تلاش میں خفیہ انداز میں سرگرداں ہو ——— اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ امریکہ و دیگر ممالک میں رہائش کیوں حاصل کرتا ——— پھر بھی وہ اپنے وجود سے چپکی ہوئی تلخ یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا ——— اور اب کچھ عرصہ سے انہی یادوں نے ایک تصویر کی شکل اختیار کر لی تھی جس کی نمائش کے لئے وہ پھر اپنے وطن ہندوستان ایک عالمی میں شریک ہونے کے لئے آیا ہوا تھا۔ اس کی موجودہ تصویر بظاہر ایک عورت کی تصویر تھی جو مختلف زاویوں اور فاصلوں کے ساتھ دیکھنے پر دوسری شکلوں میں بدل جاتی تھی یعنی اگر اسے پانچ سات گز کے فاصلہ پر کھڑا ہو کر دیکھا جاتا تو وہ ایک بوڑھی عورت نظر آتی، اس سے کچھ کم فاصلہ پر ایک جوان لڑکی نظر آتی ——— اور بہت ہی نزدیک سے دیکھنے پر ایک بچی کی شکل دکھائی دیتی ——— تصویر کی اس طرح ہدایتوں کے ساتھ نمائش کے لئے اس کا اپنا ایک اسسٹنٹ گائیڈ کی حیثیت سے ہر وقت تصویر کے قریب رہتا۔ اور اس طرح یہ تصویر ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی کچھ دیکھنے والوں کے لئے ایک معمہ بنی ہوئی تھی

ابتدا میں تھوڑے سے لوگ تصویر کے قریب نظر آتے مگر رفتہ رفتہ مجمع بڑھتا جاتا تھا۔ اس وقت بھی تصویر سے متعلق مجمع سے مختلف قسم کے جملے ابھر رہے تھے۔ موجودہ گروپ میں سلمیٰ اپنی یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ نمائش دیکھنے میں مشغول تھی اور اس وقت دوسری گیلری میں لگی تصویریں دیکھ رہی تھی ــــ موجودہ تصویر کے دیکھنے والوں میں رفعت پیش پیش تھی۔ وہ اپنی ساتھیوں سے کہہ رہی تھی۔

"کیا عجیب تصویر بنائی ہے فنکار نے۔ ایک تصویر میں تین روپ ــــ پتہ نہیں کس عظیم فن کار کا شاہکار ہے یہ۔ کمبخت نے اپنا نام بھی تو تحریر نہیں کیا ہے؟"

"ہاں اس میں بھی ایک عزم اور مصلحت پوشیدہ ہے ــــ ایک لڑکے نے رفعت کو جواب دیا۔ اسی گمنامی میں آرٹسٹ کی شہرت چھپی ہوئی ہے ــــ وہ یقینی طور پر یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ لوگ اس کے فن سے اس کو پہچان لیتے ہیں یا نہیں ــــ؟"

"بالکل ٹھیک۔" رفعت نے تائید کی۔

"ارے آپ لوگ یہاں کیا جھک مار رہے ہیں دوسری گیلری میں چل کر دیکھئے بہت نایاب قسم کی تصویریں ہیں وہاں ــــ" سلمیٰ نے اس گروپ میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

"بھول گئیں ــــ یہاں تو یہ ایک تصویر پوری نمائش پر بھاری نظر آ رہی ہے۔ ذرا قریب آ کر دیکھو ہر تصویر کو بھول جاؤ گی، خاص کر یہ دیکھ کر کہ یہ تمہاری اپنی ہی تصویر ہے ــــ" رفعت نے سلمیٰ کی کلائی پکڑ کے تصویر کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا ــــ

اور سلمیٰ نے جب تصویر کو بہت قریب سے دیکھا تو اسے حقیقتاً ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی جوانی اس کے بچپنے کی حدود میں داخل ہو گئی ہو ــــ بالکل ویسی ہی تصویر جیسی اس کی البم میں لگی ہوئی تھی ــــ سلمیٰ کی حیرت اور خیرگی بڑھتی گئی ابھی وہ ذہنی طور پر ذرا الجھی ہوئی تھی کہ رفعت نے اسے گھسیٹ کر تصویر سے کچھ فاصلہ پر کھڑا کرتے ہوئے کہا ــــ

"ذرا اب دیکھو ــــ"

اور سلمیٰ کو بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بچپنے سے چھلانگ لگا کر اپنی موجودہ جوانی میں لوٹ آئی ہو ــــ

"ارے ہاں یہ تو میری ہی جوانی ہے ــــ بالکل میری ہی موجودہ تصویر ہے ــــ مگر یہ کیسے ممکن ہے ــــ میرا وجود عالمی نمائش تک کیسے پہونچ گیا ــــ" وہ بڑبڑاتے گی۔

"ناممکن بھی تو نہیں ہو سکتا ــــ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ مصور نے تمہاری جوانی چرائی ہو ــــ یہ فنکار لوگ حسین مورتیوں کی کھوج میں رہتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ممکن ہو سکتا ہے کہ اس فنکار نے مجھے کہیں دیکھ کر میری جوانی چرائی ہو لیکن وہ میرا بچپن ــــ؟"

سلمیٰ نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"تو پھر یوں سمجھ لو کہ بالکل تم جیسی کوئی لڑکی اس فن کار سے قریب ہے۔ اور پوری طرح اس کے وجود پر چھائی ہوئی ہے۔ جس کے ساتھ اس کا ہر دور گزرا ہے ــــ مگر کسی فاصلہ کے ساتھ ــــ"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی دوسری لڑکی مجھ سے کافی حد تک مشابہ ہو ــــ مگر ــــ؟"

اس مگر کے ساتھ ہی سلمیٰ ذہنی طور پر جیسے کچھ تلاش کرنے لگی ــــ اور ماضی کی یادوں کی تہوں سے ایک جانا پہچانا چہرہ ابھرنے لگا ــــ الجھے ہوئے قدرے لمبے بال، نازک مگر ابھرے ہوئے خدوخال، گندمی رنگ کی ایک جامع شخصیت اس کی نظروں کے سامنے صاف ہوتی گئی ــــ ایک فنکار کی شخصیت واقعات کے ایک شور کے ساتھ اس کو بیدار کرنے لگے۔

"ارے یہ کیا ــــ تم ایکدم خاموش کیوں ہو گئیں۔ کیا حقیقت میں کسی پیکر کے بارے میں سوچ رہی ہو ــــ مگر اس نے تم جیسی حسین کو کس دن چرا لیا۔ کس قسم کے ماحول میں بنائی تھی اس نے یہ تصویر ــــ" رفعت نے واضح طور پر کچھ سمجھنا چاہا۔

" ہاں ـــــ اُس مصور نے ایک خوبصورت چوری کی ہے کبھی ہم دونوں میں ایک قسم کا تصادم ہوا تھا۔ ایک خوبصورت سا ٹکراؤ ایک عجیب سی بحث ذہن میں اس وقت کچھ خاکے بنا رہی ہے جس کا تعلق مجھ سے اور ایک مصور سے تھا ـــــ وہ میرا پڑوسی تھا ـــــ " سلمیٰ اچانک سنجیدہ ہوکر کچھ یادیں بیان کرنے لگی جو اس کے ذہن کے کسی گوشہ میں محفوظ تھیں۔

" تو یہ بات ہے! لیکن تم نے تو آج تک اس سلسلہ میں کچھ نہیں بتایا ـــــ " رفعت نے چھیڑا۔

" اس وقت ان واقعات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی ـــــ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ وہ مصور اپنے فن اور مستقبل میں ملنے والی شہرت پر ناز کرتا تھا اور مجھے اپنی دولت پر فخر تھا۔ اس کو مستقبل میں ملنے والی شہرت اور میری موجودہ دولت بحث کا موضوع بن جایا کرتی تھی۔ میں کہا کرتی تھی ـــ دولت انسان کو ہر مقام پر بلند رکھتی ہے مگر وہ جواب میں کہتا تھا کہ بہت سے موقعوں پر دولت شہرت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے ـــ اور اس طرح ہم دونوں میں ایک فاصلہ کے ساتھ کچھ عجیب سی قربت تھی ـــــ مگر اس کے دل میں اس طرح کی قربت پرورش پا رہی تھی مجھے کبھی خیال پیدا نہیں ہوا میرا وجود کبھی عالمی نمائش میں پہنچ کر اتنا بلند مقام حاصل کرے گا میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا ـــــ " سلمیٰ نے یہ سب کچھ اس انداز میں بیان کیا جیسے وہ اس وقت اس فن کار سے قربت کا اظہار کرتے ہوئے مسرت محسوس کر رہی ہو۔

" تب تو آج تم بہت کچھ ہار گئیں ـــــ آج شہرت اپنے نکتہ عروج پر ہے اور تمھاری دولت سرنگوں نظر آ رہی ہے ـــــ " رفعت کے ساتھ دوسری لڑکیوں نے بھی ہم زباں ہو کر کہا۔

" ہو سکتا ہے؟

" ہو نہیں سکتا یہ حقیقت ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو آج اس تصویر کو خرید کر دیکھ لو۔ اگر آج تم اس تصویر کو خریدنے میں کامیاب ہو جاتی ہو تو سمجھ لو تمھاری فتح ہوئی ورنہ اس مصور کی مکمل جیت ـــــ "

ان لوگوں کی گفتگو اس مصور کا اسسٹنٹ بغور سن رہا تھا ـــ وہ درمیان میں بولا۔

" معلوم ہوتا یہ تصویر آپ لوگوں کو بہت زیادہ پسند آگئی ہے؟

" جی ہاں ـــــ یہ تصویر نہ صرف پسند آگئی ہے بلکہ میری ان سہیلی کے لیے ایک معمہ بن گئی ہے ـــــ اور یہ اس کو خریدنا چاہتی ہیں ہر قیمت پر ـــ " رفعت نے سلمیٰ کی طرف سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

" جی ـــــ لیکن آپ یہ بھولتی ہیں کہ نمائشی تصویر بکتی نہیں ہے۔ پھر ساتھ ہی یہ ایک ایسی لڑکی کی تصویر ہے جس نے اس کے مصور کے وجود کو ایک زندہ لاش میں تبدیل کر دیا ہے، جس نے اس کا سب کچھ چھین لیا ہے "

" لیکن میں نے تو یہ سب کچھ نہیں کیا ـــــ " سلمیٰ کے منھ سے برجستہ ایک حقیقت کا اظہار ہوگیا۔

" تو کیا یہ آپ ہی کی تصویر ہے۔" اسسٹنٹ تعجب کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا

" جی ـــ ! جی ہاں کسی حد تک مجھ سے مشابہ ضرور ہے اسی لئے میں اس کو خریدنا چاہتی ہوں ـــــ کیا اس کے مصور یہاں موجود ہیں ـ؟

" جی ہاں موجود تو ہیں لیکن ان سے ملاقات ہونا آسان کام نہیں۔ وہ چونکہ ایشیا کے مانے ہوئے فنکار ہیں اس لئے ہر وقت بڑے بڑے لوگ ان کو گھیرے رہتے ہیں۔ پھر وہ خصوصاً کسی لڑکی سے تو ملنا پسند ہی نہیں کرتے جیسے انھیں لڑکی کی شکل سے نفرت سی ہوگئی ہو "

" ہر لڑکی سے ـــ! "

" ہاں کسی حد تک ہے تو ایسا ہی ـ "

" لیکن وہ مجھ سے ملنا پسند کریں گے ـــ " سلمیٰ نے جیسے ایک عزم کے ساتھ کہا ـــ زندگی کے مقصد کو بہت کم لوگ ٹھکرا پاتے ہیں!

"ممکن ہے — چلیئے میں کوشش کر کے دیکھوں گا خصوصاً اس لئے کہ ان کی یہ تصویر آپ سے بہت مشابہ ہے۔"

اور پھر سلمیٰ ایک شاندار عمارت کے ایک آراستہ کمرہ میں وجاہت عظیم کو دیکھ کر حیران رہ گئی — اس وقت جیسے اس کے حواس خمسہ نے جواب دے دیا ہو، اس کی قوت گویائی سلب ہوگئی ہو — ادھر وجاہت عظیم کے چہرہ فاتحانہ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی مگر ساتھ ہی اس کے دل میں درد کی ٹیسیں بھی ابھر رہی تھیں۔ اس کا تلخ ماضی ایک طوفان کی شکل میں نمودار ہونا چاہتا تھا — دونوں کی عجیب سی کیفیت تھی — اسی عالم میں تھوڑے سے توقف کے بعد سلمیٰ نے بڑے جذباتی لہجہ میں پوچھا۔

"آپ مجھے پہچان گئے — ویسے آپ کی مسکراہٹ تو کہہ رہی ہے کہ نہ صرف مجھ کو پہچان گئے ہیں بلکہ آپ کو بہت کچھ یاد بھی آرہا ہے — اور ان یادوں میں میرا وجود لپٹا ہوا ہے؟"

"ہوسکتا ہے — ویسے انسان کی ہنسی کے بہت سے مطالب ہوا کرتے ہیں بقول شاعر۔

(قطعہ) میری ہنسی تو میرے غموں کا لباس ہے
لیکن زمانہ اتنا کہاں غم شناس ہے
جب میں اداس تھا تو زمانہ تھا مطمئن
اب میں ہوں مطمئن تو زمانہ اداس ہے

"ٹھیک کہا نا میں نے — قطعہ برمحل تھا نا — ! ویسے میرے خیال سے انسان خود کو مدت تک نہیں پہچان پاتا —"

وجاہت عظیم نے بظاہر کچھ بے نیازی کے انداز میں کہا — ورنہ حقیقت میں ایسے اس کے جذبات نے اچانک سلمیٰ کی آمد پر اپنی زد بدست گرفت میں لینے کے لئے مجبور ضرور کردیا تھا —

"اس کا مطلب ہے آپ نے مجھے نہیں پہچانا — پہچانتے بھی کیسے ہم لوگوں کے درمیان سدا سے ایک فاصلہ جو قائم رہا ہے؟"

سلمیٰ نے کسی قدر سہمے سے لہجہ میں کہا — جیسے اچانک اس کی دولت پرست ذہنیت نے وجاہت کے فن اور شہرت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہوں، ایک عظیم شکست نے اس کے وجود کو بہت پیچھے ڈھکیل دیا ہو۔

"جی میں نے تو صرف اس تصویر کو پہچانا ہے جو ہر عالم میں میرا ساتھ دیتی ہے — اور میں اپنی ہر ہر سانس کے ساتھ اس کو اپنا ہم سفر محسوس کرتا ہوں — اور اب تو مجھے ایسا یقین ہوگیا ہے کہ انسان کی تصویر خود انسان سے زیادہ باوفا ثابت ہوتی ہے۔ قریب اور احتیاط سے رکھنے پر زندگی بھر ساتھ دیتی ہے۔ میرے خیال سے انسان کو صرف تصویر سے محبت کرنا چاہیئے۔"

"میں اس تصویر کو خریدنا چاہتی ہوں" سلمیٰ کی شکست نے پھر ایک بار اس کی دولت پرست ذہنیت کو ابھارا۔

"اس کی قیمت معلوم ہے آپ کو —؟"

"جی نہیں — پھر بھی دس ہزار بیس ہزار بہت سے بہت ایک لاکھ اس کی قیمت ہوسکتی ہے۔ ویسے آپ جو قیمت طلب کریں گے میں دوں گی۔"

"یہ آپ کا خیال ہے — آپ کا روپیہ اس کی قیمت نہیں بن سکتا —"

"تو پھر اس کی قیمت آپ کی نگاہ میں کیا ہے —!"

"ایک انسان کا خون — آپ کو اس تصویر کو حاصل کرنے کے ایک انسان کا خون کرنا ہوگا۔"

"لیکن کس کا خون — عجیب بات ہے تصویر کی قیمت انسان کا خون —"

"اس کے مصور کا خون جو سسک سسک کر دم توڑ رہا ہے جس کی ہنستی مسکراتی زندگی مدت سے غموں کی آنچ سے جھلس رہی ہے۔ جس کی آہیں اس کو کھوکھلا کر چکی ہیں۔"

"یعنی تمہارا خون —" سلمیٰ کا لہجہ بدل گیا جیسے اچانک وہ اپنے پرانے وجاہت عظیم سے مخاطب ہوگئی ہو۔

"ہاں —— تاکہ اس کے وجود کے ساتھ ان کا سب کچھ دفن ہو جائے —— اس کی موجودہ شہرت میں لپٹا ہوا افسردہ اور مہمل وجود، اس کے اندر کا پیاسا انسان —— اور پھر اس کے دل میں کوئی تصویر نہ ابھر سکے، اس کے خالی ہاتھ کسی شاہکار کو جنم نہ دے سکیں۔"

"لیکن میں تمہارا خون نہیں کر سکتی ——" سلمیٰ جیسے گھبرا گئی۔

"تو پھر تم واپس جا سکتی ہو —— میں اس تصویر کے سہارے زندہ رہ سکتا ہوں۔ اس کا بچپن اس کی جوانی اس کا بڑھاپا سب کچھ میرے ساتھ ہے اور رہے گا —— اس کا وہ تیسرا روپ جو کچھ زیادہ فاصلہ پر کھڑے ہو کر دیکھا جاتا ہے جس کے بارے میں تم نے ابھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ میری آخری عمر میں ساتھ رہے گا۔ یہ میری آخری تصویر ہے جو میرے آخری دور تک ساتھ دے گی۔ مجھے تم سے زیادہ اس تصویر سے محبت اور وفا کی امید ہے۔"

"تو کیا اس تصویر کا حقیقی وجود اس تصویر کی جگہ نہیں لے سکتا؟" سلمیٰ اپنی شکست کو جیسے تسلیم کر کے وجاہت کی طرف بڑھی۔

"نہیں —— حقیقی وجود بہت پتھریلے ہوتے ہیں جن کی قربت سے صرف زخم ملتے ہیں جو اگر رِس رِس کر ان کو آوازیں بھی دیتے رہتے ہیں تب بھی ان پتھریلے کانوں کو سنائی نہیں دیتا۔ تصویر انسان کو کھوکھلا نہیں کرتی بلکہ زخموں کو مندمل کرتی ہے ——" اتنا کہہ کر وجاہت خاموش ہو گیا —— جیسے انسانی خول میں مزید بولنے کی قوت باقی نہ رہی ہو۔

اور پھر سلمیٰ کے قدم ایک زبردست شکست کے بعد واپسی کے لئے بڑھ رہے تھے —— اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے ہر وقت سہارا دینے والی دولت نے کھوکھلی حقیقتوں کی دلدل میں ڈھکیل دیا ہو —— وہ اپنے اٹھتے ہر قدم کے ساتھ اپنے کو لڑکھڑاتا اور گرتا ہوا محسوس کر رہی تھی —— دولت شہرت کے سامنے شکست کا لباس پہنے

بقیہ صفحہ ۴۲ پر

غزلیں

گلشن پرویز

یاس کے دھندلکے ہیں جب بھی تیری یاد آئی
رو دیئے ہیں سناٹے جل بجھی ہے تنہائی

پھول پھول افسردہ، غنچہ غنچہ پژمردہ
گلشن محبت میں کس طرح بہار آئی

آپ نے نہیں دیکھا بے بسی کا وہ عالم
یاد جب گلے ملتی دور تک چلی آئی

آج بھی وہی ہم ہیں آج [illegible] تم ہو
پھر بھی جانے کیوں ہم سو [illegible] تنہائی

کیسے چارہ گر ہیں یہ کون ان کو سمجھائے؟
ناپتے ہیں نشتر سے زخم دل کی گہرائی

ہوک سی اٹھی دل میں خیر ہو نشیمن کی
دور تک چمن پر پھر برق آج لہرائی

جانے کون سے غم نے پی لیا لہو دل کا
جانے چھین لی کس نے زندگی کی رعنائی

دل میں یوں سسکتی ہے اُن کی یاد اے پرویز
جیسے شام ہجراں میں رو رہی ہو تنہائی

آزاد گلاٹی

آنے والے حادثوں کے خوف سے سہمے ہوئے
لوگ پھرتے ہیں کہ جیسے خواب ہوں ٹوٹے ہوئے

اس نگر کے جھلملاتے راستوں پر گھوم کر
ہم چلے آئے غموں کی دھول میں لپٹے ہوئے

صبح دیکھا تو نہ تھا کچھ پاس الجھن کے سوا
رات ہم بیٹھے رہے کس سوچ میں ڈوبے ہوئے

اپنے دکھ میں ڈوب کر وسعت ملی کیسی ہمیں
ہیں زمیں سے آسماں تک ہم ہی ہم پھیلے ہوئے

آج آئینے میں خود کو دیکھ کر یاد آ گیا
ایک مدت ہو گئی جس شخص کو دیکھے ہوئے

جسم کی دیوار گر جائے تو کچھ احساس ہو
اپنے اندر ہم پڑے ہیں کس قدر سمٹے ہوئے

کس سے پوچھیں رات بھر اپنے بھٹکنے کا سبب
سب یہاں ملتے ہیں جیسے نیند میں جاگے ہوئے

جن کو اے آزاد بخشی تھی مہک ہم نے کبھی
اب وہی رستے ہمارے واسطے کانٹے ہوئے

مدت تلک ہر ایک پہ جھنجھلایا سا رہا
وہ اجنبی اس شہر میں اکتایا سا رہا
وہ پھول سبز شاخ پہ شاداب تھا بہت
لیکن مزاجِ وقت سے گھبرایا سا رہا
میری زباں تو حرفِ شکایت سے دور تھی
پھر بھی وہ شرمسار سا کترایا سا رہا
ہوش و حواس کھوئے تھے بس تھوڑی دیر کو
اک عمر اپنی بھول پہ شرمایا سا رہا
فکریؔ شبِ سیاہ سے بس اتنا ہی خوف ہے
چل دے گا مجھ کو چھوڑ کے جو سایا سا رہا

پرکاش فکریؔ

ہم پہ حالات و حوادث کا اثر ایسا نہ تھا
زرد تو پہلے بھی تھا چہرہ مگر ایسا نہ تھا
دھوپ کی شدت سے جسم و تن سلگتے تھے مگر
اب سے پہلے راکھ ہو جانے کا ڈر ایسا نہ تھا
قیدِ زندانِ وفا میں آج سے پہلے کبھی
دل کو احساسِ شکستِ بال و پر ایسا نہ تھا
آج چشمِ دہر میں جو حیرتِ نظارہ ہے
کل بھی ویراں تھا مگر یارو یہ گھر ایسا نہ تھا
روح میں بھی اک تشنج ہے رگ و پے کی طرح
نظمِ دل پہلے کبھی زیر و زبر ایسا نہ تھا
برہمی میں بھی نظر آتے وہ ہم کو خوبرو
کیا ہمارا حسنِ ظن حسنِ نظر ایسا نہ تھا
اے زمیں پر آدمِ خاکی کے خالق تو بتا
کیا غلط کہتے ہیں ہم پہلے بشر ایسا نہ تھا
اخترؔ اس شہرِ خلوص و مہر کو کہئے نہ خواب
جس میں کوئی سایۂ دیوار و در ایسا نہ تھا



سعید اختر نظامی

ندرت نواز

لوگ کب غم کے تقاضوں سے الجھنا جانے
ہنسنے والوں کی ہنسی چھین کے ہنسنا جانے
دل کو اے دوستو اب اور پریشاں نہ کرو
آرزو کب کسی مرکز پہ ٹھہرنا جانے
ہم بھی رک جائیں گے پھر سردی کا موسم بنکر
تم جو سورج کی طرح آگ اگلنا جانے
آؤ آشاؤں کی باہوں سے ہی ناتا جوڑیں
ہم غریبوں سے کہاں کوئی لپٹنا جانے
وہ نہ آئے تو نگاہوں کو رہے اسکی تلاش
اور آجائے تو دل اور دھڑکنا جانے
ہم نے ہر ذرہ کی آنکھوں میں تقاضہ دیکھا
اپنا غم کہنا بھی چاہا تو نہ کہنا جانے
وقت دیکھے گا اندھیروں کو اجالوں کا لباس
زندگی درد کے شعلوں میں تو جلنا جانے

لو لگنے کے نتائج بھیانک ہو سکتے ہیں۔

لو لگنے کے آثار:-
- شدید درد سر
- چکر آنا
- قے
- تیز بخار
- جلد میں سوکھا پن
- چہرہ لال ہو جانا
- اچانک بے ہوشی

لو لگنے کا نتیجہ:-
- یہ کیفیت زیادہ دیر تک رہے تو موت

لو لگنے کا ابتدائی علاج:-
- مریض کو سائے میں لے جائیں۔
- کپڑے ڈھیلے کر دیں
- پنکھے سے ہوا دیں
- سر اور پیشانی ٹھنڈی رکھیں
- خون کے دوران کیلئے اعضا کی مالش کریں
- ہوش آنے پر نمک ملا ٹھنڈا پانی دیں

احتیاطی تدابیر:-
- گرم سیال ہرگز نہ دیں

آپ لو سے بچ سکتے ہیں،
کیسے؟
- ہلکے اور ڈھیلے سوتی کپڑے پہنیں
- کھلی دھوپ سے بچیں
- دھوپ میں سر اور گردن کے پیچھے کا حصہ ڈھکا رکھیں
- دھوپ میں پیاسے نہ جائیں۔

راجیہ سواستھ ایوم پریوار نیوجن شکشا بیورو اتر پردیش لکھنؤ نے جاری کیا۔

غزلیں

رانا گنوری

کسی صورت نظر آتی نہیں تسکین کی صورت
بہت دشوار ہے جینا اگر ایسی رہی صورت

انھیں آنکھوں سے دیکھا چاہتا ہے نورِ حق انساں
کبھی جن سے خود اپنی بھی نہیں دیکھی گئی صورت

سنوارا چاہتے تھے زندگی کی زلفِ پیچاں کو
مگر بدقسمتی سے اور بھی اُلجھی بُری صورت

یہ بس ہی تھا کہ ساری عمر کانٹوں پر بسر کر دی
فنا ہو جائے گر کوئی جئے کچھ دن مری صورت

کیسے آتے ہیں انداز جفا کیشی زمانے بیں
بھلا کیا کوئی توڑے گا مظالم آپ کی صورت

مریضانِ محبت کو ترے حاصل شفا ہوگی
کبھی جب اتفاقاً دیکھ لیں گے وہ تری صورت

بُرا ہم سے ہوا تجھ کو بھلا سمجھے ہم اے رانا
حقیقت میں ہمیں جل دے گئی تیری بھلی صورت

دلکش آفریدی

جب سے اُس زلف کے آبشاروں میں ہے
ایک ٹھنڈک سی دل کے شراروں میں ہے

آپ بھی شاملِ شہرتِ عشق ہیں !
آپ کا نام بھی اشتہاروں میں ہے

جگمگاتے ہوئے شہر کے ساکنو!
مرکزِ نور تاریک غاروں میں ہے

سوچ کر میرے اشکوں پہ تنقید کر
تیری تصویر بھی ان ستاروں میں ہے

کاسئہ سر لئے کچھ فقیر آئے ہیں
شور کیوں وقت کے تاجداروں میں ہے

شیخ صاحب ہیں اور حلقہ ہائے بتاں،
اک گنہ گار پروردگاروں میں ہے

حسن رقصاں ہے پھولوں کی محراب میں
عشق تپتے ہوئے ریگ زاروں میں ہے

رشک کرتے ہیں بافتن گانِ فلک
جانے کیا بات ہم خاکساروں میں ہے

ہوشیار اے نگاہِ تغافل ادا
اک بغاوت ترے جاں نثاروں میں ہے

کس غزل پہ میں دلکش کروں تبصرہ
جو غزل ہے تری شاہ پاروں میں ہے

حسن جعفری

غزل

خواہشوں کی آنچ سے جذبوں کا سایہ جل گیا
عمر کا سورج بھی اب تو درد و غم سے ڈھل گیا

ماتمی موسم پلٹ آیا ہے پھر اسی شہر میں
کیچلوں کو چھوڑ کر شاید کوئی پاگل گیا

ہو گئی ہے اب حرارت منجمد احساس کی
جانے کیوں سورج بھی برفیلی ہوا سے جل گیا

بے حسی کی تہہ میں میری ذات ہے سہمی ہوئی
تیز کرنوں پر بھی جادو تیرگی کا چل گیا

قتل ہم ہوتے رہے ہیں جعفری اس شہر میں
جب سے جوگی اپنے گھر سے روٹھ کر جنگل گیا

نصر قریشی

غزل

چشم خونناب کا افسانہ یوں کہہ جاؤں گا
اشک بنکر رخِ احساس پہ بہہ جاؤں گا

طنز کے تیر کو سہنا ہے بس اک امر محال
یوں تو ہر وار زمانے کا میں سہہ جاؤں گا

ایک تنکے کا سہارا ہے بہت موجوں میں
ڈوبنے والوں کے ہمراہ میں بہہ جاؤں گا

ہنس کے زہراب غم زیست پیا ہے صدیوں
کوئی بھی زخم ہو، بیٹھتے ہوئے سہہ جاؤں گا

سوکھے پتوں پہ سلگتا رہوں شبنم کی طرح
گل کی بربادی کا افسانہ تو کہہ جاؤں گا

سایۂ ابر گریزاں ہے مسرت کا وجود
غم کی پیشانی پہ اک لمحہ تو رہ جاؤں گا

روندتی ہی رہی پیروں تلے دنیا تو نصر
بن کے پتھر کسی دہلیز کا رہ جاؤں گا

اظہار الحسن

"مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں انشائیہ کے عناصر"

قدرت کی فیاضی سے تاریخ میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک تہذیب یا بہت سی اچھی قدریں ایک غیر معمولی شخصیت میں اپنا نشیمن تلاش کر لیتی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت بھی انہیں غیر معمولی شخصیتوں میں سے ایک تھی۔ انھوں نے سیاست، مذہب، وطن پرستی، علمیت اور مشرقی، مغربی تہذیبوں کو اس انداز سے اپنایا کہ ان کی ذات اچھی اقدار کا ایک حسین سنگم بن گئی اس میں ایک طرف مشرق کی سکون پسندی اور گہرائی، رواداری اور وضعداری، انسانیت اور روحانی بصیرت تھی، تو دوسری طرف مغرب کی روشن خیالی انسان دوستی، علمیت اور عوام کی پاسداری کا جذبہ کارفرما تھا وہ ایک زبردست عالم دین تھے، فلسفے پر گہری نظر رکھتے تھے، اس طرح مولانا آزاد ایک بڑی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ علم کی وہ فراوانی تھی کہ حدوں کا پتہ نہ تھا تحریر و تقریر میں وہ کمال حاصل تھا کہ جس کا جواب پیدا نہ ہو سکا۔ زبان کو انھوں نے نئی قدرت اور نیا انداز بخشا۔ اور اس کے دامن کو وسعت دی۔ الفاظ سے شعلہ و شبنم، رزم بزم، پھول اور تلوار کا کام لیا۔

اس مضمون میں ہمارا مقصد مولانا آزاد کی انشائیہ نگاری پر روشنی ڈالنا مقصود ہے اس لئے ہم خاص طور پر ان کے خطوط میں انشائیہ نگاری، کی طرف اشارہ کریں گے۔ انشائیہ نگاری اور وہ بھی خطوط کے ذریعہ ایک باکمال انسان ہونے کی دلیل ہے کیونکہ خطوط کو انسان کا ترجمان بھی کہا گیا ہے۔ خطوط نگاری کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور کی رائے ہے کہ:۔

"اچھا خط وہ کہا جا سکتا ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے جس میں بے تکلفی، بے ساختگی، خلوص، فطری رنگ، انفرادیت اور ذاتی تأثرات کی جھلک ہو۔ چنانچہ جن میں جان بوجھ کر علمیت کی نمائش انشاء پردازی کی شان، تکلف کا اظہار، خطابت کا جوش رکھا جائے خط نہیں مضمون ہے" ص۱

جب ہم "غبار خاطر" کے خطوط پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خطوط نہیں ہیں ان خطوط میں نہ تو وہ پرسکون انا کی ہے جو خطوط کی جان ہوتی ہے اور نہ یہ بے ارادہ ہی لکھے گئے ہیں۔ یہ حسن اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ مکتوب نگار نے واقعات اس لئے قلم بند کئے ہیں کہ رشتہ سخن کی گرہیں کھل سکیں۔ ان خطوط کا جذبہ بھی کارفرما نہیں ہے جو عام طور پر خطوں میں ہوتا ہے اور نہ یہ اس محبت کے جذبے کا نتیجہ ہیں جو مولانا آزاد کے دل میں احمد نگر کی اسیری کے دوران حبیب الرحمٰن شیروانی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ مولانا خود تحریر فرماتے ہیں:۔

"جو کچھ لکھ رہا ہوں کلپترہ گوئی اور لاطائل سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم بحالت موجودہ میری صدائیں آپ تک پہونچ بھی سکیں گی یا نہیں، تاہم کیا کروں افسانہ سرائی سے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا یہ وہی حالت ہوئی جیسے مرزا غالب نے ذوق خامہ فرسا کی ستم زدگی سے تعبیر کیا تھا" ص۲

ص۱ تنقیدی اشارے:۔ پروفیسر آل احمد سرور
ص۲ "غبار خاطر" مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا آزاد کے بیشتر خطوط کو انشائیہ کہا جا سکتا ہے ان میں استدلال کا زور ملتا ہے اور فلسفیانہ مباحثے بھی ملتے ہیں ان میں صرف ایک کہنے والا اور ایک سننے والا ہی نہیں ہوتا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی مخاطب ایک محفل ہے، ایک عالم ہے۔ ان کو ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ ان کا مخاطب صرف ایک مکتوب الیہ ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔ جو ان کی باتیں سن رہے ہیں۔ وہ شعر، نغمہ اور موسیقی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا قلم اگر کہیں بہکنے بھی لگتا ہے تو وہ ایک ماہر انشائیہ نگار کی طرح الفاظ کی شعبدہ بازی سے اسے راہ مستقیم پر لے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب وہ بین، ستار اور موسیقی سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں اور جب بھی انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ان جیسی شخصیت کے لئے یہ باتیں مناسب نہیں تو وہ فوراً لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، "اس بات کی عام شہرت ہوگئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنون لطیفہ ہے اور موسیقی محرمات شرعیہ میں داخل ہے (غبار خاطر)

"غبار خاطر" کے خطوط میں مولانا آزاد کی انشائیہ نگاری ابھر کر سامنے آتی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ خطوط نگاری میں کمال حاصل کرنے کے لئے نہ کسی فن کی ضرورت ہوتی ہے نہ کسی اصول کی، نہ کسی خیال کی اور نہ کسی موضوع کی، نہ ابتدا کی اور نہ انتہا کی۔ نہ وسط کی، نہ تکمیل کی، نہ تشبیب کی نہ دعائیہ کی، خط تو محض گریز کا نام ہے یہ گریز جب خونِ جگر کی آمیزش سے پیدا ہوتا ہے تو بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام "بے اصولی بھی ایک اصول بن جاتی ہے لغزشیں حسین ہو جاتی ہیں چاند اور سورج خود بنتے، سنورتے اور غروب ہو جاتے ہیں"[۱]

"غبار خاطر" میں مولانا آزاد نے جیل کی یادوں سے ایک رنگا رنگ محفل سجائی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کے مطابق:۔

"کاتب اپنے دل کے داغوں کی بہار دیکھنا چاہتا ہے غبار خاطر خطوں کا مجموعہ نہیں بلکہ مضامین کا مجموعہ ہے اور مضمون نگاری کے لحاظ سے ان کا اسلوب بھی ہے"[۲]

"غبار خاطر" کے زیادہ تر خطوط میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک معیاری انشائیہ کے لئے ضروری ہیں ان خطوں میں ایک انفرادی شخصی انداز تحریر ملتا ہے۔ ہر ہر جملے پر مصنف کی چھاپ نظر آتی ہے۔

انشائیہ میں موضوع کی کوئی پابندی نہیں ہوتی وہ نثر کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جس میں انشائیہ نگار کی ذاتی رائے کو بہت دخل ہوتا ہے وہ ادب کے میکانکی عمل سے ہٹ کر زندگی کا آزادانہ مطالعہ کرتا ہے اور اس میں انشائیہ نگار کی داخلیت اس کی رہبری کرتی ہے اس نے جس طرح زندگی کو دیکھا ہے، سمجھا ہے یا برتا ہے وہ اپنی ذاتی رائے کے ساتھ اس کو بیان کر دیتا ہے۔

اگر اس روشنی میں ہم مولانا آزاد کے خطوں کا جائزہ لیں تو مکتوب الیہ کا نام بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے وہ خود اپنی ذات سے ایک انجمن نظر آتے ہیں اس مقام پر مولانا آزاد کی لغزشیں بھی بہت حسین معلوم ہوتی ہیں۔ ان کو وہ بڑی فراغت بھی میسر ہے جو ایک انشائیہ نگار کے لئے درکار ہوتی ہے۔ انشائیہ اپنے مصنف کی شخصیت کی غمازی کرتا ہے اور اس کی شخصیت ماحول کی پروردہ ہوتی ہے انشائیہ نگار اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے اور اس کی تحریروں میں اس کے عہد کی پرچھائیاں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ مولانا کے خطوط سے ان کی شخصیت اور ان کے ماحول کا پتہ چلتا ہے مولانا لکھتے ہیں:۔

"ہماری درماندگیوں کا عجب حال ہے ہم

---

[۱] ص۲۰، تنقیدیں، ڈاکٹر خورشید الاسلام

[۲] ص۲، ادب کا مطالعہ:۔ پروفیسر آل احمد سرور

اپنے ذہنی آثار کو ہر چیز سے بچا لے جا سکتے
ہیں مگر خود اپنے آپ سے نہیں بچا سکتے۔
ہم کتنا ہی ضمیر غائب اور ضمیر مخاطب
کے پردوں میں چھپ چھپ کر چلیں مگر
متکلم کی پرچھائیاں پڑتی رہیں گی ہم جہاں
جاتے ہیں ہمارا سایہ ساتھ جاتا ہے[۵۰]

مولانا آزاد کی انفرادیت اور انانیت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ عام روش اختیار کریں یا شاہراہ عالم پر چلیں اور اسی انفرادیت کو وہ اپنے خطوط میں بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں"

"بازار میں ہمیشہ وہی جنس رکھی جاتی ہے
جس کی مانگ ہوتی ہے اور چونکہ مانگ ہوتی
ہے اس لئے ہر ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہے
اور ہر آنکھ اسے قبول کرتی ہے مگر میرا
معاملہ اس سے بالکل الٹا رہا ہے۔ جس
جنس کی مانگ ہوئی میری دکان میں جگہ
نہ پا سکی۔ لوگ دور دراز سے ایسی چیزیں
ڈھونڈھ کر لائیں گے جس کا عام رواج
ہو۔ میں نے ہمیشہ ایسی چیزیں ڈھونڈھ
کر جمع کیں جن کا کہیں رواج نہ ہو۔ اوروں
کے لئے پسند اور انتخاب کی جو علت
ہوئی وہی میرے لئے ترک و اعتراض کی
علت بن گئی انھوں نے دکانوں میں ایسا مال
سجایا جس کے لئے سب ہاتھ بڑھیں میں
نے کوئی ایسی چیز رکھی ہی نہیں جس کے لئے
ہاتھ بڑھیں لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں
تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں
کی بھیڑ لگی ہو میں نے جہاں اپنی دکان لگائی
تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگائی جہاں کم سے
کم گاہکوں کا گذر ہو سکے۔ مذہب میں، ادب
میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں
جہاں بھی نکل پڑا۔ اکیلا ہی نکلنا پڑا۔ کسی
راہ میں وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے
سکا۔ جس راہ میں قدم رکھا وقت کی منزلوں
سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو
گرد راہ کے سوا کچھ بھی نہ دکھائی دیتا تھا
اور یہ گرد بھی اپنی تیز رفتاری کی اڑائی
ہوئی تھی[۵۱]

مولانا آزاد کی یہی انفرادیت اور انانیت ان کی زندگی کی ضامن بن گئی وہ خود بھی اپنی ذات کو کبھی فراموش نہ کر سکے اپنی شخصیت کا احساس ان کو ہر قدم پر رہا اور یہ خود فراموشی نہ کرنے کا احساس ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے بھی ان کو باآسانی فراموش نہیں کر سکتے۔

مولانا "غبار خاطر" ہی میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"سوچتا ہوں زندگی کی بہت سی باتوں کی
طرح اس معاملے میں بھی ساری دنیا سے
الٹی چال میرے حصے میں آئی ہے۔ دنیا کے
سونے کا جو سب سے وقت بہتر ہوا وہی
میری بیداری کی اصل پونجی ہے لوگ ان
گھڑیوں کو اس لئے عزیز رکھتے ہیں کہ میٹھی
نیند کے مزے لیں۔ میں اس لئے عزیز رکھتا
ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں کے لذت
اندوز ہوتا رہوں"

مولانا آزاد الفاظ سے کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کا

۵۰۔ غبار خاطر

۵۱۔ غبار خاطر

استعمال اس خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ معمولی معمولی الفاظ میں بھی معنویت پیدا ہو جاتی ہے ان کا حساس ذہن چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی بڑی بڑی باتیں سوچنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اتنی معمولی چیزیں جن پر ایک معمولی آدمی دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا:

- جب لوگ کام جوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چن رہے تھے تو ہمارے حصے میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے انھوں نے پھول چن لیے اور کانٹے چھوڑ دیے ہم نے کانٹے چن لیے اور پھول چھوڑ دیے۔ ؎

اسی ایک خط میں ایک شاخ بریدہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

- یہاں احاطے کے شمالی گوشہ میں ایک نیم کا درخت ہے کچھ دن ہوئے ایک دارو‌ڑ نے اس کی ایک ٹہنی کاٹ ڈالی تھی اور جڑ کے پاس پھینک دی تھی اب بارش ہوئی تو تمام میدان سرسبز ہونے لگا نیم کی شاخوں نے رزد چیتھڑے اُتار کر بہار و شادابی کا نیا جوڑا پہن لیا جس ٹہنی کو دیکھو ہرے ہرے پتے اور سفید سفید پھولوں سے لدی ہی ہے لیکن کٹی ہوئی ٹہنی کو دیکھئے تو گویا اس کے لئے کوئی انقلاب ہوا ہی نہیں۔ ویسی ہی سوکھی کی سوکھی پڑی ہے یہ بھی اسی درخت کی ایک شاخ ہے۔ جیسے برسات نے آتے ہی زندگی اور شادابی کا نیا جوڑا پہنایا۔ یہ بھی آج دوسری ٹہنیوں کی طرح بہار کا استقبال کرتی مگر اسے اب دنیا اور دنیا کے موسمی انقلابوں سے کوئی سروکار نہ رہا۔ بہار و خزاں، گرمی سردی، خشکی و طراوت سب اس کے لئے یکساں ہیں۔ کل دوپہر کو اس کی طرف سے گذر رہا تھا یکایک شاخ بریدہ ٭ سے پاؤں ٹکرا گیا اور اسے دیکھنے لگا بے اختیار شاعر کی حسن تعلیل یاد آگئی ؂

قطع امید کردہ نہ خواہد تقسیم دہر
شاخ بریدہ راانظرے بر بہار نیست ؎

مولانا کے اس مکتوب میں خواص طور پر وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک اچھے انشائیہ میں ہوتی ہیں وہ اپنے خطوط میں جو مضمون بیان کرتے ہیں اس کی تصویر کشی اس خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ پورا منظر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اس مقام پر کھڑے ہوئے ہیں جہاں کی مولانا بات بیان کر رہے ہیں۔

مضمون طربیہ ہو یا المیہ، مسرت کا بیان ہو یا غم کا ماتم قدرت کی منظر کشی ہو یا کسی ویرانے کا بیان، مولانا کے قلم کی جادو بیانی ہر جگہ اپنا کمال دکھاتی ہے۔ جیل خانے کے اندر جب مولانا کو ان کی اہلیہ کی وفات کی خبر ملتی ہے تو ان پر غم کا ٭ مگر اس غم کی روداد کو اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے اسلوب کی داد دینی پڑتی ہے۔ وہ اپنے خط میں غم کا اظہار تو کرتے ہیں مگر یہ اظہار غم بہت دبے دبے، سہمے سہمے انداز میں ہوتا ہے۔ ضبط و تحمل کا دامن مولانا کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹتا وہ عام روش سے یہاں بھی ہٹ کر چلتے ہیں۔ وہ اپنے غم کو عوامی شاہراہوں پر لانے سے پرہیز کرتے ہیں اپنی انفرادیت کا بھرم یہاں بھی قائم رکھتے ہیں۔

" اس زمانے میں میرے جو دل و دماغ کا حال رہا ہے میں اسے چھپانا نہیں چاہتا میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں اس میں

ص؎ ۔ غبار خاطر
٭ اس مقام پر مضمون نگار کچھ لکھنا بھول گیا (ادارہ)

میرا ظاہر کامیاب ہوا مگر باطن نہ ہو سکا میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ ظاہر اور بناوٹ کا ہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور کے ہر گوشہ میں ہم سے ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے سب سے پہلی یہ کوشش کرنی پڑی کہ یہاں کی زندگی جو روزانہ معمولات ٹھہرائی جا چکی ہیں اس میں فرق نہ آنے پائے میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول برقرار رکھا ٹھیک وقت پر کمرے سے نکلتا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھتا رہا۔ بھوک یک قلم بند ہو چکی ہے لیکن میں چند لقمے حلق سے اُتارتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساتھیوں کے ساتھ نشست رہا کرتی تھی اس میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔ جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا، باتیں کرتا تھا اور جس قسم کی باتیں کرتا تھا وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔ اخبارات یہاں بارہ ایک بجے کے درمیان آیا کرتے ہیں، جیلر اخبار لے کر سیدھا میرے کمرے میں آتا ہے جونہی اس کے کمرے سے نکلنے کی اور چلنے کی آہٹ ہوتی تھی دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں ملے گی لیکن پھر فوراً چونک اُٹھتا۔ جب جیلر آتا تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار میز پر رکھ دے اور پھر میں لکھنے میں مصروف ہو جاتا گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ ظاہرداریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جن سے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے صبر و قرار کے دامن پر بے حالی اور پریشان خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے بالآخر ۱۳ اپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔" (غبار خاطر)

مولانا اپنی تلخیوں کا اظہار کرتے ہوئے جھجکتے ہیں اور اس سوز و گداز کے چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ جو ان کے دل و دماغ میں سرایت کر چکا ہے اور جس کی تشکیل کے لئے وہ زندگی کا جائزہ مختلف طریقوں سے لیتے رہے ہیں وہ اس دنیا کی ترقی اور تنزلی، خوش حالی اور بدحالی، عروج اور زوال، امیری و مفلسی، محنت جفاکشی اور عیش و آسائش سب ہی ان کی نظر میں رہتی ہیں اور مختلف پیراؤں میں وہ اس کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

"غور کیجئے تو یہاں کی ہر بناوٹ کسی نہ کسی بگاڑ کا نتیجہ ہے یا یوں کہیئے کہ یہاں کا ہر بگاڑ دراصل ایک نئی بناوٹ ہے۔ میدانوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں، درختوں پر آریاں چلنے لگتی ہیں اور جہاز بن کر تیار ہو جاتے ہیں سونے کی کانیں خالی ہو گئیں لیکن ملک کا خزانہ دیکھئے تو اشرفیوں سے بھرپور ہو رہا ہے۔ مزدور نے اپنا پسینہ سر سے پیر تک بہا دیا مگر سرمایہ دار کی عیش و عشرت کا سامان مہیا ہو گیا۔ ہم مالی کی جھولی بھری دیکھ کر خوش ہونے لگتے ہیں مگر ہمیں یہ خیال نہیں آتا کہ کسی کے باغ کی کیاری اُجڑی ہوگی تب ہی جھولی معمور ہوئی۔" (غبار خاطر)

انشائیہ اور طنز و مزاح کا قریبی رشتہ ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کی شخصیت "انشائیہ" میں ابھر کر سامنے آتی ہے اس کی بے تکلفی شوخی اور طنز و مزاح کے نشتر انشائیہ کے لطف کو دوبالا کر دیتے

انشائیہ نگار تلخ بات کو طنز و مزاح کا سہارا لے کر بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اور موثر انداز میں کہہ جاتا ہے۔ مولانا آزاد کے یہاں بھی طنز و مزاح کے نشتر ملتے ہیں۔ گو بظاہر وہ بڑے سنجیدہ، متین، خاموش طبع اور مذہبی قسم کے انسان تھے مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ باغ و بہار بھی تھے۔ ظرافت صرف ہنسنے ہنسانے کا نام ہی نہیں ہے بلکہ اس کے اندر اخلاقی، سیاسی، سماجی اور معاشی نکتہ چینیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ انشائیہ نگار کبھی تو اعلیٰ سے اعلیٰ چیز کو انتہائی پستی میں ڈال دیتا ہے اور کبھی انتہائی پست اور گمنام چیز کو بلندی کی آخری سطح پر پہونچا دیتا ہے۔ مولانا آزاد کے طنز و مزاح میں آمد کا رنگ ملتا ہے وہ اپنے طنز و مزاح کے ایسے کاری نشتر لگاتے ہیں کہ درد کا احساس تک نہیں ہوتا۔ غبار خاطر، میں مولانا نے جگہ جگہ ایسے نشتروں کا استعمال کیا ہے لیکن ایسے مقامات پر بھی ان کا دل تعصب اور بغض و عناد سے پاک نظر آتا ہے اور ان کی تحریروں میں خلوص کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ چائے اور ہندستانیوں کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> "دراصل یہ عالمگیر غلط فہمی اس طرح پیدا ہوئی کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جب چائے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی تھی تو ہندوستان کے بعض انگریز کاشتکاروں کو یہ خیال ہوا کہ سیلون اور ہندوستان کے بلند اور مرطوب مقامات میں چائے کی کاشت کا تجربہ کریں انھوں نے چین سے چائے کے پودے منگائے اور یہاں کاشت شروع کی۔ یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے انکار کر دیا مگر تقریباً اسی شکل و صورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی۔ ان زیاں کاروں نے اس کا نام چائے رکھ دیا اور اس غرض سے کہ اصل چائے سے ممتاز رہے اسے کالی چائے کے نام سے پکارنے لگے"

چائے کے سلسلے میں ایک اور دلچسپ اقتباس ملاحظہ فرما:

> "سترھویں صدی میں جب انگریز اس سے آشنا ہوئے تو معلوم نہیں ان لوگوں کو کیا سوجھی کہ انھوں نے دودھ ملانے کی بدعت شروع کی اور چونکہ ہندوستان میں چائے کی ایجاد انھیں کے ذریعہ ہوئی اس لئے یہ بدعت سیاہ یہاں بھی پھیل گئی رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہونچ گیا کہ لوگ چائے میں دودھ ڈالنے کی بجائے دودھ میں چائے ڈالنے لگے"

مولانا کے یہاں تمثیلی انداز بھی اپنی شان رکھتا ہے غبار خاطر میں انھوں نے جو تمثیلی انداز اختیار کیا ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے قدرتی مناظر سے انھیں لگاؤ ہے۔ پھولوں پھلوں، پرندوں اور بیل بوٹوں کی انھوں نے ایک رنگین دنیا بسائی ہے اس سے مولانا کی طبیعت کی نشاندہی ہوتی ہے وہ ہر چھوٹی بڑی چیز کو بڑی گہری نظر سے دیکھتے ہیں۔ حسین اور خوبصورت بیل بوٹوں کو دیکھ کر تصورات کا رخ اپنی زندگی اور اس کے مسائل کی طرف موڑ دینا ان کی انشا پردازی کا ادنیٰ کارنامہ ہے اقتباس۔

> "کوئی پھول یاقوت کا کٹورا تھا کوئی نیلم کی پیالی تھی کسی پر گنگا جمنی کی قلم کاری کی گئی تھی کسی پر چھینٹ کی طرح رنگ برنگ کی چھپائی ہو رہی تھی کہیں پھولوں پر رنگ کی بوندیں اس طرح پڑ گئیں تھیں کہ خیال ہوتا تھا کہ صناع قدرت کے موقلم میں رنگ زیادہ بھر گیا ہوگا اور صاف کرنے کے لئے جھٹکنا پڑا اور اس

کی چھینٹیں قبائے گل کے دامن پر پڑ گئیں
بہار صبح کی بیلیں برآمدے کی چھت پر
پھو نچا کر پھر اندر کی طرف پھیلا دی گئی تھیں۔
چند دنوں کے بعد نظر اٹھائی تو ساری چھت پر
پھلواری لدی ہوئی شاخیں پھیل گئی تھیں لوگ
پھولوں کی سیج بچھاتے ہیں اور کروٹوں سے
اسے پامال کرتے رہتے ہیں ہمارے حصہ میں
کانٹوں کا فرش آیا تو ہم نے پھولوں کی سیج بستر
سے اٹھا کر چھت پر الٹ دی تلووں کے کانٹے
چنتے رہے مگر نگاہ ہمیشہ اوپر کی طرف
رہتی؟

غبار خاطر میں مولانا آزاد کی انشائیہ نگاری کے جو نمونے ہمارے سامنے آتے ہیں ان سے مولانا کی تصویر بنانے میں بہت مدد ملتی ہے جہاں انھوں نے اپنی بصیرت، علمیت اور وسیع مشاہدات و تجربات سے کام لیا ہے وہاں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ اسلوب بیان، یقین پیہم عمل محکم کے ساتھ ساتھ دبیع المشرقی اور رنگین مزاجی کا عجیب و غریب امتزاج ملتا ہے۔ عشق مزاجی سے عشق حقیقی تک کے نشانات ملتے ہیں مولانا کے قدم زندگی کے ہر گوشہ سے آشنا ہیں ان کی شخصیت ایک بے باک انشائیہ نگار کی طرح سامنے آتی ہے جہاں انھوں نے بلا تکلف اور بلا تضنع اپنی زندگی کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اقتباس

"ہماری زندگی ایک آئینہ ہے یہاں ہر
چہرے کا عکس بیک وقت سینکڑوں آئینوں
پر پڑنے لگتا ہے اگر ایک چہرے پر بھی
غبار آجائے گا تو سینکڑوں چہرے غبار
آلود ہوجائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد
کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں
ہے وہ پورے مجموعہ کا حادثہ ہے دریا کی
سطح پر ایک لہر اٹھتی ہے لیکن اسی ایک
لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔
ہم خود خوش ہوکر دوسروں کو خوش کرتے
ہیں اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش ہونے
لگتے ہیں"

مولانا کے دل میں ایک دائمی درد ہے ان کی نگاہیں ایسی حقیقتوں پر پڑتی ہیں جہاں سے عوام بے حسی کے عالم میں گذر جاتے ہیں مثلاً شاخ، پرند اور قبر جیسی چیزیں جب مولانا کی نظر سے گذرتی ہیں تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے ان کے ذہن میں خیالات کا تانتا مسلسل چلا جاتا ہے۔ احمد نگر کی جیل میں ایک نیم کا درخت تھا اور اسی نیم کے درخت کے قریب ہی ایک قبر تھی جس پر مولانا کی نگاہیں بار بار پڑتی تھیں اور ان کے ذہن خیالات و تصورات رقص کرنے لگتے۔ خاص طور پر یہ تصور اور بھی زیادہ مربوط ہوگیا جب مولانا نے اپنی اہلیہ کی وفات کی خبر سنی۔

"یہاں احاطے میں ایک پرانی قبر ہے، نہیں
معلوم کس کی ہے۔ جب سے آیا ہوں سینکڑوں
بار اس پر نظر پڑ چکی ہے لیکن اب اسے
دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے ایک
طرح کا انس اس سے پیدا ہوگیا ہے کل شام
کو دیر تک اسے تکتا رہا اور متمم بن نویرہ کا
مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی کی موت پر
لکھا تھا بے اختیار یاد آگیا"

مولانا آزاد کی طبیعت کا بنیادی ضمیر ہی عشق و جنون کی شورشوں سے اٹھا تھا عشق کا یہ نشتر جگر میں بے غرض محمود کی حیثیت سے ان کے ضمیر میں داخل ہوگیا جس نے ان کی طبیعت میں ایک دائمی دردمندی، سرشاری اور دلفگاری بھر دی تھی جس کا اظہار مولانا نے جگہ جگہ کیا ہے ان کی راہ میں کانٹے ضرور تھے مگر اپنی زندگی کے مقاصد کو پورا کرنے میں وہ ان دشوار گزار راہوں سے

کتراتے نہیں تھے ان کے تلووں میں کانٹے چبھتے رہے اور چھالے پھوٹتے رہے اور وہ مسکراتے رہے اور اس وادیٔ پرخار سے گزرتے رہے۔

> "کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم پھولوں کی سیج پر
> لوٹتے ہیں اور راحت نہیں پاتے کبھی
> ایسا ہوتا ہے کہ کانٹوں پر دوڑتے ہیں
> اور اس کی چبھن میں راحت و سرور کی
> ایک نئی لذت پانے لگتے ہیں راحت والم
> کا احساس باہر سے لاکر کوئی نہیں دے
> دیا کرتا یہ خود ہمارا ہی احساس ہے۔ جو
> کبھی زخم لگاتا ہے، کبھی مرہم بن جاتا ہے
> طلب وسعی کی زندگی بجائے خود زندگی
> کی سب سے بڑی لذت ہے بشرطیکہ کسی
> مطلوب کی راہ میں ہو" (غبار خاطر)

مولانا نے اپنی زندگی کو کبھی پریشان کن محسوس نہیں کیا۔ انھوں نے زندگی کے تاریک پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا اور ہر چیز کو سامانِ راحت میں منتقل کر لیا اور ہر چیز میں حسن تلاش کرنے کی کوشش کی حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں حسن حسن ہے اور اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے، اقتباس

> "رات کا سناٹا۔ تاروں کی چھاؤں ڈھلتی
> ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات
> چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے
> کھڑے تھے۔ برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔ بیچ
> میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی
> کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا نیچے جمنا
> کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں
> پردۂ ظلمت کی اس جھل مل فضا میں اچانک
> پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف
> اٹھے اور ہوا کی لہروں پر بے رنگ نوک تیرنے
> لگے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور
> میری انگلی سے نغمے۔
> دیر تک فضا تھمی رہی گویا خاموشی سے کان
> لگا کر سن رہی ہے پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی
> حرکت میں آنے لگتا چاند بڑھنے لگتا یہاں تک
> کہ سر پر آکھڑا ہوتا۔ ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ
> کر تکنے لگتے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیف میں آآکر
> جھومنے لگتیں۔ رات کے سیاہ پردوں کے
> اندر عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی
> دینے لگتیں۔ بارہا تاج کی برجیاں اپنی جگہ
> سے ہل گئیں اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے
> اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔
> آپ باور کریں یا نہ کریں مگر واقعہ یہ ہے کہ
> اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں
> کی ہیں اور جب کبھی تاج کی گنبد کی طرف خاموش
> نظر اٹھائی ہے تو اس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے"

ان اقتباسات سے مولانا آزاد کی قوتِ تخیل اور انشائیہ نگاری کی اہلیت کا اندازہ ہوتا ہے اور مولانا کا قلم قدم قدم پر اپنی گوہر افشانیاں کرتا نظر آتا ہے۔ ان اقتباسات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کا اسلوب انشائیہ کا اسلوب ہے اگر ان خطوط کے القاب ہٹا دیے جائیں تو ان کو کوئی بھی خط کہنے یا ماننے پر تیار نہ ہوگا۔

"اعلان"

ماتیٔ جائسی سے متعلق بقیہ مضمون موصول ہو گیا ہے جو اگلے شمارے میں شاملِ اشاعت کیا جائے گا۔

ادارہ

ساحل مانکپوری

انتخاب لاجواب (منشی محبوب عالم کا منفرد ہفتہ وار)

منشی محبوب عالم اُردو کے ممتاز صحافیوں میں شمار ہوتے تھے. جس زمانہ میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی اُردو نظم کے احیا پر زور دے رہے تھے اس وقت منشی صاحب بھی اپنے خیالات کے ذریعہ اس کی ترویج و اشاعت اور اس کی مقبولیت میں اضافہ کر رہے تھے. انھوں نے مدراس کے کسی قاسم صاحب کے خط کا جواب دیتے ہوئے ۱۲ر جون ۱۹۰۱ء کے شمارے میں لکھا تھا.

"آج ہندوستان میں جس کثرت سے غزلیں تیار ہوتی ہیں اور کسی چیز کی پیدا وار اس افراط سے نہیں ہوتی ــــ انتخاب میں ایک آدھ اُستاد کی ایک آدھ غزل سے اشعار درج ہو جاتے ہیں تو عذر نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ دلچسپی کا ذریعہ ہوگی اور انتخاب لاجواب کی ایک غرض اعلیٰ درجہ کی دلچسپی بہم پہونچانا بھی ہے. اس کی علت غائی ہے بہتر ہو کہ اگر بجائے غزلیں لکھنے کے آپ کے احباب قدرتی مناظر اور اخلاقی مطالب کو نظم کا خوش نما لباس پہنا کر انتخاب میں جلوہ گر کریں پھر دیکھیں کہ خود دلچسپی کیسی ان کی گرم بازاری میں مدد نہیں دیتی"

اُن کے اس جواب سے اُن کے مزاج اور طبیعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے. وہ غزلوں کے اشعار کو بھی منتخبات نظم کے زیر تحت کوئی نہ کوئی عنوان دے کر شریک کرتے تھے.

منشی محبوب عالم نے انتخاب لاجواب کو ۱۹ویں صدی کے اواخر یعنی ۱۸۹۷ء میں لاہور سے جاری کیا تھا. یہ ٹِٹس بِٹس کی نوعیت کا حامل تھا اس میں اسی نوع کی تمام ایسی دلچسپیاں ہوتی تھیں جو ناظرین کو مطلوب تھیں. منشی صاحب نے اس ٹِٹس بِٹس ٹائپ کے رسالے کے قبل ۱۸۸۷ء میں اخبار عام ۱۸۸۸ء میں فیروز والہ سے پیسہ اخبار (اس کی متعدد کاپیاں میرے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہیں) ۱۸۸۶ء میں زمیندار ۱۸۸۶ء میں فیروز والہ سے ہمت جاری کیا.

انگلستان کی واپسی کے بعد وہ بیک وقت انتخاب لاجواب کے علاوہ، شریف بی بی، پیسہ اخبار اور بچوں کا اخبار نکال رہے تھے.

انتخاب لاجواب ۱۸ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا. تین کالم کے اس صفحاتی رسالے میں منشی صاحب کے وہ تمام تجربات، مشاہدات کی روح رچی بسی تھی. وہ عوام کا مزاج پہچانتے تھے اُن کی اس بالغ نظری اور تجربہ کاری نے انھیں صفِ اول کا صحافی بنا دیا تھا

اس اخبار نے صفحہ اول کی پیشانی پر درج ذیل جملہ بات کا نشاندہ ہے کہ یہ ملک کے دوسرے اخبار و رسائل و کتابوں کے منتخب حصے شائع کرتا تھا. جملہ یہ ہے.

"دنیا کی تمام نہایت دلچسپ اور مفید کتابوں اخباروں رسالوں اور تحریروں سے ہفتہ وارہ

اس کے علاوہ اس رسالے کی ایک یہ بھی خصوصیت تھی کہ یہ مصنفین کو معاوضہ اور ناظرین کو کئی قسم کے انعامات دیتا تھا۔

اس رسالے کی سالانہ قیمت مع محصول ڈاک چار روپیہ تھی اور فی رسالہ ایک روپیہ مقرر تھی۔

ابتدائی صفحہ پر لطائف اور اس کے علاوہ مستقل فیچر میں درج ذیل عنوانات کے تحت منتخب تحریریں شائع ہوتی تھیں۔

۱۔ حکمت کے موتی مشرق و مغرب سے
۲۔ روئے زمین کے رسم و رواج اور توہمات
۳۔ دلچسپ کہانیاں
۴۔ دنیا کی نتیجہ خیز تاریخی حکایات
۵۔ کارآمد باتیں
۶۔ انتخاب علوم
۷۔ کئی اور عجیب باتیں
۸۔ سوالیہ ثلاثہ
۹۔ زمانہ باتیں
۱۰۔ نامیوں کے نشان
۱۱۔ ناظرین کے مرسلہ لطیفے
۱۲۔ مراسلات
۱۳۔ منتخبات نظم
۱۴۔ غور طلب دلچسپ نقطے
۱۵۔ انتخاب مفید
۱۶۔ مشاہیر عہد
۱۷۔ واقعاتِ عالم کا انتخاب

پیشِ نظر شمارے میں صفحہ ۱ پر ۱۲ لطیفے عنوان وار شائع ہوئے ہیں۔ جن میں سے چند بدیۂ ناظرین ہیں۔

لڑائی کا مزا دوسرے دن آتا ہے:۔

رحیم:۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کریم سے آج صبح کیوں لڑا۔

سلیم:۔ ہاں بھائی اب تمہیں معلوم ہوا ہے کیا تمہیں یہ خیال پہلے نہ آیا تھا؟

رحیم:۔ خیال تو اب بھی نہیں آتا تھا، اس کم بخت نے آج دوپہر کو عام ضیافت کی ہے۔

دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہیں:۔

دلہن:۔ (شادی کے بعد) پیارے! کیا تم مجھے معاف کردو گے اور بدستور مجھ سے محبت کرو گے۔ کیونکہ اب میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میرے سفید دانت مصنوعی ہیں۔

دولہا:۔ (سر پر ہاتھ پھیر کے) خدا کا شکر ہے کہ اب مجھے بھی اپنے چھوٹے بال تم سے چھپانے کی ضرورت نہ ہوگی، میں گنجا ہوں۔

خبریں پہنچانے کا ذریعہ:۔

ملاقاتی:۔ آپ کو اخبار کے لئے اس قدر خبریں کہاں سے مل جاتی ہیں۔ شاید آپ کے نامہ نگار بہت سے ہیں۔

ایڈیٹر:۔ نہیں مجھے نامہ نگاروں کی ضرورت نہیں صرف ایک بیوی ہی کافی ہے۔

صفحہ ۲ پر ۱۹۱۰ء کی دو بڑی نمائش کے عنوان کے تحت گلاسگو کی نمائش کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس کی تیاری ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو شروع ہوئی تھی اور جس کی تیاری میں ۲ سال کا عرصہ صرف ہوا تھا۔ جو ایک سو ایکڑ زمین پر۔ دریائے کلون کے کنارے پر کھولی گئی جس کے متعلق درج ذیل عبارت کافی دلچسپ ہے۔

"یہ نمائش ایک سو ایکڑ زمین پر کھولی گئی اور دریائے کلون کی خوبصورتی کے علاوہ جس کے ایک طرف کوہستان۔ گلشن کی ڈھلانیں اور دوسری طرف بڑے بڑے نامور سوداگروں کی کوٹھیاں کی قطاریں ہیں اس میں مشہور رکلونگھم پارک بھی شامل ہے۔"

اس نمائش میں روس، کینڈا، بلجیم، فرانس، ہالینڈ، امریکہ وغیرہ شریک تھے۔ اس نمائش کے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"اس کا مدعا صرف سائنس اور آرٹ کی
ترقی دینا ہے"

اور آگے چل کر اس کی تاخیر کے اسباب بیان کئے گئے ہیں

"ایڈورڈ ہفتم کو ملکہ مرحومہ کی موت نے
نمائش کھولنے کے ارادہ سے باز رکھا لیکن
بادشاہ نے اپنی طرف سے اپنی لڑکی
ڈچز آف خالف کو مقرر کر دیا"

اس نمائش میں روس کے پویلین کی بے حد تعریف کی گئی ہے۔

"روسی عمارات میں ایک نہایت شاندار
عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ جس میں زار روس
اپنے سیر نمائش کے دن گزاریں گے یہ
ہال روسی محلات کے وسط میں کھڑا کیا
گیا ہے۔ جہاں روسی طرز و طریق کے کھانے
پینے کے سامان اور سلطنت کی ہر قسم کی
پیداوار کی چیزیں دکھلائی گئی ہیں"

روس کے علاوہ کینڈا اور جاپان کے پویلین کی بھی تعریف کی گئی ہے جاپان کے ریفرشمنٹ روم کی تعریف کرتے ہوئے درج ہے کہ

"ایک خوش گوار جاپانی باغ میں چائے
کا پیالہ پینا اور پھر اس کو: اندام جاپانی
دوشیزہ کے ہاتھ سے، جو اپنا قومی لباس
پہنے ہوئے ہوگی کتنا حسرت انگیز
ہوگا"

نمائش گلاسگو کی بیرونی اور اندرونی گوشہ کی دو تصویریں اور زار روس کے محل کا فوٹو شامل اشاعت ہے

نمائش گلاسگو میں برٹش جنوبی افریقہ کی وحشیانہ زندگی سے لے کر دور شائستگی تک کی ترقی تصویروں اور ماڈلوں کے ذریعہ دکھائی گئی ہے۔

اس نمائش کے بعد امریکہ کے بفیلو کی نمائش کا تذکرہ بھی درج ہے اس نمائش کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اس کا بڑا مدعا شائستگی ایسے کار عظیم کو انجام
دینا اور مشرقی کرہ کے سیکڑوں برس کے
معاملات کو ظاہر کرنا ہے۔ اٹلانٹا کے ۱۸۹۶ء
کی دلائل کی بڑی کامیابی اس خیال کی ذمہ دار
ہے اور امید کی جاتی ہے کہ یہ نمائش انگلستان
کی دوستی کو امریکن ملکوں سے بڑی مضبوطی
سے ملحق کر دے گی"

اس نمائش کی ایک خوبصورت عمارت کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

"بفیلو کے دولت مند مسٹر جے اسرائیٹ
نے پرائیویٹ طور پر تیار کی ہے اور
اسے نمائش کے انٹرسٹ میں مفت دے
دیا ہے۔ ۰۰ ہزار پونڈ کی لاگت سے
سفید سنگ مرمر کی نہایت بلند اور خوبصورت
بنائی گئی ہے نمائش کے ختم ہونے کے
بعد یہ عمارت بطور صنعتی خزانہ کے استعمال
میں آئے گی"

آگے چل کر اس کے طول و عرض کا ذکر کیا گیا ہے۔

"اس کے لئے ۳۵۰ ایکڑ زمین پسند کی
گئی ہے جس کے بیچ حصہ پر ایک نہایت
خوبصورت جھیل اور ایک چراگاہ ہوگی"

اس نمائش کی تیاری میں تقریباً ۱۰ لاکھ ڈالر یا دو لاکھ

پونڈ صرف کئے گئے اور نمائش کے اندرونی حصہ میں کئی چشمے اور فوارے نصب کئے گئے تھے اور مختلف انواع کے پھول اور پودے لگا دیے گئے تھے۔ اس نمائش کی سب سے بڑی اور حسین عمارت "برقی مینار" تھی۔ جس کی بلندی ۴۰۹ فٹ تھی جس کی روشنی نیاگرا آبشار تک جاتی تھی۔ اور اس کے گنبد کی چوٹی پر ایک روشن بت نصب کیا گیا تھا۔

صفحہ ۴ کے دوسرے اور تیسرے کالم میں "قسمت کا کھیل" کے عنوان کے تحت نیوساؤتھ ویلز، بھکری ہل (آسٹریلیا) اور کیلیفورنیا میں [illegible] ... مات پر سونے کی سلوں اور اینٹوں کی دستیابی کا ذکر کیا گیا ہے لیکن [illegible] طوالت نظر انداز کرتا ہوں۔

صفحہ ۴ پر "... کے موتی مشرق و مغرب سے" کے عنوان کے تحت ۱۲ اقوال درج کئے گئے ہیں سب سے اول مقام پر حضرت محمد صاحب کا قول نقل کیا گیا ہے اس کے بعد سائرس، گولڈ سمتھ، شیکسپیئر، لیوٹیار، والٹر، سرڈبلیورالی، ٹولنڈ، بیکن کنفیوشس اور آرتھر وا... چند اقوال درج ہیں۔

... [illegible] بات پر بلا دلیل اعتبار کر لیتا ہے تمہیں ہرگز اس کی بات پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔

(لیوٹیار)

دانا آدمی بے وقوفوں سے زیادہ سیکھتے ہیں مگر بے وقوف داناؤں سے بہت کم

(بیکن)

کام کرتے وقت خیال کرو کہ تمہارے دس ہاتھ اور ۲۰ آنکھیں ہیں۔

(کنفیوشس)

صفحہ ۸ کے دوسرے کالم میں "روئے زمین کے رسم و رواج اور توہمات" کا عنوان ہے۔ جس میں سانپوں سے کھیلنا، عرب کا ایک عجیب و غریب دستور شادی کی عجیب رسم اور جاپان میں غسل کی عجیب رسوم کے متعلق دلچسپ حکایتیں درج کی گئی ہیں۔

صفحہ ۵ پر "دلچسپ کہانیاں" کے عنوان کے تحت "لاوارث جھمکا" کہانی شائع کی گئی ہے۔ جو ۱۶۰۴ء کے واقعہ سے متعلق ہے یہ واقعہ شہنشاہ اکبر کے عہد میں پیش آیا تھا۔ کہانی سچی اور عبرت خیز ہے۔ جس میں خوشحال گڑھ کی ایک عورت کے قتل کے اسرار کا ذکر ہے۔ قاضی شہر کے بیان کے مطابق۔

..... تاریخ کو خبر ملی کہ ایک مردہ عورت ثمرآن نالے کے کنارے پڑی ہے خبر سنتے ہی ہم نے فوراً اس کے متعلق تحقیقات شروع کی مگر نہ تو یہ معلوم ہوا کہ وہ عورت کون تھی۔ اور نہ یہ ہی معلوم ہوا کہ وہ کس طرح جاں بحق ہوئی اس کے ایک کان سے سونے کا ایک جھمکا ملا تھا۔ اس کے متعلق ہم حکم صادر کرتے ہیں چونکہ یہ جھمکا اب لاوارث ہے اس لئے اسے ہمارے چند مشیروں کو دو دن کی تنخواہ دی جائے کہ جنہوں نے بڑی محنت سے کام کیا ہے اور باقی رقم مقتولہ کے تجہیز و تکفین پر صرف کی جائے۔"

اس بیان کے بعد قاضی شہر کے لئے یہ خبر انتہائی تشویش ناک تھی کہ ابھی تمام خرچ کے بعد بھی ایک بھاری رقم باقی ہے۔ لہٰذا اس رقم کو خرچ کرنے کے لئے دوبارہ تحقیقات کا حکم صادر کیا گیا تاکہ یہ زاید رقم صرف ہو جائے آخرکار تین دن کی مزید تحقیق نے اس بقایہ رقم کو بھی صرف کر دیا گیا۔ لیکن قتل کا معمہ نہ حل ہوا۔

صفحہ ۶ کے اول کالم پر "دنیا کی نتیجہ خیز تاریخی حکایات" میں شاہ ابراہیم ادھم کے فقیر ہونے کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ جو کافی مشہور ہے۔ جس کو انگریزی کے نامور شاعر نے منظوم ترجمہ

بھی کیا ہے۔ اور اُردو و فارسی میں نظم کیا گیا ہے۔

صفحہ ۴ کے کالم تین پر "کار آمد باتیں" کے زیر عنوان انڈوں کے چھلکوں کا استعمال، عجیب حکمت، مٹی کے برتن پر کانچ کی قلعی کرنا، دلچسپ مفید ٹوٹکے، خالص ہیرے کی شناخت کا ذکر کیا گیا ہے۔

صفحہ ۷ پر کالم ایک اور دو پر "انتخاب علوم" میں اشیاء کا وزن، چینی سے روشنی، عجیب تجربہ، درازی قد کا تجربہ، پر نوٹس شایع کئے گئے ہیں اور کالم تین پر "نئی اور عجیب باتیں" میں آتشزدگی کا انسداد، سبز پشیم دار بھیڑیں، بے پنش شہد کی مکھی، سفر میں اخبار کا شغل، واٹر پروف کاغذ، آتش فشانی پر دلچسپ معلومات یکجا کی گئی ہیں۔ جس میں سے "سبز پشیم دار بھیڑیں" پر جو نوٹ درج ہے وہ نقل کرتا ہوں۔

"جرمنی میں تانبے کی کانوں کے گرد و نواح میں اس قسم کی بھیڑیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ وہ ہر وقت مٹی میں رہتی ہیں اور گاہ گاہ پانی بھی پیتی ہیں جو کہ تانبے کے کارخانوں سے نکل کر ایک جگہ جمع ہو جاتا ہے چونکہ اس پانی میں تانبے کی آمیزش ہوتی ہے اس کا اثر بالوں تک پہنچتا ہے اور وہ سبز پیدا ہوتے ہیں"

صفحہ ۸ پر "مواليد ثلاثہ" کے تحت شرمیلا درخت، امینہ کے قطرے، زہرہ ور گورا، وہیل مچھلی کا وزن کے متعلق دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

شرمیلا درخت

"فلوریڈا کے دلدلی علاقوں میں اسی قسم کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں۔ سیتنول حاکم فلوریڈا نے ایسے "کنوارا درخت" کہا ہے۔ جو کہ اپنی معشوقہ (بارش) کی آمد پر سُرخ رنگ اختیار کر لیتا ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب بارش کا آغاز ہوتا ہے تو بتدریج اس کا رنگ بھی تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ سبز رنگ بالکل ہی معدوم ہو جاتا ہے۔ سوائے ان چند سبز نشانات کے جو چوڑی شاخوں کے نیچے نظر آتے ہیں جب بارش ختم ہو جاتی ہے تو یہ درخت پھر اپنا اصلی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔"

بقیوں کا ذکر محض طوالت کی خاطر نظر انداز کرتا ہوں۔

صفحہ ۸ کے کالم تین پر "زنانہ باتیں" اور صفحہ ۹ پر "ناموں کے نشان" کے تحت "بے چارہ اندھا مصنف، مہاراجہ صاحب جموں، شاہ شیام لوتھر اعظم کی بائبل اور شاہ ایڈورڈ ہفتم رشوت نہیں لیتے۔" جیسی مفید اطلاعات درج ہیں۔

صفحہ ۹ کے کالم تین پر ناظرین کے مرسلہ لطیفے شایع کئے گئے ہیں۔

صفحہ ۱۰ پر ہندوستان کی تجارتی اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ سنہ ۱۸۹۹ء اور سنہ ۱۹۰۰ء میں کون کون سی اشیا؟ — غیر ممالک کو برآمد کی گئی ہیں۔ اس کی تفصیل محض قارئین کی دلچسپی کے خاطر درج کر رہا ہوں۔

ہندوستان کی تجارت برآمد

۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۰ء میں جو اشیاء ہندوستان سے ممالک غیر میں بھیجی گئیں ان کا مقابلہ بالتفصیل درج کیا جاتا ہے۔

باہر بھیجی ہوئی چیزوں کی تفصیل	۱۸۹۹ء (روپیہ میں)	۱۹۰۰ء (روپیہ میں)
(۱) زندہ حیوان	۱۰۴۴۷۳۲	۱۲۴۲۰۱۹
(۲) خوردنی و نوشیدنی اشیاء		
(i) چاول	۷۰۲۳۸۹۱۱	۶۹۲۴۸۳۶۶
(ii) غلہ گندم و آٹا	۴۱۵۶۰۲۱۵	۲۴۰۳۹۹۳
(iii) چائے	۵۷۸۶۵۶۴۸	۵۹۵۴۷۱۰۰
(iv) دیگر اشیاء	۲۲۷۵۲۲۹۳	۱۴۷۳۵۸۸۳
(۳) دھات و دھات کی ساختہ اشیاء		
(۴) دوائیاں وکیمیاگری کی اشیاء رنگ وغیرہ کے مصالحے		
(i) افیون	۴۵۹۳۵۱۶۴	۵۶۸۹۶۷۳۱
(ii) نیل	۵۱۹۲۶۷۲	۲۷۸۵۶۲۷
(iii) دیگر اشیاء	۶۹۲۸۰۲۸	۳۹۵۶۰۱۷
(۵) تیل	۴۸۸۷۱۹۲	۳۹۵۶۰۱۷
(۶) غیر ساختہ شدہ وکچا مصالحہ		
(i) کپاس	۵۸۸۹۱۳۹۸	۳۵۴۵۸۶۰۹
(ii) پٹسن	۳۲۰۳۸۱۹۴	۴۶۶۷۷۷۰۵
(iii) تیل کے بیج	۷۰۳۹۷۰۶۰	۲۲۲۱۷۴۱۱۶
(iv) دیگر اشیاء	۹۱۷۱۱۵۱۱	۷۸۸۱۰۶۸۶
(۷) ساخت شدہ قدرے ساخت شدہ		
(i) سوت	۴۸۳۰۲۲۱۴	۱۷۹۳۴۳۶۹
(ii) کپڑا	۷۵۹۹۵۹۱	۸۸۲۴۹۵۶
(iii) دیگر اشیاء	۷۰۵۶۹۲۲۳	۹۱۰۱۴۳۹۷
	۶۰۷۲۸۱۰۷۹	۵۶۱۳۵۵۳۶۵
(۸) سونا	۱۵۱۱۲۱۳۸	۲۵۶۸۰۴۳۰
(۹) چاندی	۳۰۴۵۵۰۲۰	۱۷۸۱۴۵۹۷
کل تجارت برآمد	۶۷۰۶۹۴۲۰۶	۶۲۲۴۴۷۲۶۰

صفحہ ۱۰ کے کالم دو پر مرزا غالب کی حاضر جوابی کے سلسلے میں ایک لطیفہ درج کیا گیا ہے جو آم کے سلسلے میں ہے اور اسی صفحہ کے تیسرے کالم پر "سونے کی زبان" کے عنوان کے تحت ایک ایرانی بادشاہ اور کسان کا وہ واقعہ درج کیا گیا ہے جس میں اس نے محض اپنی حاضر جوابی کی بنا پر سونے کی تین تھیلیاں حاصل کیں۔ اس کی اس موقعہ شناسی اور حاضر جوابی کو دیکھ ایرانی بادشاہ یہ کہتے ہوئے چل دیا کہ

"اے خدا میں اب یہاں زیادہ دیر نہیں
ٹھہر سکتا ورنہ اگر یہ شخص تیری ہستی کو
ثابت کرنے لگ گیا تو میرا خزانہ ختم
ہو جائے گا"

صفحہ ۱۱ پر مراسلات، منتخبات نظم، اور غور طلب دلچسپ نکتے جیسے عنوان نظر آتے ہیں۔ مراسلات کے سلسلے میں دینا ناتھ حافظ آبادی کا "انگوٹھے کا نشان" کے متعلق مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ کسی انگوٹھے کا نشان تمام عمر یکساں نہیں رہتا اور انگوٹھے کے نشان کو "خدائی مہر" کہنے پر اعتراض کیا ہے اور اسے مبہم بتایا ہے۔

منتخبات نظم میں حضور نظام، ظفر، بحر، اسیر، غالب رند، شیخ باقر علی، تحمل وغیرہ کے اشعار عنوان دے کر درج کئے گئے ہیں۔ جس کو محمد عبد اللہ فیروز والیہ نے بغرض اشاعت ارسال کئے تھے۔

صفحہ ۱۲ پر انتخاب مفید کا ایک معلوماتی صفحہ ہے جس میں دنیا کے عجائبات، سیاسیات، ایجادات، رسومات، لسانیات، درآمدات، تجارت اور پیداوار وغیرہ کے متعلق دلچسپ اور مفید اطلاعات شائع کی گئی ہیں۔ جن کی تعداد اکسٹھ (۶۱) ہے۔ اور جن میں سے چند یہاں لکھتا ہوں۔

چند سال کا عرصہ ہوا جرمنی میں ایک کلاک
ایجاد ہوا تھا جس کی رفتار تھی ... ۹ ہزار سال

بتلائی جاتی تھی۔

روسی ریل گاڑیوں میں لیڈیوں کے لئے چرٹ پینے کے لئے علاحدہ کمرے مقرر ہیں

جرمنی کے ۲۱۳ باشندوں میں ایک آدمی کالج میں تعلیم پاتا ہے۔

بھیڑ اپنے وزن سے ۶ گنا زیادہ خوراک سال بھر میں کھا جاتی ہے۔

اگر ایک جسیم آدمی کے چمڑے کو زمین پر بچھایا جائے تو ۱۵ مربع فیٹ زمین پر آتا ہے۔

سنہ ۱۸۹۵ء میں افغانستان میں ... ۶ ہزار فوج موجود رہتی ہے۔

فلپائن سے ...... ۴۴ چرٹ ہر سال باہر جاتے ہیں۔

تاتاری زبان کے ۴۰۴ حروف ابجد ہیں

چین میں سالانہ ...... ۷ ٹن نمک پیدا ہوتا ہے۔

ہسپانیہ میں یورپ کے سب ممالک سے بڑھ کر دھاتوں کی کانیں ہوتی ہیں ان کانوں میں لوہا، تانبا، جست، سیسہ، چاندی وغیرہ

صفحہ ۱۳ پر مشاہیر ہند کے عنوان کے تحت آنریبل سر کشور پرشاد شکر آنجہانی کے سی، آئی، اے رئیس شہر جالندھر کی سوانح حیات اور کارنامے قلم بند کئے گئے ہیں اُن کے قبل ۱۵ مشاہیر پر نوٹس شائع ہو چکے تھے۔ کشور صاحب کی تصویر بھی ہے۔

صفحہ ۱۴ پر یورپ کی خطرناک خفیہ جماعتیں، جعل سازی جرم ہے اور ہتھیاروں کا تصور، مختصر واقعاتی تحریریں شامل اشاعت ہیں۔

صفحہ ۱۵ پر چند لطیفے اور پیسہ اخبار کے اشتہارات درج کئے گئے ہیں۔ صفحہ ۱۶ پر "واقعات عالم کا انتخاب" کے زیر عنوان ہفتے کی اہم خبریں شائع کی گئی ہیں۔ جن میں سے چند خبریں یہاں درج کر رہا ہوں۔ تفصیلی خبروں میں پہلی خبر جنگ ٹرانسوال ہے اور چین کی خانہ جنگی کے متعلق بڑی تفصیل سے خبر دی گئی ہے۔ چند مختصر خبروں میں سے چند یہاں نوٹ کر رہا ہوں۔

۱. محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس لکھنؤ کا آئندہ اجلاس لکھنؤ میں ہوگا۔

---

۲. مدراس میل کہتا ہے کہ مدراس میں حضور قیصرہ کی یادگار کے متعلق چنداں جوش نہیں پایا جاتا۔ اب تک صرف ۶۱۴۳ روپیہ چندہ وصول ہوا ہے جس میں سے ۲۲۵۸۴ روپیہ سنٹرل فنڈ کلکتہ کو بھیجا جائے گا۔

---

۳. گورنر بمبئی کی لیڈی صاحبہ کو ہندوستانی زبان سیکھنے کا بہت شوق ہے انھوں نے اُردو پڑھنے کے لئے ایک مسلمان اسسٹنٹ ڈپٹی انسپکٹر کو اپنا اتالیق مقرر کیا ہے۔

---

۴. گزشتہ ہفتے ۱۴۵۵ جانیں مندرجہ ذیل ہندوستان میں طاعون سے ضائع ہوئی ہیں۔ احاطہ بمبئی میں ۴۲۷، شہر بمبئی میں ۱۰۵، میسور ۹۴۹، کلکتہ ۱۱، بنگالہ ۴۔

---

۵. جون میں تجارت درآمد برآمد کلکتہ کی مالیت ۱۴ کروڑ گیارہ لاکھ روپیہ تھی۔

---

۶. لکھنؤ میں انجمن ہمدردی حیوانات قائم ہوئی ہے۔

---

۷. ۱۳؍ جولائی کو حکیم عبدالمجید خاں مرحوم کے سوم کے روز بہت سے روسا دہلی اور بیرونجات کے حاضر تھے۔ اُن کے دونوں صاحبزادوں کو پہلے تو خواجہ قطب پھر روشن چراغ دہلی اور پھر سید حسن رسول نما کی طرف سے دستار بندی کرائی گئی اور عام ہندو مسلمان نے ڈھائی تین سو پگڑیاں بندھوائیں۔

---

۸. ڈیرہ غازی خاں کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ چند دنوں سے دریائے سندھ مستقل طور پر طغیانی پر ہے۔

---

۹. جنگ ٹرانسوال کی تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اب پھر بوئر جمع ہو کر آخری حملہ کیمپ کارتی پر کرنے والے ہیں۔

---

۱۰. شورش چین کے تازہ حالات یہ ہیں کہ باغیوں کو چین میں جو عارضی کامیابی ہوئی تھی اسے کچلا نے پھر شورش سر نکالا ہے۔

صفحہ ۱۱ پر لورانس داحمر پر توبک مصنفہ مصطفیٰ رشید کے اس ترکی ناول کا ترجمہ سید سجاد حیدر یلدرم بی اے نے کیا ہے اس ناول میں ترکی کی معاشی اور تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی نقشہ کشی کی گئی ہے. سجاد حیدر یلدرم نے بہت خوبصورتی سے اور کامیابی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے (سجاد حیدر یلدرم ۱۸۸۰ء میں ضلع بجنور میں پیدا ہوئے تھے. علی گڑھ کے گریجویٹ ہیں. آپ جب زمانہ میں حکومت ہند کے عہد میں ترکی میں سفیر تھے اس زمانہ میں آپ نے اپنا قلمی نام "یلدرم" رکھا جس کے معنی بجلی کے ہوتے ہیں. اردو میں ترکی کے متعدد شہ پاروں کا ترجمہ کیا. ترکی سے واپس آکر یوپی میں ڈپٹی کلکٹر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں رجسٹرار کے عہدے پر کام کیا ۱۹۴۳ء میں مختصر سی علالت کے بعد وفات پائی. موصوف اردو انشائیہ نگاری میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں. آپ نے آنریبل حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی سے ترکی زبان پڑھی)

یلدرم صاحب نے مطلوب حسینان لوارنس واحمر پر توبک جو ترکی زبان وادب کے معیاری ناولوں میں شمار ہوتا ہے ترجمہ کیا اور اپنے استاد اسمٰعیل صاحب کے نام معنون کیا ہے. یلدرم صاحب اس نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ

"جناب آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں صاحب
رئیس دتاولی کے نام نامی پر باظہار شکر
گزاری ان بزرگانہ احسانات اور مربیانہ
عنایات کے جو انھوں نے میرے حال
پر مبذول فرمائیں. اور جن کی طفیل سے
میں ترکی زبان سیکھنے کی تمنا پوری کرسکا
کیونکہ جناب ممدوح نے اپنا ہرج اوقات
کرکے مجھے سبق دیئے. میں بکمال ادب
اس ترجمہ کو ڈیڈیکیٹ کرتا ہوں"

اس ناول کے "باب اول" کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے.

"کانون ثانی (کانون ثانی ایک ترکی مہینہ کا نام ہے اس زمانہ میں سردی شدت سے پڑتی ہے) ختم ہونے کو تھا. چار دن سے ایسی سرد اور تیز ہوا چل رہی تھی کہ استنبول میں جو برف پڑ رہی تھی اس کے پگھلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی. آخر کار برف جہاں آرا سے زمین کو روشنی اور گرمی بخشی"

اس باب کے آخری حصہ مکالموں پر مشتمل ہیں جو پرتوبک اور مادا موزل لورانس. (مادا موزل سے مراد کنواری لڑکی) کے درمیان ہوتی ہے. جس میں اس کے خاندانی حالات اور اس کی مصروفیات اور دوسری دلچسپیوں کے متعلق اظہار کئے گئے ہیں.

"رات کے جلسوں کے متعلق کوئی خبر ہے؟"

"مجھکو خبر نہیں میڈم"

"آج کی رات سفارت خانہ میں جو دعوت دی جائے گی اس میں آپ ضرور مدعو ہوں گے"

"جی! ہوں تو آپ بھی تشریف لائیں گے نا"؟

"امید تو کرتی ہوں"

"مجھے امید ہے کہ مادا موزل لورانس کو بھی وہاں دیکھنے کی عزت حاصل کروں گا"

....

"چونکہ باتیں کرتے کرتے اس مقام پر پہونچ گئے تھے جہاں گاڑی کھڑی تھی. لہذا یہ مکالمہ ختم ہوا. تینوں اس فقرہ کی تکرار کے بعد جدا ہوئے "انشاء اللہ آج شب کو ملیں گے"

اس شمارہ میں باب دوم بھی شریک اشاعت ہے۔ جس میں دولت مند شرکت کو جاتے ہوئے پرتو سے ایک ایسی خاتون سے ملاقات ہوتی ہے۔ جو اس سے ایک حادثہ کے طور پر ٹکراتی ہے۔ وہ واقعہ یوں ہے۔

" برف پھر پڑنی شروع ہوگئی۔ دکانوں کے نوکر
جوان لڑکیاں اور مرد برف گیند بنا بنا کر
ایک دوسرے کی طرف پھینکتے اور ہنستے اور
قہقہے لگاتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس
آرہے تھے۔ اُن کی تقلید میں بعض معمر میڈیم
اور موسیو (مسٹر) بھی ایسی حرکتیں کرتے نظر
آتے تھے.......... اپنے دل میں کہا، ایک
ذرا برف زیادہ پڑنی شروع ہوئی تھی کہ دیکھو
انسانوں میں کیا شور و شغب کیا وحشت پیدا
ہوگئی ہے"

" ان فلسفیانہ خیالات کے سلسلہ کو
برف کی ایک گیند نے جو اس کی ناک پر آکر
لگی منقطع کر دیا.......... گاڑی سے بچنے
کے لئے ایک کنارہ کو ہوتا تھا کہ ایک شخص
سے بڑے زور کے ساتھ ٹکر کھائی اور
دونوں کے دونوں ایک جگہ پر گر پڑے...
یہ حضرت ایک میڈیم تھیں"

پرتوبک اس کو اُس کے جائے مقام پر پہنچاتا ہے تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایک طوائف ہے۔ وہ سوچتا ہے۔ کہیں یہ عورت معزز خاندان سے نکلتی تو ملاقات سے مجھے کیسی خوشی حاصل ہوتی"

اس جملہ سے پرتوبک کے مزاج اور اس کے کردار کا پتہ چلتا ہے اس طرح مجموعی طور پر ترجمہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ناول اس دور کی ترکی تہذیب اور انگریزی تہذیب دونوں کے تصادموں اور مفاہمت پر مبنی ہے۔

آخر میں صفحہ ۱۸ کے کالم تین پر چار سطری لطیفہ درج ہے۔ اس طرح اس رسالے کی ابتدا اور انتہا دونوں لطیفے پر مبنی ہے۔

فارم IV

پریس رجسٹریشن بکس ایکٹ ۱۹۵۶ء (ترمیم شدہ) کی دفعہ D کے قاعدہ ۸ آٹھ کے مطابق ماہنامہ "ترنم" لکھنؤ کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات شایع کئے جاتے ہیں۔

(۱) مقام اشاعت ۱۵۔ احتشام نگر لکھنؤ ۱۔۔ ۲۲۶

(۲) وقفہ اشاعت ماہانہ

(۳) پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر اور ایڈیٹر نجمہ اخلاق قومیت ہندوستانی پتہ نمبر ۱۵۔ احتشام نگر لکھنؤ ۱۔۔ ۲۲۶ نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۳ سے چھپوا کر شایع کرتی ہیں۔

(۴) رسالہ ہذا میں کوئی مالک یا حصہ دار نہیں ہے۔ میں واحد مالک ہوں۔ میں نجمہ اخلاق اعلان کرتی ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں

دستخط نجمہ اخلاق (پبلشر)

اخلاق حسین عارف

"بکٹ کہانی کا خالق"

نام محمد افضل تخلص افضل اور گوپال مصنف "بکٹ کہانی" عرف بارہ ماسہ متوفی ۱۰۳۵ھ ہجری مطابق ۱۶۲۵ء جیسا کہ اس کے بارے میں تحقیق ہوچکا ہے دلی کے نزدیک مقام پانی پت کا رہنے والا تھا۔ تاریخ ولادت نامعلوم۔ اس کی متذکرہ تصنیف کو شمالی ہند کی شاعری کا پہلا مستند نمونہ کہا جاتا ہے۔

شیخ قیام الدین قائم نے اپنے تذکرہ "مخزن نکات" (تصنیف ۱۱۶۸ھ) میں افضل کو سعدی[1] شیرازی، امیر خسرو، ملا نوری محمد افضل افضل، سلطان عبداللہ قطب شاہ، مرزا فضلی، قادر، آزاد، احمد گجراتی، محمود سراج، شاہ ولی اللہ، مرزا عبدالقادر، موسوی خاں فطرت، جعفر وغیرہ۔ اس ترتیب سے طبقۂ اول کے شعراء میں شمار کیا ہے۔

میر کے تذکرہ "نکات الشعراء" میں دیگر شعراء کے ساتھ افضل کا ذکر نہیں ملتا جبکہ میر حسن حسنی کے "تذکرۂ شعرائے اردو" میں افضل کا نام تو ہے مگر اسے "کدام ہندو بچہ نامی گوپال بود" کہا گیا ہے حالانکہ تحقیق سے یہ مترشح ہوا کہ گوپال دراصل افضل ہی کا دوسرا تخلص ہے جو اس نے اس دوران اختیار کر لیا تھا جبکہ وہ متھرا کے ایک مشہور مندر میں پجاری بن کر قیام پذیر رہا۔ اس بیان کی سند میں بکٹ کہانی کا آخری شعر جو دراصل مقطع ہے اس نے اپنے دونوں تخلص افضل اور گوپال کی بندش کے ساتھ پیش کر دئے ہیں جو اس طور سے ہے ؎

بہ یاد دلبرا خوشحال می باش
گہے افضل گہے گوپال می باش

افضل کے سو سال بعد ایک، اہم حوالہ انیسویں صدی کے آغاز میں ان کے ایک عقیدت مند اور ہم مشرب عبداللہ انصاری کے بارہ ماسہ میں ملتا ہے جو ۱۲۳۹ھ ہجری مطابق ۱۸۲۳ء کے قریب کی تصنیف ہے۔ اس بارہ ماسہ کا قلمی نسخہ شعبۂ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنے والی نسلیں افضل کا ذکر کس عقیدت سے کرتی رہی ہیں اور اس کی تصنیف کی کس قدر دھوم رہی ہے۔ عبداللہ انصاری نے اپنے بارہ ماسہ کے ابتدائی اشعار میں افضل کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

سراسر اہل عرفاں شاہ افضل
نہایت کامل و یکتا و اکمل
انھوں نے اک بکٹ لکھی کہانی
کیا جس میں بیاں سوز نہانی
بکٹ پیچیدہ رستہ ہے برادر
سمجھ لے وہ طریقت کو سراسر
زنانی بولی ہے اس کی پیاری
جسے سنکر ہو دل میں بے قراری

لیکن اس سے بھی بڑھ کر افضل کی سیرت اور سوانح کے باب

---

[1] میر تقی میر نے اپنی تصنیف "نکات الشعراء" میں سعدی کو ایک دکنی شاعر بتایا ہے (مرتبین بکٹ کہانی۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی و ڈاکٹر مسعود حسین خاں)

میں "نکات الشعراء" ریاض الشعراء[1] میں ملتے ہیں جو علی قلی خاں داغستانی
کی فارسی شعراء کے بارے میں تصنیف ہے اس کی تاریخ تصنیف ۱۱۶۱ھ
"بہتان عالی" سے ظاہر ہے کہ اسے "مخزن نکات" پر آٹھ سال قبل
کی تصنیف ہونے کی وجہ سے تقدم حاصل ہے۔ والہ افضل کے بارے
میں لکھتا ہے کہ "ہندی اور فارسی زبانوں میں اشعار بڑی عمدگی سے
کہتے تھے" وہ بھی افضل کو پانی پتی لکھتا ہے۔ دو صفحات پر مشتمل اس
کے بارے میں مضمون سے مترشح ہوتا ہے کہ افضل صرف ہندی اور
فارسی کا باکمال شاعر ہی نہ تھا بلکہ فارسی نثر نویسی پر بھی اسے قدرت
حاصل تھی۔ اس کا پیشہ معلمی تھا اور بہت مقبول تھا۔ اس کے حلقۂ
درس میں "جم کثیر و جم غفیر" کا عالم رہتا تھا۔ چونکہ ابتداء سے عشق
پیشہ اور درویش مشرب واقع ہوا تھا اس لئے بڑی عمر میں ایک ہندو
عورت کی زلف گرہ گیر میں الجھ کر نوبت یہاں تک پہنچی کہ مجنوں صفت
ہوگیا روزہ نماز بالائے طاق کر کے معشوق کے کوچہ کے ایر سے
پھیرے کرنے لگا اسی جنونی کیفیت میں عاشقانہ غزلیں کہتا جن میں
کا ایک مطلع والہ نے درج کیا ہے ؎

عالم خراب حسن قیامت فشان کیست
دور کدام فتنہ گراز د زمان کیست

افضل کی یہ کیفیت دیکھ کر پہلے تو عورت روپوش ہوگئی لیکن اس
کے اس عمل سے افضل کے عشق کی شدت کم نہ ہوئی آخرش،
ایک شب انتہائی رازداری سے اس عورت کو اس کے رشتہ
داروں نے متھرا پہنچا دیا۔ افضل کچھ عرصہ تک سرگرداں رہے
بالآخر انھیں جب پتہ چلا کہ وہ متھرا میں ہے تو خود بھی محبوب کے
دیدار کی خاطر متھرا پہنچ گئے بہت دنوں تک وہاں بھی خاک
چھانتے رہے بڑی تگ و دو کے بعد ایک دن انھیں دیدار ہو
ہی گیا کیا دیکھتے ہیں کہ وہ گلعذار چند پری وشوں کے ہمراہ ایک
مقام پر گل گشت کر رہی ہے افضل بے تابانہ اس کی طرف بڑھے
اور حسب حال شعر پڑھا ؎

خوشا رسوائی و حال تباہے
سر راہے و آہے و نگاہے

افضل کی اس حرکت سے وہ بہت برافروختہ ہوئی بڑے
درشت لہجہ میں بولی۔ "بڈھے تجھے شرم نہیں آتی منھ پر سفید
ریش لگائے ہے، اور مجھ جیسی جوان عورت سے عشق
کرنے چلا ہے" افضل اس طنز کو برداشت نہ کر سکے اس
پری پیکر کو قابو میں لانے کے لئے داڑھی منڈائی، جنیو پہنا
قشقہ لگا، برہمنوں جیسا لباس زیب تن کر کے ایک مندر
میں پجاری کا چیلا بن کر بیٹھ گئے۔ پجاری کی دن رات خوب
خدمت کی اور تمام متعلقہ علوم پر ایسی دسترس حاصل کی کہ
درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔ پجاری نے خوش ہو کر انھیں اپنا نائب
خاص بنا لیا کچھ عرصہ بعد جب وہ مرنے لگا تو وصیت کی کہ میرے
مرنے کے بعد افضل ہی میرا جانشین ہو چنانچہ وصیت کے مطابق
اس کے بعد افضل گرو تسلیم کر لیا گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی شہرت دور
دور تک پھیل گئی اور افضل کا حلقۂ ارادت وسیع ہوتا گیا۔

وہاں کی یہ رسم تھی کہ سال میں ایک بار عورتیں
اس مندر میں زیارت کے لئے آتی تھیں اور نذر و نیاز پیش
کرتی تھیں اتفاق سے مقررہ دن جب عورتیں نذر نیاز چڑھانے
کے لئے آنا شروع ہوئیں ان میں سے ایک ایک کر کے آتیں
اور گرو کے قدموں میں قدم بوس ہوتیں۔ اس جم غفیر میں افضل
کی محبوبہ بھی تھی جب وہ اندر آکر قدم بوسی کے لئے جھکی انھوں
نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگاتے
ہوئے اس سے دریافت کیا۔ "مجھے پہچانا!" جب اس دلربا
کی آنکھیں چار ہوئیں اور اس نے بغور دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ تو
وہی مجنوں صفت ہے جو پجاری کے بھیس میں یہاں فروکش
ہے تو وہ یکدم عالم حیرت و استعجاب میں غرق ہو کر بولی ائے
میری خاطر تم نے اس قدر تکالیف اور مصائب اٹھائے لا

---

[1] مرتبین بکٹ کہانی پروفیسر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی و ڈاکٹر مسعود حسین خاں
فرماتے ہیں کہ داغستانی کے اس تذکرہ کا ایک نسخہ (فارسی نمبر ۱۴۱)
اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے۔

اچھا، اب جو تمہاری مرضی، وہی میری منشاء۔

اس کے بعد وہ عورت مشرف بہ اسلام ہو جاتی ہے اور دونوں خوش خوش وطن واپس آکر عرصہ تک ایک ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسی طرح وال کی فراہم کردہ معلومات کی بناء پر افضل کی شخصیت اور حالات کی بہت سی گتھیاں کھل جاتی ہیں۔

افضل کی نظم کا اصل نام "بکٹ کہانی" ہے جو مثنوی کے انداز میں بحر ہزج مسدس محذوف الآخر (مفاعیلن، مفاعیلن، فعولن) میں لکھی گئی ہے۔ بعض اشعار بحر ہزج مسدس مقصور الآخر میں بھی ہیں جبکہ ارکان مفاعیلن، مفاعیلن مفاعیل ہیں واضح ہو کہ ہزج مسدس محذوف اور ہزج مسدس مقصور کا ایک ساتھ لانا جائز ہے اس لئے کہ تقطیع میں کوئی فرق نہیں واقع ہوتا۔

چونکہ ہندی شاعری میں تخاطب عورت کی جانب سے ہوتا ہے کیونکہ صنف نازک کا دل شعر کے سانچے میں اپنی تمام امنگوں، پیار، حسد، فراق اور حرماں نصیبیوں کو ڈھالتا ہے اس میں بھرپور درد اور کسک ہوتی ہے۔ اس میں مرد کی بے وفائیوں، بے اعتنائیوں اور عورت کی ازلی وفا شعاریوں اور والہانہ سپردگی کی جھلک ہوتی ہے جو مشرقی اور خصوصاً ہندوستان کی پراچین روایات کے عین مطابق ہے۔ یہاں کی عورت اپنے پرستار کو دیوتا کا درجہ دیتی ہے جس کی وہ ہمیشہ پوجا کرنا اپنی حیات کا منشاء سمجھتی ہے چنانچہ بقول عبد اللہ انصاری افضل نے مٹھاس سے لبریز زنانی پیاری بولی میں سوز نہانی کا تذکرہ کچھ اس انداز سے کیا ہے جسے پڑھ کر دل بیقرار ہو جاتا ہے۔

افضل کے بارہ ماسہ اور ملک محمد جائسی کی پدماوت کے ناگ متی ویوگ کھنڈ میں ایک گہری معنوی اور جذباتی مماثلت پائی جاتی ہے اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ افضل نے اس سے استفادہ کیا ہوگا کیونکہ وہ افضل کی تخلیق سے سو سال قبل کی تصنیف ہے۔ حالانکہ ملک محمد جائسی اور افضل دونوں صوفی اور پریم مارگی ہیں فرق یہ ہے کہ پدماوت کا قصہ بیک وقت مجاز اور حقیقت کی دوہری سطحوں پر چلتا ہے اس کے برعکس افضل کی بکٹ کہانی کچھ اس طرح تشکیل کی گئی ہے جس سے وہ مجاز کی سطح سے اوپر نہیں اٹھتی بہرحال افضل نے یہ ڈرامہ کچھ اس انداز سے کھیلا ہے کہ اردو شعر کی تاریخ میں اس سے زیادہ رنگین داستان کہیں اور نہیں ملتی۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ بارہ ماسہ میں افضل نے اپنی محبوبہ کا کردار ادا کیا ہے یہ ایک برہنی کی کہانی اسی کی زبانی ہے جس میں مجاز کی تڑپ اور اعصاب پر ہوس وصل اور سیج کی خواہش کی تکرار ملتی ہے۔ اسلوب کے نقطۂ نظر سے بکٹ کہانی اس عہد کی ریختہ گوئی کا مکمل نقش ہے۔

اصل قصہ شروع کرنے سے قبل ۷۵ اشعار پر مشتمل تمہید ہے اس کے بعد مختلف کیفیتوں کو بارہ مہینوں کے بارہ حصوں میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ ہر ماہ موسم کی مناسبت سے داستان عشق اور اس سے متعلقہ کیفیات کی مرقع کشی کی گئی ہے۔ جو کل ۳۲۱ اشعار میں محیط ہے۔ جو طبع ثانی ہے۔

(طلبا کے لئے لکھا گیا)

ملاحظہ ہو "فن شاعری" صفحہ ۔ از علامہ اخلاق دہلوی۔

اخلاق حسین عارف

"رانی کیتکی اور کنور اودے بھان"

تلخیص:۔ داستان یوں ہے کہ کنور اودے بھان بغرض شکار جنگل میں جاتا ہے وہاں اسے ایک ہرن دکھائی دیتا ہے جس کے تعاقب میں وہ اپنا گھوڑا ڈال دیتا ہے تعاقب کرتے کرتے شام ہو جاتی ہے گھبرا کر سرشام وہ ایک باغ میں پہنچتا ہے جہاں کچھ پریاں جھولا جھول رہی ہیں جن میں شہزادی کیتکی بھی ہے جو راجہ جگت پرکاش کی بیٹی ہے اودے بھان اسے دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتا ہے اور وہ بھی اودے بھان پر جان سے واری ہو جاتی ہے۔ دونوں وفا کا قول وقرار کر لیتے ہیں اور محبت کی یاد قائم رکھنے کے لیے وہ آپس میں اپنی اپنی انگوٹھیاں بدل لیتے ہیں جب ان دونوں کی محبت کی خبر اودے بھان کے والدین کو ملتی ہے تو وہ ایک برہمن کے ذریعہ اپنے بیٹے کا پیغام شادی راجہ جگت پرکاش کے پاس بھجواتے ہیں۔ جیسے سنتے ہی وہ آگ بگولا ہو جاتا ہے توہین آمیز جملے استعمال کرتا ہے اور برہمن کو قید کرا دیتا ہے اودے بھان کے باپ کو جب اپنی ہتک عزت اور برہمن کی گرفتاری کی خبر ملتی ہے تو وہ جگت پرکاش کے ملک پر فوج کشی کر دیتا ہے جگت پرکاش اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر گھبرا کر اپنے گرو مہندر گر سے مدد طلب کرتا ہے۔ گرو مہندر گر ایک پہاڑ پر مع اپنے نو سے لاکھ چیلوں کے اقامت گزیں ہے جب وہ مطلع ہوتا ہے تو وہ بہت غصہ ہوتا ہے اور اپنے تمام چیلوں کے ہمراہ اس کی مدد کو آتا ہے یہاں آکر وہ اودے بھان اس کے والد سورج بھان اور والدہ لچھمی باس کو جادو کے زور سے ہرن اور ہرنی اور فوج والوں کو پتھر کی مورتیاں بنا دیتا ہے۔ چلتے وقت وہ راجہ جگت پرکاش کو بالوں کا ایک گچھا دیتا ہے تاکہ وقت ضرورت اس میں کا ایک بال نوچ کر آگ میں رکھنے سے وہ اس کی مدد کو آ سکتا ہے اس کے علاوہ وہ ایک سفوف بھی دیتا ہے جس کو آنکھ میں لگانے سے لگانے والا سب کچھ دیکھ سکتا ہے مگر اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ رانی کیتکی کسی طرح سے تھوڑا سفوف دستیاب کر لیتی ہے ایک دن اسے لگا کر اودے بھان کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے اور جنگل جنگل ماری ماری پھرتی ہے اس کا باپ اپنی اکلوتی اولاد کے غائب ہو جانے سے بہت غمزدہ ہو جاتا ہے اور اس کی سہیلی مدن بان کو اس کی تلاش کے لیے بھیجتا ہے ان دونوں کی ملاقات جنگل میں ہوتی ہے اس کے ذریعہ کیتکی اپنی الفت کا حال لکھ کر اپنے باپ کو بھیجتی ہے اس کا باپ وہ خط اپنے گرو کو دکھاتا ہے جس پر محبت کا راز منکشف ہوتا ہے تو وہ اودے بھان کو اپنا بیٹا بنا لیتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ وہ خود کنور کو کیتکی سے بیاہنے آئے گا گرو مہندر گر جگت پرکاش کو اپنی راجدھانی لوٹ جانے کو کہتا ہے اور خود اودے بھان اور اس کے والدین کی تلاش میں نکلتا ہے مگر باوجود تلاش بسیار وہ ان لوگوں کو نہیں پاتا آخر پریشان ہو کر وہ اپنے دوست راجہ اندر سے تعاون کی درخواست کرتا ہے راجہ اندر اس کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتا ہے چنانچہ اسی سلسلہ میں وہ ایک رات جنگل میں راگ رنگ کی محفل منعقد کراتا ہے جس میں جنگل کے تمام ہرن اور ہرنیاں گانا سننے جمع ہو جاتے ہیں اس موقع پر راجہ اندر جادو پڑھا ہوا پانی گرو مہندر گر کو دے کر کہتا ہے کہ اس کو ہرنوں پر چھڑک دو۔ پانی کے چھڑکتے ہی کنور اس کے والد اور اس کی ماں دوبارہ اپنی اصلی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ انھیں لے کر گرد

جہاں دگر بڑے اہتمام اور شان و شوکت کے ساتھ بمع اپنے لوے لاکھ چیلوں کے اور راجہ اندر مع اپنی پریوں کے اکھاڑے کے رانی کیتکی کے ساتھ کنور کو بیاہنے جاتے ہیں طرح طرح کے باجے بجتے ہیں تمام آبادی بڑے کروفر سے آراستہ و پیراستہ کی جاتی ہے اور تمام وہ لوازمات برتے جاتے ہیں جن کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے اسی شاہی شادی کے اہتمام میں وہ تزک و احتشام دکھایا جاتا ہے جس کو اصلیت کا جامہ پہنانے میں شاید قارون کا خزانہ بھی ناکافی ثابت ہوتا بہرحال دونوں کی شادی ہو جاتی ہے اور دونوں راج آپس میں ضم ہو جاتے ہیں اور سب لوگ خوش و خرم ہو کر رہنے لگتے ہیں قصے کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے۔ جیسے ان کے دن پھرے دنیا میں سب کے دن پھریں۔ اور آمین کے ساتھ داستان کا خاتمہ ہو جاتا ہے

نمونۂ کلام

داستان کی تلخیص کے بعد ضرورت ہے کہ چاشنی کے طور پر تھوڑا سا کلام کا اقتباس دے دیا جائے جو دلچسپی سے خالی نہیں اور اس سے مصنف کے طرز نگارش کی بھی نشان دہی ہوتی ہے اس حصہ میں اول حمد خدائے تعالیٰ ہے بعد، نعت رسولِ عربی اور ثنائے آلِ رسول ہے پھر تمہید آغاز داستان ہے

حمد :- سر جھکا کر ناک رگڑتا ہوں [۱] اس بنانے والے کے سامنے جس نے ہم سب کو بنایا اور بات کی بات میں وہ سب کر دکھایا جس کا بھید کسی نے نہ پایا ؎

آتیاں جاتیاں جو سانسیں ہیں [۲]
اُس کے بن دھیان سب یہ پھانسیں ہیں
یہ کل کا پتلا [۳] جو اپنے اُس کھلاڑی کی سدھ [۴] رکھے تو کھٹائی [۵] میں

کیوں پڑے؟ اور کڑوا کسیلا کیوں ہو؟ اس پھل کی مٹھائی چکھے جو بڑوں سے بڑے اگلوں نے چکھی ہے۔ دیکھنے کو آنکھ دی اور سننے کو یہ کان دئے ناک [۶] بھی اونچی سب میں کر دی۔ مورتوں [۷] کو جی دان دئے۔ مٹی کے باسن [۸] کو اتنی سکت کہاں جو اپنے کمہار [۹] کے کرتب کچھ بتا سکے؟ سچ ہے، جو بنایا ہوا ہو اپنے بنانے والے کو کیا سراہے [۱۰]؟ اور کیا کہے؟ یوں جس کا جی چاہے پڑا بکے۔ سر سے لگا پاؤں تک جتنے رونگٹے ہیں جو سب کے سب بول اٹھیں اور سراہا کریں اور اتنے برسوں اسی دھیان میں رہیں جتنی ساری ندیوں میں ریت اور پھول پھلیاں کھیت میں ہیں تو بھی کچھ نہ ہو سکے۔

نعت رسولؐ اور ثنائے آلِ رسولؐ اس سر جھکانے کے ساتھ ہی دن رات جپتا ہوں اس داتا کے بھیجے ہوئے پیارے کو جس کے لئے یوں کہا، جو تو نہ ہوتا میں کچھ نہ بناتا، اور اس کا چچیرا بھائی جس کا بیاہ اسی کے گھر ہوا اس کی سرت مجھے لگی رہتی ہے۔ میں پھولا اپنے آپ میں نہیں سماتا اور جتنے ان کے لڑکے بالے ہیں انھیں کی یہاں پر چاؤ [۱۱] ہے۔ اور کوئی ہو، کچھ میرے جی کو نہیں بھاتا۔ مجھے اس گھرانے کے چھٹ [۱۲] کسی لے بھاگ اور ایک چور ٹھگ سے کیا پڑی؟ جیتے مرتے انھیں سبھوں کا آسرا اور ان کے گھرانوں کا رکھتا ہوں تینسوں گھڑی

تمہید آغاز داستان ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھ آئی کہ کوئی کہانی ایسی کہئے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بول سے نہیٹ نہ ملے۔ تب جا کر میرا جی پھول کی کلی کے روپ میں کھلے: باہر کی

---

[۱] بڑے ادب سے [۲] نفس کی یہ آمد و شد بغیر حمد و تسبیح باری تعالیٰ بے کار ہے۔ [۳] انسان [۴] اپنے خالق کا دھیان [۵] مصائب میں کیوں گرفتار ہو۔

[۵] تکالیف کیوں جھیلے۔ [۶] جتنے ذی روح طبقہ ارض پر یا جہاں کہیں بھی ہیں انسان کی ناک ان سب میں نمایاں ہے۔ ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ تمام خلقت میں انسان کو اس نے ممتاز کیا یعنی اشرف المخلوقات بنایا۔ [۷] مٹی کے پتلوں کو زندگی عطا کی۔ [۸] مٹی کے پتلوں کی کیا تاب و طاقت۔ [۹] اپنے خالق کی تعریف و توصیف کر سکے [۱۰] مخلوق اپنے خالق کی مدح سے قاصر ہے [۱۱] مودت و محبت [۱۲] علاوہ۔

بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ نہ ہو۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے پرانے دھرانے بوڑھے گھاگ یہ کھٹراگ لائے سر ہلا، منہ بنا کر، ناک بھوں چڑھا کر آنکھیں پھرا کر کہنے لگے، یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی، ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکھا پن نہ ٹھونس جائے جیسے بھلے لوگ اچھوں سے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں جوں کا توں وہی ڈول رہے اور چھانہ کسی کی نہ پڑے یہ نہیں ہونے کا۔ میں نے ان کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹہوکا کھا کر جھنجھلا کر کہا کچھ ایسا انوکھا پن نہیں جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کے انگلیاں نچاؤں اور بے سری بے ٹھکانے کی الجھی سلجھی باتیں سمجھاؤں۔ جو مجھ سے نہ ہو سکتا، تو بھلا یہ بات منہ سے کیوں نکالتا! جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا۔

اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ لوگ اسے پکارتے ہیں کہہ سناتا ہے۔ داہنا ہاتھ منہ پر پھیر کر آپ کو جتاتا ہوں جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور آؤ جاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں جو دیکھتے ہی آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل، اچھلاہٹ میں ہرنوں کے روپ میں ہے اپنی چوکڑی بھول جائے۔

گھوڑے پہ اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں
کرتب جو کچھ ہیں سو دکھاتا ہوں میں
اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی
کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

اب آپ کان رکھ کے سنکھ ہو کے ٹک ادھر دیکھیے کس ڈھب سے بڑھ چلتا ہوں اور اپنے ان پھول کی پنکھڑی جیسے ہونٹوں سے کس کس روپ سے پھول اگلتا ہوں۔

"داستان کے بارے میں"

اس قصے کے مرتب بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی رائے ہے کہ سید انشاء اللہ خاں انشاؔ نے مقفیٰ، مسجع اور مرصع عبارت سے نثر کو نظم کی چاشنی دے کر نئے روپ سے اس کا سنگھار کر کے اردو زبان پر بڑا احسان کیا ہے۔

داستان رانی کیتکی اور کنور اودے بھان، چند امتیازی خوبیوں کی حامل ہے کہ اس میں عربی فارسی کا ایک لفظ نہیں آنے دیا۔ آج کل جیسی ہندی نہیں ہے کہ نہ لکھنے والا سمجھے نہ پڑھنے والا بلکہ اس کی خوبی یہ ہے کہ اسے اردو والا بھی بہ آسانی سمجھ لے گا اور ہندی والا بھی۔ زبان اور بیان دونوں صاف ہیں۔ ظرافت کی جابجا چاشنی نے کلام کی شوخی کو بہت بڑھا دیا ہے۔

سری کرشن جی کا تذکرہ دوران بارات اس خوبی سے لاتے ہیں کہ سچی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ کرشن جی کی پیدائش، ان کا گوکل آنا، گائیں چرانا، مرلی بجانا، گوپیوں کا ریجھنا، رادھا سے کرشن جی کا پریم، سری کرشن جی کا دوارکا جانا، گوپیوں کا ان کی جدائی میں تڑپنا وغیرہ وغیرہ کچھ اس انداز سے قلم بند کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے انشاؔ بذات خود سری کرشن جی کے عہد میں موجود تھے اور یہ تمام واقعات ان کا آنکھوں دیکھا احوال ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ انشاؔ ہندو مذہب اور اس کے رسوم و رواج سے کافی واقف تھے۔ جابجا ہندی دوہے عبارت کے حسن کو دوبالا کر رہے ہیں اگرچہ کہ تغزل اور اردو شاعری کے معیار کو مجروح کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انشاؔ نے لکھنؤ کے اپنے عہد کے معاشرہ، تمول، عیش پرستی، فضول خرچی، تقاریب اور ان کی آرائش و اہتمام وغیرہ کا نہایت سچا نقشہ کھینچا ہے اس داستان کا مطالعہ نہ صرف دلچسپی کا باعث ہے بلکہ ہمیں قدیم اردو ادب طرز معاشرت اور رسومات وغیرہ سے روشناس کراتا ہے اور اس شاندار زمانہ کی یاد تازہ

۱؎ یہ دراصل "منہ" ہونا چاہیئے۔ ۲؎ اسے "ہاتھ لاؤ" ہونا چاہیئے۔ بے معنی دیوانہ سڑی سودائی۔ ۳؎ سامنے آکر۔

رہتے جب ہندو مسلم بھائی بھائی اور آپس میں شیر و شکر تھے۔

"کچھ مصنف کے بارے میں"

اس داستان کے مصنف سید انشاء اللہ خاں انشاؔ ہیں جو نواب سعادت علی خاں کے دربار میں قصہ گو کی حیثیت سے وابستہ تھے ان کی طبیعت میں انتہائی ظرافت اور زبان میں بے حد شوخی اور رنگینی تھی۔

ان کے والد ماجد حکیم سید میر ماشاء اللہ خاں سمرقند کے رہنے والے تھے جو ہندوستان میں وارد ہو کر دلی میں آباد ہو گئے اور رفتہ رفتہ شاہی امراء میں داخل ہو گئے۔ انشاؔ دلی میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کے والد دلی کی سکونت ترک کر کے مرشد آباد چلے گئے وہاں ان کی بڑی توقیر ہوئی۔ زمانہ کی روش کے مطابق انشاء کو مروجہ علوم کی تعلیم دلائی گئی تمام علوم و فنون سے بہرہ ور ہونے کے بعد ان کی طبیعت شاعری کی طرف مائل ہوئی وہ اپنے والد سے اصلاح لیتے رہے۔ انشاؔ اپنی جولانی طبع کی وجہ سے روز افزوں ترقی کرتے رہے کچھ دنوں بعد ان کے والد دوبارہ دلی لوٹ آئے شاہ عالم بادشاہ نے انھیں شاہی شاعر کی جگہ مرحمت فرمائی ان کا رنگ جمتا دیکھ کر حاسد پیدا ہو گئے جو انھیں بے عزت کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر انھوں نے سبھوں کو نیچا دکھا دیا۔ سید انشاؔ بہت ہی طباع تھے ان میں موقع شناسی کوٹ کوٹ کر بھری تھی وہ آئی پر چوکتے نہ تھے فوراً جو کچھ کرنا ہوتا کر گذرتے تھے۔

دلی کی حالت ابتر دیکھ کر وہ آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ چلے آئے جہاں اس وقت صف اول کے شعرا میں مصحفیؔ اور جرأتؔ تھے اسی زمانہ میں مرزا تفضل حسین نامی ایک صاحب تھے جن کی قابلیت کا لوہا ہر شخص مانتا تھا وہ انشاؔ کی بڑی عزت کرتے تھے ادھر کے ودسرے دربار میں ان کے کافی رسوخ تھے انھوں نے انشاؔ کی تعریف نواب سے کی اسی وقت سے وہ نواب سعادت علی خاں کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ انشاؔ خود تو درباری شاعر رہے مگر موقع سے فائدہ اٹھا کر بہت سے لوگوں کو اونچے اونچے مراتب پر پہنچا دیا۔

انشاؔ کی قابلیت اور شعر و شاعری کی شہرت لکھنؤ و دور دراز کے علاقوں میں بہت دور تک پہنچ گئی۔ انشاؔ کی قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ ان کی غزل پڑھی جانے کے بعد بڑے شعرا اپنی غزلیں ہاتھ سے رکھ دیتے اور پڑھنے سے انکار کر دیتے تھے۔ انشاؔ عربی فارسی اور اردو زبانوں پر تو پوری دسترس رکھتے ہی تھے علاوہ ازیں وہ بیک وقت کئی زبانوں اور بولیوں پر پوری قدرت رکھتے تھے پنجابی، پوربی، کشمیری، پشتو، ہندی اور سنسکرت الفاظ کی آمیزش سے ان کا کلام مزین ہے انھوں نے غزلیں بے انتہا اچھی لکھی ہیں ان کے علاوہ قصائد بھی بہت خوب کہے ہیں۔

انشاؔ کی قادر الکلامی کا ہر تذکرہ نویس معترف ہے انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور کمالات کا مظاہرہ کیا ہندی کے نرم و شیریں الفاظ بڑی نفاست کے ساتھ استعمال کئے ہیں شوخی ظرافت ان کی طبیعت کی رنگینی اور بانکپن کی خوب جلوہ آرائی کی ہے قدرت زبان زور بیان اور لطافت محاورات کی رنگینی خوشنما تراکیب نہایت پسندیدہ اپنے کلام میں سموئے ہیں۔

مقام افسوس ہے کہ انشاؔ کی عمر کا آخری حصہ بڑے آلام و مصائب میں گھرا ہوا گذرا۔ نواب سعادت علی خاں سے کسی بات پر رنجش ہو گئی۔ دربار سے نکال دئے گئے۔ تنخواہ بند ہو گئی اس پر طرہ یہ کہ جوان بیٹے کی موت نے انھیں دیوانہ بنا دیا ایک وہ زمانہ تھا کہ نواب کی ناک کا بال تھے پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ معتوب ہو گئے۔ میلا کثیف لباس پہنے عالم دیوانگی میں ادھر ادھر پھرتے خفقان روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ ستر برس کی عمر میں اس دنیائے آب و گل سے کوچ کر کے راہی عالم بقا ہو گئے۔ اللہ بس باقی ہوس۔

(طلباء کے لئے لکھا گیا)

دشیں آغا

باقیاتِ محمودؔ پر ایک نظر

برصغیر کی غیر قدرتی تقسیم نے کروڑوں انسانوں کی قسمتوں پر جس طرح اپنا منحوس سایہ ڈالا، اُس سے اُردو زبان کی تقدیر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ تقسیم ہند کے طوفان میں جس قدر نقصان زبان و ادب کے سرمایہ کا ہوا اُس کی تلافی کا تو ذکر ہی کیا صحیح صحیح اندازہ لگانا بھی ایک ناممکن سی بات ہے۔ طوفان کے بعد کے اثرات نے اُردو زبان کو جن شدائد سے دوچار کیا اُس نے تو تباہی کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، ادبی انجمنوں اور نام و نمود سے بے نیاز، انفرادی کوشش و کاوش کرنے والوں پر اُردو زبان کو بچا لینے کی جو ذمہ داری آ پڑی وہ ایک زمانے کی جرمن ماؤں کو اپنی مادری زبان بچانے کی انتھک اور مسلسل کوشش سے کسی طرح بھی کم نہیں کہی جا سکتی۔

ہندوستان میں جمہوری حکومت کی داغ بیل ڈالی گئی کانگریس پارٹی کی حکومت نے جس کے زیر سایہ ماضی کے بہت سے نقصانات کی تلافی بھی کر لی گئی اور ملک آج استقامت و استحکام کی منزلوں میں داخل ہو گیا، اُردو زبان کو پہونچنے والے غیر معمولی نقصان کی بھی ممکن حد تک تلافی کی کوشاں رہی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو زبان کو آج تک زندہ رکھنے میں بڑا حصہ ادیبوں اور شاعروں ہی کا رہا ہے۔

شاعری، واردات قلبی کے اظہار کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ ہے۔ انسان کے جذبات و احساسات کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والی چیز کوئی ہے تو وہ شاعری! حقائق گواہ ہیں کہ بڑے سے بڑے شعلہ بیان مقرروں کی جادو اثر تقریریں اس طرح عوام کے دلوں میں جوش اور حوصلے نہیں پیدا کر سکی ہیں جس طرح کسی شاعر کے صرف ایک مصرعہ نے عوام کے لہو کو گرما دیا اور جذبات میں ہلچل پیدا کر کے بڑے بڑے انقلاب برپا کرا دیئے۔

انسانی شعور کو بیدار کرنے میں بھی شاعری کا ہمیشہ بڑا دخل رہا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں جدوجہد کے جذبہ کو ہمہ وقت متحرک رکھنے میں بھی اشعار سے بڑی مدد ملتی ہے۔ شاعری فی الحقیقت قوتِ تخیّل سے مرکب ہے اور تخیّل قوت اختراع یا ملکہ استنباطی کا نام ہے یعنی فلسفہ میں ایجاد انکشاف اور شاعری میں رنگا رنگ مضامین اسی کا نتیجۂ عمل ہوتے ہیں۔ وہ شاعری جو ہر قسم کے جذبات کا آئینہ بن سکے، وہ شاعری جس سے فلسفۂ اخلاق و حکمت کے دقائق کو حل کیا جا سکتا ہے، وہ شاعری جو اخلاق و تمدن پر گہرا اور مفید اثر ڈال سکتی ہو، ان ہی صفات و محامد کا خزانہ اپنے دل و دماغ میں رکھنے والا صحیح معنوں میں شاعر کہلا سکتا ہے۔ پھر شعراء میں تفوق و ترجیح، ہر شخص کے مذاقِ سلیم، وسعتِ معلومات، نگاہ اور پسند پر منحصر ہے!

اصطلاحِ شعراء میں اُس کلام موزوں، مقفیٰ اور بامعنیٰ کو شعر کہتے ہیں جو بالقصد کہا گیا ہو ورنہ غیر شاعر کی زبان سے بھی ایسے کلمات ادا ہو جاتے ہیں جو موزوں ہوتے ہیں پھر بھی محض ارادۂ شعری نہ ہونے کی وجہ سے اُس پر شعر کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا

ایک شاعر جس کے حلقۂ نظر میں کائنات کی لامتناہی وسعتیں ہوتی ہیں جب اپنے تخیلات میں تلاطم پاتا ہے اُس وقت دائرۂ امکان کی تمام کیفیات کے چہرے سے نقاب اُٹھا دیتا ہے اور الفاظ کی فصاحت انداز بیان کی جدت، ترتیب و تناسب کا حسن اُن ہی کیفیات کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں اس لیے مقصدی شاعری کی تاثیر اور اہمیت سے انکار ممکن ہی نہیں!

ملک کے مختلف خطوں میں اُردو زبان کی بقا و ترویج میں مصروف، بے لوث افراد کی طرح الٰہ آباد کے مردم خیز دوآبہ میں بھی گذشتہ چوتھائی صدی سے چمن اردو کی آبیاری کرتے رہنے والی شخصیتوں میں ایک شخصیت ہے۔ محمود خاں صاحب محمود کی ۔۔۔ انھیں ادبی حلقے عرف عام میں محمود رائے بریلوی کے نام سے جانتے ہیں محمود رائے بریلوی ایک پختہ اور کہنہ مشق شاعر ہیں جن کی شاعری میں وارداتِ قلبی کا اظہار جس سادگی اور خوش اسلوبی سے پایا جاتا ہے وہ کسی بھی باذوق، حساس اور صاحب نظر کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا محمود صاحب کے کلام میں وہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں جو کسی شاعر کے درجۂ کمال پر فائز ہونے کا ثبوت ہوتی ہیں۔ محمود صاحب کے اشعار میں سادگی، درد آمیزی اور شوخی کی فراوانی ہے آپ کا کلام پُر اثر اور حقائق سے قریب تر ہوتا ہے۔ رنگینی، لطافت اور بے ساختگی کی کتنی ہی مثالیں آپ کے اشعار میں ملتی ہیں روزمرہ، پاکیزگی اور برجستگی محمود صاحب کا حصہ ہے۔ وہ اپنے کلام میں سادگی و فصاحت، روزمرہ و سلاست کا خاص لحاظ رکھتے ہیں۔ میدان شاعری میں سمند فکر کی جولانیوں اور ترتیب بندش کی خوبیوں ہی نے اُن کے کلام کو دوسروں سے ممتاز اور پُر تاثیر بنا دیا ہے۔

محمود صاحب ہمیشہ دل پسند الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں اور اپنے مخصوص پیرایۂ بیان سے شعر کو وہ حسن عطا کر دیتے ہیں جو دل و دماغ کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے مثال کے طور پر دنیا سے انسان کے عارضی تعلق اور دنیا کی انسان کے لیے بے حقیقتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

اُڑ جاؤں گا چمن سے مثال شمیم گل
ڈھونڈھے گی بے ثباتیٔ عمر رواں مجھے

ندرتِ الفاظ اور سادگیٔ بیان شعر میں جان ڈال دیتی ہے ایک غزل کے مطلع میں سوسائٹی کے مروجہ تکلفات و تصنع پر تاسف کے ساتھ نہایت لطیف پیرایہ میں طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

رسماً جو پوچھتا ہو اسے کیا بتائیں ہم
ہمدرد کوئی ہو تو غم دل سنائیں ہم

اسی غزل کے دوسرے مطلع میں تحصیل حاصل کے مضمون کو محبوب کے تجاہل عارفانہ اور دانستہ تغافل کے پردے میں یوں نظم کیا ہے ؎

اُن کے ستم کا حال اُنھیں کیا بتائیں ہم
جو شخص جاگتا ہو اسے کیا جگائیں ہم

دورِ حاضر کے شدائد نے لوگوں کو جس طرح بے بس و بے حال کر رکھا ہے اُس کی تصویر کشی اس طرح کی ہے ؎

تنگ آ گئے ہیں کشمکش روزگار سے
مرنے کی اپنے مانگ رہے ہیں دعائیں ہم

قوت تخیل کے استدلال کا طریقہ عام استدلال کے طریقوں سے قطعاً مختلف ہوا کرتا ہے اسے ایک طرح کا منطقی مغالطہ کہا جاتا ہے جو حسن تعلیل کی صورت میں نازک اور حیرت انگیز انداز بیان اختیار کر لیتا ہے۔ انسان خطاؤں کا مرکب ہے بے عیب ذات صرف خدائے واحد کی ہے اس فلسفہ کی حقیقت کو نہایت نزاکت اور شوخی سے یوں نظم کیا ہے ؎

بیکار ہے ہمارے گناہوں کی باز پرس
انسان ہیں ضرور کریں گے خطائیں ہم

ایک شعر میں فلسفۂ حسن و عشق کے مطابق دونوں کو ایک دوسرے کا ہم پلہ قرار دیتے ہوئے جن نپے تلے الفاظ کا استعمال کیا ہے

اور جس طرح تقدیم و تاخیر کو ملحوظ رکھا ہے وہ محمود صاحب کی کہنہ مشقی اور قدرتِ نظم پر دلیل ہے۔ کہتے ہیں ؎

وہ لوگ بندۂ تیغِ وفا و جفا پر تلے رہا ہیں
وہ ہم کو آزمائیں انھیں آزمائیں ہم

محمود صاحب کا سارا کلام ایسے ہی حسین اشعار سے مزین ہے۔ محمود صاحب رائے بریلی میں پیدا ہوئے تھے وہیں پرورش و تعلیم پائی اب گزشتہ پچیس برس سے بسلسلۂ ملازمت الٰہ آباد میں اقامت گزیں ہیں۔ دنیائے ادب میں ضلع رائے بریلی کو یہ افتخار حاصل ہے کہ اسی سرزمین نے ملک محمد جائسی جیسی عظیم شخصیت کو جنم دیا جن کے علمی سرچشمے سے آج تک کشتِ ادب سیراب ہو رہی ہے۔ محمود صاحب کو اس ضلع سے نسبت ہی کیا کم تھی کہ الٰہ آباد کے قیام نے ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی کے ادبی فیوض و برکات سے بھی مستفیض کر دیا۔ محمود صاحب حضرت نوح ناروی کے شاگرد ہیں۔ دلدادگانِ شعر و سخن اور دارفتگانِ علم و ادب حضرت نوح ناروی مرحوم کے مکتبۂ فکر سے خوب واقف ہیں اُستاد کی جائے قیام سے قربت ہونے کے باعث ہمہ وقت کی صحبت نے محمود صاحب کے ذوقِ شعری کو چار چاند لگا دیے۔

محمود صاحب، ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی مرحوم کی قائم کردہ انجمن سفینۂ ادب الٰہ آباد کے جنرل سکریٹری بھی ہیں اس انجمن کے تحت ہر ماہ ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہوتا رہا ہے۔ طرحی مشاعروں میں طبع آزمائی نے بھی محمود صاحب کے کلام کو کافی جلا بخشی۔ اپنے نفسِ مطلب کو صاف سادہ اور عام فہم زبان میں ادا کردینے کا ہنر انھیں اُستاد ہی کے فیضِ صحبت سے حاصل ہوا جس کا فخریہ اعتراف اپنی ایک غزل کے مقطع میں یوں کیا ہے ؎

بھٹک سکوں گا نہ میں جادۂ سخن سے کبھی
ملا ہے نوح سا محمود خضرِ راہ مجھے

شیرینیِ بیان، شوخیِ طبع، مضمون رسی اور محمود صاحب کی قادرالکلامی کے ثبوت میں "باقیاتِ محمود" سے چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

طوفاں نے خود سفینہ کنارے لگا دیا
رکھ لی مرے خدا نے مرے ناخدا کی بات

کیا کیا تخیلات کے لمحے تھے دلفریب
تا دیر دل ہی دل میں کل اُن سے ہوا کی بات

جنھیں سکھایا تھا منزل رسی کا میں نے طریق
سمجھ رہے ہیں وہی آج گردِ راہ مجھے

بہت بڑی چیز دل کی خودداری
میں کروں التجا خدا نہ کرے

عشق کی ابتدا تو ہو محمود
عشق کی انتہا خدا نہ کرے

طبیعت اپنی تلون پسند ہے یارب
اگر بہشت میں گھبرا گئی تو کیا ہوگا

ہم خاک کریں اُن سے عنایت کی توقع
جو بات بھی کرنے کے روادار نہیں ہیں

کیا قدر ہے اس دور میں آئینۂ دل کی
اس جنس کے دنیا میں خریدار نہیں ہیں

محمود صاحب کا مجموعۂ کلام "باقیاتِ محمود" ترتیب و تکمیل کے مراحل طے کر کے جلد ہی زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر اہلِ نظر اور صاحبانِ ذوق کی لذتِ کام و دہن کی تسکین کا سبب بنے گا۔

بقیہ صفحہ ۱۵ کا

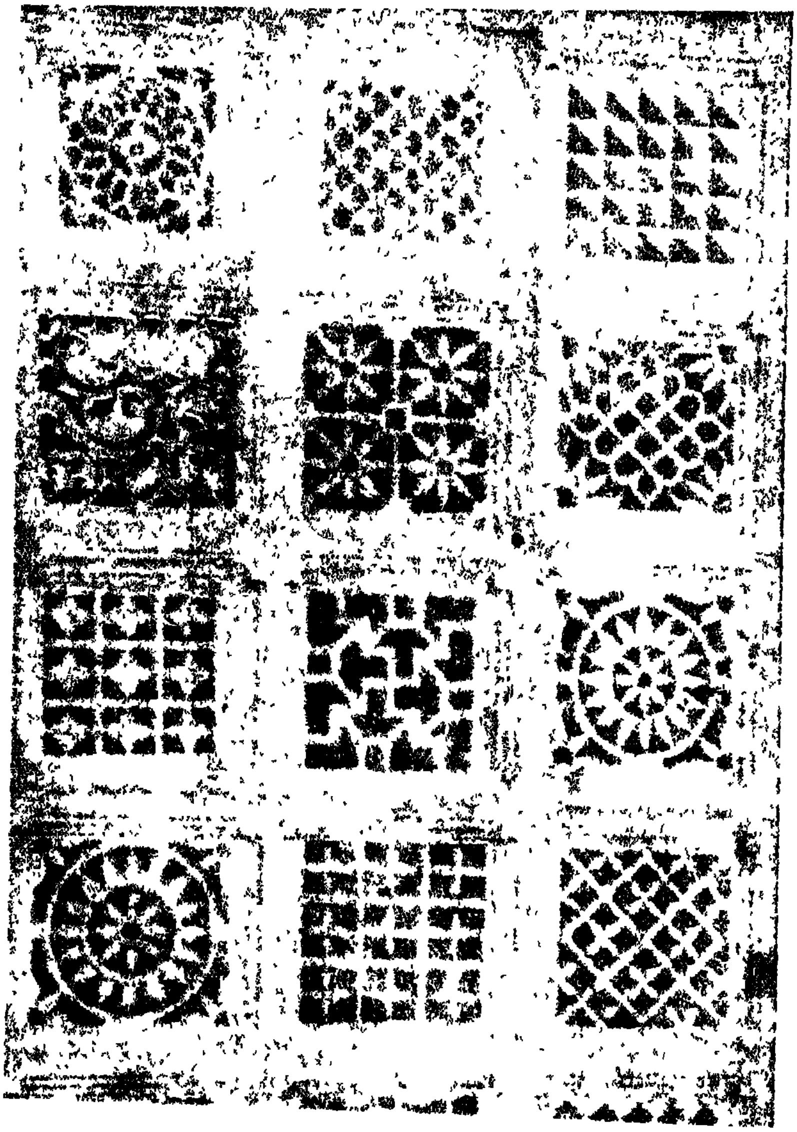
واپس لوٹ رہی تھی۔ ــــــ وجاہت کے ملازم نے سلمیٰ کے باہر چلے جانے کے بعد دروازہ بند کر دیا ــــــ اور وجاہت سلمیٰ کی آخری تصویر کے تصور میں غرق ہو گیا۔

Approved by the Government of Jammu & Kashmir for Libraries

ماہنامہ

ترنم

لکھنؤ



Editor
Najma Akhlaque

3(6-91)

Sub-Editor
Iqbal Akhter

Price
Re. 1-00

ANNUAL
Rs 10-00

یوم آزادی نمبر

ماہنامہ
ترنم
لکھنؤ

جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۶ لغایت ۹

مدیرہ: نجمہ اخلاق

نائب مدیر: اقبال اختر

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ
سالانہ دس روپے

فون نمبر ۲۹۲۵۰

ترتیب

• پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: نجمہ اخلاق • کتابت: سید نواب حیدر نقوی
• طباعت: نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۳
• مقام اشاعت: ۱۵ اردو بازار احتشام نگر، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

"سوز و ساز"

اتر پردیش کے پچھلے عوامی الکشن کے بعد سے کاغذ کا بھاؤ بتدریج بڑھتے بڑھتے اب تقریباً چار گنے سے بھی زیادہ ہوگیا ہے۔ سفید کاغذ کا حال ہے نیوز پرنٹ تو گویا دیکھنے میں بھی نہیں آتا اس پر طرفہ یہ کہ وقت پر ملتا بھی نہیں۔ یوں تو ضروریات زندگی کی ہر چیز اسقدر گراں ہو گئی ہے کہ ناقابل بیان ہے ہر شے کی گرانی کی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ کاغذ بھی گراں ہوگیا اور رفتہ رفتہ کمیاب ہو کر اب تو نایاب ہوگیا ہے بازار ہفتوں دوڑتے رہیئے کاغذ کسی بھاؤ دستیاب نہیں ہوتا۔ ادھر تو تقریباً ایک سال سے یہ کیفیت ہے دوسری طرف سرکاری بجٹ پاس ہوا تو کفایت شعاری اور بچت کی مہم نافذ کردی گئی اسی مناسبت سے اشتہار و تشہیر کے لئے جو رقم عموماً تمام متعلقہ محکموں کو دی جاتی تھی اس میں خاصی تخفیف کردی گئی اس کا بہت برا اثر اخبارات اور رسائل پر پڑا کیونکہ کفایت شعاری کے تحت اشتہارات بڑی حد تک کم کردیئے گئے اس کے علاوہ اشتہارات کے نرخ بھی کم کردیے گئے اس طرح اخبارات کی آمدنی پر کافی ضرب لگی اس بحران اور افتاد کا شکار ہو کر نہ معلوم کتنے اخبارات نے اپنے صفحات کم کر دئے، قیمت بڑھادی اور بہت سے کاغذ کی نایابی اور کساد بازاری کی تاب نہ لاکر دم توڑ چکے۔

کاغذ کی نایابی کا مسئلہ صرف اخبارات و رسائل ہی تک محدود نہیں بلکہ اس کا اثر ہمارے تعلیمی نظام پر پڑرہا ہے۔ یہاں تک کہ بچوں کی نصابی کتابیں، کاپیاں اور دوسری چیزیں تیار نہیں ہو پار ہی ہیں۔

اس بحران سے وہ بڑے بڑے اخبارات و رسائل کسی حد تک بچے ہوئے ہیں جو کسی منظم ادارہ کے تحت نکل رہے ہیں ساری مصیبت چھوٹے پونجی والے اخبارات پر پڑی ہے جو اپنے محدود وسائل اور ذرائع کے اندر کسی نہ کسی طرح تھوڑے سرمایہ سے اپنا کام چلا رہے تھے ــــــ

چونکہ ہماری تہذیبی، معاشرتی، ایکتا اور تعلیمی تک ودو کا دارو مدار کاغذ پر ہے اور وہ نایاب ہے جس کا بہت برا اثر پڑرہا ہے اس لئے حکومت کو چاہیئے کہ بہت سے کاموں کے مقابلہ میں اس مسئلہ کو ترجیح دیتے ہوئے کاغذ کی بحالی کی جانب اپنی توجہ جلد از جلد مبذول کرے۔

میرا وطن ہندوستاں

ساحر لکھنوی

نسرین و سوسن کا وطن زینت گہِ سرو و سمن — گل پوش بھی گل پاش بھی یہ جلوہ زارِ نسترن
پھولوں کے گہنے سے لدی جس طرح جوگی کی دلہن
یہ خطۂ جنت نشاں — کتنا حسیں کتنا جواں
جیسے خیالوں کا جہاں
میرا وطن ہندوستاں

آئینۂ خلد و ارم، ثانیٔ فردوس بریں — دنیائے رنگ و نور ہے اللہ ری یہ سرزمیں
ہر رہگذر ہے کہکشاں، ذرے ستاروں سے حسیں
ہے کیف آگیں ہر سماں کتنا حسیں کتنا جواں
جیسے خیالوں کا جہاں
میرا وطن ہندوستاں

یہ لہلہاتی کھیتیاں یہ کیف پرور ندیاں — یہ حسن سادہ کی پھبن پنگھٹ پہ یہ اٹھکھیلیاں
یہ لوگ گیتوں کا جہاں، کتنا حسیں کتنا جواں
جیسے خیالوں کا جہاں
میرا وطن ہندوستاں

معراجِ رنگ و نور ہے یا وادیٔ کشمیر ہے — روئے زمیں پر خلد کی اک ہو بہو تصویر ہے
یا دلکشی حسن کی منہ بولتی تصویر ہے
ہر سو فضائے بوستاں۔ کتنا حسیں کتنا جواں
جیسے خیالوں کا جہاں
میرا وطن ہندوستاں

یہ عشق کا عظمت کدہ، یہ شاہکارِ اہلِ فن — قرباں ہے روئے چمن یہ تاج کا سیمیں بدن
کچھ سادگی کچھ بانکپن۔ جانِ ارم، روحِ عدن
عشق و وفا کی داستاں۔ کتنا حسیں کتنا جواں
جیسے خیالوں کا جہاں
میرا وطن ہندوستاں

یہ فخرِ تاجِ ایشیا، یہ مرکزِ صدق و صفا — سرچشمۂ مہر و وفا امن و اخوت آشنا
ہر منظرِ جنت نشاں انوار کا ہے آئینا
گوہر بکاں، گوہر فشاں — کتنا حسیں کتنا جواں
جیسے خیالوں کا جہاں
میرا وطن ہندوستاں

جشنِ آزادی کا ایک نغمہ

نئے انسان کا المیہ

پریم وار برٹنی

تعارف مرا مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟
کسی نام سے بھی مجھے یاد کر لو
کہ اپنے زمانے کا گوتم بھی ہوں اور گاندھی بھی ہوں
میں موسیٰ بھی ہوں اور منصور بھی ہوں
کہن سال تہذیب کی گہری کالی گپھاؤں سے باہر نکل کر
میں پھر ابنِ آدم کو آواز دوں گا
کہ عیسیٰ کی تاریک سولی کا پُرنور پیغام ہوں میں
کہ سقراط کا رقص کرتا ہوا آتشیں جام ہوں میں

مرا نام لیکر پکارو گے جب بھی
تو صدیوں پرانی روایات کے گنبدوں سے نکل کر
نئے آنے والے دل آویز لمحوں کو آواز دوں گا
اندھیروں میں سہمے ہوئے انقلابوں کو پرواز کا راز دوں گا
میں دھرتی کے ہر زخم کو،
چاندنی کی لطافت کا اعزاز دوں گا

مرا نام لیکر پکارو تو معلوم ہوگا
کہ میں وقت کے ہر بدلتے تقاضے کا عنوان بھی ہوں
میں انسانیت کی چمکتی دمکتی ہوئی آن بھی ہوں
میں امن و محبت کا ارمان بھی ہوں
کنہیا کی گیتوں بھری بانسری کی مدھر تان بھی ہوں
میں گیتا بھی انجیل بھی اور قرآن بھی ہوں
میں انسان بھی ہوں، میں بھگوان بھی ہوں

یہ پھیلا ہوا آسماں یہ سمندر
یہ دھرتی یہ دھرتی کے اُجلے نظارے
یہ سارے کے سارے
مرا نام ہیں اور مرا روپ ہیں
مرے ہی پگھلتے ہوئے درد کی دھوپ ہیں

نہ ماں ہے نہ کوئی بہن ہے نہ بھائی
مرے جسم و جاں دے رہے ہیں دُہائی
کسی سے مرا کوئی رشتہ نہیں ہے
میں تنہا تھا، تنہا ہوں، تنہا رہوں گا
ازل سے ابد تک
محبت کے خوابوں کے سُونے سفر میں
مرے سائے کی کوئی منزل نہیں ہے
مری روح کا کپکپاتا ہیولا
بدن اور لہو کے بھی رشتے کا قائل نہیں ہے
مجھے اُس سلگتے ہوئے سُرخ لمحے کی لذت نے پیدا کیا ہے
کہ جس کی تمازت نے آفاق کا حُسن پگھلا دیا ہے
وہ لمحہ کہ جس کی حرارت بھری حشر انگیزیوں نے
لہو کے سمندر کو گرما دیا ہے
میں وہ لمحۂ جاوداں ہوں
میں وہ قلزم بیکراں ہوں

مگر دنیا والو
کسے دل کے زخموں کا مرگھٹ دکھاؤں
خود اپنے لہو سے چتا اپنی آنکھوں کی کیسے جلاؤں
مری زندگی کے انوکھے سفر میں
اندھیرے افق سے، اندھیرے افق تک
جدھر دیکھئے بس دھواں ہی دھواں ہے
یہ کیسی فضا ہے، یہ کیسا جہاں ہے!

ارے جنگ بازو
مری آتما کے کھنڈر کے قریب آؤ اور دیکھو کہ اس میں
کئی ہیروشیما جلے ہیں بجھے ہیں
کئی ویت نام آج بھی میری آنکھوں میں نوحہ کناں ہیں
مری روح کے غار میں جھک کے دیکھو

یہاں راکھ ہی راکھ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے

یہ مانا کہ میں بے شباہت ہوں بے ڈھب ہوں لیکن
ذرا میرے البیلے ملبوس کی دلبرائی تو دیکھو
مرے ناتراشیدہ بالوں کی ہیئت کذائی تو دیکھو
بدل جائیں کتنے ہی نقشے جہاں کے
گذر جائیں کتنے ہی یگ آسماں کے
مگر یہ حقیقت، حقیقت رہے گی
کہ بدنام تو ہوں کہ بدشکل تو ہوں
ارے جنگ بازو،
میں بدخو نہیں ہوں
میں سلفے کا دم ہوں، چرس کا دھواں ہوں
مگر جلتے بارود کی بو نہیں ہوں

چیچک سے بچیئے

اس مصیبت سے اگرچہ بچہ موت کے منھ میں جانے سے بچ گیا تو کہیں اندھا، گونگا، لنگڑا یا بدصورت نہ ہو جائے؟

بچاؤ کے لئے

۱۔ چیچک کا ٹیکہ لگوایئے۔ یہ ٹیکہ پیدائش کے بعد ایک ہفتہ کے اندر لگوالینا بہتر ہے۔ صرف کامیاب ٹیکہ ہی چیچک سے بچاتا ہے۔

۲۔ آس، پاس، پڑوس میں اگر کوئی چیچک کا مریض ہے تو فوری طور پر قریب کے ابتدائی ہیلتھ سنٹر اور ضلع یا شہر کے ہیلتھ افسر کو مطلع کر دیجئے۔ مریض کا پورا پتہ اسے بتا دیجئے تاکہ مرض کو پھیلنے سے روکا جا سکے ایک ہی روگی سے بہت سے لوگ روگی ہو سکتے ہیں۔

آپ سواستھ سیوا نردیشک (راشٹریہ چیچک انمولن کاریہ کرم) اترپردیش نے جاری کیا۔

ملک زادہ منظور احمد

زندگی میں پہلے اتنی تو پریشانی نہ تھی
تنگ دامانی تھی لیکن چاک دامانی نہ تھی

جام خالی تھے مگر میخانہ تو آباد تھا
چشم ساقی میں تغافل تھا پشیمانی نہ تھی

غازہ تو ایک تھا سب کے چہرے مختلف
غور سے دیکھا تو کوئی شکل انجانی نہ تھی

جن سفینوں نے کبھی توڑا تھا موجوں کا غرور
اس جگہ ڈوبے جہاں دریا میں طغیانی نہ تھی

پڑھ چکا اپنی غزل منظور تو ایسا لگا
مرثیہ تھا دور حاضر کا غزل خوانی نہ تھی

تسنیم فاروقی

مٹ کے بھی ترک محبت کی نہ ٹھانی ہم نے
دل کی تھی بات دماغوں کی نہ مانی ہم نے

ہاتھ سے ہاتھ کا تنو ہار تعارف تو ہوا
دل سے ملنے کی مگر ریت نہ جانی ہم نے

یہ سہارا بھی کوئی کم تو نہیں جینے کو
تجھ کو چاہا تھا کبھی دشمن جانی ہم نے

اصطلاحاً جسے کہتا ہے زمانہ آنسو
ان کی آنکھوں میں بھی دیکھا ہے وہ پانی ہم نے

ہم نے پہنچائی ہے ذروں کی زباں کرنوں تک
شہر کیا ہوگا جہاں خاک نہ چھانی ہم نے

کیسے ہر بہتے ہوئے آب کو دریا کہہ دیں
تھوڑے پانی میں بھی دیکھی ہے روانی ہم نے

اس کا اک روپ بھی تسنیم بیاں کر نہ سکے
عمر بھر جمع کئے لفظ و معانی ہم نے

نرجس زیدی

یہ باعث دل کو غم رخصت بہار نہیں
ستم ہے یہ کہ خزاں بھی تو پائیدار نہیں
گلے لگائیں بھلا کیوں نہ تجھے غم جاناں
نصیب کیا ہمیں غم ہائے روزگار نہیں
بھر آئے فرطِ مسرت سے آنکھ میں آنسو
لبوں کو آہ تبسم جو سازگار نہیں
میں کیسے حسرتِ مُردہ کو دل میں دفن کروں
کہ صحن گھر میں بنا کوئی مزار نہیں
کسی سے اپنا تعارف کرائیں کیا نرجس
حقیقت اپنی خود ہم پر بھی آشکار نہیں

کانت گرودر شبنم

غزل

وائے قسمت آنکھ اس محفل کو دیکھے دور سے
ایک راہی جس طرح منزل کو دیکھے دور سے
دیکھتے ہیں اُن کو یوں اُمید کی نظروں سے ہم
جیسے کوئی ڈوبتا ساحل کو دیکھے دور سے
سوزِ غم کی آنچ سے آنکھیں نہ جل جائیں کہیں
دیکھنے والا ہمارے دل کو دیکھے دور سے
خوف سے رسوائی کے ہم دیکھتے ہیں یوں انہیں
جیسے مجنوں پردۂ محمل کو دیکھے دور سے
اُس کا روئے آفتابی دیکھ شبنم اس طرح
جس طرح بسمل کوئی قاتل کو دیکھے دور سے

غزلیں

کرشن پرویز

مے کیف ان کی لگے ہر جام دیوانہ لگے
ڈوبتا آنکھوں میں اُن کی سارا میخانہ لگے
ایک بھی دیپک نہیں جلتا کسی کی یاد کا
کس قدر سنسان یارو دل کا ویرانہ لگے
دیر ہو کعبہ، کلیسا ہو، کوئی آتش کدہ
ہم کو تو سب ایک ہی ہستی کا کاشانہ لگے
سن کے میری داستاں شوخی سے فرمانے لگے
یہ فسانہ تو نہیں کچھ جانا پہچانا لگے
وہ عیادت کیلئے پرویز در پر آئے ہیں
یہ حقیقت بھی ہمیں تو ایک افسانہ لگے

وید دیوانہ

یوں آپ نے وفا کے سفینے ڈبو دیئے
دریا تو کیا ہے گھاٹ کے پتھر بھی رو دیئے
وہ روز و شب جو اصل میں تھے حاصلِ حیات
ہم نے تمہارے عشق کے خوابوں میں کھو دیئے
آئے کہیں نہ آپ کی چارہ گری پہ حرف
دل کے لہو سے داغ زمانے کے دھو دیئے
ہم نے تو ہنس کے چوم لئے تھے خزاں کے لب
تم نے گلوں کی آنکھ میں کانٹے چبھو دیئے
دل میں جہاں کا درد نہاں ہے کچھ اس طرح
کوزے میں جیسے سات سمندر سمو دیئے
مہکے گا ایک دن یہیں گلزار دیکھنا
ہم نے جنوں کے پھول بیاباں میں بو دیئے
اے وید شہر میں جو پڑا موتیوں کا کال
ہم نے کسی کی زلف میں موتی پرو دیئے

غزلیں

مظفر النساء نازؔ

جس طرف دیکھو اُدھر عالمِ تنہائی ہے
ہم نے خوش رہنے کی یہ کیسی سزا پائی ہے

یوں بظاہر تو کوئی نام نہیں ہے اُس کا
کس کی تصویر نگاہوں میں اُبھر آئی ہے

قدر گھٹ جائے گی اظہارِ محبت میں ندیم!
اس میں میری ہی نہیں تیری بھی تو رسوائی ہے

قافلے اشکوں کے پلکوں پہ اُبھر آئے ہیں
منزلِ دوست! سمجھتی ہوں قریب آئی ہے

ہوں میں تنہا مگر اتنی ابھی تنہا تو نہیں
میرے ہمراہ تری یاد اُبھر آئی ہے

نازؔ کس طرح سے مفہومِ وفا سمجھاؤں
زندگی اپنی ہی آواز سے ٹکرائی ہے

غزالہ غزلؔ

ہے آج ہم آغوشِ خوشی کے بھنور سے
اُبھری تھی جو آواز صداؤں کے نگر سے

رستے ہیں ابھی تک بھلا کیوں ہائے تمنا
عرصہ ہوا لوٹے ہوئے یادوں کے سفر سے

کوزے میں سمندر کو بھرے سوچ رہی ہوں
سوکھی ہوئی دھرتی پہ کہیں آگ نہ برسے

سرگوشیوں کے شہر میں رہ سکتا ہے کیسے
جو شخص کہ خود اپنی ہی آواز کو ترسے

تقدیر ہی آسیب زدہ ہے مری غزلؔ
پھر مجھکو بھلا شکوہ ہو کیوں شام و سحر سے

قطعات

سرجیت شیدا

میرے خوابوں میں آکے اک پری نے
میری سوئی ہوئی قسمت جگا دی
یہی ہے شیوۂ گردش زمانہ
نشیمن جب بنا بجلی گرا دی
کبھی رنج و الم کی بات کہہ دی
کبھی جذبات کو ٹھوکر لگا دی
کسی کافر ادا کی اک ادا پر
متاعِ زندگانی سب لٹا دی
تیری آنکھوں کی مستی اللہ اللہ
لگا ہوں ہی لگا ہوں میں پلا دی
بخم کاکل سنوارا آپ نے کیوں
میرے افکار کی دنیا مٹا دی
کوئی آیا نہ چارہ گر ہمارا
زمانے بھر کو شیدا نے صدا دی

سید مرتضیٰ خوشتر

ذہن کو جھوٹے سہاروں پہ نہ لایا جائے
زیست کو عزم و تحمل ہی سے سجایا جائے
اپنے اعمال پہ عصیاں کا نہ سایا جائے
ان کو کردار سے پاکیزہ بنایا جائے
پھول بیکار ہے اڑ جائے جب اسکی خوشبو
راز کو اپنے بہر حال چھپایا جائے
آہ مظلوم قیامت کا اثر رکھتی ہے
بھول کر بھی کسی دل کو نہ دکھایا جائے
اجنبی کوئی بھی نظروں میں نہ ہوگا خوشتر
ذہن سے اپنی جو نفرت کو مٹایا جائے

غزلیں

ہیرانند سوز

ہم سے کشتوں کی بات ذرا غور سے سنو
پیغام دے رہا ہے خدا غور سے سنو

یارو شکستِ دل کی صدا غور سے سنو
آئینہ ایک ٹوٹ چلا غور سے سنو

آنکھیں جو فرطِ غم سے نہیں تر تو کیا ہوا
اندر برس رہی ہے گھٹا غور سے سنو

اس داستاں میں سن کے جسے رو رہے ہیں لوگ
ہوگا ضرور ذکر مرا غور سے سنو

کیسا ہے آپ کے دورِ خزاں شاخ شاخ پر
سر رکھ کے رو رہی ہے ہوا غور سے سنو

شاید خود اپنے بوجھ کے نیچے دبے ہیں لوگ
ہے شہر شہر شور بپا غور سے سنو

کس درجہ ہولناک ہے اس خامشی کی گونج
سہمے ہوئے ہیں ارض و سما غور سے سنو

اسلوبِ نو سے سوز ہوا ہے غزل سرا
شاید نہ ہو کسی نے سنا غور سے سنو

—

ندرت نواز

عظمتوں کا دیار بن کے رہو
شہر میں شہریار بن کے رہو

بن کے کمتر خلاؤں کو چھو لو
راستے کا غبار بن کے رہو

میں تمہارے لئے پریشاں ہوں
تم مرے غمگسار بن کے رہو

اس طرح مفلسی سے عشق کرو
سینۂ زر پہ خار بن کے رہو

ہوش محرومِ دار ہے یارو
وحشتوں کی بہار بن کے رہو

زندگی خود شراب ہے ندرت
بن پیئے پُرخمار بن کے رہو

—

بھاری صنعت کے تحت سرکاری سیکٹر کے کارخانے

بھارت میں سرکاری سیکٹر کے کارخانے بنائے اس عزم کی غمازی کرتے ہیں کہ اپنے عوام کو سماجی انصاف کے تقاضوں کے تحت خوشحالی سے ہمکنار کرایا جائے۔ سرکاری سیکٹر کے کارخانے اصل میں وہ ستون ہیں جن پر سماج وادی بھارت کی تعمیر کی جا رہی ہے۔

ملک میں سرکاری سیکٹر کے کارخانوں کی کارکردگی پر نکتہ چینی ہوتی رہی ہے۔ اس قسم کی نکتہ چینی کا خاص سبب ایسے کارخانوں کے مقصد اور کردار کے بارے میں غلط فہمی اور ایسے خود غرض افراد ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ پبلک سیکٹر کو ہماری اقتصادی پیش رفت میں ایک مثبت اور موثر کردار ادا نہیں کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس امر کو نظر انداز کر کے انہوں نے سرکاری سیکٹر کے کارخانوں کے خلاف پروپیگنڈا کیا۔

یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ ایسے کارخانے قائم کرنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ بھارتی معیشت کی توسیع اور نشوونما کے لئے درکار بعض اہم سامان کی کمی کو پورا کیا جائے۔ سرکاری سیکٹر کے کارخانوں کی تشکیل منافع حاصل کرنے کے لئے نہیں کی گئی تھی بلکہ بنیادی مقاصد یہ تھے کہ ہمارے عوام کو سماجی انصاف حاصل ہو سکے۔ چنانچہ ان کارخانوں میں کام کرنے والے ہزاروں کارکنوں کو ضروری آسائش اور سہولیات بہم پہنچائی گئیں تاکہ یہ لوگ با مقصد زندگی گزار سکیں اور نئے بھارت کی تشکیل میں شمولیت کر سکیں۔

سرکاری سیکٹر کے بعض کارخانے اس قدر عظیم ہیں کہ ان میں کروڑوں روپے کا سرمایہ لگا ہوا ہے جو کہ نجی شعبوں کے کارخانوں [illegible] ہے کہ [illegible] شعبے کے کارخانے روپیہ اکٹھا کرنے کے لئے بنیادی طور پر مالی اداروں، سرکاری اور افراد پر انحصار رکھتے ہیں جبکہ اپنے طور پر یہ بہت کم سرمایہ لگاتے ہیں۔

نجی سیکٹر کے بعض بڑے کارخانے کافی مدت سے مسائل کا سامنا کر رہے ہیں جنھوں نے کافی عرصے سے منافع کا اعلان نہیں کیا ہے۔ سرکاری سیکٹر کے کارخانوں نے آزادی کے بعد سے ہی کارکردگی شروع کی ہے اس لئے ان کارخانوں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی ہے کہ یہ فوراً ہی توقعات کے مطابق کامیابیوں سے ہمکنار ہو جائیں گے۔

کیونکہ سرکاری سیکٹر کا تصور بالکل نیا تھا اس لئے اہم جگہوں پر کارکردگی انجام دینے کے لئے مناسب قسم کے عملے کے انتخاب میں بھی کچھ دیر لگی۔ زیادہ تر حالتوں میں غیر اطمینان بخش کارکردگی کی اصل وجہ عملے سے متعلق غلط پالیسی تھی اور پھر جہاں کہیں بھی انتظامیہ میں تبدیلیاں کی گئیں، یونٹوں نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ بھاری صنعت کی وزارت کے تحت کام کرنے والے سرکاری شعبے کے کارخانوں کی کارکردگی پر اگر نظر ثانی کی جائے تو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کارخانوں کی کارکردگی قابل ستائش ہے۔

سنہ [illegible] کے دوران سرکاری سیکٹر کے کارخانوں نے ۳ ارب ۹ کروڑ روپے کی مالیت کی کل پیداوار کی جو کہ ۳ ارب ۵۹ کروڑ روپے کے مقرر کردہ نشانے کا ۵۰ فیصد ہے۔ سنہ [illegible] میں ۲ ارب ۱۰ کروڑ روپے کی مالیت کی پیداوار ہوئی۔ گذشتہ سال کی پیداوار کے مقابلے میں موجودہ سال کی پیداوار کی مالیت میں ۲۰ کروڑ روپے کا اضافہ ہوا ہے جبکہ گذشتہ سال کی پیداوار کے مقابلے میں ۴۴ فی صد زیادہ ہے۔

خام مال اور بجلی کی کمی اور نقل و حمل کی دشواریوں کو مد نظر

دیکھتے ہوئے یہ کارکردگی لائق ستائش ہے۔

بھارت ہیوی الیکٹریکلز لمیٹڈ۔ جیس سوپس اور مشین ٹول کارپوریشن آف انڈیا لمیٹڈ کی پیداوار سال کے لئے مقرر کردہ نشانوں سے تجاوز کر گئی ہے جیس سوپس کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کے پیداواری نشانے پر سال کے دوران ہی نظر ثانی کی گئی تھی اور اس میں اضافہ کر دیا گیا تھا

مائننگ اینڈ الائیڈ مشینری کارپوریشن۔ تنگ بھدرا اسٹیل پروڈکٹس۔ ریچرڈسن اینڈ کروڈاس اور گرینشم اینڈ کراوان نے اپنے پیداواری نشانوں کا ۹۶ فیصد حصہ حاصل کر لیا ہے تریوینی اسٹرکچرلز لمیٹڈ نے اپنے پیداواری نشانے کا ۹۰ فیصد حصہ حاصل کر لیا ہے۔

بھارت ہیوی الیکٹریکلز

بھارت ہیوی الیکٹریکلز گروپ نے ۱۹۷۳-۷۴ء میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس نے دو ارب ۲۸ کروڑ روپے کی مالیت کی پیداوار کی جو کہ دو ارب ۲۴ کروڑ روپے کے نشانے سے ۴ کروڑ روپے زیادہ ہے۔ بھارت ہیوی الیکٹریکلز گروپ صلاحیت کے مکمل استعمال کے لئے تیزی سے پیش قدمی کر رہا ہے ۱۹۷۳-۷۴ء میں حقیقی پیداوار اور ۱۹۷۴-۷۵ء کے لئے مقرر کردہ پیداوار کے درمیان فی صد پیش رفت صرف ۲۴ فیصد ہے جبکہ اس سے قبل فی صد پیش رفت ۵۰ فیصد ہوا کرتی تھی ـــ ۱۹۷۴-۷۵ء کے لئے دو ارب ۱۸ کروڑ اور ۵۰ لاکھ روپے کی مالیت کی پیداوار کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

ہیوی انجینئرنگ کارپوریشن

ہیوی انجینئرنگ کارپوریشن نے ۱۹۷۳-۷۴ء میں ۴۴ کروڑ [illegible] لاکھ روپے کی مالیت کی پیداوار کی جبکہ ۱۹۷۲-۷۳ء کی پیداوار کی مالیت کے مقابلے میں ۲ فیصد زیادہ ہے۔ تاہم ۱۹۷۳-۷۴ء کی پیداواری [illegible] کروڑ روپے کے نشانے کا [illegible] فیصد

ہی ساری رہی۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ مالی سال کی تیسری چوتھائی کے دوران بجلی میں شدید کٹوتی کی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ [illegible] فورج پلانٹ میں نہایت کم پیداوار ہوئی [illegible] اس کی بدولت ہیوی مشین بلڈنگ پلانٹ اور ہیوی مشین ٹولز پلانٹ میں بھی پیداوار میں کمی ہوئی کاسٹنگز اور فورجنگز کی نامناسب دستیابی کے علاوہ غیر ملکی کل پرزوں کی فراہمی میں تاخیر ہونے کی وجہ سے بھی پیداوار پر برا اثر پڑا ہے۔ اب جبکہ فیکٹری کو درکار غیر ملکی سامان کے لئے روس سے ایک معاہدہ ہو گیا ہے، اس لئے امید ہے کہ موجودہ سال کے دوران فیکٹری کی پیداوار کافی بڑھ جائے گی۔

ہندوستان مشین ٹولز

۱۹۷۳-۷۴ء میں ہندوستان مشین ٹولز کے تمام یونٹوں کی مجموعی پیداوار ۴۰ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے کی مالیت کی تھی جبکہ پیداواری نشانہ ۴۶ کروڑ ۷۹ لاکھ روپے کا تھا۔

سال کے آخری چوتھائی کے عرصے کے دوران ٹریکٹروں کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا ہے حالانکہ مالی سال کی تیسری چوتھائی کے عرصے میں دیسی سامان کی نامناسب فراہمی اور کافی حد تک نامنظوری کی وجہ سے پیداوار کو شدید جھٹکا لگا تھا ایک سال میں چار ہزار ٹریکٹروں کی تیاری قابل ستائش ہے۔ پچھلے سال سے گھڑیوں کی تیاری میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ سری نگر میں بھی گھڑیاں تیار کرنے کے لئے ایک فیکٹری قائم کی جا رہی ہے۔

تاہم پرنٹنگ اور ڈائی کاسٹنگ کی مشینوں کی پیداوار خلاف توقع سست رہی ہے لیکن ۱۹۷۴-۷۵ء میں پیداوار زیادہ بہتر ہو گی۔

اس پیداواری کارگزاری کی مطابقت کے لحاظ سے [illegible] میں مالی کارکردگی میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے ـــ ۱۹۷۲-۷۳ء میں [illegible] لاکھ روپے کا نقصان ہوا تھا لیکن ۱۹۷۳-۷۴ء کے دوران [illegible] منافع حاصل کیا گیا ہے۔ بھارت ہیوی الیکٹریکلز لمیٹڈ نے ۱۹۷۳-۷۴ء میں [illegible] کا منافع حاصل کیا ہے۔ ۱۹۷۳-۷۴ء [illegible]

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

ایسے محقق کا کیا کرے کوئی

کالی داس گپتا المتخلص بہ رضا

اس بات پر اب بھی مصر نظر آتے ہیں کہ دگیر لکھنوی مسلمان نہیں ہوئے تھے اور وہ ہندو ہی مرے۔ اس ناقص موضوع پر ان کا ایک مضمون "عظیم مرثیہ گو چھنولال دگیر" کے نام نیا دور لکھنؤ مطبوعہ دسمبر ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔ موصوف نے اس میں جن امور پر اپنا زور قلم صرف کیا تھا اس کا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

(۱) دگیر کبھی مسلمان نہیں ہوئے تھے اور وہ ہندو ہی مرے تھے۔ اگر انھوں نے تبدیل مذہب کیا ہوتا تو کوئی اسلامی نام بھی رکھا ہوتا۔

(۲) دیوان اودھ افتخار الدولہ مہاراجہ میوہ رام بہرحال ہندو تھے۔ دگیر ان کی بیوی کو مہارانی نہیں بیگم صاحبہ کہتے تھے جو خالص اودھ کی تہذیب ہے۔ ایک ہندو راجہ یعنی میوہ رام کے ہوتے ہوئے دگیر کا ہندو مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو جانا احمقانہ خیال ہے۔ غرضیکہ دگیر کے مذہب بدلنے کا سوال لغو ہے اور اس کے لئے ہمارے پاس کوئی قطعی شہادت نہیں۔

جب گپتا صاحب کا یہ مضمون راقم الحروف کی نظر سے گزرا تو اس نے "غلام حسین دگیر لکھنوی" کے عنوان سے نیا دور لکھنؤ مطبوعہ [illegible] میں ایک مستند مقالہ شائع کیا۔ مقالے میں ثابت کیا گیا کہ دگیر پہلے ہندو تھے شاعری میں طرب تخلص کرتے تھے [illegible] غازی الدین حیدر کے زمانے میں مسلمان ہوئے اور غلام حسین اسلامی نام رکھا۔ راقم نے یہ بھی ثابت کیا [illegible] اسلام کر کے دائرہ اسلام [illegible]

کچھ عرصے کے بعد گپتا صاحب نے یہی مضمون جس کا ذکر ابتدا میں کیا گیا مولوی عبدالماجد دریا بادی کے تاثرات کے ساتھ دوبارہ بمبئی کے ایک رسالہ "صبح امید" شمارہ مئی ۱۹۸۲ء میں شائع کرایا۔ جب یہ مضمون راقم نے پڑھا تو اس نے "صبح امید" بمبئی کے ایڈیٹر جناب عبدالحمید بوبیرے کے نام ایک مختصر سا مقالہ "عبدالماجد دریا بادی، کالی داس گپتا رضا اور دیگر محققین کی غلط فہمیوں کا ازالہ" کے عنوان سے دگیر کے بارے میں بغرض اشاعت بھیجا۔ چونکہ گپتا صاحب صبح امید کے ایڈیٹر کے ممدوحین میں سے ہیں اس لئے اس نے یہ مقالہ اپنے پرچے میں آج تک شائع نہیں کیا۔ راقم نے پھر اسے مجبوراً اخبار سرفراز لکھنؤ میں شائع کرایا۔

حال ہی میں گپتا صاحب نے صبح امید بمبئی کے شمارہ فروری، مارچ ۱۹۸۴ء میں "مرثیہ گو منشی چھنولال دگیر" سکینہ لکھنوی کا شائع کیا ہے۔ یہاں پھر گپتا صاحب نے اپنی کم علمی اور تنگ داماں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ وہ بضد ہیں کہ دگیر کبھی مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے۔ ان کے پاس کوئی ٹھوس اور مستند شہادت نہیں ہے اس لئے وہ ہوا میں باتیں کر کے اپنا مذاق خوب اڑاتے ہیں۔ ان کی مثال مرزا صائب کے اس شعر کی مصداق ہے کہ ؎

ثنائے خود بخود گفتن نہ زیبد ہر گز اے صائب
چو زن پستان خود مالد حظوظ نفس کے یابد

وہ ہمیشہ دگیر کے بارے میں بے پر کی اڑاتے ہیں۔ دراصل اس مضمون کے لکھنے کے محرک ڈاکٹر صفدر آہ ہیں مگر ایسے محقق کا کیا کرے کوئی جو بقول داغ دہلوی "صاف چھپتے بھی نہیں [illegible]"

گپتا صاحب کھلم کھلا ان کا نام لینے سے جھجکتے ہیں بلکہ انھیں ایک " مخطوطہ شناس اور بزرگ محقق " سے تعبیر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صفدر آہ گپتا صاحب کے خرچے پر گپتا صاحب کے موقف کی حمایت میں لکھنؤ بھی گئے تھے۔ لکھنؤ میں وہ جناب سید مسعود حسین رضوی ادیب اور جناب مہاراجکمار محمود آباد سے بھی ملے تھے لہٰذا گپتا صاحب کا یہ کہنا لغو اور سفید جھوٹ ہے کہ مہاراجکمار صاحب ان سے نہیں ملے تھے۔ گپتا صاحب کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) اگر دلگیر مسلمان ہوئے ہوتے تو بہر حال ایک اسلامی نام بھی ضرور رکھا گیا ہوتا۔ ان کے مسلمان ہونے کی خبر کذب محض ہے۔

(۲) تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں دلگیر کا جو اسلامی نام بتایا گیا ہے وہ جعلی ہے اور یہ جعل سنہ ۱۹۱۲ء کے بعد بنایا گیا۔

(۳) سارے ہندوستان میں ایک ایسی مثال بھی نہیں پیش کی جاسکتی جہاں کسی ہندو کے تبدیل مذہب کے بعد اس کا اسلامی نام نہ رکھا گیا ہو۔

قارئین کے لئے گپتا صاحب اور ان کے " مخطوطہ شناس اور بزرگ محقق " کی باتوں کا جواب ذیل میں دیا جاتا ہے۔

(۱) جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ دلگیر اصل میں ہندو تھے۔ نام لالہ چھنو لال ولد منشی رسوا رام، قوم کے کایستھ تھے۔ ابتداء میں طرب تخلص کرتے تھے بعد میں دلگیر کے نام سے شہرت حاصل کی۔

دلگیر پہلے نوازش حسین خاں عرف مرزا خانی کے شاگرد تھے۔ جب وہ کانپور گئے تو دلگیر شیخ ناسخ کی طرف متوجہ ہوئے اور انھیں سے استفادہ کیا۔ شیفتہ نے دلگیر کے تبدیل مذہب کی یہ وجہ بتائی ہے کہ چونکہ انھیں آئمہ معصومین سے بہت زیادہ عقیدت تھی اس لئے اپنے آبائی مذہب کو ترک کر کے اسلام قبول کیا وہ زیادہ تر مرثیہ کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے دلگیر تخلص کرتے ہیں۔ شیفتہ نے گلشن بیخار سنہ ۱۲۴۸ ہجری میں شروع کیا تھا اور اسے سنہ ۱۲۵۰ھ میں تمام کیا یعنی دلگیر کے انتقال کے ۱۴ سال پہلے تذکرہ لکھا گیا تھا۔ راقم الحروف کے پیش نظر گلشن بیخار کا ایک مخطوطہ ہے جو سنہ ۱۲۵۰ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس میں دلگیر کا ترجمہ " تخلص طرب " کے تحت مندرج ہے۔ دلگیر کے تبدیل مذہب کے بارے میں شیفتہ کے الفاظ یہ ہیں۔

" بیشترہا فکر مراثی مائل و دراں نظر بہ مناسبت
دلگیر تخلص دارد و مرثیہ ہائش در زبانہا
مشہور و بر السنہ مذکور و فرط اعتقادش بائمہ اسلام
باعث بر تغییر کیش شدہ کہ دین آبائی را
گذاشتہ بشرف اسلام مشرف گشتہ " (مخطوطہ
گلشن بیخار کتاب خانہ راجہ صاحب محمود آباد)

شیفتہ کے علاوہ متعدد معاصرین نے ان کے مسلمان ہونے کی تصدیق کی ہے۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں!۔

(۱) سعادت خاں ناصر مصنف خوش معرکۂ زیبا مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی ورق ۱۸ سال تصنیف ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء

(۲) حکیم قطب الدین باطن مصنف گلستان بے خزاں سال تصنیف ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء

(۳) سید محسن علی محسن مصنف سراپا سخن سال تصنیف ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۸ء

(۴) نصر اللہ خاں خویشگی مصنف گلشن ہمیشہ بہار مطبوعہ ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء

(۵) مولوی عبد الغفور خاں سال تصنیف سنہ ۱۲۴۳ھ مطبوعہ سنہ ۱۸۴۳ء

(۶) ڈاکٹر اسپرنگر۔ مصنف اودھ کیٹلاگ سال طبع سنہ ۱۸۵۴ء

ان لوگوں کے علاوہ منشی مہاراج بہادر مؤلف آثار الشعرائے ہنود صفحہ مطبوعہ سنہ ۱۸۸۵ء، اور لالہ سری رام

(مولف خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۱۹۴) نے بھی تسلیم کرلیا ہے کہ دلگیر مسلمان ہو گئے تھے۔

دراصل دلگیر بادشاہ غازی الدین حیدر کے ابتدائی عہد ۱۲۳۰ھ میں مسلمان ہو گئے۔ ناصر لکھنوی کہتے ہیں کہ

"سال یک ہزار دو صد و سی سن ہجری میں شرف اسلام سے مشرف اور شیعۂ امیرالمومنین سے ہم طرف ہوا۔"

خوش معرکۂ زیبا نسخۂ پٹنہ میں دلگیر کے ترجمے میں حاشیے پر ان کا اسلامی نام غلام حسین بھی درج ہے۔

"سابق میں حسب بیان میاں دلگیر ہنود تھے۔ جب سے مسلمان ہوئے اپنا نام سلام حسین مقرر کیا۔"

جناب قاضی عبدالودود صاحب ناصر کی عبارت سے متفق ہیں کہ دلگیر سابق میں ہندو تھے۔ جب مسلمان ہوئے تو غلام حسین اسلامی نام رکھا۔ یہ عبارت قاضی صاحب نے آج سے کچھ برس پہلے راقم الحروف کو پٹنہ سے بھیجی تھی۔ اسی قسم کی ایک تحریر انھوں نے لکھنؤ کے جواں سال محقق ڈاکٹر سلیمان حسین صاحب کو بھی ارسال کی تھی۔

خوش معرکۂ زیبا نسخۂ پٹنہ کی مذکورہ بالا تحریر کے بارے میں ہوش و خرد کھو کر ڈاکٹر صفدر آہ کی پشت پناہ پر کس طرح مضحکہ خیز، لغو اور لچر باتیں کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

"تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا واحد غیر شایع شدہ تذکرہ رہ گیا تھا جس میں دلگیر کا ذکر تھا چونکہ قلمی کتاب میں جعلسازی کی گنجائش کافی نکل آتی ہے اس تذکرے پر جعلسازوں کی خصوصی توجہ مبذول ہوئی۔ یہ جعل ۱۹۶۴ء کے بعد بنایا گیا اس کا ایک بدیہی اور ناقابل تردید ثبوت بھی پیش کئے دیتا ہوں۔ ڈاکٹر نسیم انہونوی نے ۱۹۶۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کی وساطت سے پٹنہ کے اس مخطوطہ کی فوٹو کاپی حاصل کرکے اسے کچھ عرصہ ہوا کتابی صورت میں شایع کردیا ہے فوٹو کاپی لینے میں مخطوطے کے حاشیے بھی فوکس میں تھے چنانچہ جہاں کہیں بھی مخطوطے کے حاشیے پر کوئی عبارت یا نشانات ہیں وہ سب اس فوٹو کاپی میں آ گئے ہیں۔ لیکن غلام حسین کے جعلی نام والی عبارت اس فوٹو کاپی کے حاشیے پر کہیں نہیں ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ غلام حسین کا نام ایک ایسا جعل ہے جو آٹھ دس سال کے اندر بنایا گیا ہے۔ مزہ تو یہ ہے کہ پروفیسر مسعود حسن ادیب صاحب بھی نہایت دیدہ دلیری سے فرماتے ہیں کہ دلگیر کا اسلامی نام غلام حسین تھا۔ کیا ان کے ایسے محقق کے لئے نام کے اس اعلان کے ساتھ یہ بتانا ضروری نہ تھا کہ یہ نام مخطوطۂ پٹنہ کے حاشیے پر کاتب مخطوطہ کی تحریر سے الگ کسی دوسرے کی تحریر میں مرقوم ہے اور یہ تحریر مشکوک اور جعل ہے۔"

گپتا صاحب اور ان کے "مخطوطہ شناس محقق" کی داد دیجئے۔ اگر دونوں بزرگ خوش معرکۂ زیبا نسخۂ پٹنہ کے دیکھنے کی زحمت فرماتے تو شاید ہی دلگیر کے بارے میں اس قسم کی فاش غلطی نہ کرتے۔ چونکہ ان کی علمی بصارت صفر کے برابر ہے۔ اس لئے اب ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی سمجھتے ہیں۔ اگر اس قسم کے دو چار نام نہاد محقق اور ہوتے تو نہ معلوم اردو کی نیا کب کی ڈوب جاتی۔ تحقیق کے دونوں ناخدا اب ڈاکٹر نسیم انہونوی کو سہنا تے ہیں۔ گپتا صاحب کا مذکورہ بالا اقتباس نہ صرف ... بے بنیاد اور لچر ہے بلکہ مضحکہ خیز اور گمراہ کن بھی ہے۔ ان کا یہ کہنا سراسر جھوٹ اور کذب ہے کہ خوش معرکۂ زیبا نسخۂ پٹنہ میں ۱۹۶۴ء کے بعد کسی مرد جاہل نے جعل کر کے دلگیر کا اسلامی نام غلام حسین لکھا ہے۔ راقم الحروف ۱۹۶۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ڈی لٹ کا کام کر رہا تھا اس نے اپنی آنکھوں سے ٹیگور لائبریری کے

میکرو فلم سیکشن میں خوش معرکۂ زیبا نسخۂ پٹنہ کی میکرو فلم دیکھی دلگیر کے ترجمے کے حاشیہ میں یہ عبارت صاف اور واضح ہے کہ:

"سابق میں میاں دلگیر ہندو تھے۔ ان کا
نام چھنولال تھا۔ جب سے مسلمان ہوئے اپنا
نام غلام حسین مقرر کیا۔"

گپتا صاحب اور ان کے "بزرگ محقق" کو معلوم ہونا چاہئیے کہ مصنف نے یہ اضافہ خود اپنے ہاتھ سے کیا ہے۔ دراصل ڈاکٹر شمیم صاحب حاشیے کی اس عبارت کو درج کرنا بھول گئے ہیں۔ جب راقم نے اس فاش غلطی کی طرف ان کی توجہ مبذول کی تو انھوں نے غلطی کا اعتراف کر کے اظہار افسوس کیا۔ گپتا صاحب اگر ڈاکٹر موصوف کے مطبوعہ نسخہ کا مختصر سا مقدمہ ذرا توجہ اور دلچسپی سے پڑھتے تو شاید اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے شمیم صاحب نے بغیر مبہم الفاظ میں حاشیے کی اس عبارت کو مصنف کے ہاتھ کی تحریر تسلیم کیا ہے۔ وہ خوش معرکۂ زیبا کے صفحہ ۴۷ کی ابتدا میں لکھتے ہیں کہ

"پٹنہ والے نسخے کی اہمیت اس باعث ہے
کہ اس پر حواشی میں احسان، اختر، امانت،
امیش، مظلوم، جرات، دبیر، میشر، شائق،
عشق، شہید، یاور، بحر، شوق، شجاعت، دلگیر
اور سالم وغیرہ کے حالات میں اضافہ بے
ماخذ لکھے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے
کہ یہ حواشی خود مصنف کے تحریر کئے ہوئے
ہیں یا کسی دوسرے شخص نے اضافہ کردیا
ہے۔ چند باتیں اس کی طرف صاف اشارہ
کرتی ہیں کہ یہ حواشی خود مصنف کے لکھے
ہیں۔"

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نسخۂ لکھنؤ کا سال کتابت ۱۲۶۰ھ ہے اور نسخۂ پٹنہ اس سے پیشتر کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا سال کتابت ۱۲۶۳ھ ہے۔ نسخۂ ہذا ۱۲۸۶ھ مطابق ۲ اگست ۱۸۶۹ء میں خرید اگیا تھا۔ صفحۂ اول پر درج ذیل ہے۔

"من تملیک محمد ارتضا حسین بن حیدر حسین خان
مرحوم و مغفور خرید شدہ بتاریخ ۲۲ ربیع الثانی
۱۲۸۶ھ بہ قیمت مبلغ ہفت روپیہ......
۲ ماہ اگست ۱۸۶۹ء خرید شدہ"

راقم الحروف کا دعویٰ ہے کہ نسخۂ پٹنہ کے حواشی مصنف کے ہاتھ کے اضافے ہیں اور یہ اضافے ۱۲۶۳ھ اور ۱۲۸۶ ہجری کے درمیان مصنف نے خود اپنی زندگی میں ہی کئے ہیں۔ گپتا صاحب نے دلگیر کے حاشیہ کا جو ۱۹۶۳ء کے بعد کا زمانہ تعین کیا ہے وہ لغو اور بے بنیاد ہے۔ اگر گپتا صاحب اور ان کے مخطوطہ شناس بزرگ بہ نظر تحقیق پسندی کام لیتے تو وہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی ناکام کوشش نہ کرتے۔ کاش وہ جناب قاضی عبدالودود جناب عطا کاکوی یا ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سے دس پیسے کا کارڈ لکھ کر دلگیر کے بارے میں دریافت کرتے۔

خوش معرکۂ زیبا کے مصنف سعادت خاں ناصر کے بیان کی تائید خود دلگیر سے بھی ہوتی ہے کہ وہ عہد غازی الدین حیدر کی ابتدا میں مسلمان ہو گئے تھے ۱۲۵۵ ہجری میں وہ محمد علی شاہ بادشاہ (متوفی ۱۲۵۸ھ) کی خدمت میں "عرضداشت منظومہ" پیش کرتے ہیں۔ اس کی تمہید میں کہتے ہیں کہ نواب سعادت علی خاں آرام گاہ (متوفی ۱۲۲۹ھ) کے عہد میں وہ "مداح شاہ" کے طور پر مشہور ہوئے تھے اور غازی الدین حیدر کے ابتدائی زمانے میں مسلمان ہوئے۔ عرضداشت میں انھوں نے اپنے کو بار بار غلام کہا ہے جو ان کے اسلامی نام "غلام حسین" پر دلالت کرتا ہے۔ چند شعر قابل ذکر ہیں:

ہوا میں جو مشہور مداح شاہ
کہ آگہ ہوئے جنت آرام گاہ
بس اکرکیا آپ نے سرفراز
دیا مجھکو ہم چشموں میں امتیاز

پڑھا جبکہ معروضۂ خانہ زاد
کرم سے کیا نام بندے پہ صاد
اسی طرح برسوں ملازم رہے
دُعاگو ہمیشہ یہ خادم رہے
زمانہ جو شاہِ زمن کا ہوا
مشرف باسلام بندہ ہوا
اسی سال میں نے لیا تعزیہ
نہیں میری اس عرض میں کچھ ریہ
سنا جبکہ حضرت نے یہ ماجرا
کیا شاد ہو کر اضافہ مرا
کئی سال بندہ وہ پایا کیا
مدام اپنے مصرف میں لایا کیا
جو نواب مرحوم آئے یہاں
پڑی مجھ پہ یہ گردش آسماں
کہ موقوف میرا اضافہ ہوا
بہت تب سے مقروض بندہ ہوا
سو بندہ بھی ہے اس کا امیدوار
نگاہِ کرم ہو ادھر ایکبار
ادا میرے سر سے ہو ہر ایک کا دین
نہ ہو ترک مجھ سے عزائے حسینؑ
کرے صدقۂ شاہ سے یہ غلام
عزاداری سبطِ احمد امام

عرضداشت دوم سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے دلگیر کو دو سو روپے عنایت کئے۔ شاعر کہتا ہے ؎

کہاں تک میں شکرِ عنایت کروں
زباں میں کہاں تک حکایت کروں
یہ دو سو جو مجھکو عنایت ہوئے
زیادہ یہ تھے مجھکو دو لاکھ سے
یہ جو کچھ کہ مجھکو عنایت ہوا
ہوا سب کا سب صرفِ بزمِ عزا

دلگیر عرضداشت سیوم میں بادشاہ کی قدردانیوں کا اعتراف یوں کرتے ہیں ؎

ہزار شکر مرا بخت نحس سعد ہوا
کہ قدرداں مرا چالیس سال بعد ہوا

گپتا صاحب اور ان کے "مخطوطہ شناس" بزرگ دوست اگر اب بھی دلگیر کے بارے میں بضد ہیں کہ وہ ہندو تھے۔ اور ہندو ہی مرے تو یہ عقل و دانش بہایدگریست کے مترادف ہوگا۔ گپتا صاحب فرماتے ہیں کہ اگر دلگیر مسلمان ہوئے ہوتے تو مصحفی اس کا ذکر کرتے۔ ان کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ مصحفی نے ریاض الفصحا سنہ ۱۲۳۶ ہجری میں لکھا۔ اصل بات یہ ہے کہ مصحفی نے یہ تذکرہ سنہ ۱۲۲۱ ہجری میں شروع کیا تھا اور اسے سنہ ۱۲۳۶ھ میں ختم کیا۔ بہت ممکن ہے کہ دلگیر کا ترجمہ سنہ ۱۲۲۱ھ یعنی آغازِ تذکرہ میں ہی لکھا گیا ہو۔ اس زمانے میں وہ طربؔ تخلص کرتے تھے۔

دلگیر نے بقول محسن لکھنوی (سراپا سخن ص ۱۱۵) اپنا دیوان لکھنؤ کے موتی جھیل میں ڈبو دیا تھا۔

گپتا صاحب اس پر بھی شک کرتے ہیں۔

جناب گپتا صاحب کے تحقیق و ذوقِ جستجو کی داد دیجئے فرماتے ہیں کہ

"راجہ میوارام جو ہندو تھے ان کے ہوتے ہوئے دلگیر کیسے مسلمان ہو جاتے؟ یہ بھی انکشاف کرتے ہیں کہ دلگیر نے راجہ میوارام کی بیوی کو بیگم کہہ کر اودھ کی تہذیب پیش کی ہے۔"

"وائے برما و گرفتاری ما"۔ گپتا صاحب کو یہ بھی نہیں معلوم کہ خود راجہ میوارام اور ان کی مہارانی مسلمان ہوگئی تھیں۔ میوارام کے والد کا نام نول کشن تھا۔ پہلے ہندو تھے جب مسلمان ہوئے تو اسلامی نام ہدایت علی خاں قرار دیا۔ بادشاہ نصیر الدین حیدر متوفی سنہ ۱۲۵۳ھ

نے عاک سے پاک کیا اور افتخار الدولہ کا خطاب دے کر اپنا دیوان مقرر کیا اور انعام میں تین لاکھ روپے بھی دئے۔
(تاریخ اودھ صـ۲۱۶ جلد چہارم نجم الغنی رامپوری) راقم کی دریافت ہے کہ پہلے دبیر مسلمان ہو گئے تھے اور بعد میں میوا رام۔ میوا رام تعزیہ داری ایام محرم میں صدق دل سے کرتے تھے۔ اور دو تین لاکھ روپے عشرۂ محرم اور آئمہ طاہرین کی وفات پر صرف کرتے تھے
(تاریخ اودھ صـ۲ جلد چہارم)

میوارام کے ایک ہم عصر مرزا محمد کاظم لکھتے ہیں کہ۔

"تعزیہ داری عشرۂ محرم ہزار ہا صرف می کردند
و دہ صد کس از ذاکرین در عشرۂ محرم در مجالس
مبین می داشتند و مجلس از اول شب شروع
می شد و آخر شب تمام می گردید۔ و بہ اکثر ذاکرین
مبلغ خطیر عنایت می شد و ذاکرین کربلائے معلیٰ
و حجاج و سادات و مومنین بتبرعات بسیار می
نمودند (رسالۂ سوانح عمری محمد کاظم صـ۱۸
مطبوعہ ۱۸۵۸ء)

میوارام تاریخ اودھ میں افتخار الدولہ کے خطاب سے ہی مشہور ہیں آخرکار کربلائے معلیٰ میں جاکر روضۂ اقدس کے کلید بردار ہوکر وہیں ۱۲۶۲ھ میں راہی جنت ہوئے (حیات دبیر صـ۸۵ ثابت لکھنوی) اور وہیں دفن ہیں۔ منیر شکوہ آبادی نے تاریخ کہی

سہ

افتخار الدولہ میوا رام مہراج زمن
والۂ نام علی و تابع شرع نبی
گنج ہائے شائگاں صرف عزاداری نمود
کس ندیدم ہم چو او در لکھنو را دو سخی
اکتساب دولت و حج و زیارتہا نمود
شد مقیم کربلا در خدمت سبط نبی
شہرہ شد او صاحب دریند و لزان و طرب
ذکر خیرش بر زبانہا ہم غنی و ہم جلی

در ثبات و صبر و تسلیم و رضا و احتیاط
از میان اہل ایماں بردہ گوئے فرخی
حالیا رخت سفر بربست در کرب و بلا
ساکن گلزار جنت گشت چوں سرو سہی
سال مرگ اندر صفائش نظم کردم اے منیر
دیں پناہ و صالح و زوار امیر و متقی
۱۲۶۲ ہجری (نظم منیر صـ۵۱۵)

غرضیکہ دونوں بزرگ یعنی صاحب اور مصاحب پہلے ہندو تھے، بعد میں مسلمان ہوئے اور مسلمان ہی مرے۔ راجہ میوا رام وطن سے دور کربلائے معلیٰ میں اور دبیر لکھنؤ میں بہ عمر ۶۹ سال ۱۲۹۲ ہجری میں انتقال کر گئے۔ نخاس کی ٹیڑھی قبر میں دفن ہیں۔ رشک لکھنوی نے تاریخ کہی سہ

در گلشن عشلد با جمیع شہدا
گشتہ پابوس مرثیہ گو دبیر
تاریخ وفات او نوشتم اے رشک
آہ افسوس مرثیہ گو دبیر

گپتا صاحب "صبح اُمید صـ۲۶" میں فرماتے ہیں کہ

"سارے ہندوستان میں ایک ایسی
مثال بھی پیش نہیں کی جاسکتی جہاں
کسی ہندو کے تبدیل مذہب کے بعد
اس کا اسلامی نام نہ رکھا گیا ہو"

گپتا صاحب کو یہ بھی نہیں معلوم کہ شاعر کو اپنے نام سے مطلب نہیں ہوتا ہے وہ تخلص سے مشہور ہوتا ہے بہت سے شعراء ایسے ہیں جن کے نام معلوم نہیں لیکن وہ تخلص سے ہی ہم تک پہنچے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ تبدیل مذہب کے بعد ہر ایسا آدمی نئے نام کی بدولت ہی یادگار رہے۔ اُردو شعراء میں کئی ایسی مثالیں ہیں کہ تبدیل مذہب کے بعد ان کا نیا نام معلوم ہی نہ ہوسکا بلکہ وہ تخلص سے ہی مشہور ہیں۔ کیا گپتا صاحب یہ بتا سکتے ہیں کہ آفتاب رائے رسوا جب

مسلمان ہوئے تو انھوں نے اسلامی نام کیا رکھا تھا۔ اسی طرح لالہ بال مکند تخلص حضور جب دل سے مسلمان ہوگئے تو کون سا اسلامی نام رکھا۔ اس قسم کی متعدد مثالیں دی جاسکتی ہیں کہ جن لوگوں نے تبدیلی مذہب کیا ان کا نیا نام معلوم نہیں ہوسکا۔

گپتا صاحب کو اپنے اور مخطوطہ شناس بزرگ محقق کے سوا ہر دوسرے کی بات جعل نظر آتی ہے۔ ان کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کہ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ وہ راقم کی تحقیقی کتاب منظومات میاں دلگیر کو بھی اپنی ہی طرح جعل سمجھتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ دلگیر کا یہ کہنا سے

زمانہ جو شاہ زمن کا ہوا
مشرف بہ اسلام بندہ ہوا

سفید جھوٹ اور الحاق ہے۔

جب تک گپتا صاحب دلگیر کے آبائی مذہب پر قائم رہنے کے ثبوت میں کوئی معاصر، ٹھوس اور مستند شہادت پیش نہیں کرسکتے راقم الحروف کا یہ کہنا حرف آخر ہے کہ دلگیر مسلمان ہوگئے تھے۔

اس بارے میں بقول میر

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

گپتا صاحب کی سخن فہمی طالب داد ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ شعر سازی بھی ہیں اور مقصد برآری کے لئے شعر کے الٹے سیدھے مطلب وضع کرتے ہیں۔ اس کی مثال میں ناسخ کا درج ذیل شعر پیش کیا جاتا ہے جو گپتا صاحب نے ماہنامہ "صبح امید" مطبوعہ مارچ سنہ ۱۹۵۷ء میں اپنی دلیل کے ثبوت میں نقل کیا ہے۔

متحد ایسے زمانے میں کہاں ہوتے ہیں
آپ دلگیر ہے ناسخ جو ہے دلگیر جدا

اس شعر کے معنی گپتا صاحب کی زبان سے سنئے اور لطف اندوز ہوجئے۔ فرماتے ہیں :

"اس شعر میں غریب الاستعمال لفظ "متحد" کے معنی سوا بھس کے اور کچھ نہیں کہ دلگیر ہندو مسلم تہذیب کے اتحاد کا نمونہ تھے

اور ہندو ہونے کے باوجود عہد کے منفرد مرثیہ گو تھے۔"

دراصل اس شعر میں تاریخ اودھ کے ایک اہم واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ نواب معتمد الدولہ آغا میر اودھ کے نامور وزیر رہ چکے ہیں۔ وہ ناسخ پر بڑے مہربان تھے جب آغا میر کے گھر سنیچر اترا اور وہ برطرف ہوئے تو ناسخ کہاں جاتے۔ انھوں نے نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کشمیری کے خوف سے راہ فرار اختیار کی۔ دلگیر کے ایک ہمعصر اور میر مشیر علی افسوس کے نواسے میر حسین علی تاسف نے اس کی تاریخ "قطعہ در تاریخ گریختن ناسخ از خوف آمد نواب منتظم الدولہ" کے عنوان کے تحت کہی۔ ذیل میں دو شعر پیش کئے جاتے ہیں سے

لکھنؤ سے آج بھاگا شیخ ناسخ بے حیا
ہے دبنگی جس کا جامہ خالی عار و ننگ سے
اس بھگوڑے کی تاسف کہہ یہ تاریخ گریز
دم کٹا بھینسا مگر یہ بچ گیا ہو رنگ سے

۱۲۵۳ھ

(دیوان تاسف قلمی کتاب خانہ راجہ صاحب محمود آباد)

دلگیر ناسخ کے شاگرد تھے اور ان کا کافی ادب کرتے تھے۔ اگرچہ وہ لکھنؤ میں ہی رہے۔

لیکن پھر بھی نواب منتظم الدولہ کے برسر اقتدار آنے پر حوادث زمانہ کے شکار بنے رہے۔ وہ پریشان حال رہے اور ان کا اضافہ بھی موقوف کیا گیا۔ اس بارے میں دلگیر کہتے ہیں سے

جو نواب مرحوم آئے یہاں
پڑی مجھ پہ یہ گردش آسماں
کہ موقوف میرا اضافہ ہوا
بہت تب سے مقروض بندہ ہوا

گپتا صاحب کی "صلاحیت شعر فہمی" کی داد ایک

اور مرتبہ دیکھئے۔ ان کی مثال غالب کے اس شعر کی آئینہ دار ہے ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

وہ دلگیر کے اس شعر کے معنی نہیں سمجھے ؎

مثالی شاہ نے بنیاد ہر دیر
نہیں آگاہ ہے شر سے بجز خیر

گپتا صاحب کی رائے میں اس شعر کی روشنی میں محمد علی شاہ بادشاہ کی رواداری میں فرق آتا ہے اور بقول ان کے وہ متعصب تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے گپتا صاحب شاعری میں بادہ و ساغر کی علامتیں نہیں سمجھتے ہیں۔ اس شعر میں بنیاد دیر مٹانے کے معنی یہ ہیں کہ محمد علی شاہ عادل و منصف تھے ان کے عہد میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پانی پیتے تھے۔ نہ معلوم وہ میر کے اس شعر کے کیا معنی سمجھتے ہیں۔

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

جناب راجہ صاحب محمود آباد کے کتاب خانے میں دیوان دلگیر کا ایک قلمی اور غیر مطبوعہ نسخہ محفوظ ہے۔ اس میں مثنویاں اور قطعات وغیرہ شامل ہیں یہ مجموعہ انھوں نے ۱۲۵۶ھ ہجری میں مرتب کیا تھا۔ راقم الحروف نے اسے "منظومات میاں دلگیر" کے نام سے سنہ ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔ گپتا صاحب اور ان کے مخطوطہ شناس استاد گرامی ایسے کلام دلگیر تسلیم نہیں کرتے ہیں بلکہ طوطی پس آئینہ کی طرح یہی رٹ لگاتے ہیں کہ یہ کسی جعل ساز نے اپنی طرف سے دلگیر کے نام ترتیب دیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ :۔

"کیا اکبر حیدری صاحب اس نام نہاد دیوان دلگیر کے مخطوطہ کو بمبئی یونیورسٹی، بھارتی ودیا بھون لائبریری یا کسی دوسری بمبئی کی لائبریری میں ماہرین کی جانچ کیلئے بھجوا سکتے ہیں۔ ماہرین کے مصارف اور مخطوطہ کے بحفاظت آنے جانے کے تمام مصارف میں برداشت کروں گا۔ اس طرح تھوڑے سے نقصان مایہ سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

گپتا صاحب سرمایہ کے سہارے ہی دن کو رات اور رات کو دن میں تبدیل کرنے کی امکانی کوشش کر رہے ہیں اس سے قبل انھوں نے اپنے مخطوطہ شناس اور بزرگ محقق کو لکھنؤ بھیجا تھا۔ انھوں نے اپنی طرف سے وکالت کی تھی لیکن چوں کہ مقدمہ ہی سست اور بے بنیاد تھا اس لئے وکیل صاحب اپنا سا منہ لیکر واپس چلے گئے۔

لکھتے لکھتے مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ آپ بھی سنئے :۔

"ایک دفعہ ہمارے ایک دوست نے ایک بنا سپتی وکیل کو اپنے مقدمے کے سلسلے میں مقرر کیا وکیل صاحب کا دل و دماغ اور کتاب خانہ چراغ مفلس کی طرح ہمیشہ بے نور رہتا تھا۔ اور بغیر کسی محنت اور مطالعہ کے بچارے مؤکل کو ادھر ادھر دوڑاتے تھے۔ آخر کار جب جج صاحب نے وکیل صاحب کو مؤکل کے سامنے برسر اجلاس انگریزی میں مقدمہ ہارنے اور خرچہ ادا کرنے کا فیصلہ سنایا تو وکیل صاحب کے چہرے پر مصنوعی بشاشت آنے لگی۔ عدالت کے باہر اپنے مؤکل سے کہا کہ گون اٹھاؤ مٹھائی اور انعام لاؤ مقدمہ جیت گئے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد بچارے مؤکل پر وکیل صاحب کا جعل کھل گیا اور راقم کے سامنے کہا کہ ہمارا مقدمہ بڑا مضبوط ہے۔ جتنا خرچ ہو گیا ہے وہ سب مل جائے گا۔ عدالت دستاویز کی شناخت اور جانچنے کے لئے باہر سے ماہرین بلوائیگی۔ تم بے فکر رہو۔ مقدمہ جیتنا بائیں ہاتھ کا کام ہے۔"

گپتا صاحب کو اب مخطوطہ شناس محقق یہی رائے دیتے ہیں کہ ماہرین کو مخطوطہ کی شناخت اور جانچنے کے لئے بمبئی طلب کیا جائے۔

بقیہ مضمون ص۳ پر

چھٹی قسط

سید صفدر حسین عابدی

سوانح حیات مانی جائسی

اور ہجر کا یہ سلسلہ تمام عمر قائم رہا جس وصل دائمی کا انھیں پورا پورا یقین تھا وہ ان کے حصہ کی بات نہ تھی۔ ان کے حصہ میں تو ہجر اور غم ہجر کا ماتم کرنا تھا ؎

باقی ہے شب ہجر تا سحر حشر
جس کی ہو یہاں صبح یہ وہ شام نہیں ہے

ہوش ہونے دو بجا ٹھہرو نکیرین اے ذرا
زیست کی ناکامیوں سے دل ہے گھبرایا ہوا

کیا کہیئے کس سے کہیئے کہیئے تو کون سمجھے
بس میں ہوں اور رونا حالِ دلِ حزیں پر

الغرض مانیؔ "حالِ دلِ حزیں" پر تمام عمر روتے رہے، روتے رہے، تڑپتے رہے، روتے روتے ایک منزل ایسی بھی آتی ہے کہ آنسو تھم جاتے ہیں۔ آہ و زاری، نالہ و فریاد کا سلسلہ رُک جاتا ہے، شدت غم سے انسان کو چپ سی لگ جاتی ہے۔ مانیؔ پر بھی وہی کیفیت طاری ہوئی ؎

احباب کو خوشی ہے کہ اب مجھ کو غم نہیں
روتے نہیں کہ دل ہی میں تاب الم نہیں

کیسے دعوے ہو کہ جوش اشک خونیں سیل دریا ہو
یہ عالم ہو کہ اب دو آنسوؤں کا بھی تو رونا ہو

مسکراتا ہوں مصیبت میں کوئی کیا سمجھے
یہ بھی اک شکل ہے ماتم کی تبسم تو نہیں

آنکھوں میں رکھ کے ایک متبسم نظر کو میں
رونا سکھا رہا ہوں دل فتنہ گر کو میں

غم و الم سہتے سہتے انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے اور بالآخر وہ ستم اس کے لئے ستم نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ یہ کیفیت مانیؔ کے دل ناکام کے ساتھ بھی پیش آئی۔ ان کا دل اس کا عادی ضرور ہو گیا لیکن عشق کی وہ تڑپ اور سوزش انھیں اس درجہ مرغوب ہے کہ وہ نہیں چاہتے کہ ان کی طبیعت ستم سے ساز باز کر لے اس لئے وہ اپنے محبوب کو کوئی نئی مصیبت ڈھانے کی ترغیب دیتے ہیں ؎

ذرا دشواریٔ منزل بڑھا دینا عنایت سے
ستم نے کر لیا ہے ساز اب میری طبیعت سے

آس و یاس اور امید و بیم کی منزل ہر انسان کی زندگی میں آتی ہے۔ وہ ان گوناگوں واقعات سے بڑی حد تک متاثر ہوتا ہے اور کبھی تو کوئی واقعہ ایسا بھی ہوتا ہے جو اس کے جوڑ جوڑ کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ بعینہٖ یہی صورت حال ہمیں مانیؔ کے یہاں نظر آتی ہے۔ عشق میں ان کی ناکامیابی اگر اپنی جگہ پر ناکامی ہی کی حد تک محدود رہتی تو زیادہ توجہ کی بات نہ تھی مگر اس ناکامی نے تو زندگی سے متعلق ان کے نظریات کو ہی یکسر تبدیل کر دیا تھا۔ زندگی ان کے لئے اپنی تمام تر عشوہ طرازیوں اور رنگینیوں کے بعد بھی ایک بے حقیقت چیز تھی۔ ان کی زندگی کا مقصد تو اس حسرت ناکام پہ رونا اور عہد وصل کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو بہانا تھا۔

فطرت انسانی کا تقاضا ہے کہ جب اس پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو وہ کسی عظیم تر ہستی کا سہارا ڈھونڈتی ہے

..... بجز ذات پروردگار کے سوا کسی کو سہارا دینے والا کوئی اور نہیں ہے چنانچہ حقیقت بھی یہی ہے کہ جب انسان دنیا میں مصائب و پریشان حالی کا مقابلہ کرتے کرتے تھک جاتا ہے جب اس کے بازوؤں سے قوت سلب ہو جاتی ہے، جب اسے اپنے تمام تر مقاصد میں کامیابی کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا تو اس مایوسی کے عالم میں وہ خدا اور صرف خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہی تصور اس کے زخم خوردہ مایوس و نامراد دل کے لیے مرہم کا کام کرتا ہے اور اس طرح اس کے قلب کو یکسوئی اور طمانیت میسر آجاتی ہے اور وہ پھر اپنی کوششوں میں ڈوب جاتا ہے۔

لیکن اکثر افراد شدائد و مصائب کے عالم میں جن نفسیاتی احساسات کا شکار ہوتے ہیں وہ یہ نہیں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا بلکہ وہ کوششوں کا تمام سلسلہ منقطع کرکے اپنی تقدیر پہ صابر و شاکر ہو جاتے ہیں۔ عمل کی قوت دھیرے گھٹ جاتی ہے اور وہ ہر آنے والی مصیبت کو قدرت کا عطیہ یا نوشتۂ تقدیر سمجھ کر جھیل جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہی کیفیت ہمیں فانی کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ عشق میں ان کی ناکامیابی نے انھیں تقدیر کا پابند کر دیا تھا۔ اب ان کے لیے ہر مصیبت دنیا کی ہر اذیت خدا کی طرف سے عطا کی ہوئی نعمت تھی یا بالفاظ دیگر تقدیر کا لکھا ہوا پورا ہو رہا تھا، جسے ہر حال میں جھیلنا از بسکہ انسان کے لئے لازم تھا۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق انسان عمل کی دنیا میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا وہ مجبور محض ہے، اُسے ہر ہر منزل پر مشیت پروردگار کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ انسان خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے مگر اس کی کسی کوشش کا کچھ بھی حاصل نہ ہوگا جب تک مرضیٔ الٰہی اس کے مطابق نہ ہو اس لئے انسان کے لئے زندگی میں کسی مقصد کی خاطر کوشش کرنا گویا بے سود ہے۔

۵

ہوئی ہو چارہ سازی منحصر دیدار جاناں پر
مشیت ہنس رہی ہو قسمت بیمار ہجراں پر

اپنے دل میں ڈھونڈھ لے مرغ چمن طرح بہار
رائیگاں سعیٔ تجسس میں پر پرواز ہے

اور جب ضبط غم کی کوئی انتہا نہ ہو، جب سینہ میں غم گھٹنے لگا ہو، جب کلیجہ پھنکا جا رہا ہو، جب زندگی دوزخ کے مانند ہو گئی ہو اس وقت انسان موت کی آغوش میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ فانی کی زندگی غم عشق اور اس کی محرومیوں کی بدولت ایک دہکتا ہوا انگارہ تھی۔ وہ جل رہے تھے، تڑپ رہے تھے۔ زندگی کی الم سامانیوں کا سلسلہ کبھی نہ ختم ہونے والا تھا۔ ایسی صورت میں ان کی تسکین و تسلی کا اگر کوئی ذریعہ تھا تو وہ موت اور صرف موت کا تصور ۵

پھر موت کیا بری ہے اگر زندگی میں ہو
فکر دوائے صبح و خیال دعائے شب

الٰہی مجھے موت خاموش کر دے
کہ پھر آج تاکید ضبط فغاں ہے

سکون دائمی کا انتظار ہے یہ زندگی
صلہ ملے گا یعنی ہم کو دل کے اضطراب کا

یاالٰہی رخصت پرواز پائے اب تو روح
آہ یوں تڑپا کرے کب تک بزیر دام ہجر

موت اک مژدۂ جاں بخش بنی جاتی ہو
کون دامن کی ہوا دینے لگا تم تو نہیں

مری ہر سانس گویا ایک گام سعی پیمائی
یہ میں جیتا نہیں مصروف ہوں قطع منازل میں

جس کے لیے زندگی، زندگی نہ ہو کر سکون دائمی یعنی موت کا انتظار رہ گئی ہو، جس کی ہر سانس زندگی کا ثبوت نہیں بلکہ موت کی منزلیں طے کئے جانے کا ایک مرحلہ ہو، "جو فکر دوائے صبح و خیال دعائے شب" سے تنگ آکر موت

کی تمنا بھی زندگی کا جال سمجھتا ہو۔ ظاہر سی بات ہے کہ زندگی اس کے لئے اپنا حقیقی مفہوم کھو چکی تھی۔ مآنی کا زندگی سے مایوس ہو کر فناسوں میں ہو جانا اپنے تمام حرکت و عمل کے سلسلہ کو مفقود کر کے موت کی آغوش میں پناہ لینے کی تمنا کرنا تو فطری بات تھی لیکن حیرت اس بات پہ ہے کہ ان کے کلام میں بکثرت ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جن میں زندگی کی بے پناہ تڑپ موجود ہے۔ جن کے مطالعہ سے زندگی کو ایک نوع کا حوصلہ ملتا ہے اور زندگی سے متعلق ایک رجائی پہلو پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے بیشتر مقامات پر اس طرح اظہار خیال کر کے گویا زندگی اور اس کی اُلجھنوں کا مقابلہ کرنے کی ناکام کوشش کی ہے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مشکلوں سے روح کو مانوس ہونا چاہیئے
زندگی دشواریوں ہی میں ہو آسانی کہاں

ہمت مردانہ و عزم مصمم چاہیئے
منزل آجائے گی دشواریٔ منزل جائے گی

تو ساتھ تھی اے ہمت مردانہ تو میں نے
کس منزل دشوار کو آساں نہیں دیکھا

سب کچھ اپنا ہو اگر ہو عزم مردانہ مرا
ساغر و مینا تو کیا ہو جائے کاشانہ مرا

کوشش سے منہ مت موڑ ہمت کا دامن مت چھوڑ
ورنہ مشکل ہو جاتا ہو ہر کام جو آساں ہوتا ہو

جب تھکوں گا یہیں ساحل بھی بنا لوں گا کہیں
بحر آفات کی ہر موج کنارہ ہو مجھے

جہد ہے رازِ بقا سعی ہو تقدیر حیات
زندگی کیا جو کوئی مطلب مشکل نہ رہا

رند نے سعی طلب سے اپنی پایا ہو یہ جام
ورنہ یوں ہاتھوں میں آتا ہو کہیں پیمانہ آب

کانٹے بچھے ہیں جادہ دشوار عشق میں
اچھا تو آج پاؤں بنا دوں گا سر کو میں

بظاہر یہ ایک متضاد سی بات ہے کہ کوئی شخص زندگی سے مایوس بھی ہو اور پُر امید بھی۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے ہمیں مآنی کے نہاں خانۂ دل کی سیر کرنا ہوگی۔ سالنامہ نقوش کے شخصیات نمبر میں کلب مصطفیٰ صاحب مرحوم کا یہ تجزیہ بڑا ہی وقعت انگیز ہے کہ "یہ خوش ہوں تو خفا ہونا بھول جائیں اور خفا ہوں تو خوش ہونا مشکل سے انھیں یاد آئے۔ اپنا کلام سُنانے کا شوق نہ ہونے پر بھی جی میں آجائے تو خود سُنا چلیں اور مڑک آجائے تو خوشامدوں اور التجاؤں پر بھی نہ سُنائیں' بے خبری پر اُتر آئیں تو اہل و عیال کی پروا نہ کریں اور باخبری کے عالم میں ہوں تو غیروں تک کے لئے پریشان رہیں۔ کسی سے محبت کریں گے تو والہانہ انداز میں اس کے ذکر میں رطب اللساں رہیں گے اور نفرت کریں گے تو نام تک زبان پر نہ آنے دیں گے"

مآنی کے مزاج کا یہی کامپلکس (   ) ان کے کلام میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ ان کے خیالات و نظریات میں تضاد کی اصل حقیقت ان کے مزاج کا یہی کامپلکس ہے۔ نظریات میں تضاد کی مثال کے بطور ذات پروردگار اور اس کی مختلف صفات سے متعلق اُن کے خیالات کا سرسری جائزہ لیجئے۔ عدل خداوندی سے متعلق ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں ؎

حشر ہے روزِ جزا لیکن یہ دیکھا ہو ضرور
کبر کی پاداش دنیا میں ہو اور فی الفور ہے

ضرور شان رحیمی پہ اعتقاد رہے
خدا رحیم ہے لیکن یہ بات یاد رہے

عبودیت سے تجاوز کبھی نہیں ہو روا
ہیں قہر و عدل بھی منجملۂ صفات خدا

شاعر اس حقیقت کو بصدق دل قبول کرتا ہے کہ خدا رحیم ہو' وہ عدل خداوندی کا قائل بھی ہے' جزا و سزا پر بھی اعتقاد

رکھتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بندگانِ خدا کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا بھی فرض عین سمجھتا ہے کہ عبودیت سے کسی بھی اعتبار سے تجاوز کرنا درست نہیں۔ خدا اگر رحیم ہے تو اس کے ساتھ ہی ساتھ قہار و جبار بھی ہے۔ وہ اگر نیک اور برگزیدہ بندوں پر رحم کرتا ہے تو متکبر اور سرکش انسان کو سزا بھی دیتا ہے۔

لیکن دوسرے ہی لمحہ مشیت پر طنز کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

ہوئی ہے چارہ سازی منحصر دیدار جاناں پر
مشیت ہنس رہی ہے قسمت بیمار ہجراں پر

چیخ اٹھتا ہے تڑپ جاتا ہے بے بس مظلوم
اور چپ محو تماشا ہے مشیت کیسی

اور ایک موقع تو ایسا بھی آتا ہے کہ جب قیامت جزا و سزا یہاں تک کہ ذات خداوندی پر ایک کے وجود پہ شک کی نظر ڈالتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

دل زار ہے اور آفت پہ آفت
کہاں ہے خدا اور تخت عدالت

واقعہ یہ ہے کہ ماتی مکمل طور پر جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ کوئی واقعہ یا حادثہ ذرا سی دیر میں ان کے شگفتہ دل کو کمھلا دینے کے لئے کافی ہے اور کبھی کوئی مژدۂ جانفزا ان کے مرجھائے ہوئے دل کے کھِل اٹھنے کا سامان فراہم کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں اگر ایک طرف زندگی سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ افزا نقطہ نظر ملتا ہے تو دوسری طرف زندگی میں ایک ہارے ہوئے جواری کی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔

ماتی کے بیشتر اشعار ان کی زندگی کے ترجمان ہیں۔ ان کی زندگی کے اکثر پہلو صرف ان کے اشعار کی روشنی میں سامنے آ سکتے ہیں۔ شعوری اور غیر شعوری دونوں حیثیتوں سے انھوں نے اپنی خزاں نصیبی اور ستم کیشی کی داستان بیان فرمائی ہے جس کو "داد عظیم"

نے ان کی ذات کو آتش سیال بنا رکھا تھا۔ اس کے سمجھنے کے لئے ان کے اشعار کی خاصی تعداد معاون و مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ بعض نظمیں اور کچھ اشعار تو ایسے ہیں کہ کوئی طالب علم ان کی سوانحی اہمیت سے صرف نظر کر ہی نہیں سکتا۔ ان اشعار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے اندر وہی تڑپ، وہی سوز و اثر موجود ہے جو عام طور پر ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اکثر اشعار میں غضب کا جوش اور گرمی پائی جاتی ہے۔ جذبہ کی شدت نے اکثر مقامات پہ باغیانہ روش اختیار کر لی ہے۔ ایسے ہی موقعوں پہ ہمیں ان کے یہاں ایک نوع کا عدم توازن نظر آتا ہے۔ غالباً جوشش وجذبہ کی فراوانی ان کے دل و دماغ کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے اور وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ میں کہہ کیا رہا ہوں۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں ؎

حیات و موت سے واقف نہیں مگر ماتی
کیا ہے مجھ کو محبت نے نوجوان برباد

مقدر جہاں ایک دن مجھ کو لایا۔ ملی تھی جہاں مجھ سے میری جوانی
وہیں سے ہے آغاز عہد تمنا۔ وہیں ختم تھی دنیوی زندگانی

یہ بند و بست بھی کچھ تو نے کر لیا صیاد
قفس میں آ نہ سکے باس کی ہوا صیاد
تھی ابتدائے بہاراں و فصل گل ماتی
کہ آشیاں مرا برباد کر گیا صیاد

اب تو شاید ہی مرے نغمے کسی کو یاد ہوں
کچھ نہ پوچھو مدتیں گزریں چمن چھوٹے ہوئے

ناحق احباب منافق مرے بدنام رہے
خود یہ تقدیر محبت ہے کہ ناکام رہے

باقی ماتی

اشتیاق احمد لاری

میر حسن کا انداز بیان اور محاکات آفرینی

(سحر البیان کی روشنی میں)

انداز بیان اور ندرت معانی

نہیں مثنوی ہے یہ اک پھلجھڑی
مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی
نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں
نہیں مثنوی ہے یہ سحر البیاں

میر حسن کی یہ رائے اپنی مثنوی کے بارے میں بالکل صحیح ہے شاعرانہ تعلی اور مبالغہ کے باوجود بھی یہ دعویٰ حقیقت سے خالی نہیں۔ میر حسن کی دائمی زندگی اور مقبولیت کا سبب سحر البیان کے انداز بیان، ندرت معانی اور محاکات آفرینی میں پوشیدہ ہے۔ میر و سودا کے عہد میں جبکہ اُردو زبان اتنی صاف اور فصیح نہیں ہوئی تھی، میر حسن نے نہایت صاف اور فصیح، بامحاورہ، سادہ اور شستہ زبان اپنی مثنوی میں استعمال کر کے اپنی زباندانی اور سحر بیانی کا اعتراف اہل زبان سے کرایا۔

محاورہ اور روزمرہ کی صفائی، سادگی اور سلاست کی وجہ سے سحر البیان کے اشعار آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں اور ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ مثلاً:

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
کٹی رات حرف و حکایات میں
سحر ہو گئی بات کی بات میں

کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں
سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

میر حسن نے جو محاورے استعمال کئے ہیں وہ آج بھی اسی طرح بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ یہ محاورے بڑی خوبی اور مناسبت سے استعمال ہوئے ہیں مثلاً

یہ عالم جو دیکھا تو غش کر گئیں
وہ جتنی کہ آئی تھیں سب مر گئیں

سنو جانی جو کوئی خود پہ مرے
تو دل پہلے اپنا بھی صدقہ کرے

گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل
نظر سے نظر، جی سے جی، دل سے دل

پسینا پسینا ہوا سب بدن
کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن

میں اس طرح کا دل لگاتی نہیں
یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں

روزمرہ بول چال میں میر حسن بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے کرداروں کے منہ میں ایسی زبان دیدی ہے جو اسی طبقہ کی ترجمانی کرتی ہے جس سے اس کردار کا تعلق ہے۔ اس گفتگو میں کہیں تصنع یا تکلف پیدا نہیں ہوتا۔ روانی اور سلاست ہر جگہ موجود ہے۔ نجومیوں اور پنڈتوں کی زبان سے وہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو یہ طبقہ استعمال کرتا رہا ہے۔

کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا
چندرماں سا بالک ترے ہو ئے گا
لگے ہیں اب تو خوشی کے بچن
نہ ہو گر خوشی تو نہیں برہمن
مہاراج کے ہوں گے مقصد شتاب
کہ آیا ہے اب پانچواں آفتاب
نجومی نے کی آپ کے یاوری
کہ آئی ہے اب پانچویں مشتری

بادشاہ، شاہزادے، شاہزادی اور وزیر زادی کے حسب مراتب الفاظ لائے گئے ہیں۔ فطریت اور سلاست ہر جگہ قلم چومنے کے لئے بے چین ہے۔ مثلاً

مرو تم پری پر وہ تم پر مرے
ذرا بس تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے
کہا مجھ سے پیاری نہ بیزار ہو
پھر آؤں گا، بولی کہ مختار ہو
مجھے جو چلے تو خوش آتے نہیں
ترے ناز بے جا یہ بھاتے نہیں

بادشاہ کی گفتگو وزیروں سے ملاحظہ ہو۔ متانت، سنجیدگی اور وقار اس میں موجود ہے جو بادشاہوں کے شایان شان ہے۔

کہ میں کیا کروں گا یہ مال و منال
فقیری کا ہے میرے دل کو خیال
بہت ملک پر جان کھویا کیے
بہت فکر دنیا میں سویا کیے

وزیروں کے جواب میں کتنی نیاز مندی، وفاداری اور ہمدردی ہے، ملاحظہ ہو۔

فقیری جو کیجئے تو دنیا کے ساتھ
نہیں خوب جانا ادھر خالی ہاتھ
مگر ہاں جو اولاد کا ہے یہ غم
سو اس کا تردد بھی کرتے ہیں ہم

شاہزادہ بے نظیر کے فراق میں جب بادشاہ کی حالت خراب ہو جاتی ہے تو اسے اس طرح تسلی دی جاتی ہے

کہا گو جدائی گوارا نہیں
ولیکن خدائی سے چارا نہیں
خدا جانے اب اس میں کیا بھید ہے
یہ کہتے ہیں جیتوں کو امید ہے

مکالموں کا یہ فطری انداز ہر جگہ موجود ہے۔ سوال و جواب برمحل اور باموقع۔ انداز و اسلوب کہیں شوخ کہیں سنجیدہ ماحول اور موضوع کے مطابق۔ مثلاً شاہزادے کی گمشدگی کے بعد محل کی لونڈیوں کا بیان نہایت سادہ اور فطری انداز میں کیا گیا ہے۔

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی
کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو
گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو

محاکات آفرینی

میر حسن کو انسانی جذبات، فطری کیفیات، محاکات اور جزئیات نگاری پر مکمل عبور حاصل ہے۔ ان کی نگاہیں بڑی دوربیں ہیں۔ کردار نگاری ہو کہ فطری مناظر کی تصویر یا انسانی فطرت کا بیان، وہ معمولی چیزوں پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور انہیں کام میں لاتے ہیں۔

میر حسن کی محاکات آفرینی پر مختلف نقادوں نے تنقیدی نظر ڈالی ہے اور سب نے ان کی فنی مہارت کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی فرماتے ہیں۔ "میر حسن کی اصل خصوصیت جو ہر جگہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے سیکڑوں چیزوں کا نقشہ کھینچا ہے اور مختلف مناظر کا سماں دکھایا ہے لیکن کسی موقع پر فطری انداز سے تجاوز نہیں کیا ہے بلکہ ہر جگہ فطرت کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

میر حسن نے بڑی عرق ریزی اور ذہنی کاوش کے بعد مثنوی تصنیف کی ہے اور ہر تصویر میں رنگ آمیزی ماحول اور پس منظر کے مطابق کی ہے۔ ان کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ نقادوں پر جو یہ

پڑتی ہیں تو اس سے "دوں دوں" کی آوازیں نکلتی ہیں۔ میر حسن نے اس کو بھی محسوس کیا ہے جس کا اظہار ان کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

کہا زیر نے بم سے بہر شگون
کر دوں دوں خوشی کی خبر کیوں نہ دوں

جب شاہزادہ بے نظیر غسل کرتا ہے اور اس کے تلوے سنگ پا سے مَس ہوتے ہیں تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے اور بے اختیار پاؤں کھینچ لیتا ہے۔ بالکل فطری تصویر ہے۔

ہنسا کھلکھلا وہ گل نو بہار
لیا کھینچ پاؤں کو بے اختیار
عجب عالم اس نازنیں پر ہوا
اثر گدگدی کا جبیں پر ہوا

کہاروں کو چلتے سب نے دیکھا ہوگا۔ مگر میر حسن نے انھیں کس طرح دیکھا! تیز قدم اور بے آواز

کہاروں کی زر بفت کی کرتیاں
اور ان کے دبے پاؤں کی پھرتیاں

جزئیات سے کام لیکر میر حسن نے محاکات میں جان ڈالدی ہے۔ تیز مشاہدہ اور زبان و بیان پر زبردست قدرت ہونے کی وجہ سے انھوں نے باغ، حوض، نہر، بہار، خزاں، خوشی، غم، جلوس کا منظر، غسل کا منظر، محل کی زندگی، کنیزوں اور باندیوں کی خوشی اور چھیڑ چھاڑ، پرستان کی سیر اور شادی بیاہ کے مناظر و رسومات کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ یہ تصویریں ایسی ہیں کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔

شاہزادہ بے نظیر کی ولادت کے بعد محل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ایک خوبصورت اور دلکش باغ کی تیاری کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس باغ کا نقشہ ملاحظہ ہو۔

بنی سنگ مرمر کی چو پڑ کی نہر
گئی چار سو اس کے پانی کی لہر
قرینے سے گرد اس کے سرو بھی
پھر اک دور دور اس سے سیب بھی

گلوں کا لب نہر پہ جھومنا
اسی اپنے عالم میں منھ چومنا
خراماں صبا صحن میں چار سو
دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بو
صدا قمریوں کی بلبلوں کا وہ شور
درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور

اور جب شاہزادہ غائب ہو جاتا ہے تو اس باغ کی رونق اور بہار کی رنگینی بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتی ہے اور وہاں دھول اڑنے لگتی ہے۔

اکڑ تا گئے سرو سب اپنا بھول
اڑانے لگیں قمریاں سر پہ دھول
ترانے سے بلبل کے جی ہٹ گیا
گلوں کا جگر درد سے پھٹ گیا
لب جو سے اڑنے لگی گرد گرد
گل اشرفی کا ہوا رنگ زرد
جہاں رقص کرتے تھے طاؤس باغ
لگے بولنے واں منڈیروں پہ زاغ

محض شاہزادے کی گمشدگی کی وجہ سے باغ کا یکایک اجڑ جانا دراصل انسانی فطرت کی ایک مخصوص کیفیت کو ظاہر کرتا ہے انسانی خوشی اور شگفتگی کی حالت میں اپنے گرد و پیش کے ماحول کو ہنستا اور رقص کرتے ہوئے دیکھتا ہے اور جب دل پر غم کے بادل چھائے ہوں تو وہی فضا اور ماحول سوگوار اور بے کیف نظر آنے لگتا ہے۔ میر حسن کی فطرت شناسی کا جوہر مثنوی میں کئی جگہ نظر آتا ہے۔

محل کی زندگی اور لونڈیوں کی شوخی کا منظر انھوں نے نہایت فطری انداز میں پیش کیا ہے۔ اولاد سے محرومی کے باعث بادشاہ کی قلبی کیفیت اور شاہزادے کی گمشدگی کے بعد اس کی طبعی رنجیدگی، شاہزادے کی فرقت میں بدر منیر کی حالت زار، نجم النساء کی شوخی اور چھیڑ چھاڑ، شاہزادے کا رہائی پانے کے بعد بدر منیر اور نجم النساء سے ملنا، بے نظیر کی واپسی پر بادشاہ کی خوشی اور محل میں چراغاں اور

زندگی میں ایک نئی مسرت آمیز لہر۔ ہر حالت و کیفیت کی تصویر انھوں نے ایک ماہر مصور کی طرح پیش کی ہے اور کہیں بھی واقعیت اور حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔

بدر منیر شاہزادے کی فرقت میں تصویر غم بن گئی اس کی بے چینی اور اضطراب کی کیسی فطری تصویر ان اشعار میں موجود ہے۔

دوانی سی ہر سمت پھرنے لگی
درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
خفا زندگانی سے ہونے لگی
بہانے سے جا جا کے رونے لگی
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا
نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے
محبت میں دن رات گھٹنا اسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو
تو اٹھنا اسے کہہ کے ہاں جی چلو
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی
یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
چمن پہ نہ مائل نہ گل پر نظر
وہی سامنے صورت آٹھوں پہر

رقص و سرود کی محفل میں وہ گائن کی ایک ایک حرکت پہ نظر رکھتے ہیں۔ طوائف کا بناؤ سنگار، آرائش و زیبائش اور اس کی ایک ایک ادا نگاہوں کو دکھا دیتے ہیں۔ بدر منیر عیش بائی کو گانا سننے کے لئے بلاتی ہے، ذرا اس طوائف کو دیکھئے، پیشہ ور ڈومنی کی تصویر ہے۔

عجب چال سے وہ چلی نازنیں
کہ مستی میں پاؤں کہیں کا کہیں
وہ خلقت کی گرمی وہ ڈومنی پنا
۔۔ میں گجھو کا سا چہرہ بنا

بندھا سر پہ جوڑا چڑی زر و شال
کمر کی لچک اور مٹک کی وہ چال
وہ اٹھی ہوئی چین پشواز کی
وہ مسکی ہوئی چولی انداز کی
چلی وہاں سے دامن اٹھاتی ہوئی
کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

بے نظیر کی ولادت سے محل کی زندگی میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ دائیاں اور مغلانیاں خوشی کے عالم اٹکھیلیاں کرتی پھرتی ہیں۔ محل کی بے فکر زندگی اور لونڈیوں کی طبعی شوخی کا انھوں نے بنظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ خوشی کے جذبات ان کا الھڑ پنا اور چھیڑ چھاڑ میں جو فطری شوخی ہوتی ہے اس کی تصویر کشی ان اشعار میں موجود ہے۔

وہ گھٹنا وہ بڑھنا اداؤں کے ساتھ
دکھانا وہ رکھ رکھ کے چھاتی پہ ہاتھ
کبھی منہ کے تئیں پھیر لینا ادھر
کبھی چوری چوری سے کرنا نظر
دکھانا کبھی اپنی چھب مسکرا
کبھی اپنی انگیا کو لینا چھپا
ادھر اور ادھر آتیاں جاتیاں
پھریں اپنے جوبن پہ اتراتیاں
بجاتی پھرے کوئی اپنے کڑے
کہیں واہ وا اور کہیں وا چھڑے
کہیں اپنے چٹے سنوارے کوئی
اری اور سہیلی پکارے کوئی

نجم النساء جب بدر منیر کو شاہزادے کے پاس لے جاتی ہے تو وہ شرم و حجاب سے سمٹ جاتی ہے۔ یہ عورت کی فطرت کا تقاضا ہے وہ پہلی ہی ملاقات میں غیر مرد سے نہیں کھل سکتی۔

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے
بدن کو چرائے ہوئے ناز سے

منہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے
لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے

اسی طرح سنسان جنگل، نور قمر، گانے بجانے کا عالم، رقص و سرود کی محفل، پرستان کا منظر، نجومیوں اور رمالوں کا بیان، محل کی زندگی، کنیزوں کی چھیڑ چھاڑ، باغ کا منظر، محبت کی گھاتیں، پیار کی باتیں، فراق کے جذبات، وصال کی سرشاریاں، شادی بیاہ کا منظر، بادشاہ کی سواری، صبح کا منظر، خوشی کے جذبات، غم کی کیفیات، آلات موسیقی، ملبوسات، زیورات اور نفسیات انسانی کی معمولی سی معمولی جزئیات پر بھی میر حسن کی دوربین نگاہیں پڑ جاتی ہیں اور وہ ان کی مکمل تصویر اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے ان کی زندگی اسی ماحول میں انھیں اشیاء کو پرکھتے اور بسر کرتے گزری ہے۔ خارجی حالات کا بیان ہو کہ داخلی کیفیات کا، ہر جگہ آمد و سلاست موجود ہے۔ آورد کا کہیں نشان نہیں اشعار ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ ہیں جیسے زنجیر کی کڑیاں۔

تخیل کی بلندی سے انھوں نے محاکات میں جان ڈال دی ہے، ہر جذبہ و خیال اور منظر کی حقیقی اور فطری تصویر پیش کر دی ہے زبان و بیان کی شگفتگی میر حسن کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے حصہ میں نہیں آئی وہ ایک تماشائی کی حیثیت سے عالم پر نگاہ نہیں ڈالتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر طبقہ اور ہر منظر کو نہایت قریب سے دیکھا اور زندگی انھیں کے مطالعے اور مشاہدے میں صرف کر دی ہے، جبھی تو کہتے ہیں ؎

زلبس عمر کی اس کہانی میں صرف
تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف

آزادی کی ۲۷ ویں سالگرہ کے موقع پر

حکومت اتر پردیش کا عہد

عوام کی خدمت کے لئے ایک صحت مند، چاق و چوبند اور مستعد نظم و نسق، پردیش کو سماجی اور معاشی اعتبار سے ترقی یافتہ بنا کر ریاست کے ساتھ وابستہ لفظ "پسماندہ" کو مٹا دینا۔

اس سمت میں حکومت کے کچھ ٹھوس قدم

- قانون دفاع ہند اور دیگر قوانین کے تحت ۴۴ ضلعوں میں ۱۴۳۴۳ چھاپے مارے گئے۔ ریاست بھر میں اسمگلنگ کی روک تھام کے لئے ۹۰ چوکیاں قائم کی گئیں۔
- محکمہ پولیس، تیسرے اور چوتھے درجہ کی سرکاری ملازمتوں میں ہریجنوں اور اقوام متحدہ فہرست کے لئے ۵۰ فیصد اسامیاں محفوظ۔
- ہریجنوں پر ظلم و تشدد کے معاملہ میں اب پولیس اور سول حکام سے جواب طلب کئے جانے کا بندوبست۔
- ایک ہمہ وقتی ڈپٹی انسپکٹر جنرل (برائے تحفظ ہریجن) کی تقرری۔
- ۵۴ لاکھ سے زیادہ کھیت مزدوروں کی کم سے کم یومیہ اجرت میں ایک روپیہ ۲۰ پیسہ کا اضافہ۔
- شکر ملوں کے ۹۰ ہزار مزدوروں کے مہنگائی بھتہ میں ۳۲ روپیہ ماہوار تک کا اضافہ۔
- چوتھے پنج سالہ منصوبہ کے اختتام پر ریاستی وسائل سے آبپاشی کی مجموعی صلاحیت ۶۵ لاکھ ہیکٹر ہو گئی۔
- چھوٹی آبپاشی اسکیموں کے تحت ۷۵-۱۹۷۴ء کے دوران ۱۴۰۰ ریاستی ٹیوب ویل، ۵۰۰۰ نجی ٹیوب ویل اور ۱۷۹۰۰ پمپنگ سیٹ لگانے کی تجویز۔
- پانچویں پنج سالہ منصوبہ میں ہینڈلوم صنعت کی ترقی کے لئے ۱۵ کروڑ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے جس سے امداد باہمی ہینڈلوم کپڑے کی پیداوار ۱۸ کروڑ میٹر سے بڑھ کر ۲۸ کروڑ میٹر ہو جائے گی۔
- ریاست میں سوت کی کمی کو دور کرنے کے لئے ۳۰ کتائی ملیں قائم کرنے کی تجویز جن میں سے آٹھ ملوں کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا ہے۔
- دیہی علاقوں میں روزگار کے تیز رفتار پروگرام کے تحت گزشتہ مالیاتی سال میں ۹۹۲۳۴ کیلومیٹر لمبی سڑکوں اور ۱۳۰۴ پلیوں کی تعمیر

یہ ہیں ہماری ہر دلعزیز سرکار کے بعض ٹھوس قدم

محکمہ اطلاعات، اتر پردیش کا جاری کردہ

اخلاق حسین عارف

قصائد

(فارسی قصیدہ کا مختصر تعارف)

کہا جاتا ہے کہ فارسی شاعری کا آغاز قصیدہ گوئی سے ہوا اور فارسی شعراء نے قدیم [illegible] گوئی میں عربی شعراء کی تقلید کی۔ قدیم عربی قصیدہ ایک مخصوص روایتی نظم کی حیثیت رکھتا تھا جو عربی تہذیب و تمدن کا آئینہ دار ہوتا تھا اگر اسے عرب کی "پبلک رجسٹر" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ فارسی شعراء نے عربی قصیدہ کی تقلید کی لیکن اسے صرف مدح گوئی کے لیے مخصوص کیا۔ عرب والوں نے قصیدہ کے حسب ذیل حصے قرار دیئے۔

(۱) تشبیب، قصیدہ کا ابتدائی حصہ جس میں عشقیہ اشعار ہوتے ہیں۔

(۲) تخلص، جسے گریز بھی کہتے ہیں۔ اس حصہ میں شاعر تمہید سے مدح کی طرف گریز کرتا ہے۔

(۳) مدح: ممدوح کے اوصاف و کمالات کا تذکرہ۔

(۴) دعا یا دعائیہ: اس حصہ میں ممدوح کے لئے دعا کی جاتی ہے اور اپنا مدعا بیان کیا جاتا ہے۔

فارسی شعراء نے بھی قصیدہ کی بنیاد انھیں اجزاء پر رکھی۔ عرب کا شاعر عام طور پر صلہ و انعام سے بے نیاز ہو کر صرف اس کی مدح کرتا ہے جو مدح کے قابل اوصاف رکھتا ہو اور تعلی اور غلو سے پرہیز کرتا ہے برخلاف اس کے فارسی قصیدہ ابتداء ہی سے صلہ و انعام کا اظہار کہا گیا۔

[illegible] عام طور پر [illegible] سب سے پہلا

قصیدہ گو شاعر کہا جاتا ہے جس کا ایک قصیدہ بہت مشہور ہے جس کا مطلع حسب ذیل ہے۔

اے رسانیدہ بہ دولت عرش خود تا فرقدین
گسترانیدہ بہ جود و فضل در عالم یدین

فارسی قصیدہ گوئی کے چار ادوار ہیں اور ہر دور جداگانہ خصوصیات کا حامل ہے۔ دور قدیم اس دور کے ممتاز قصیدہ گو شاعر عباس مروزی، رودکی، دقیقی، عمارہ مروزی، (شعرائے دور سامانیہ) عنصری، [illegible] مسعود سعد سلمان (شعرائے عہد سلجوقیہ) کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس دور کے قصائد میں عام طور پر لفظی صناعی اور صورت گری پر زور دیا جاتا تھا۔ سادہ خیالات سادہ لفظوں میں بیان کرنے کے باوجود اس بات کی کوشش کی جاتی تھی کہ الفاظ بیشتر ہم قافیہ ہوں مرادف الفاظ اور صنائع بدائع کا استعمال بھی عام تھا۔ رودکی کے قصائد میں واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کے مضامین کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ دقیقی نے مضامین فطرت کو بھی اپنے قصیدوں میں جگہ دی۔ عربی الفاظ کا کم سے کم استعمال بھی اس کی خصوصیت ہے۔ عمارہ مروزی پند و موعظت کے اور عبرت کے مضامین سے اپنے کلام کو سجاتا ہے۔

عنصری غزنوی دربار کا ملک الشعراء تھا وہ اپنی قصیدہ گوئی کے صلہ میں شاہانہ فیاضیوں سے اتنا مالا مال ہو گیا تھا کہ امراء میں اس کا شمار ہوتا تھا اور دوسرے شعراء خود اس کی مدح سرائی کرتے

تھے۔ وہ اپنے قصائد میں مختلف اشیاء کا باہم موازنہ کرتا ہے۔ کبھی قصیدہ کو سوال و جواب سے شروع کرتا ہے۔ واقعہ نگاری کا کام بھی قصیدوں سے لیتا ہے۔ مناظر قدرت کی تصویر کشی اور مختلف اشیاء کے اوصاف کا بیان بھی اس کے قصیدوں میں ملتا ہے۔ صنایع و بدایع کے استعمال اور مضمون آفرینی پر بھی اسے بڑی قدرت حاصل تھی حالانکہ وہ دور قدما کا شاعر تھا جس کی امتیازی خصوصیت سادگی تھی۔

فرخی کے کلام میں زبان کی صفائی اور سلاست و روانی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ واقعہ نگاری اس طرح کرتا ہے کہ واقعہ کی اصل تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ صنایع و بدایع کے استعمال پر بھی اسے قدرت حاصل تھی اور بدیہہ گوئی بھی اس کی خصوصیت تھی۔

عنصری کو بھی صنایع و بدایع کے استعمال کا بہت شوق تھا۔ واقعہ نگاری کی بھی مثالیں اس کے قصائد میں موجود ہیں لیکن بیشتر کلام ضایع ہوگیا۔

منوچہری نے دل کھول کر عربی قصیدہ گوئی کی تقلید کی۔ انھیں بحروں اور قافیوں کو استعمال کیا۔ عربی الفاظ اور فقروں کے استعمال پر بھی اسے بڑی قدرت حاصل تھی۔ برجستگی اور روانی بھی اس کے قصائد میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ مناظر قدرت کی تصویر کشی میں بڑی مہارت پیدا کی تھی۔ واقعہ نگاری میں نئے اسلوب پیدا کئے اور قصیدہ میں سراپا نگاری کا آغاز اسی نے کیا۔ اس کا ذہن تشبیہات کی ایجاد پر بہت مائل تھا۔

اسدی طوسی نے قصائد میں جدت کا راستہ نکالا۔ تشبیب میں مناظرات لکھے۔ وہ دو چیزوں کا باہم موازنہ کرکے دونوں کی طرف سے ترجیح کے دلائل پیش کرتے ہوئے مدح کی طرف گریز کرتا ہے۔ مضمون آفرینی کی طرف بھی مائل رہتا ہے۔

حکیم سنائی اگرچہ کہ ایک صوفی شاعر تھے اور مثنوی گوئی کے لئے مشہور ہوئے لیکن ان کے قصائد بھی پختگی، برجستگی اور صفائی کے لئے بہت ممتاز ہیں جن میں تمثیل نگاری کے بھی نمونے ملتے ہیں۔

امیر معزی نے قصیدہ گوئی میں عنصری اور فرخی کی اتباع کی کلام میں صفائی اور روانی بھی ہے۔

قطران کے قصائد بھی اپنی پختگی، روانی اور صفائی کے لئے مشہور ہیں۔ صنایع لفظی و معنوی کے استعمال پر اسے بڑی قدرت حاصل تھی۔ واقعہ نگاری اور مختلف اشیاء کا وصف بیان کرنے میں اسے بڑی مہارت تھی۔

دور متوسطین:۔ فارسی قصیدہ گوئی کے دوسرے دور کا آغاز انوری سے ہوتا ہے جس نے قدیم ڈگر سے ہٹ کر قصیدہ کے لئے نئی راہیں نکالیں۔ ہیئت اور موضوع دونوں ہی میں نئے تجربات کی بنیاد ڈالی۔ رعایت لفظی کی قدیم خصوصیات کی جگہ سادگی اور مضمون آفرینی پر توجہ کی۔ قصیدہ کی محدود دنیا کو نئی وسعتیں بخشیں، حکمت، ریاضی اور نجوم جیسے عالمانہ مسائل کو بھی قصیدہ میں جگہ دے کر اس کے علمی وقار کو بلند کیا۔ انوری عربی و فارسی پر یکساں عبور رکھتا تھا اور عربی الفاظ و فقرات اصطلاحات اور محاورات کو بے تکلفی کے ساتھ نظم کرنے پر قادر تھا۔

اس دور کے ممتاز قصیدہ نگاروں میں انوری کے علاوہ خاقانی، ظہیر فاریابی، ادیب صابر، جمال الدین اصفہانی، اندقی، ابوالفرج رونی، عبدالواسع جبلی، رشید وطواط اور کمال اسمٰعیل کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں جنھوں نے صنف قصیدہ گوئی کو بام عروج پر پہونچایا۔

خاقانی کے قصائد میں مختلف فنون کی اصطلاحات، تلمیحات اور اشارات بکثرت ہیں۔ واقعہ نگاری کے نمونے بھی اس کے قصائد میں بہت ملتے ہیں۔ مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ کئی کئی سو اشعار کے قصائد بے تکلفی سے کہتا ہے اور اس کی روانی میں فرق نہیں آنے پاتا۔ تشبیہات و استعارات کی جدت، نئی بندشیں، صنایع لفظی و معنوی، دقیق مضامین اور فکر کی بلندی اس کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ہجو گوئی پر بھی آمادہ ہوتا ہے اور اس کی دل آزاری ہوتی ہے

شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ظہیر فاریابی دقت پسندی اور مضمون آفرینی کے لئے مشہور ہے اس نے بندش میں چستی، بلندی اور زور پیدا کیا۔ زبان میں صفائی اور گھلاوٹ پیدا کی۔ نازک اور حسین تشبیہوں کی ایجاد اور نئی نئی تمہیدیں اس کے قصائد کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

ادیب صابر کے قصائد میں واقعہ نگاری کی مثالیں پائی جاتی ہیں اور اسے بھی اس عہد کے ممتاز شعرا میں شمار کیا جاتا ہے۔

ازرقی کے قصیدوں کا امتیازی وصف تشبیہات و استعارات کی ندرت اور تکلف و تصنع ہے۔

جمال الدین اصفہانی نے اپنے قصیدوں میں دنیا کی بے ثباتی کے مناظر حسین اور دلکش پیرایہ میں نظم کر کے قصیدہ کے موضوع میں وسعت پیدا کی ہے۔

ابو الفرج رونی اپنے انداز بیان کے لیے ممتاز ہوا انوری اور مسعود سعد سلمان جیسے بلند پایہ قصیدہ گو بھی اس کے کمالات کے معترف ہیں۔

عبد الواسع جبلی صنایع و بدایع پر زیادہ مائل نظر آتا ہے۔ لف و نشر اور صنعت اعداد کے استعمال کا اسے بہت شوق تھا پورے پورے قصیدے انھیں صنعتوں میں کہے ہیں اور زور بیان میں فرق نہیں آنے دیا۔

رشید وطواط خوارزم شاہی دربار سے وابستہ رہا جو سلجوقیوں کے حریف تھے۔ سلجوقیوں اور خوارزم شاہیوں میں جو مختلف جنگیں ہوئیں ان کے حالات پر تکلف انداز میں رشید نے اپنے قصائد میں بیان کئے ہیں۔ صنایع لفظی کے استعمال پر اسے بڑی قدرت حاصل تھی اور یہی اس کا پسندیدہ طرز بیان تھا۔

کمال اسمٰعیل ساتویں صدی ہجری کا ممتاز قصیدہ گو تھا اس نے قصیدہ میں نت نئے مضامین پیدا کئے۔ مشکل طرحوں [illegible] زبان کی [illegible]

دی اور ہجو میں ظرافت کو داخل کر کے اسے کارآمد بنایا ورنہ یہ شاعری کے لئے ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتی۔ دور متوسطین کی قصیدہ گوئی اسی پر ختم ہوتی ہے اور مجموعی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں قصیدہ کی دنیا وسیع ضرور ہوئی، اسے عالمانہ مضامین کے لیے استعمال کیا گیا۔ لیکن قصیدہ گوئی کی غرض مداحی اور صلہ و انعام کی طلب کے سوا اور کچھ نہ رہی۔

دور متاخرین

اسلامی دنیا میں تیموریوں کے خونی انقلاب اور اسلامی حکومتوں کی تباہی کے ساتھ ساتھ قصیدہ گوئی کی تاریخ میں ایک نیا باب کھلا۔ متاخرین کے زمانہ کا آغاز شیخ سعدی سے ہوا جو دراصل گیسوئے غزل کے سنوارنے والے تھے۔ لیکن انھوں نے قصیدہ گوئی کی تاریخ میں بھی ایک نیا انقلاب پیدا کیا۔ آزادی خیال، پند و موعظت، مبالغہ سے اجتناب، تربیت اخلاق، مناظر قدرت، شیخ کے عام موضوعات ہیں۔ پیرایہ ادا کے لحاظ سے بھی ان کے قصیدے لاجواب ہیں۔ دور متاخرین کے قصیدہ گو عام طور پر الفاظ کی شان و شوکت، ترکیبوں کی چستی اور جدت پسندی کے ساتھ ساتھ مضمون آفرینی پر مائل تھے۔ مبالغہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ تشبیہات و استعارات کا استعمال عام ہو گیا اور ہیئت و موضوع میں نئے نئے تجربات کئے جانے لگے۔

فارسی قصیدہ نگاروں کے تیسرے دور میں سعدی کے بعد امیر خسرو دہلوی، اوحدی، مرا غہ ای، خواجو کرمانی، ابن یمین، سلمان ساوجی، جامی، علی شیر، محتشم کاشانی، فیضی، عرفی شیرازی، نظیری، ظہوری، قدسی، صائب، طالب آملی اور کلیم ہمدانی کے نام قابل ذکر ہیں۔

امیر خسرو بلا کے بڑے ہی جامع کمالات کے بزرگ تھے۔ شاعر کی حیثیت سے غزل، قصیدہ، مثنوی میں کمال حاصل کیا۔ سعدی [illegible] خسرو کو بھی [illegible] وہ نہیں کہ قصیدہ کو کلاسیکی [illegible]

بنا دیا جائے اس لئے وہ دوسرے موضوعات مثلاً مناظر قدرت، اخلاقی تعلیمات اور پند و موعظت کو قصیدہ میں جگہ دیتے ہیں۔ تشبیہ و استعارہ کی ندرت اور زبان و بیان کی نئی نئی صناعیوں کے لیے بھی خسرو کے قصائد امتیازی شان کے حامل ہیں۔ سعدی کی طرح وہ قصیدہ کے شاعر نہیں ان کا اصل میدان تو غزل اور مثنوی ہے اور ان کا قول ہے کہ ؎

از گفتن مدح دل بمیرد شعرا چه تو [illegible] باشد

لیکن اس کے باوجود انھوں نے قصیدہ میں بھی اپنے کمالات کے اچھوتے نمونے پیش کئے ہیں۔

اوحدی مراغہ ای کے قصائد بھی اخلاقی تعلیمات سے بھرپور ہیں۔ تصوف کے خیالات بھی جا بجا موجود ہیں۔ خواجو کرمانی نے قصیدہ میں قدما و متوسطین کی پیروی کی ہے۔ ابن یمین نے بھی اخلاقی موضوعات کو اپنایا ہے۔ سلمان ساوجی قصیدہ گوئی کے آسمان پر ابھرے۔ زبان کی صفائی، سادگی، شستگی اور نئے نئے مضامین کی ایجاد کے لیے سلمان کے قصائد کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔ جامی کا مخصوص میدان مثنوی ہے لیکن قصیدہ کو بھی حمد، نعت، منقبت اور اخلاقی تعلیمات کے لیے استعمال کیا۔ علی شیر کو بھی اپنے اخلاقی قصائد کے لیے شہرت حاصل ہے۔ محتشم کاشانی نے قصیدہ میں نئی نئی تمہیدوں کا اضافہ کیا۔ فیضی نے قصیدہ کے لیے نئی نئی طرحیں نکالیں اور کئی کئی سو اشعار کہہ کر زور کلام کا مظاہرہ کیا۔ جوش بیان اور حسین تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ ثقیل عربی الفاظ کا استعمال اس کی خصوصیات ہیں۔ اکبری دور کے شعراء میں عرفی شیرازی کو قصیدہ گوئی میں امتیازی درجہ حاصل ہوا۔ مضمون آفرینی اور زور کلام نیز اپنے نئے لب و لہجہ کے اعتبار سے عرفی کو فارسی کے تمام قصیدہ نگاروں پر شرف برتری حاصل ہوا۔ وہ کبھی فلسفہ کے عمیق مسائل کو نظم کرتا ہے کبھی منظر کشی اور واقعہ نگاری کے بہترین نمونے پیش کرتا ہے کبھی ڈرامائی انداز بیان اختیار کرتا ہے کبھی مسلسل مضامین کے بیان سے قصیدوں کو سجاتا ہے کبھی اپنے زور بیان سے حریفوں کے چراغ گل کر دیتا ہو

کبھی تشبیہات و استعارات کی جدت اور نئی نئی ترکیبوں کا ایجاد پر مائل نظر آتا ہے۔ فخریہ نگاری میں اس کا کوئی جواب نہ تھا اپنے ذاتی اوصاف و کمالات کے بیانات کے ساتھ ساتھ حسب و نسب پر فخر و غرور بھی اس کا امتیازی وصف ہے۔ مضمون آفرینی، طرز ادا کی جدت اور اخلاقی مضامین کے بیان کے لئے عرفی کے قصائد بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ نعت و منقبت کے قصائد میں بھی اپنے فخر و مباہات کے بیان سے وہ گریز نہیں کرتا۔ علوئے ہمت اور خودداری بلکہ خودنگری کے مضامین عرفی سے بہتر کسی اور فارسی گو شاعر نے نہیں بیان کئے۔

نظیری در اصل غزل کا شاعر تھا لیکن شخصی حکمرانی کے دور میں اسے بھی قصیدہ گوئی سے مفر نہ تھا۔ بندش کی چستی، نئی ترکیبوں کی ایجاد، روزمرہ اور واقعہ نگاری کے نمونے اس کے قصیدوں میں بکثرت ملتے ہیں۔ طالب آملی دربار جہانگیری کا ملک الشعراء اور فیضی کا شاگرد تھا۔ ندرت تشبیہ، لطف استعارہ، واقعہ نگاری اور زود گوئی اس کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ صائب تبریزی جو صائب اصفہانی بھی کہلاتا ہے اپنی زود گوئی، فصاحت، روزمرہ اور تمثیل نگاری کے لئے امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ابو طالب کلیم ہمدانی کے قصائد میں غزل کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ مضمون آفرینی اور زبان کی صفائی بھی قصیدوں میں موجود ہے۔ مثالیہ نگاری اس کا امتیازی وصف ہے۔ ظہوری تخیل کی بلند پروازی پر مائل ہے، لفظی تراش خراش اور صنائع کے ساتھ ساتھ صفائی، پختگی اور روانی بھی اس کے قصائد میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ قدسی اپنی مضمون آفرینی کے لیے امتیازی مقام کا حامل ہے۔

دور جدید:۔

متاخرین کا زمانہ ختم ہونے کو پہونچا تو پھر قصیدہ گوئی کی تاریخ میں ایک نیا انقلاب آیا۔ قصیدہ گو شعراء نے متقدمین اور متوسطین کی اتباع شروع کی۔ یہ بارھویں صدی ہجری کا زمانہ تھا اور اصفہان اس تحریک کا مرکز بنا۔ سید علی مشتاق اصفہانی کو دور جدید کا سربراہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ انھوں نے پہلے پہل

ہم خیال شعراء نے عنصری، فرخی، منوچہری، خاقانی اور انوری کی طرز کو پھر سے زندہ کیا۔ دور جدید کے قصیدہ نگاروں میں مجمر اصفہانی، نشاط اصفہانی، صبا کاشانی، وحید وقار، ہزار محمود حکیم مرزا ابوالقاسم فرہنگ قائم مقام، مرزا حبیب قاآنی، سروش اصفہانی اور محمود خاں ملک الشعراء میں مرزا غالب دہلوی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مجمر اصفہانی نے انوری، خاقانی اور امیر معزی کی طرز پر قصیدے لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی۔ نشاط اصفہانی کے قصائد بھی قدما کی تتبع کے لئے مشہور ہیں۔ قدیم ادبیات فارسی کی تجدید کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ صبا فتح علی قاچار کے دربار کا ملک الشعراء تھا اسے بھی قصیدہ گوئی کے لئے شہرت حاصل ہوئی۔ احمد وقار، مرزا محمود حکیم اور مرزا ابوالقاسم فرہنگ مشہور شاعر وصال شیرازی کے ہنرمند بیٹے اور باکمال شاعر تھے۔ فرہنگ نے فرانس کے دارالسلطنت پیرس کی تعریف میں بڑے معرکہ کا قصیدہ لکھا جسے فارسی قصیدہ گوئی کی تاریخ میں امتیازی مقام حاصل ہے قائم مقام کے قصائد میں عصری حالات کا پرتو بہت نمایاں ہے وہ سیاسی تغیرات کو بھی بڑی کامیابی سے بیان کرتا ہے۔ انھیں دور جدید کے قصیدہ نگاروں میں مرزا حبیب قاآنی کا کلام اس اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ہے کہ اس نے زبان و بیان کی طرف سب سے زیادہ توجہ کی۔ قدرت الفاظ اور ندرت بیان میں قاآنی کو اپنے ہم عصر شعراء پر فوقیت حاصل ہے۔ تشبیہ در تشبیہ اور جزئیات کی تصویر کشی میں اسے کمال حاصل ہے۔ مناظر قدرت کے بیانات بھی اس کے کلام میں بکثرت ہیں۔ واقعہ نگاری ایسی کرتا کہ کوئی جزو باقی نہ رہ جاتا۔ صفائی، روانی اور پختگی کے لئے بھی اس کے قصاید اپنی مثال آپ ہیں۔ لفظی تراش خراش اور صنائع کے نمونے بھی جا بجا اور بکثرت ملتے ہیں۔

سروش اصفہانی اور محمود خاں ملک الشعراء کے قصائد بھی قدما کے طرز پر ہیں۔ ان میں مضمون آفرینی کی خصوصیات بھی موجود ہیں۔ ہندی شعراء میں مرزا غالب دہلوی نے بھی قصیدہ گوئی میں قدما اور متوسطین کی روش اختیار کی۔ جدت پسندی اور نکتہ آفرینی ان کا امتیازی وصف ہے۔ وہ عرفی کی طرح فخریہ اشعار بھی کہتے ہیں لیکن عام طور پر قصائد میں فلسفیانہ انداز رہتا ہے۔ مبالغہ آرائی کو انھوں نے آخری حدوں تک پہنچا دیا ہے اگر چہ الفاظ اور محاوروں کا استعمال بے تکلفانہ کرتے ہیں۔ پھر بھی زبان کی صفائی اور روانی قائم رہتی ہے۔

فارسی قصیدہ کی بنیاد حصول صلہ و انعام کے لئے مدح سرائی پر رکھی گئی تھی اور چند شعراء کے سوا مجموعی طور پر قصیدہ نگاروں کا یہی بنیادی مقصد رہا اسی لئے انیسویں صدی [illegible] شاہنشاہوں کا خاتمہ ہوتا گیا۔ مدح و تحسین ہی نہیں [illegible] بھی ختم ہو گیا اور رفتہ رفتہ یہ [illegible] ہو گئی۔

(طلباء کے لئے لکھا گیا)

بقیہ مضمون "ایسے محقق کا کیا کرے کوئی" صفحہ ۲۲ کا

بہر حال میں [illegible] گپتا صاحب کی اس پیشکش کو دل سے قبول کرتا ہوں اور انھیں ماہنامہ "ترنم" لکھنؤ کے ذریعہ مطلع کرتا ہوں کہ وہ جناب امتیاز علی خاں عرشی جناب [illegible] جناب مالک رام صاحب، جناب مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی جیسے محققین پر مشتمل ایک نشست کا انتظام کریں۔ راقم الحروف ماہرین کی اس کمیٹی کے سامنے جناب مہاراجکمار صاحب سے اجازت لیکر دیوان دگیر کا نسخہ پیش کرے گا۔ کمیٹی جو بھی فیصلہ دے گی مجھے وہ منظور ہوگا۔ میں گپتا صاحب کو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان کے جواب کا انتظار کروں گا۔

عابد ضمیر

حادثے زندگی کے

"آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہوا ہے بابو؟"

مدھم لیکن کھنکتی ہوئی آواز میرے کانوں میں گونج اٹھی میں اچانک چونک اٹھا اور چلتے چلتے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس سنسان گلی میں اور کوئی نہ تھا۔ صرف میں تھا اور میرے سامنے وہ تقریباً راہ روکنے کے سے انداز میں کھڑی تھی ـــــ ایک نوجوان اور الھڑ حسینہ، گداز جسم، مست شباب اور شرابی آنکھیں! اُن شرابی آنکھوں سے چھلکنے والی شراب نے مجھے بن پیئے ہی مدہوش کر دیا۔ میں نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں اور اُسے وقت بتاتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

تیسرے دن اسی گلی میں اسی وقت وہ پھر میری راہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ اتفاق سے اس دن بھی ہمارے آس پاس اور کوئی نہ تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک بوڑھی گائے آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی اور کچھ مزدور عورتیں گائے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"راستہ کیوں روک لیا؟"

میں نے اس کی مقناطیسی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"واہ بابو! اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے! راستہ روک کر مجھ ہی کو دوشی ٹھہراتے ہو!؟"

اُس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ کوئی دیکھ لے تو کیا کہے گا!؟"

میں نے سخت لہجے میں کہا اور اُس سے کترا کر نکل جانا چاہا۔ لیکن وہ پھر میرے سامنے آ گئی اور اس بار ہمارے درمیان اتنا کم فاصلہ رہ گیا کہ اُس کے جوان جسم کی خوشبو مجھے مدہوش کرنے لگی۔ اور میں اُس سے بچ کر آگے نکل گیا۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن سے آفس میں کام اتنا بڑھ گیا کہ میرے گھر آنے جانے کے اوقات میں بھی فرق پیدا ہو گیا۔ کئی دنوں تک اُس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں نے بھی اطمینان کی سانس لی کہ بلا ٹلی لیکن دسویں دن اُس سے پھر مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں نگاہیں جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ گلی پار کر رہا تھا۔ میرے آگے پیچھے کچھ بچے اور بوڑھے بھی گلی پار کر رہے تھے۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ اچانک سامنے آ کر راستہ نہ روک لے! لیکن آگے پیچھے کہیں اُس کی صورت دکھائی نہ دی۔ میں نے بے فکری سے گلی پار کر لی اور موڑ تک پہنچ گیا لیکن ابھی میں موڑ سے گزر ہی رہا تھا کہ کسی نے مترنم لہجے میں آواز دی ـــ

"بابو جی! آپ کی کتاب ـــ!"

میں نے مڑ کر دیکھا وہ اپنے دروازے پر کھڑی تھی۔ بہار پر خزاں کا سایہ پھیلا ہوا تھا۔ اُس کا گلاب جیسا شاداب چہرہ مرجھا گیا تھا۔ شرابی آنکھوں کے گلابی ڈورے کہیں اندھیرے میں گم ہو چکے تھے اور اُس کے انگ انگ میں تڑپتی ہوئی شباب کی بجلیاں خاموش تھیں!

"میری کتاب!؟"

میں نے اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں دبی کتاب کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ میں اُس کی ہوشیاری

اور عیاری پر دنگ رہ گیا۔

" ہاں بابو! آپ جب کل ادھر سے گزر رہے تھے تو یہ کتاب آپ کے بیگ سے نکل کر گر پڑی تھی!"

اُس نے میری طرف کتاب بڑھاتے ہوئے کہا۔ اچانک میرے ہاتھ کو جنبش ہوئی اور کتاب میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے کتاب کھول کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے چونک اُٹھا۔ کتاب کے اندر ایک لفافہ رکھا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔

" اِسے گھر لے جا کر پڑھیں!"

میں نے دل کی دھڑکنوں کو سمیٹ کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے رخساروں پر حیا کی سُرخی دوڑ گئی اور شرابی آنکھوں کے جام چھلک اُٹھے۔ میں کتاب لے کر آگے بڑھ گیا۔

گھر پہنچ کر میں نے بیتابی سے لفافہ چاک کیا اور خط نکال کر پڑھنے لگا۔ لکھا تھا ـــــ

" تم بڑے کٹھور ہو بابو! نہ جانے مجھے تڑپانے میں تمہیں اتنا مزہ کیوں ملتا ہے! آخر تم دس دن تک کہاں غائب ہو گئے تھے؟ تمہاری جدائی میں ایک ایک پل میرے لئے ایک ایک صدی کے برابر گزرا ہے۔ میری حالت اس مچھلی کی طرح ہو گئی تھی جسے پانی سے نکال کر خشکی پر تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہو۔ میں اپنی آنکھوں میں انتظار کے دیپ جلائے تمہاری راہ تکتی رہی اور تم نہ جانے کن وادیوں میں بھٹکتے رہے۔ جب تک تمہیں نہیں دیکھا تھا، تمہارے لئے میں اتنی بے چین نہ تھی۔ جب تمہیں پہلی بار دیکھا تو ایسا لگا جیسے تم اپنے اندر میرے روٹھے ہوئے دیوتا کو سمائے ہوئے ہو۔ تم سوچتے ہو گے کہ میں کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہوں۔ مگر میں سچ کہتی ہوں بابو! میں ایک ایسی پجارن کی مانند ہوں جس سے اس کا دیوتا روٹھ کر آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں کہیں کھو گیا ہو۔ تمہیں دیکھتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میرے من مندر کے دیوتا نے تمہارا روپ اپنا لیا ہو۔ تمہاری یاد میرے سپنوں میں بسی ہوئی ہے۔ تمہیں دیکھ کر اپنے ہوش کھو بیٹھتی ہوں اشوک! من کی گہرائیوں سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور بے اختیار تم سے لپٹ کر رونے کو جی چاہتا ہے۔ ڈرتی ہوں کہ کہیں تمہیں پھر نہ کھو بیٹھوں۔ تمہیں دس دنوں تک نہ دیکھا تو ایسا لگا جیسے میری روح کا کنول مرجھا گیا ہو۔ وعدہ کرو، اب تو مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ گے ـــ!؟

تمہاری پجارن

کویتا۔"

کویتا کا خط پڑھ کر اُس کی من موہنی صورت میری نظروں کے سامنے گھوم گئی۔ اُس کے پیار میں ڈوبے ہوئے الفاظ سے مجھ پر نشہ سا چھانے لگا۔ زندگی کی پرسکون جھیل میں ہلچل سی مچ گئی۔ من کا پیاسا پنچھی خوشی سے ناچ اُٹھا اور کسی کو پا لینے کی آرزو پوری ہوتی ہوئی دکھائی دی۔ میں اُسی وقت کویتا کے خط کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔

" کویتا! میری جان

تمہارا خط پڑھ کر میرے اوپر نشہ سا چھا گیا۔ لیکن تم نے مجھے اشوک کیسے سمجھ لیا!؟ میرا نام انیل ہے، اشوک نہیں! چھوڑو ان باتوں کو سچ تو یہ ہے کہ تم کسی کویتا سے بڑھ کر حسین ہو۔ تمہیں پا کر زندگی کتنی حسین ہو جائے گی! تم نے میرے دل کی بنجر زمین پر اپنے پیار کی بارش کر کے میری خشک اور ویران زندگی کو سیراب کر دیا ہے۔ آفس میں بے جان فائلوں کے درمیان گھرا ہوا میں بھی اپنے آپ کو بے جان سا محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن آج تمہارا خط پا کر اپنے اندر حرارت اور پیار کی گرمی محسوس کر رہا ہوں۔ آج زندگی کتنی رنگین اور پرکیف معلوم ہو رہی ہے! ایسا لگتا ہے جیسے اس شہر میں میرا ٹرانسفر تمہیں پانے ہی کے لئے ہوا ہو۔ مجھے تم جیسی ہی ایک چنچل اور حسین جیون ساتھی کی تلاش تھی جس کی معصوم اور کلیوں جیسی پاک مسکراہٹ روح کی ساری تھکن دور کر دے ـــــ پرسوں دہلی جا رہا ہوں۔ وہاں ہیڈ آفس میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں مجھے کچھ دنوں تک رکنا ہوگا۔ وہاں سے واپسی پر تمہیں دلہن بنا کر اپنے گھر لے آؤں گا! کہو اب تک خوش ہو؟ کیا شرما گئیں!؟

تمہارا اپنا ـــــ انیل!" ۔

دوسرے دن آفس جاتے ہوئے میں نے مڑا ہوا خط ہوشیاری سے کویتا کے ہاتھ میں تھما دیا اور آگے بڑھ گیا۔ شام کو واپسی میں اُس سے ملاقات نہ ہوئی کیونکہ اُس دن میں دوسرے راستے سے گھر واپس آیا تھا۔

اگلے دن میں نے [illegible] اسٹیشن بھیج دیا [illegible] کر رکھے۔

میں پیدل ہی چل پڑا تاکہ کویتا کا دیدار کرتا ہوا اسٹیشن پہنچ جاؤں۔ جب میں کویتا کے گھر کے نزدیک پہنچا تو اُس نے اپنی کھڑکی سے مجھے دیکھ لیا اور دروازہ کھول کر میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ جب میں اس کے سامنے سے گزرنے لگا تو اُس نے بے اختیار ہو کر میرا ہاتھ تھام لیا اور تقریباً چیختے ہوئے لہجے میں بولی ـــ

"انیل! مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ۔ وہ بھی ایک دن اسی طرح مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا اور آج تک واپس نہیں آیا!"

"وہ کون ـــ ؟"

میں نے اُس کی چھلکتی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ اسی وقت ایک بوڑھی عورت دروازے سے نکلتی ہوئی بولی ـــ

"انیل بابو! آپ میری لڑکی کی باتوں کا برا نہ مانیں ـــ جب سے [illegible] اس کا شوہر مارا گیا ہے یہ اُس کے غم میں پاگل سی ہوگئی ہے۔ آپ کی شکل اس کے شوہر سے ہوبہو ملتی ہے ـــ !"

نہ جانے وہ عورت کیا کیا کہتی رہی، میں آگے کچھ نہ سن سکا ـــ مجھے تو اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی تیز رفتار ٹرین چھک چھک کرتی ہوئی میرے اوپر سے گزر گئی ہو!!

بقیہ "آدھی رات" صفحہ ۴۵ کا

بستر تک پہنچا۔ لائٹ جلائی۔ ۔ ۔

پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ میں نے آنکھ بند کر لی روشنی کا دائرہ غائب ہوگیا۔ نقاہت اس قدر طاری تھی کہ بے سدھ کتنی ہی دیر تک بستر پر پڑا رہا۔

[illegible] کو پیش آئے برسوں گزر چکے ہیں۔ اب سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ رنج و اندوہ کا وہ احساس اس رات کس طرح میرے وجود پر چھا رہا تھا۔

یہ دراصل للی کے دل پر گزرنے ہوئے صدمے کا ایک پرتو تھا۔

بقیہ "شوق آخر" صفحہ ۴۲ کا

نماز عشق کو تم نے تو آسان سمجھا آخر
تجھے کرنا پڑے گا خون ارماں سے وضو برسوں

ابھی لوگوں کا اصرار دوبارا ہو رہا تھا کہ اندر حویلی [illegible] سکتہ کر گئی۔ طارق فوراً اندر گئے کچھ لوگ اور بھی دوڑے کسی نے آکر کہا بیگم طارق کی طبیعت خراب ہو گئی ہے، وہ بے ہوش ہو گئیں۔ میں ایک بار اور آخری بار [illegible] دیکھنا چاہتا تھا اس لئے حویلی میں داخل ہو گیا ـــ وہ بے ہوش ایک مسہری پر پڑی تھی ـــ چاروں طرف لوگوں نے بھیڑ لگا رکھی تھی میں بھی ان لوگوں میں شامل ہو گیا ـــ چند ہی لمحے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور میرے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا ـــ "خوش رہیے تو سدا یہ دعا ہے مری ـــ" اور پھر میرے آنسو اس کی یاد دیں ـــ میری تنہائیاں میری زندگی بن ـــ !!!

کامل حمیدی

سُونی نگری

میں آفس سے آکر تھک گیا ہوں، ایک کرسی پر نیم دراز پڑا ہوں. دوسری پر میرا پاؤں جما ہے پاؤں میں جوتا بندھا ہے. دکھساکسما کر پاؤں سسک رہا ہے اور بے چوں چرا جوتے کے ظلم سہتا جا رہا ہے، ٹیبل پر میگزین کا انبار بے ترتیب پڑا ہے. جس کو کئی روز سے دیکھ بھی نہیں پایا ہوں. "بیسویں صدی" کا ایک شمارہ اٹھا کر دیکھتا ہوں جس میں طارق کا ویڈنگ کارڈ پڑا ملا ہے. میں اسے بھول ہی گیا تھا. بھولوں کیوں نہیں زندگی نے یہ موقع کب فراہم کیا کہ خوشیوں کی برات کا ذہن میں ڈیرہ رہے. میری شادی بھی ہوئی ہوتی تو شاید میں بھی پہلی سالگرہ مناتا اس کی نئی زندگی کے آغاز کو ایک برس بیت چکا ہے لیکن کارڈ کے خدوخال اس کی چمک دمک کہتی ہے کہ شروعات ابھی ابھی ہوئی ہے. شاید بڑی محبت ہے دونوں میں. کیا میں تقریب میں شرکت کروں؟ طارق نے بڑی ضد کی ہے. اکثر میری تنہائی میں میرے قریب رہا ہے. بڑا پُر خلوص دوست ہے ابھی ابھی دو دن تو ہوئے ہیں بیگم کو مکان سے یہاں لایا ہے. میں جاؤں گا. باہر کھڑکی کھول کر وقت دیکھنا چاہا تو ہوا کا ایک تیز اور شریر جھونکا کمرے میں داخل ہو گیا. میرے رخسار کو چھو کر اسے آگے بڑھنا چاہیئے تھا لیکن اسے بھی میرا کھردرا اور کھوکھلا جسم بھا گیا ہے. میرے انگ انگ کو اپنی ٹھنڈک سے بھگونے لگا. باہر تاریکی اور بڑھ گئی سامنے اسٹریٹ لیمپ بھی روشن ہو گیا لیکن میں نے اپنے روم کو تاریک ہی رہنے دیا. کیونکہ میری زندگی کا ہر پہلو تاریک ہو چکا ہے. اب میرا ساتھی فقط میرا یہ کمرہ ہے جس میں اپنے راز کو چھپائے بیٹھا ہوں اکثر تنہائی میں میرا درد بھی بانٹ لیتا ہے (میں کسی سے اپنی مایوسی کا راز کہتا کیوں پھروں)

میری زندگی [illegible] زہر ہی زہر ہے. کبھی سوچتا ہوں زندگی سے فرار [illegible] لیکن ہر ارادے کے بعد نہ جانے کیوں مجھے ایسا [illegible] ہوتا ہے میری تبسم مجھ سے خفا ہو گئی ہے ایک پچتاوے [illegible] ہے ــــ عارف یہ تم کیا سوچ رہے ہو ــ [illegible] ساتھ مسکراتے تھے کیوں تم اوٹ پٹانگ سوچ رہے ہو [illegible] . . . .

تبسم ــــ! وہ بھی کتنی حسین شام تھی جب تمہاری قربت سے میری زندگی میں امیدوں کی کرن پھوٹی تھی، جو صلے پلتے تھے اور آج ــ ــــ ؟!

آج [illegible] ویران صحرا کے سوا کچھ بھی نہیں ــ میرا دل تمہاری [illegible] کھنڈر ہے ارمانوں کا شہر نہیں. ہائے وہ بیتے دن جب میں بی اے کر کے رانچی چلا آیا. یہاں میری گزر بسر کا [illegible] اٹھا لیا. پھر میں اس قابل بھی ہو گیا کہ تمہیں اپنے پاس بلا لوں [illegible] لیکن وہ جو کبھی میرا چمن تھا ویران ملا. میری تمناؤں کا مسکن اجڑ چکا تھا وہاں کے در و دیوار بے گانے بنے مجھے تک رہے تھے اس لئے کہ میری معصوم آرزو میرے دل کے نہاں خانے میں دفن ہو چکی تھی. تمہاری ڈولی میرے پہنچنے سے قبل دور بہت دور کسی کے گھر کی زینت بننے جا چکی تھی. میں بے بس لٹی مایوسی کی داستان اپنے سینے کے مدفن میں چھپائے ہارے جواری کی طرح واپس لوٹ آیا پھر نہ وطن کو مڑ کر دیکھا میرے پیار کی اجرت تمہاری جدائی کا کرب ہے. اور تمہاری ہی یادیں میرے جیون سہارا بھی ــــ

تم ——— اس وقت بہت یاد آ رہی ہو لیکن میں کس کو اپنا دکھ سناؤں۔ آج نہ جانے کیوں سوچ رہا ہوں کہ اگر میں تم سے کبھی نہ ملا ہوتا تو جدائی کا یہ غم میرے وجود پر تاریکیاں نہ بکھیرتا۔ میری رگوں میں نامرادیوں اور ناکامیوں کا زہر نہ بھرتا۔ یہ وقت جو آج رک سا گیا ہے، یہ ہوا جو تھم سی گئی ہے یہ فضا جو غم کے آنسو برسا رہی ہے، یہ بہار جس کی گود میں خزاں ہمک رہی ہے اور میری زندگی کی راہوں پر نوکیلے زہریلے کانٹے بچھا رہی ہے۔ یہ سارا ماحول جو اشکبار سا ہو گیا ہے۔ میری زندگی میں نہ آتا۔ یہ غموں کے داغ میرے دامن پر نہ پڑتے میرے دل کا آبگینہ تمہاری جدائی کے سنگ ریزوں سے یوں پاش پاش نہ ہوتا یہ دل کا آئینہ یوں نہ ٹوٹ جاتا اس آئینہ پر منقش تمہارا عکس جمیل اتنا دھندلا اس قدر گدلا تو نہ ہوتا۔ میرے ارمانوں کی کشتیاں اس طرح جل کر راکھ تو نہ ہوتیں میں یوں لٹا لٹا سا نیم وحشی بنا اپنی حیات کو کھو بیٹھنے میں نہ لگ گیا ہوتا۔ پیار کا محل ریت کے تودوں پر کیوں بنایا ——؟ ہرا بھرا پیار کا چمن یوں دیکھتے دیکھتے نذر آتش ہو گیا۔ تمہارا ایک ایک رسیلا بول جو میرے کانوں میں شہنائیاں بجایا کرتا تھا آج وہی راگ سوگ سے بھرپور ہو گیا اور میرا وجود خلش سے لبریز ہو گیا ——!!!

میں کیا کروں ان دلنواز لمحوں کو جن کی سانسوں میں تمہاری خوشبو رچی بسی ہے۔ میں کہاں بھاگوں ان حسین شاموں کے تصور سے جن کی دھڑکنوں میں تمہاری آنکھوں کا جادو جاگ رہا ہے۔ میں کیسے دامن بچاؤں ان چاندنی راتوں کے سحر سے جن میں تمہارے صندلی بدن کا لمس گھلا ہوا ہے۔ میں اپنے دل کی دھڑکنوں سے تمہارے نام کی تکرار کیسے مٹا دوں۔ میں کیسے بھول جاؤں کہ میں تم سے کبھی ملا تھا ——!

اُف میں یادوں کے کھنڈر میں کہاں سے کہاں بھٹک گیا۔ طارق میرا انتظار کرتا ہو گا۔ عجیب وحشی ہوں میں ۔۔ اس خیال نے جلدی جلدی کمرے کو بند کر کے طارق کے ڈیرہ کی طرف بھاگنے کو مجبور کر دیا۔ طارق دروازے پر میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر دوڑتا آیا۔ مجھ سے شکوے کرتا ہوا مجھے گھسیٹ کر ایک بڑے سے کمرے میں لے گیا۔ وہاں کئی پہچانے اور انجانے لوگ میرے منتظر تھے۔ طارق تمام لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "یہ میرے خوش گلو دوست عارف ہیں۔ جن کے متعلق ان کے آنے سے قبل بتا چکا ہوں آپ لوگ اب دستر خوان کی طرف آئیں" ۔۔ انہیں لوگوں میں سے کسی نے کہا۔ "بھابھی کے بغیر دستر خوان کی طرف کون جائے؟" یہ سن کر طارق نے پردے کے اندر جھانک کر کہا۔ "سنتی ہو دوستوں کا اصرار ہے تمہیں سر دست ادھر ہی ہونا ہوگی" ایک مدھم سی سریلی آواز آئی: "جی اچھا" پھر طارق نے کہا اب تو آجایئے وہ تو آئیں گی ہی۔ سب لوگ دستر خوان کی طرف بڑھے اپنی اپنی جگہ لیکر بیٹھ گئے۔ مجھے طارق نے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ چند منٹوں بعد وہ آگئیں۔۔ سب لوگوں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ میری جرأت جانے کہاں کھو گئی۔ میں شاید تبسم کے خیالوں میں گم ہو گیا تھا۔ لوگ طارق کو خوب خوب دعائیں دے رہے تھے اور بھابی سے پوچھ رہے تھے اپنی ساری خوبصورتی آپ نے کہاں سے چرائی۔ ایک ترنم پھوٹا۔ بس وہیں سے جہاں سے آپ اس سے قبل لوٹ چکے تھے؟ میں آواز سنکر چونک پڑا۔ یہ تو میری پہچانی ہوئی آواز میری تبسم کی ہے۔ شکل بھی وہی ۔۔ میں گلا پھاڑ کر چیخنا چاہتا تھا اس سے میری نظریں ملیں وہ کانپ سی گئی تھی۔ وقت کی نزاکت دیکھ کر خون کے گھونٹ پی گیا ۔۔ وہ ابھی آئی کہہ کر ہال سے کمرے میں چلی گئی اور پھر نہ آئی۔ پارٹی کے اختتام پر طارق نے کہا۔ عارف وہ غزل جو تم برابر گنگناتے ہو "لہو برسوں" ذرا ان لوگوں کو بھی سناؤ۔ خود مجھے ایسا محسوس ہوا تھا شاعر نے صرف میرے لئے یہ غزل کہی ہے۔ تمام لوگوں کے اصرار پر میں غزل سنانے لگا۔

سراپا جستجو بن کر پھرا ہوں کو بہ کو برسوں
بہا ہے چشم خوں آلود سے دل کا لہو برسوں
بس اک موہوم سا سایہ رہا کرتا ہے نظروں میں
نہ جانے کون تھا جس کی رہی ہے جستجو برسوں
جنوں بدنام ہے لیکن حقیقت یہ ہے دنیا میں
خرد نے ہی بہایا ہے زندگانی کا لہو برسوں

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

ایس ایم عابد نقوی
لندن

آدھی...... رات

رات انتہائی سرد اور تاریک تھی۔ کہر کی چادر نے ہر شئے کو نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ فضا پر سناٹے اور تاریکی کی حکمرانی تھی۔ میں "اسکاٹ لینڈ" سے بذریعہ کار ایک ضروری کام سے "نیوکاسل" جا رہا تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے جب "اسکاٹ لینڈ" سے "ایڈنبرا" کے آدھے راستہ پر آ چکا تھا۔ ہلکی ہلکی دھند اس وقت بھی فضا پر مسلط تھی جو کہ گہری ہوتی جا رہی تھی عالم یہ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ حماقت کہیے یا جلدی...... کہ میں جلد پہنچنے کے خیال سے "ہائی وے" چھوڑ کر ایک ایسے راستہ پر مڑ گیا جس کے متعلق سن ضرور رکھا تھا مگر سفر کرنے کا پہلے کبھی اتفاق نہ ہوا تھا اپنی اس غلطی کا احساس مجھے جلدی ہی ہو گیا تھا سڑک بے حد پتلی اور پیچیدہ تھی دور دور کسی لیمپ پوسٹ کا نام و نشان نہ تھا۔ دھند کا یہ عالم تھا کہ تاریک سے تاریک اور گہرے سے گہری ہوتی جا رہی تھی۔ دور نزدیک کسی کسی آبادی کا پتہ نہ تھا اور اگر تھا بھی تو کہیں اور تاریکی کی سیاہ چادر نے اسے نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ سنسان اور تاریک رات انجان راہ اور گاڑھی سیاہ دھند میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہنے کی وجہ سے سر درد کرنے لگا تھا۔ کار دس گیارہ میل کی رفتار سے رینگ رہی تھی۔

رات کا ۱ بج چکا تھا ابھی آدھا راستہ بھی نہ طے کر پایا تھا مجھے رہ رہ کر اپنی حماقت پر غصہ آ رہا تھا لیکن اس بھیانک اور سنسان مقام سے نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی ایسے میں کوئی شخص بھی میری اس راحت اور خوشی کا اندازہ بخوبی کر سکتا ہے جو کہ مجھے اس چھوٹی سی سرائے کے یکایک نظر آ جانے پر ہوئی سفر اگلی صبح تک ملتوی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور میں نے کار روک لی۔

وہ سرائے چھوٹی...... مگر نہایت صاف ستھری اور گرم تھی...... سرائے کا مالک ایک بوڑھا پر شفقت اور باتونی آدمی تھا ہم جلد ہی بے تکلف ہو گئے اور کھانے کے دوران مختلف موضوع پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔

میں پورے دن کا تھکا ہوا تھا اس پر مسلسل "دو گھنٹہ" کی دماغ سوزی سے طبیعت پر سستی اور کسلمندی سی طاری تھی۔ میں سن رہا تھا بوڑھا بول رہا تھا...... نہ جانے کس وقت موضوع بدل کر بھوت پریت پر آ گیا تھا......

شاید تمہیں بھوتوں پر یقین نہ ہو! مجھے بھی نہ تھا مگر اس سرائے کو خریدنے کے بعد سے مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی..... بوڑھا کہہ رہا تھا ..

کیوں اس سرائے میں کیا ہے...! میرا شوق تجسس جاگ اٹھا... کسلمندی، سستی دور ہو گئی اور میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ بھوتوں کی کہانی کو میں نے وہم و گمان سے زیادہ کبھی اہمیت نہ دی کہ نہ ہی اپنی زندگی میں کبھی میرا اور کسی بھوت کا آمنا سامنا ہوا... بھوتوں کی کہانیاں میں بڑے شوق سے سنتا لیکن اس یقین کے ساتھ کہ یہ سب فرضی اور من گھڑت داستانیں ہیں۔

"۳ ماہ" قبل کے بھوت نے اس سرائے اور اس کے آس پاس کے رہنے والوں کو بھوتوں کے وجود کا یقین دلا دیا ہے میرے استفسار پر بوڑھے نے کہا۔

"یہ بہت پرانی کہانی ہے اس سرائے میں تقریباً

سمجھ لیجئے وہ لاوارث تھی اس کا نام کیارلی تھی۔ سرائے ہی کے ایک کمرے میں وہ دُکّی اور لڑکیوں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ نام تو اسکا کچھ اور تھا مگر لوگ اسے قلی کہہ کر پکارتے تھے... تھی بھی وہ قلی کے پھول سے زیادہ نازک وحسین۔ چھریرا جسم لمبے سنہرے بال اور مور جیسا معصوم چہرہ اپنی سنجیدہ طبیعت شائستہ اطوار رکھ رکھاؤ کے باعث وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی تضحیک کا نشانہ بنی رہتی۔۔ سرائے کا گندہ ماحول گاہکوں کی بے باک نظریں اور ساتھ کام کرنے والوں کا طنزیہ سلوک ان سب نے مل کر قلی کو اپنی زندگی سے بیزار کر دیا تھا وہ فرار ہونا چاہتی تھی۔۔ اپنے ماحول سے فرار، مگر جاتی کہاں؟ کتنے آوارہ لوگ اس کے پیچھے لگے دھمکیاں دیں اپنی محبت جتائی مگر وہ لاوارث لڑکی۔ بے سہارا، نہ پیسہ پاس، نہ کوئی سرپرست پھر بھی کسی کے فریب میں نہ آئی۔

لیکن دنیا میں جو کچھ اسے چاہیئے تھا پیار کے دو بول۔۔ وہ بھی بولنے والا کوئی نہ تھا زندگی یونہی گذارتی رہی۔ ایک رات ایک خوش پوش نوجوان سرائے میں داخل ہوا نووارد کے چہرے کی شرافت اور اعلیٰ پوشاک اس کے ضامن تھے کہ وہ کسی نہایت اونچے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔

اس رات کے بعد وہ نوجوان ہر رات آتا رہا قلی کو اس سے دلچسپی بڑھتی گئی۔ ملاقاتیں ہوتی رہیں زندگی میں پہلی مرتبہ قلی کو کسی کے برتاؤ میں حقیقی خلوص نظر آیا۔ نہ جانے دل میں کیا کیا امیدیں باندھتی رہی یہ نہ سوچا کہ کبھی محل میں ٹاٹ کا پیوند لگا ہے؟

لوگوں کی طنزیہ باتوں اور آوارہ لوگوں سے تنگ آ کر دل کی بات زبان پر لے آئی۔۔ میں شادی کرنا چاہتی ہوں کب تک انتظار کروں؟

جلد ہی قلی بہت جلد۔۔۔ یہ سن کر وہ یقین کر لیتی اور خاموش ہو جاتی دن گذرتے رہے اور ایسا وقت بھی آیا کہ نوجوان نے آنا بند کر دیا اس کی محبت ... ملاقاتوں کے چرچے سرائے کے ہر شخص کی زبان پر آنے لگے۔۔۔ زندگی کی پہلی اور آخری خواہش کا یہ انجام ہوگا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی اب وہ پہلے سے خاموش اور دکھی رہنے لگی ہر ایک سے دور۔۔ دور... لاتعلق۔

سوچا کرتی زندگی میں کوئی ہمدرد نہیں... کیا انسانیت ختم ہوگئی؟ پھر صبر و شکر سے اور شکستہ دل سے اپنے کام میں لگ جاتی.... اور اس کی آنکھیں اس نوجوان کا انتظار کرتیں اور مایوس ہوتی لوگ تاڑ جاتے....

ایک دن اسے اسی نوجوان کا خط ملا۔ اپنے اتنے دن نہ آنے کی معذرت اور اسے ہدایت کہ وہ ہفتہ کی رات گیارہ بجے سڑک کے موڑ پہ ملے۔۔ پھر وہ چرچ جا کر دنیا کی نگاہوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے اس کے سوکھے کھیتوں میں پانی بھر گیا۔ فصل بہار پھر سے آگئی وہ خوشی میں جھوم اٹھی۔۔ ابھی ہفتہ میں تین دن باقی تھے یہ سوچ سوچ کر وہ خوشی سے ناچنے لگی راتوں کو جاگ جاگ کر عروسی کا جوڑا تیار کرتی اور دن بھر کام میں مصروف رہتی۔ ہفتہ کی رات بھی آ ہی گئی۔۔۔۔

ساتھیوں کی دبی دبی ہنسی اور آنکھوں میں چھپی شرارت کو نظر انداز کرتی وہ وقت سے پہلے ہی آنے والے خطرے سے بے خبر سڑک کے موڑ پہ پہنچ گئی۔

رات اندھیری تھی ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی طوفان کے آثار تھے۔ ہوائیں تیز چل رہی تھیں۔ لیکن وہ ان باتوں سے بے نیاز دل میں امنگیں لئے انتظار کر رہی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار اب بارش میں تبدیل ہو چکی تھی۔۔ مگر جس کا انتظار تھا نہ آیا۔ وہ بارش میں کافی بھیگ چکی تھی رات کافی گذرنے کے باوجود وہ انتظار کرتی رہی۔

اتنے میں اس نے دیکھا کہ دور سے کسی کے کار سے اترنے کی آواز آئی اور وہ آواز اس کے قریب بڑھتی رہی وہ خوشی خوشی موسم کی تکلیف اور انتظار کی گھڑیاں... سب کو بھول کر اس کی طرف لپکی۔ اس کی باہوں میں پہنچنے کے لئے بے قرار تھی۔ اتنے میں وہ سایہ اس سے ٹکرایا اور اس کی چیخ نکل گئی دوسرے

لڑ وہ اس اجنبی کی بانہوں میں سہمی ہوئی بے ہوش پڑی تھی نامعلوم وہ اسے کار میں ڈال کر کہاں لے گیا۔ دوسرے دن کے اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی ایک نوجوان حسینہ کی برہنہ لاش برابر کے کھیت کی جھاڑیوں سے برآمد ہوئی اور ساتھ ہی اس کا عروسی کا جوڑا اپھٹا ہوا پڑا تھا۔

یہ خبریں چاروں طرف پھیل گئیں۔ للی مر گئی۔ شدید صدمہ اور احساس۔۔۔ تجہیز و تکفین کے چند دن بعد دوسری دونوں لڑکیوں نے جو للی کے ساتھ ہی کمرے میں رہتی تھیں۔ وہ کمرہ چھوڑ دیا۔

راتوں کو رونے کی آواز کپڑوں کی سرسراہٹ اور ہلکی ہلکی درد بھری ستار کی آواز کسی کی ذی روح کی موجودگی کا احساس انھیں خوفزدہ کرنے کے لئے کافی تھا۔

کہانی ختم ہو گئی تھی۔ بوڑھا سگار سلگا رہا تھا۔ شاید وہ چہرے کے تاثرات ہی رہے ہوں گے کہ بوڑھے نے کہا۔ شاید تمھیں یقین نہیں آیا؟۔۔۔ مگر لوگوں کو اب بھی وہ نظر آتی ہے۔ سفید لباس سر سے پاؤں تک جگمگاتی عروسی کی پوشاک۔ تاج پہنے اندھیرے میں یکایک نمودار ہو جاتی ہے اور یکایک ہی غائب ہو جاتی ہے۔ شاید اس کمرے میں ایک رات بسر کرنے کے بعد یقین آجائے۔ میں نے کہا رات ٹھہرنا تو تھا ہی کیوں نہ یہ معمہ بھی حل ہو جائے گا۔۔۔ میں نے دل میں سوچا، تھوڑی سی رد و قدح کے بعد میں وہ کمرہ کرایہ پر لینے میں کامیاب ہو گیا۔

کمرہ بہت سادہ اور چھوٹا سا تھا۔۔۔ صرف ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک چھوٹا سا بلب۔۔۔ رات کافی گذر چکی تھی۔ میں تھکا ہوا تھا۔ لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔۔۔ لیکن اس لڑکی کے خیال نے جگانے پر مجبور کیا۔ رات کے آخری پہر میں ذرا سی غنودگی آنے لگی۔

وہ کسی کے ہاتھ کا ٹھنڈا لمس تھا۔ جس نے مجھے بیدار کیا کوئی برف سے بھی زیادہ سرد ہاتھ آہستہ آہستہ میرے سر پر پھیرتا رہا۔ ہلکی ہلکی ستار کی دل سوز آواز جیسے کوئی اپنی غم ناک کہانی سنا رہا ہو۔ ستار کے ذریعہ سنا رہا ہے میں نے ہاتھ بڑھا کر گھبراتے ہوئے لائٹ آن کر دی۔۔۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔۔۔ مجھے اپنے وہم اور حماقت پر ہنسی آگئی بتی بجھا کر لیٹ گیا آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ پھر کمرے میں وہی احساس، بتی جلائی تو کوئی نہ تھا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا رفتہ رفتہ ایک عجیب سا احساس روح پر چھانے لگا۔

جیسے کوئی اور کمرے میں موجود ہو یقین سا ہو رہا تھا کہ اگر بتی بجھا دوں گا تو اسے دیکھ لوں گا۔۔۔ میں نے بتی بجھا دی چند سکنڈ گھپ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر مجھے نظر آ ہی گیا۔

روشنی کا ایک چھوٹا سا نقطہ دروازے پر زمین سے کوئی تین فٹ اوپر حرکت کر رہا تھا اور اس میں سے ستار کے مدبھرے دل سوز گیت نکل رہے تھے۔ اس میں ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ میں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

اس روشنی اور مدبھرے گیت کا احساس میرے سارے وجود پر چھاتا چلا جا رہا تھا۔ کوئی چیز میرے دل کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ایک خواہش جڑ پکڑتی جا رہی تھی۔ روشنی کے اس حصار اور مدبھرے نغمہ کو اپنے اندر جذب کر لوں۔۔ اس میں تحلیل ہو جاؤں۔۔۔ میں بستر سے اتر گیا آگے بڑھ رہا تھا روشنی کے اس حصار کی جانب محو رہا۔ نہ جانے وہ کون سی قوت تھی جو مجھے اپنے آپ میں لے آئی۔ مجھے ہوش آگیا روشنی کے اس ہالہ سے چند ہی قدم کے فاصلہ پر تھا۔ ڈر اور خوف میرے رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا ٹھنڈا جسم۔ اور ٹھنڈک کا احساس پورے وجود پر چھا رہا تھا۔ ہاتھوں اور پیروں میں حرکت کی سکت نہ تھی۔

رنج و غم۔ تنہائی کا ایک عجیب سا جان لیوا احساس دل اور دماغ پر طاری تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس بھری دنیا میں بالکل تنہا۔۔۔۔ بے سہارا۔۔۔ ہوں کوئی بھی میرا نہیں۔۔ دل سینے میں ڈوب رہا تھا۔ بمشکل اپنی تمام قوتوں کو جمع کر کے پیچھے کی طرف پلٹ پڑا۔ خدا جانے کس طرح گرتا پڑتا

[illegible]

ابن فریدی

تعارف

منظور ہاشمی صاحب کو میں بہت عرصے سے جانتا ہوں لیکن اس حیثیت سے تعارف کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے کہ وہ شاعر بھی ہیں۔ پھر ایسا ہی اتفاق تھا کہ ایک ادبی نشست میں ان کو غزل سرا دیکھا ورنہ شاید وہ اپنی زبان سے اس کا کبھی ذکر ہی نہ کرتے

منظور ہاشمی خاموش طبیعت، منکسر المزاج اور بے ریا انسان ہیں۔ تنہائی پسند تو نہیں کہہ سکتا لیکن مزاجاً کم آمیز ضرور کہہ سکتا ہوں البتہ جب رسم و راہ بڑھتی ہے تو خاموشی سے گویائی کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ شاید مجھے یہ سطریں لکھتے ہوئے پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ منظور ہاشمی جو شعبۂ تعلیم سے وابستہ ہیں لائبریری سائنس میں بی۔ ایل۔ ایس۔ سی ہونے کے ساتھ انگریزی ادب میں ایم۔ اے بھی ہیں لیکن کلام سے انگریزی شوق فن کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اپنی روایت، اپنا گرد و پیش، اپنا ارضی مزاج جو ہر علاقائی یا ملکی حدود کا خاصہ ہوتا ہے وہ انہیں بھی عزیز ہے

کہتے ہیں کہ شاعری دس سال سے کر رہے ہیں۔ لیکن رسالوں میں ابھی دو تین سال ہوئے سیاہ و سفید میں نظر آنا شروع ہوئے اور اسی قلیل عرصے ہی میں۔ روبی ادبی ایوارڈ کے تحت طرحی غزلوں کے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا۔ ان کی فن سے پُرخلوص لگن کا ثمرہ ہے۔ اس کا اعتراف یوں بھی ہوتا رہتا ہے کہ ہندوستان کے اچھے ادبی رسالوں میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان رسائل میں ترنم، شاعر، آہنگ، نئی روشنی اور تحریک وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

منظور ہاشمی نے ہر میدان میں جست لگانے یا ہر گیند [illegible] صرف ان اصناف کو اختیار کیا ہے جن میں وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار میں خود کو زیادہ کامیاب محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف غزل اور قطعات میں ہی مشق سخن کرتے ہیں۔ ان کے کلام سے کچھ نہ کچھ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

اُس کے ماتھے کی لکیروں کو پڑھا ہے میں نے
جانتا ہوں مری تقدیر میں کیا لکھا ہے!!

لیکن تقدیر میں جو بھی لکھا ہو وہ اس کو ہی حاصل حیات سمجھتے ہیں۔

چند لمحوں کی رفاقت بھی بہت ہوتی ہے
چند لمحوں کے سوا زیست میں رکھا کیا ہے؟

زندگی ان کا خاص موضوع ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں سے وہ پوری طرح آشنا ہیں۔

کوئی مجھ سے تو نہ کہنا کہ ابھی زندہ ہوں
وقت کی کوکھ میں اک لمحۂ آئندہ ہوں
زندگی کتنی حسین کتنی بڑی نعمت ہے
آہ میں ہوں کہ اسے پا کے بھی شرمندہ ہوں
اجنبی جان کے ہر شخص گزر جاتا ہے
اور صدیوں سے اسی شہر کا باشندہ ہوں

لیکن زندگی کے اندھیروں میں ان کی نگاہ ہمیشہ روشنی کی کرن پر مرکوز رہتی ہے اور آنے والی تابندہ سحر پر وہ مکمل یقین رکھتے ہیں۔

تجھ کو پانے کی ہوس اک حسین خواب سہی
ایسے خوابوں کا [illegible]

راہ میں چھائے ہوئے گہرے اندھیروں کے قریب
ایک تابندہ ستارا بھی بہت ہوتا ہے

یا ان کے یہ اشعار

زمیں تو تپ رہی ہے لیکن ہوا میں خوشبو ہے بادلوں کی
قدم بڑھائے چلو کہ آگے کہیں کوئی آبشار ہوگا !
اسی توقع پہ بجھتی آنکھوں سے جلتے سورج کو دیکھتا ہوں
مری سلگتی زمیں پہ ابر رواں کبھی سایہ دار ہوگا!!

یا جب وہ کہتے ہیں کہ ؎

یہ مری سادہ دلی ہے کہ مرا حسنِ یقیں
ناامیدی میں بھی اک آس بندھی رہتی ہے
جانتا ہوں کہ یہاں کوئی نہیں آئے گا
جانے دروازہ پہ کیوں آنکھ لگی رہتی ہے

زندگی اور اس کے خواب ان کو بہت عزیز ہیں
انجام جو کچھ ہو ؎

دل میں بے تاب تمناؤں کے چشمے پھوٹے
آنکھ میں ہاری ہوئی فوج کے لشکر اترے
خواب کے جسم میں سورج کے جو نشتر اترے
خون میں ڈوبے ہوئے صبح کے منظر اترے
تیز پانی کے مسافر ہیں ہمیں کیا معلوم
کس کو جانا ہے کہاں کون کہاں پر اترے

احساس کی شدت اور جذبات کا خلوص ان کی
خاص پہچان ہے۔ ؎

بگولا بن کے چلتے ہیں آرزو کے صحرا میں
موم کا بدن لیکر دھوپ تاپتے ہیں ہم
نیند کے جزیرے تک نا ؤ اب نہیں جاتی
رات کا سمندر ہے اور جاگتے ہیں ہم
لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ
یہ فیصلے موسم کی تیز ہواؤں کو
کس کس کی مہربانی کا احساس رہے

وہ زندگی سے ہار ماننے کے لئے تیار نہیں
کھنچی رہیں گی سروں پر اگر یہ تلواریں
متاعِ زیست کا احساس بڑھتا جائے گا
یونہی ڈبوتا رہا کشتیاں اگر سیلاب
تو سطحِ آب پہ چلنا بھی آ ہی جائے گا
کواڑ اپنے اسی ڈر سے کھولتے ہی نہیں
سوا ہوا کے انہیں کون کھٹکھٹائے گا

یہ انتخاب بلا قصد و ارادہ ہے اس لئے اس میں بڑی گنجائش ہے کہ یہ آپ کو پسند آئے اور منظور ہاشمی صاحب کو اس لئے پسند نہ آئے کہ ان کا اس سے اچھا کلام منتخب ہونے سے رہ گیا۔ ایسا ہونا فطری بات ہے اس لئے کہ ابھی انھوں نے نہ تو اپنا مجموعۂ کلام شائع کرایا ہے اور نہ ان کا سارا کلام میرے سامنے ہے۔ جس قدر کلام سے میں متعارف ہو چکا ہوں اس کی بنیاد پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے انداز میں بڑا ٹھہراؤ، بڑی گہرائی، بڑی تازگی اور بڑی تابندگی ہے۔ کسک اور آرزو ان کے کلام میں ضرور ہے لیکن فرار، مایوسی اور انتشار کے داغ ان کے شعری دامن پر نہیں لگ سکے ہیں۔ وہ متاعِ زیست کے احساس کو ہمیشہ بڑھتا ہوا محسوس کرتے ہیں اور چند لمحوں کی زیست کو بہت بڑی دولت تصور کرتے ہیں۔ ان کے خواب میں ہزاروں نشتر اترتے ہیں لیکن وہ بس ایک چراغ کو روشن رکھنے کے سوجتن میں شعر کے ہزاروں روپ دکھا دیتے ہیں۔

میں منظور ہاشمی کے کلام پر کوئی تفصیلی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا اس لئے کہ ان کے تعارف میں اس کی گنجائش نہیں۔ وقت آئے گا تو آپ ہی لوگوں میں سے کوئی اس طرف بھی متوجہ ہوگا میں تو صرف اپنے قلم کو ان کے اس شعر تک لا کر رکھ دینا چاہتا ہوں ؎

لفظوں کی رفتہ رفتہ ضرورت نہیں رہی
اب وہ بھی سن لیا ہے جو سب نے کہا نہ تھا

ماہنامہ

ترنم

لکھنؤ



Editor
Najma Akhlaque

3(10-12)

Sub-Editor
Iqbal Akhtar

Price
Re. 1-00

ANNUAL
Rs. 10-00

ممبر آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس

حکومت جموں کشمیر کی لائبریریوں کیلئے منظور شدہ

ماہنامہ ترنم لکھنؤ

جلد --- نمبر ۳

شمارہ -- نمبر ۱۰، ۱۱، ۱۲

مدیرہ :- نجمہ اخلاق

معاون مدیر :- اقبال اختر

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ
سالانہ دس روپے

فون نمبر ۲۹۲۵۰

ترتیب

• پرنٹر، پبلشر پروپرائٹر :- نجمہ اخلاق • کتابت :- نواب حیدر نقوی

• طباعت :- نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۳ • مقام اشاعت :- ۱۵ بارود خانہ (احتشام نگر) لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

سوز و ساز

ہم اس سے پیشتر بھی اپنے اداریوں کے ذریعہ وقتاً فوقتاً ہوش مند اور درد مند اردو داں طبقہ کی توجہ اس طرف مبذول کرا چکے ہیں کہ اس وقت ان کے سامنے اہم ترین مقصد اردو زبان و ادب کی توسیع تعلیم اور اس کے حقوق کی نگہداشت کرنا ہے اب جبکہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے اردو کے سلسلہ میں ہمیں کچھ آسانیاں اور کچھ مراعات بہم پہنچائی ہیں اور وہ خود محسوس کرنے لگی ہیں کہ یہ زبان اسی ملک کی زائیدہ اور پروردہ ہے جسے یہاں کے باشندوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت اور مذہبی عقائد مل جل کر پروان چڑھایا ہے اور اس زبان میں اتنی جان، لوچ، لچک اور شیرینی لطافت ہے کہ جسے دیکھئے اس کا گرویدہ نظر آتا ہے حتیٰ کہ جو اس کے پکے دشمن ہیں وہ بھی اسی کے ذریعہ اپنی دشمنی کا اظہار کرتے ہیں۔ تو اب ہمارا اہم فریضہ اس کی تعلیم و تدریس کی توسیع کے لیے کوشش کرنا ہے بغیر اس کے ہم اپنے بنیادی مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اس مقصد کی تکمیل کے لئے تمام اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی کی سطح تک اردو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائے جانے پر زور دینا حامیان اردو کا کام ہے اردو کی توسیع کے سلسلہ میں شبینہ مدرسے کھول کر اردو پڑھنے والوں کی ہمت افزائی کرنی چاہیئے ان کے لئے تھوڑا وقت نکال کر قریہ قریہ اور محلہ محلہ یہ کام بحسن و خوبی انجام دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ بہتر ہوگا کہ ملک میں جہاں جہاں اردو لائبریریاں قائم کی گئی ہیں اسی میں ایک گوشہ نکال کر نصف گھنٹہ یا ایک گھنٹہ کے لئے اردو درجات قائم کر کے اردو کی تعلیم کا انتظام کیا جا سکتا ہے بغیر ایثار اور قربانی، نفس کشی اور جذبہ ہمدردی کے دنیا میں کوئی چیز بھی حاصل نہیں ہوئی ہے اگر حامیان اردو ذرا سا ایثار اور تھوڑی وقت کی قربانی دے کر اپنی چہیتی زبان کی ترویج و بقا میں حصہ لیں تو مشکل بڑی حد تک آسان ہو جائے۔ ہمیں توقع ہے کہ ہماری اپیل صدا بہ صحرا نہ ثابت ہوگی۔

نجمہ اخلاق

تسنیم فاروقی

وجود

میں ایک موج ہوں اس بیکراں سمندر کی
جو اپنے دوش پہ خیمے لئے حبابوں کے
حریم آب میں کچھ قافلے سے خوابوں کے
کنار آب میں شورش تھکن کا جھاگ لئے
ہزار رنگ کی سیپیں صدف دُرِ نایاب
بہا بہا کے کناروں کی جھولیاں بھر دے
کہیں پہ شور کہیں مچھلیاں کہیں پودے
نفس نفس سے کسی انتقام کا عالم
ہو جس کا نقطۂ آغاز برہمی ہیجان
سکون سرحد انجام کا کوئی انعام
عمیق سطح پہ چلتی ہوئی لکیروں میں

سپاٹ سنگ کے ساحل سے سر کو ٹکرا کر
نہ جانے کب یہاں میرا وجود کھو جائے
میں ایک موج ہوں اس بیکراں سمندر کی

--

اختر بستوی

سوچتا ہوں کہ

لاکھ شاداب ہو آباد ہو دنیا کا چمن
دل کی قسمت میں ہے تنہائی کے کانٹے کی چبھن
بے سہارا یہ ہمیشہ سے رہا ہے یارو
اس نے ہر درد اکیلے ہی سہا ہے یارو
صرف اک راز جو سینے میں چھپا بیٹھا ہے
دوست بنکر اسے تسکین دیا کرتا ہے
سوچتا ہوں کہ میں وہ راز بھی افشا کر دوں
دل کو اب دہر میں بالکل ہی اکیلا کر دوں

--

غزلیں

نازش پرتاپ گڑھی

اسی ایک فقرۂ درد میں مری داستان تمام ہے
یہ وہ دورِ زیست ہے ساقیو کہ خلوص جسمیں حرام ہے

مرے دوستوں کو نہ دیکھئے یہ فریبِ زیست بھی خام ہے
مرے دشمنوں کو نہ پوچھئے کہ انھیں میں میرا بھی نام ہے

مری رہگذارِ حیات میں یہ نہ جانے کیسا مقام ہے
کہ ہنسوں تو دل کا بھرم کھلے نہ ہنسوں تو درد حرام ہے

کوئی چوٹ ہو کوئی زخم ہو مرے دوستوں ہی کے نام ہے
جو بھی ہے حاصلِ آگہی تو اس آگہی کو سلام ہے

مئے غم جو شیشۂ دل میں ہو تو وہ اک حیاتِ دوام ہے
مگر آکے ساغرِ چشم میں جو چھلک پڑے تو حرام ہے

سنبھل اے شعورِ حیاتِ غم! یہ جمودِ اجل کا پیام ہے
کہ جہانِ درد میں دیر سے نہ سحر ہے اور نہ شام ہے

نہ صداقت آبِ سخن رہی نہ خلوصِ حسنِ کلام ہے
یہ ہے سانحہ مرے دور کا کہ ہنر فریب کا نام ہے

نہ تو راہبر کی طلب مجھے نہ نشانِ راہ سے کام ہے
مرے ساتھ نازشِ بے ہنر مرا غم ہے میرا کلام ہے

ثمر ہلوری

محبت خود فریبِ زندگی ہے
رہینِ آئینہ یہ روشنی ہے

مصر ہے حرمتِ صہبا پہ واعظ
خدا جانے یہ کیسا آدمی ہے

ابھی پردے میں ہے وہ حسنِ زیبا
ابھی جذبِ نظر میں چھڑ گئی ہے

بڑی گستاخ ہے آوارۂ گل
صبا دامن کو ان کے چھو گئی ہے

تری چشمِ کرم کا کیا بھروسہ
نظر تیری غلط انداز بھی ہے

سوال اس بات کا اٹھا ہے پھر سے
محبت تم کو مجھ سے واقعی ہے؟

ثمر جو ہے بظاہر زہرِ قاتل
وہی آبِ حیاتِ عشق بھی ہے

وصی احمد

غزل

نیند کی بستی میں داخل ہو گئے
صبح سے پہلے ذرا، ہم سو گئے
آج اپنے آپ ہی ایسا ہوا
بیٹھے بیٹھے ہم فسردہ ہو گئے
خاک سے ابھرے ہوئے مٹی کے لوگ
پھر کہاں مٹی میں جاکر سو گئے؟
تم کو پہچانا نہیں، پر تم سے تم
ہم خود اپنے سے تو واقف ہو گئے
غم کے بادل برس کر اس برس
اس پرانی زندگی کو دھو گئے

اقبال ماہر

اپنا محل

سود و زیاں سے کام نہیں تھا
بغض و عناد و حرص و ہوس کا
نام نہیں تھا
اپنوں سے پرخاش نہیں تھی
ہم خرم تھے اپنے مکاں کے
تم ممتاز حرم کی زینت
کوئی مصاحب کوئی خدمت گار ہمارے پاس نہیں تھا
کوئی کنیزوں کا انبوہ تمہارے ساتھ نہیں تھا
پہرے ہمارے گرد نہیں تھے
تاج نہیں تھا
وہ تخت طاؤس نہیں تھا
کوئی کوہ نور نہیں تھا
ہم دونوں بے خوف و خطر رہتے تھے جہاں پر
مٹی کا چھوٹا سا محل تھا

غزلیں

نگار آبادی

دل مرا شاکیِ جفا نہ ہوا
یہ وفادار بے وفا نہ ہوا
شکوۂ غم رہا زباں پہ مدام
شکرِ راحت کبھی ادا نہ ہوا
خوش ادائی سے بھی تری اے دوست
کچھ ادائی کا حق ادا نہ ہوا
عمر بھر کی سکونِ دل کی تلاش
عمر بھر دل سے غم جدا نہ ہوا
قیدِ ہستی کے بعد قیدِ عدم
مر کے بھی ختم سلسلہ نہ ہوا
ایسی کس کام کی مسیحائی
جس سے بیمار کا بھلا نہ ہوا
دل ہے تکمیلِ عشق سے محروم
درد اگر درد کی دوا نہ ہوا
وہ مصیبت کسی کی کیا جانے
جو مصیبت میں مبتلا نہ ہوا
آپ کے وعدۂ وفا کے نثار
کوئی وعدہ کبھی وفا نہ ہوا
نارسائی سی نارسائی ہے
دل رسا ہو کے بھی رسا نہ ہوا
غم سے کس کو ملی نجات نگار
کون دل ہے جو مبتلا نہ ہوا

—

راج کھیتی

سُرمئی گیسوؤں کے گھیروں میں
زندگی جا چھپی اندھیروں میں
مل ہی جائے گا صبح کا ساحل
ڈال دے ناؤ شب کے گھیروں میں
بن گئی جھوم کر میری دلہن
چاندنی رات سات پھیروں میں
پھر اُجالوں کا دَور آئے گا
دل نہ مغموم ہو اندھیروں میں
بدنصیبی بھی پھوٹ کر روئی
ہائے ان مفلسوں کے ڈیروں میں
ظلمتیں ہم کو راس آ جائیں
آپ تو کھو گئے سویروں میں
عالمِ کیف میں ہیں اہلِ شباب
ناگنیں مست ہیں سپیروں میں
راج رازِ حیات پاؤ گے
ڈوب کر حادثوں کے گھیروں میں

—

دو غزلیں

ہرپال سنگھ بیتاب

جو حق پرست ہے وہی ناکام دہر ہے
یہ زندگی ہے یا کہ شرابوں کا شہر ہے
دانشوروں کے شہر میں الفت کا دخل کیا
ہر ذہن ایک سانپ ہے ہر سوچ زہر ہے
چہرہ مگر کسی کا بھی روشن نہیں یہاں
مانا تمہارا شہر چراغوں کا شہر ہے
اپنی انا پہ ناز ہے جن کو وہ جان لیں
پھیلے تو ایک بحر جو سمٹے تو نہر ہے
کرب و بلا میں مبتلا پائے وہاں بھی لوگ
سنتے تھے کوئی شہر مسیحا کا شہر ہے
انسانیت کی لاش ترقی کا فلسفہ
تہذیب ہے عروج پہ یا کوئی قہر ہے
آتا ہے تیرنا جسے ہو جائے گا وہ پار
اب زندگی تو ایک سیاست کی نہر ہے
بیتاب مایا جال میں مت بھول جائیو
بحر نفس ہے اور حیات ایک لہر ہے

--

سحر کی پہلی کرن کے ہیں وہ نمائندہ
گھنیری رات میں ہیں جو چراغ تابندہ
نظر نظر ہے کوئی خواب دور اندیشی
نفس نفس سے امیدوں کے شہر پائندہ
اک آئینہ تھا جسے دل سمجھ کے توڑ گیا
اک ایک ٹکڑے میں عکس ستم ہے تابندہ
بکھر گیا ہے تخیل خلا میں انساں کا
زمیں کے نوحوں پہ ہوتا ہے کس کو شرمندہ
یہ توپ و ٹینک ہیں سب نفسیات کے ماتحت
ہے جس میں عزم وہ زندہ وہ قوم پائندہ
نظر وسیع کرو پھر سمجھ سکو گے مجھے
میرا وجود ہے اک نقش وقت آئندہ
کہاں سے آیا یہ دیوانہ شہر دانش میں
گناہ غیر پہ جو ہو رہا ہے شرمندہ
ہر ایک نغمہ ہے موجود ساز میں بیتاب
اگر بجائے کوئی با شعور سازندہ

--

غزلیں

مہدی پرتاب گڈھی

ہر گام پہ نفرت کی دیوار اٹھا دی ہے
پھر بھی مجھے یاروں نے جینے کی دعا دی ہے

اس دور نے غزلوں کو اسلوب نیا دے کر
اظہار کے دریا کی وسعت بھی بڑھا دی ہے

شیشے کے بدن والے پتھراؤ میں آ گئے تھے
لیکن مرے مشرب نے اُن کو بھی دُعا دی ہے

جس مرحلۂ غم میں آنسو نہ نکل پائیں
اس میں بھی مجھے تم نے ہنسنے کی سزا دی ہے

تنہائی نے کھینچا ہے یہ کیسا حصار آخر
اس سمت ہوا کو بھی آنے کی منادی ہے

آخر دل ناداں کو پیغام خرد دے کر
تم نے مرے پیروں میں زنجیر پنہا دی ہے

میں کانٹوں کے بستر پر آرام سے سوتا تھا
کس نے مری آنکھوں سے اب نیند اڑا دی ہے

سرگوشی سے غنچوں کے اک چوٹ لگی دل پر
اک تیری جدائی نے کیا کیا نہ سزا دی ہے

اب اُس کے تقدس پر حیراں ہیں فرشتے بھی
اشکوں نے گناہوں کی تحریر مٹا دی ہے

امروز کی محرومی میں جھیلوں گا ہنس ہنس کر
دل نے رُخِ فردا کی تصویر دکھا دی ہے

بر قاب ہٹائی تھی احساس کے سینے سے
حالات کے دامن میں اک آگ لگا دی ہے

طوفان میں کافی ہے تنکے کا سہارا بھی
رات آئی تو مہدی نے اک شمع جلا دی ہے

■ ■

ذکی کاکوروی

آسماں سے شب تاریک میں تارا ٹوٹا
آئی آواز، ارے! دل یہ ہمارا ٹوٹا

میں نہ کہتا تھا کہ نازک ہے بہت دل میرا
پھیر لی آنکھ جو تو نے، تو سہارا ٹوٹا

وائے ناکامیٔ قسمت کہ بھنور سے بچ کر
لب ساحل پہ جو آئے، تو کنارا ٹوٹا

جانے کیا بات ہے، پہلی سی وہ جھنکار نہیں
دل یہ کہتا ہے۔ کہیں ساز ہمارا ٹوٹا

ہم بلا نوش ہیں، ہم سے کہاں ساغر چھوٹے
چھوڑ دے، چھوڑ دے، ظالم، یہ خدارا، ٹوٹا

اپنے بیگانے ہوئے، تم ہوئے مجھ سے بدظن
زندگی کا مری ہر ایک سہارا ٹوٹا

اے ذکی جس کے سہارے تھی نوا پروازی
ساز دل کا وہی اک تار ہمارا ٹوٹا

■ ■

ہیرانند سوز

نہ عاقبت سے ڈرا مجھ کو میرے رب ضمیر
مرا وجود ہے خود ہی گناہ کی تعزیر
طلسم ذات ہے بس پچھواڑے کے جھونکوں تک
میں اک فسانہ ہوں صحرا کی ریت پر تحریر
سکوں تو لمحۂ موجود کی پناہ میں ہے
جھٹک دیں ماضی و فردا کا دست دامنگیر
ہزار بار فدا اُن پہ پائلوں کی جھنک
جو خود بجا کے چلے اپنے پاؤں کی زنجیر
جو خواب جتنا دکھاتا تھا خواب کی حد تک
ہے اتنی تلخ اگر اس کی ہے یہی تعبیر
ہے علم و فن میں خلاؤں کی بیکراں وسعت
مرا قصور فقط روشنی کی ایک لکیر
کہاں اُڑے گا وہ تخیل کی بلندی پر
ہے سوز اپنے مسائل کی تیلیوں میں اسیر

عزالہ غزلی

کئی بار بنتے سنورتے ہیں ہم
سمٹ کر ہمیشہ بکھرتے ہیں ہم
کئی مرحلے سے گذرتے ہیں ہم
کہیں جا کے تب پھر نکھرتے ہیں ہم
تمھیں کیا خبر ہے تمھیں کیا پتہ
تمھیں کسقدر پیار کرتے ہیں ہم
کسی کے لئے تب تلک سوچ لیں
تم آؤ یہیں پر ٹھہرتے ہیں ہم
تمھیں نے کیا ہے ہمیں خودپرست
تمھیں پر یہ الزام دھرتے ہیں ہم
ہے معتراض تو اپنے بھی ہاتھ میں
غزل میں نئے گل کترتے ہیں ہم
سبھی لوٹ آئے سفر سے مگر
عزالہ ابھی تک ٹھہرتے ہیں ہم

غزلیں

غزلیں

نظمی صدیقی

یہ موجِ صبا تیغِ دو دم ہے کہ نہیں ہے
ہر شاخِ گل اک تازہ قلم ہے کہ نہیں ہے
اے کاتبِ تقدیر مری لوحِ جبیں پر
اک حرفِ خوشی کا بھی رقم ہے کہ نہیں ہے
بازار میں ان اجلے خریداروں کو دیکھو
پوچھو نہ مگر دام و درم ہے کہ نہیں ہے
کشکولِ گدائی لئے یہ غولِ بیاباں
رسوائی احسان و کرم ہے کہ نہیں ہے
تلوار اٹھاؤ تو مگر قتل سے پہلے
اٹھا ہوا سر دیکھ لو خم ہے کہ نہیں ہے
میں نوحہ طرازِ غمِ جاناں سہی لیکن
یارو کہو تم کو کوئی غم ہے کہ نہیں ہے
ان زرد گلابوں پہ نظر کیجئے نظمی
دم بھر کا تبسم بھی ستم ہے کہ نہیں ہے

— —

اشفاق گوہر

وقت کے زلزلوں نے گرائے محل، منہدم ہو گئے قصر جذبات کے!
ولولے سو گئے غم کی آغوش میں، لطف باقی نہیں اب عنایات کے!
کتنے ہی سورجوں کی تپش بجھ گئی، ان گنت سنگ ریزوں کا دل ہل گیا!
مقصدِ زندگی کی طلب کے لئے، چیر کر دل بھی دیکھے ہیں ذرّات کے!
آج کے لوگ ہیں کسقدر بے وفا ثبت ہے ان کے سینوں پہ نقشِ جفا!
دل ہے فولاد کا، ہاتھ ہیں آہنی، عزم شیشوں کے ہیں جسم ہیں دھات کے!
ختم کیوں ہو گئی ساعتوں میں یہ شب آپ نے اس کو شاید اشارہ کیا
ٹوٹ کر رہ گئے جانے کیوں سلسلے گنگناتے ہوئے شوخ لمحات کے
ہو گئے میرے زخمِ جگر خندہ لب، ان کی یادوں کا ہر داغ گل بن گیا
حسن کی بزم میں آج اے شانِ غم، پیش کرنے ہیں گلدستے سوغات کے
دن کا دستِ طلب کیوں لرزنے لگا، توشۂ وقت کیوں ہاتھ ملنے لگا
چاندنی کی دلہن اشک برسائے ہے جانے کیوں چاک ہیں پیرہن رات کے
اس سے بڑھ کر متاعِ جنوں کیا ملے، اور اسکے سوا دادِ غم کیا ملے!
تو نے بخشے ہیں جو چار آنسو مجھے، میرے دامن میں گوہر ہیں سوغات کے

— —

ڈاکٹر سلام سندیلوی

نواب شمس الدین احمد خاں کی پھانسی کا واقعہ

جناب محمد عثمان غنی صاحب کا ایک مضمون ۵ ؍ اگست ۱۹۸۰ء کے قومی آواز، میں میری نظر سے گزرا جس کا عنوان "صدر فخرالدین علی احمد اور خاتون اوّل عابدہ بیگم" ہے اس مضمون میں موصوف نے ایک گمراہ کن بات لکھی ہے۔ جو غالباً کسی سہو پر مبنی ہے۔ انھوں نے تحریر فرمایا ہے۔

"مسٹر فخرالدین علی احمد کی والدہ لوہارو کے نواب ضیاالدین احمد کی پوتی اور نواب شمس الدین احمد خاں کی اولاد میں تھیں۔ جن کو ۱۸۵۷ء کے آشوب کے بعد جنرل فریزر کے قتل کے الزام میں پھانسی دی گئی تھی۔"

یہ بات بالکل غلط ہے کہ نواب شمس الدین احمد خاں کو جنرل فریزر کے قتل کے الزام میں ۱۸۵۷ء کے آشوب کے بعد پھانسی دی گئی۔ دراصل اس قتل اور پھانسی کا واقعہ یوں ہے۔

فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں نے ۱۸۲۶ء میں اپنی جائداد کا بٹوارہ کر دیا۔ انھوں نے فیروزپور جھرکہ کی ریاست اپنے بڑے بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر دی جو میواتی بیوی کے بطن سے تھے۔ اور لوہارو کا پرگنہ نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاالدین احمد خاں کے سپرد کر دیا۔ یہ دونوں بیٹے نواب احمد بخش خاں کی دوسری بیوی کے بطن سے تھے۔ جو ان کی ہم قوم تھیں۔

اکتوبر ۱۸۲۷ء میں نواب احمد بخش خاں صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد نواب شمس الدین احمد خاں نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کو لوہارو کا پرگنہ بھی ملنا چاہیئے۔ اور ان کے دونوں بھائیوں کے لیئے پنشن مقرر ہو جانا چاہیئے۔ نواب شمس الدین احمد خاں نے یہ درخواست دہلی کے ریذیڈنٹ کے پاس روانہ کی۔ جس نے فیصلہ کیا کہ لوہارو پر صرف نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاءالدین احمد خاں کا حق ہے۔ نواب شمس الدین احمد خاں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس نے یہ بھی لکھ دیا کہ جب تک نواب ضیاءالدین احمد خاں نابالغ ہیں۔ ان کے حصے کا روپیہ مصارف انتظام میں وضع کر کے سرکاری خزانے میں جمع ہوتا رہے۔ اور جب وہ بالغ ہو جائیں۔ تو لوہارو کا پرگنہ دونوں بھائیوں میں برابر تقسیم ہو جائے۔ گورنر جنرل نے ریذیڈنٹ کے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ اگر نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاالدین احمد خاں رضامند ہو جائیں تو اُن کو جاگیر کی آمدنی کے برابر نقد روپیہ مصارفِ انتظام کے سلسلے کا وضع کر کے ان کو سالانہ ملتا رہے۔ اور لوہارو کا پرگنہ نواب شمس الدین احمد خاں کی نگرانی میں دے دیا جائے۔

اس فیصلے کے بعد ہی اس وقت کے ریذیڈنٹ کا تبادلہ ہو گیا۔ اس کی جگہ پر ایک نئے ریذیڈنٹ کی تقرری ہوئی۔ اس نے حکومت ہند کی تجویز پر عمل کیا۔ اور لوہارو کا پرگنہ نواب شمس الدین احمد خاں کے سپرد کر دیا۔ مگر نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاالدین احمد خاں نے اس فیصلہ کو مسترد کر دیا۔

۱۸۳۲ء میں دہلی کے ریذیڈنٹ ولیم فریزر مقرر کئے گئے۔ جو نواب احمد بخش احمد خاں کے گہرے دوست رہ چکے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ نواب احمد بخش ..... خاں کے بٹوارے کے مطابق لوہارو کا پرگنہ نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاءالدین احمد خاں کو ملنا چاہیئے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے نواب امین الدین احمد خاں کو کلکتہ اپنے مقدمہ کی پیروی کے لیئے بھیجا۔

نواب امین الدین احمد خاں کلکتہ پہونچے۔ اور گورنر جنرل

بقیہ صفحہ ۳۹ پر

ڈاکٹر نوشی

پاکستانی پنجابی شاعری

گذشتہ کئی برسوں سے پاکستان میں علاقائی زبانوں کی تحریک کافی زور پکڑ رہی ہے۔ بنگلہ دیش کے قیام میں یقیناً بعض اہم سیاسی وجوہات شامل رہی ہیں لیکن جو بات اس کی بنیاد بنی وہ زبان کا مسئلہ ہی تھا۔ یعنی بنگالی مسلمانوں کا بنگلہ زبان کے لیے عشق پاکستانی پنجاب کی حالت ذرا مختلف ہے۔ وہاں کے پنجابی پاکستان کے قیام کے بعد خود کو تغیر پذیر حالات کے مطابق ڈھالنے میں کوشاں ہوئے تھے۔ تصنع ان کی زندگی کا حصہ ہی نہیں بلکہ ان کی وضع زندگی بن گیا تھا۔ وہ اپنی تہذیب اور اپنے تمدن سے منکر ہو کر ایک ایسے متعصب مسلم معاشرہ کی تشکیل میں محو ہو گئے تھے، جو ان کے زاویۂ نگاہ سے خالص شرعی معاشرہ ہو۔ یہی اس وقت کے پاکستانی پنجاب کی شکل تھی۔ لیکن وہاں کے پنجابی اپنی صدیوں کی تہذیب سے، پانچ دریاؤں کی سرزمین کے انفرادی تمدن سے اور اپنی طویل تاریخ سے کیسے منہ پھیرے رہ سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعصب کی جو تہیں ان کے ذہن پر جم گئی تھیں وہ ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگیں اور وہ لوگ بڑی تیز رفتاری سے حقیقت کی طرف، اپنی بنیاد کی طرف لوٹنے لگے۔ ان کی اس کوشش سے سب سے زیادہ نقصان ہوا اردو کا اور سب سے زیادہ فائدہ ہوا پنجابی کو۔ جس مہذب مگر مصنوعی معاشرے کی تعمیر کی کوشش ان پنجابیوں نے کی تھی وہ صرف ایک خواب ہی بنا رہا اور عوام اپنی جڑوں سے نہ ٹوٹ سکے۔ غرض پنجابی کے لئے ان کی محبت بیدار ہوئی، پنجاب یونیورسٹی لاہور میں شعبۂ پنجابی قائم ہوا، ریڈیو پاکستان پر پنجابی پروگراموں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ حتیٰ کہ اردو کے بعض مشہور و معروف شعراء نے بھی اپنی مادری زبان پنجابی میں شعر کہنا شروع کیا۔ فیض، حفیظ، قتیل شفائی کے نام یہاں قابل ذکر ہیں۔ پنجابی رسالوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور وہاں کے شعراء نے پنجابی میں شعر کہنے میں وقار محسوس کیا۔

اس میں شک نہیں کہ پنجابی ادب کا اس علاقے سے بہت گہرا تعلق ہے جسے آج پاکستان کہتے ہیں۔ شیخ بابا فرید سے لیکر مولا بخش کشتہ تک، پنجابی شاعری کے سات صدیوں پر پھیلے اس طویل سفر میں مسلمان ادیبوں کی تعداد غیر مسلم ادیبوں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ لیکن قیام پاکستان کے فوراً بعد سے مغربی پنجاب کے ادیب پنجابی زبان میں شعر کہنے کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے غالباً یہ ایک کامپلیکس تھا جس کے لیے ہم اس وقت کے متعصب شرعی، مسلم معاشرہ کی تشکیل کے خواب کی شرمندگیٔ تعبیر کو ذمہ دار ٹھہرا سکتے ہیں۔ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے تخلیق کردہ پنجابی ادب میں مختلف اور متضاد آوازوں کی موجودگی عرصہ دراز تک رہی ہے۔ مسلمان صوفی شعراء جہاں شریعت اور طریقت کی سنگ لازم زمین پر کھڑے تھے وہاں سکھ گورو صاحبان کی شاعری میں طریقت سے بغاوت کی تلقین ملتی تھی۔ گورو صاحبان کی بانی میں شریعت بھی صوفیوں والی نہیں ہے بلکہ انھوں نے سہل بھگتی پر زور دیا ہے لیکن ادب کے ان روپوں میں ایک چیز مشترک بھی ہے اور وہ ہے پانچ دریاؤں کی اس سرزمین کی تہذیب اور یہاں کی عوامی زندگی۔ اس سے نہ کبھی صوفی شعراء ہی غافل ہوئے اور نہ

اسے سکھ گورو صاحبان نے بھی نظر انداز کیا۔ ہم آہنگی کا یہ جذبہ عوامی
ادب میں اور زیادہ زور دار ہو جاتا ہے۔ پنجابی لوک ساہتہ نہ
ہندوؤں کا ہے نہ مسلمانوں کا اور نہ سکھوں کا، یہ سب کا ہے اور سب
کو اپنا لگتا ہے۔ اس کے لیے ادب ہی افراد کا مستحق نہیں ہے،
معاشرہ بھی ہے۔ اصل میں پنجابی مسلمانوں میں کثیر تعداد ان لوگوں کی ہے
جو بنیادی طور پر مسلمان نہیں تھے بلکہ انھوں نے اپنا مذہب ترک کر
کے اسلام قبول کیا تھا۔ ان کے وہاں کے رسم و رواج، کھان پان
ان کے انداز و اطوار ہندو سکھوں سے قدرے مختلف ہوتے ہوئے
بھی ان کے باہمی تعلقات میں کچھ فرق نہیں پڑا تھا۔ خود مسلمانوں
میں بھی وہ متعدد علاقائی رسمیں آج تک موجود ہیں جو سو فیصدی ہندو
سکھوں کے ہاں دستیاب ہوتی ہیں۔ مثلاً شادی کے موقع پر دولہا کا
گھوڑی پر سوار ہونا، تلوار لیکر چلنا، ڈولی لانا وغیرہ رسمیں آج بھی پاکستانی
مسلم معاشرہ میں جوں کی توں موجود ہیں۔ نتیجۃً پنجابی لوک ساہتہ میں
جس عوامی زندگی کو زبان ملی ہے وہ شادی کے گیتوں کے روپ میں
ہو یا مرگ کے بین کیرنوں کے روپ میں، ہو، موسموں اور تہواروں
سے متعلق ہو یا کھیتوں اور فصلوں سے، وہ سب کا مشترکہ ہے کسی
ایک قوم کا نہیں۔

پاکستان کا پنجابی مسلمان گذشتہ برسوں میں اپنی پنجابیت
کو قدرے جذباتی انداز میں محسوس کرنے لگا ہے۔ اسلامی معاشرے
کا جذبہ اس کے لئے اب اتنا اہم نہیں رہا جتنا پہلے تھا۔ یہی وجہ
ہے کہ آج وہاں کے اکثر مسلمان اپنے نام کے ساتھ ٹوانا، گل، گرلوال،
ایل، سودھی، بیدی، دھیر، بھنڈاری وغیرہ جاٹوں اور کھتریوں والی
اپنی اصل ذات کا نام جوڑنے لگ گئے ہیں۔ معاشرے کی اس کروٹ
سے پنجابی ادب کی ترویج و ترقی کے بہت سے راستے کھل گئے ہیں۔
موجودہ پاکستان میں پنجابی شاعری کے تین روپ دستیاب
ہوتے ہیں۔ پہلا وہ روپ جسے "لوک ساہتہ" کہا جاتا ہے۔ دوسرا وہ
جسے "روایتی شاعری" کہا جا سکتا ہے۔ اس میں بیت، کوتت اور
قصہ کاؤیہ کی مروج طرزوں پر لکھی گئی مترنم نظمیں شامل ہیں۔ تیسرا وہ
روپ ہے جسے ہم "جدید پنجابی شاعری" کا نام دیتے ہیں۔ شاعری
کے پہلے روپ میں صرف عوام کی روزمرہ کی زندگی کا بیان ہوتا ہے
اور اس قسم کے ادب کی روایت بہت قدیم اور بہت طویل ہے۔
دوسری قسم کی شاعری کا تعلق پنجابی زبان کے مشاعروں سے ہے۔
جہاں سامعین کو خوش کرنا ہی شاعر کا مقصد اعلیٰ ہوتا ہے۔ ایسی
شاعری میں اگر ذہانت اور فلسفے کو شامل کر دیا جائے تو سامعین
اسے قبول کرنے سے معذور ہو جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا کہ شاعر
مشاعرہ میں ناکام رہتا ہے۔ تیسری قسم کی شاعری "جدید شاعری" ہے
جس میں فکر اور ذہانت کو مکمل دخل حاصل رہتا ہے۔ پاکستانی پنجابی
شاعری اپنے اسی روپ میں ارتقا پذیر ہوئی ہے، اور اسی روپ
میں جدید پنجابی شاعر نے پہلی بار اپنا، اپنے دل و دماغ کا، عوام کا،
سیاست و معاشیت کا تجزیہ کیا ہے۔

لیکن اس شاعری کی بعض اپنی مجبوریاں بھی ہیں۔ پاکستان کے
سیاسی حالات نے وہاں کے ادیب کو تقریر و تحریر کی وہ آزادی
کبھی عطا نہیں کی، جو ہندوستانی ادیب کو حاصل ہے۔ پنجابی شاعری
پر اس کا اثر یہ ہوا کہ پاکستان کی پنجابی شاعری بیان کی صفائی کے
بجائے استعاروں، اشاروں، کنایوں کی طرف راغب ہوتی گئی۔
لہذا اس انداز کے باعث اپنے جذبات کے اظہار کے لیے
ان شعراء نے سینکڑوں نئے استعارے، نئی تلمیحیں ایجاد کیں۔ ظاہری
طور پر تو اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح پنجابی شاعری
کو قوت ملی ہوگی لیکن اس کے برعکس یہ شاعری غیر فصیح اور مشکل
فہم ہوگئی۔

ہندوستانی پنجابی شاعری، سے پاکستانی پنجابی شاعری ہمیشہ
ہی مختلف رہی ہے۔ روایتی شاعری تو اردو فارسی الفاظ کی کثرت
کے باعث اور اسلامی تہذیب و تمدن سے لئے گئے استعارات و
تلمیحات کے باعث یہاں کی پنجابی شاعری سے مختلف ہوتی تھی
اس سے لطف اندوز ہونے والے لوگ بھی مختلف تھے یا یہ
کہیے کہ قیام پاکستان نے انھیں مختلف بنا دیا تھا۔ جدید پنجابی شاعری
میں بھی یہ اختلاف نظر آتا ہے۔ مشہور محقق ڈاکٹر عطر سنگھ کے مطابق
اس کی دو وجوہات ہیں۔ اوّل یہ کہ جدید پنجابی شاعر جدید پاکستانی

بقیہ ص ۲۲ پر

اخلاق حسین عارف

مثنویات (فارسی)

(مختصر تعارف)

مثنوی کا ہر شعر علیحدہ ہوتا ہے۔ یعنی قصیدہ اور غزل کی طرح اس میں یہ پابندی نہیں کہ پوری نظم ایک ہی قافیہ میں کہی جائے یا ردیف کی پابندی ہو۔ اس لئے اشعار کی تعداد بھی مقرر نہیں۔ مضمون کی وسعت کے مطابق جتنے اشعار چاہیں کہے جا سکتے ہیں۔ مضمون کی بھی کوئی پابندی نہیں۔ فلسفہ، تصوف، رزم، عشق، داستان، پند و موعظت، جو مضمون چاہیں بیان کر سکتے ہیں۔

عربی شاعری کی ایک قسم "رجز" کو مثنوی کا اولین نمونہ کہا گیا ہے لیکن مثنوی کے نام سے اس صنف سخن کا سراغ فارسی شاعری میں پہلے پہل ملتا ہے۔ مثنوی بہت بسیط اور گوناگوں عنوانات پر مشتمل ہے۔

عہد سامانیہ کے شاعر رودکی کو مثنوی کا موجد کہا جاتا ہے جس نے نصر بن احمد سامانی فرماں روا کی فرمائش پر "کلیلہ و دمنہ" کا ترجمہ مثنوی میں کیا تھا اس کے علاوہ اس نے دوسری مثنویاں بھی تخلیق کیں۔ رودکی کے بعد دوسرے شعراء نے بھی اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور بہت سی مثنویاں تصنیف ہوئیں ان میں سے بیشتر آج ناپید ہو چکی ہیں۔ اس عہد کے دوسرے شعراء میں دقیقی بھی قابل ذکر ہے جس نے شاہنامہ لکھنے کا آغاز کیا اور ایک ہزار اشعار قلم بند کر چکا تھا کہ اپنے ایک غلام کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

پھر غزنوی سلاطین کا زمانہ آیا اور اس عہد میں فارسی مثنوی ارتقا کی بلند ترین منزلوں پر پہنچ گئی۔ فردوسی طوسی جسے مثنوی گوئی کا پیغمبر مانا جاتا ہے اسی عہد کا شاعر تھا۔ اس نے شاہنامہ کے نام سے ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل طویل ترین رزمیہ مثنوی لکھی جس میں خالص فارسی زبان استعمال کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ رزمیہ واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ قدیم ایران کی تہذیب و تمدن کی تصویریں پیش کیں۔ عشقیہ شاعری کے کمالات بھی جا بجا دکھلائے لیکن متانت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ واقعہ نگاری اور جذبات انسانی کی تصویر کشی کے حسین نمونے پیش کئے۔ اس کے عہد کے ممتاز شعراء میں اسدی طوسی کی مثنوی "گرشاسپ نامہ" بھی قابل ذکر ہے۔

غزنوی سلطانوں کے بعد سلجوقی حکمرانوں کا زمانہ آیا اور فارسی نظم و نثر کی عام طور پر ترقی ہوئی دیگر اصناف سخن کے ہمدوش مثنوی کے لئے بھی ترقی کی نئی راہیں کھلیں۔

فردوسی رزمیہ مثنوی کو انتہائے عروج تک پہنچا چکا تھا۔ اب مثنوی میں تصوف و اخلاق کے مضامین بھی بیان کئے جانے لگے اس سلسلہ میں حکیم سنائی کی "مثنوی حدیقہ" خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس کے ذریعہ پہلے پہل فارسی میں تصوف کے مضامین پیش کئے گئے۔ اخلاقی مضامین نظم کرنے کا آغاز بھی سنائی نے کیا۔ سنائی نے "حدیقہ" کے علاوہ اور بھی مثنویاں لکھیں جو ناپید ہو چکی ہیں۔ اس کے عہد کے دوسرے شعراء میں خواجہ فرید الدین عطار اور نظامی گنجوی کے نام بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے اپنی تصانیف کے ذریعہ مثنوی کی صنف کو وسعت بخشی۔ عطار سلجوقی دور کے ممتاز صوفی شاعر

تھے۔ انکی مثنویوں میں "منطق الطیر" الٰہی نامہ، اسرار نامہ، مصیبت نامہ، خسرو نامہ، مظہر العجائب، اور لسان الغیب آج بھی موجود ہیں جن میں صوفیوں کے عقائد اور ان کے باطنی حالات و تجربات کا تفصیلی بیان ملتا ہے۔ "منطق الطیر" اپنے تمثیلی انداز بیان کے اعتبار سے ایک معرکۃ الآرا مثنوی کہی جاسکتی ہے۔ نظامی گنجوی کی مثنویاں "خمسہ" اور "پنج گنج" کے ناموں سے مشہور ہیں اور اس میں حسب ذیل پانچ مثنویاں شامل ہیں۔

۱۔ مثنوی مخزن الاسرار:۔ بارہ سو اشعار پر مشتمل ہے اور اس مثنوی میں نظامی نے تصوف، پند و موعظت اور اخلاق مضامین حکایات کے پیرایہ میں بیان کئے ہیں۔

۲۔ مثنوی خسرو شیریں:۔ چھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ایک طویل عشقیہ داستان ہے۔

۳۔ لیلیٰ مجنوں:۔ ۱۳۰۰ مثنوی میں ساڑھے چار ہزار اشعار ہیں اور یہ بھی ایک مشہور عشقیہ داستان ہے۔

۴۔ مثنوی ہفت پیکر:۔ یہ چار ہزار چھ اشعار پر مشتمل ہے جس میں ساسانی دور کی ایک داستان نظم کی گئی ہے

۵۔ اسکندر نامہ:۔ دس ہزار اشعار سے زائد پر مشتمل یہ مثنوی اخلاق مضامین اور رزمیہ عنوانات پر مشتمل ہے۔

فردوسی کے بعد نظامی کو سب سے بڑا مثنوی گو شاعر کہنا بیجا نہ ہوگا۔ خاقانی اگرچہ قصیدہ گو شاعر تھا۔ لیکن اس کی ایک مثنوی "تحفۃ العراقین" قابل ذکر ہے جس میں سفر حج کے حالات اور راستہ کے واقعات نظم کئے گئے ہیں۔ خاقانی اسی دور کا شاعر تھا۔

تیموری دور غزل اور مثنوی کا دور ارتقا تھا۔ شیخ سعدی اس دور کے سب سے ممتاز شاعر اور صنف غزل کے پیغمبر مانے جاتے ہیں۔ مثنوی میں بھی ان کی بلند مائیگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا ــــ "بوستان" ان کا شاہکار ہے جس میں اخلاقی نصیحتیں حکایتوں کے پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں۔ اخلاقی شاعری کا آغاز تو حکیم سنائی کر چکے تھے لیکن سعدی نے "بوستان" کے ذریعہ اس زمین کو آسمان پر پہنچا دیا۔ ان کی مثنویاں آزادی خیال، جذبات، اخلاقیات، تہذیب و تربیت، ریاکار عالموں کی پردہ دری، بے تعصبی، فلسفہ و حکمت اور مناظر قدرت کے مضامین سے پر ہیں۔ ان کی قوت تخیل بڑے غضب کی تھی اور پیرایہ ادا بڑا ہی دلکش اور مؤثر تھا۔

اس عہد کی ممتاز مثنویوں میں محمود شبستری کی "گلشن راز" اور مولانا رومی کی "مثنوی معنوی" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں مثنویاں تصوف اور فلسفہ کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ مثنوی معنوی میں پچیس ہزار اشعار ہیں اور اسے فارسی زبان میں تصوف کے مضامین کی سب سے بڑی اور اہم مثنوی کی حیثیت حاصل ہے۔ رومی کے بعد جامی کی مثنویاں قابل ذکر ہیں جن کے نام حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ سلسلۃ الذہب:۔ یہ مثنوی فلسفہ، اخلاق نیز پند و موعظت پر مشتمل ہے۔

۲۔ سلامان و ابسال:۔ یہ ایک داستان ہے۔

۳۔ تحفۃ الاحرار:۔ یہ تصوف و معرفت کے مضامین پر مشتمل ہے۔

۴۔ سبحۃ الابرار:۔ یہ بھی تصوف کے مضامین، دلچسپ حکایات اور تمثیلات پر مشتمل ہے۔

۵۔ یوسف و زلیخا:۔ یہ ایک عشقیہ داستان ہے۔

۶۔ لیلیٰ مجنوں:۔ یہ بھی ایک عشقیہ داستان ہے۔

۷۔ خسرو نامہ اسکندری:۔ یہ اخلاقی مضامین پر مشتمل ہے۔

ایران کے علاوہ ہندوستان بھی فارسی شاعری کا ایک اہم مرکز رہا ہے اور ہندی شعراء نے بھی مثنوی کے ارتقاء میں نمایاں حصہ لیا۔ اس سلسلہ میں پہلا اور اہم نام خواجہ امیر خسرو دہلوی کا ہے۔ جن کی حسب ذیل مثنویاں قابل ذکر ہیں۔

۱۔ مثنوی قرآن السعدین:۔ اس مثنوی میں سلطان کیقباد اور بغرا خاں کی صلح کا حال بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ تاج الفتوح:۔ فیروز شاہ کی تخت نشینی یعنی ۶۸۹ ہجری تا ۶۹۰ تک کے واقعات نظم کئے گئے ہیں۔

۳۔ نہ سپہر:۔ اس میں نو ابواب ہیں اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے۔

۴. دُول رانی اور خضر خاں:۔ یہ ایک عشقیہ داستان ہے۔
۵. مطلع الانوار :۔ یہ تصوف کے مضامین پر مشتمل ہے۔
۶. شیریں خسرو :۔ یہ ایک عشقیہ داستان ہے۔
۷. آئینۂ اسکندری :۔ سکندر نامہ نظامی کے طرز پر ہے۔
۸. لیلیٰ مجنوں :۔ یہ عشقیہ داستان ہے۔
۹. ہشت بہشت :۔ داستان۔

امیر خسرو کو مثنوی گوئی میں نظامی کا ہم پلہ سمجھنا غلط نہ ہوگا انھوں نے مثنوی میں وصف نگاری کا آغاز کیا یعنی مختلف اشیاء پر نظمیں لکھ کر مثنوی گوئی میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

ہند کے دوسرے مثنوی گو شعراء میں دربار اکبری کے ملک الشعراء فیضی کا مقام بہت ممتاز ہے جس کی دو مثنویاں "مرکز ادوار" اور "نل ودمن" اب بھی موجود ہیں۔ نل ودمن چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے یہ ایک عشقیہ داستان ہے جسے فیضی نے چار ماہ کی مدت میں تصنیف کیا تھا۔ اس کے علاوہ مہا بھارت کا سنسکرت سے فارسی نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ فیضی کی مثنویوں کا امتیازی وصف جوش بیان ہے اور اس کی یہ خصوصیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ فخریہ مضامین بیان کرنے میں اسے بڑی قدرت تھی اور ایسے موقعوں پر اس کا جوش بیان دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ اس نے فلسفے کے خشک مسائل کو اپنے حسین اور دلکش طرز بیان سے شگفتہ و شاداب بنا دیا۔ استعارات کی شوخی اور تشبیہات کی ندرت بھی فیضی کا نمایاں وصف ہے۔

مغلوں کے آخری دور میں مرزا اسد اللہ خاں غالب نے بھی چند مثنویاں لکھیں جن میں سب سے اہم مثنوی ابر گہر بار ہے جو اگرچہ کہ ناتمام رہ گئی مگر طرز ادا، شوخی اور ندرت کے لحاظ سے یہ مثنوی بہت اہم ہے۔ مثنوی میں حمد کا نیا انداز ملتا ہے مناجات میں شکوہ کا رنگ بہت دلکش ہے اور مؤثر بھی۔ ساقی نامہ اور مغنی نامہ کے اشعار اپنا جواب آپ ہیں۔

ڈاکٹر افتخار احمد فخر

مختار صدیقی

مختار الحق نام، مختار تخلص، پورا نام مختار صدیقی تھا مگر شاعری کی دنیا میں مختار صدیقی کے نام سے معروف ہوئے۔ آبائی وطن سیالکوٹ تھا مگر آپ کے والد نے گوجرانوالہ کو جب بسلسلۂ معاش اپنا وطن بنا لیا تو مستقل سکونت وہیں کی ہو گئی اور یہیں یکم مارچ ۱۹۱۹ء میں ان کی پیدائش ہوئی[۱] ابتدائی تعلیم گوجرانوالہ ہی میں ہوئی پھر انھوں نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان ۱۹۴۳ء میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا شاعری یہیں کالج کے زمانہ میں شروع ہو گئی تھی۔ گھر کے ادبی ماحول نے جس پر اور بھی جلا بخشی۔ قدیم اساتذہ کے کلام کے بالاستیعاب مطالعہ نے مختار صدیقی کو روایت اور قدامت پرستی کی جانب کھینچا مگر ان کے کلام میں تازگی اور جان زمانے کے تقاضوں سے متاثر ہونے کا فطری نتیجہ ہیں۔ یوں تو انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر غزلیں پھر بھی مقابلتہً کم کہی ہیں جن میں اصغر گونڈوی کے رنگ سخن کی تقلید کا خود مختار صدیقی کو بھی اعتراف ہے جیسا کہ انھوں نے اپنے خود نوشت حالات زندگی میں تحریر کیا ہے۔ باوجود اس کے وہ ۱۷ اپریل ۱۹۳۹ء میں حلقۂ تلامذۂ سیماب اکبرآبادی میں شامل ہو جاتے ہیں اور اپنے استاد سے عقیدت بھی رکھتے ہیں۔ اصغر گونڈوی سے ذہنی طور پر متاثر ہونے کی وجہ ان کی جبلی خاصیت تھی جس کا ذکر انھوں نے اپنی شاعری اور فطرت سے متعلق اپنے خود نوشت حالات میں کیا ہے جس کا بیان آگے آئے گا۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد انھوں نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کر لی تھی اور آخر عمر تک ریڈیو ہی سے وابستہ رہے۔ بقول مالک رام:-

"ملازمت کا پورا زمانہ ریڈیو کی ملازمت میں گذرا۔ اولاً آل انڈیا ریڈیو میں اسسٹنٹ کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد اسی عہدے پر وہ ریڈیو پاکستان چلے گئے۔ جب وہاں ٹیلی ویژن کا شعبہ قائم ہوا تو اس میں مضمون نویسی کا کام ان کے سپرد ہوا تھا۔ اسی عہدے پر وہ اپنی موت تک قائم رہے"[۲]

دوران تعلیم اگرچہ معاشیات و فلسفہ آپ کے مرغوب و محبوب مضامین رہے مگر ــــ "معاشیات سے بی اے کرنے کے باوجود اپنی شاعری میں مزدور و سرمایہ دار کو مختار صدیقی نے کبھی در خور اعتنا نہ سمجھا"[۳] اس کی تصدیق خود ان کے درج ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے جس میں کہ انھوں نے اپنی شاعری اور فطرت پر سے نقاب اٹھانے کی سعی کی ہے۔

مختار صدیقی لکھتے ہیں کہ:-

"...... شاعری میں رفتہ رفتہ ایک خاص رنگ

---

[۱] سنہ پیدائش "تماہی" تحریر" جنوری مارچ ۱۹۷۳ء میں ۱۹۱۷ء درج ہے ص ۹
[۲] " " " " " " " " " " " " "
[۳] "میری بہترین نظم" مرتبہ میراجی ص ۱۰۱

پیدا ہوگی جسے غنائی و جذباتی (Lament) کہا جاتا ہے۔ عورتوں کے جذبات کو کرشن راؤ کی تمثیل میں ادا کرنا اردو میں یقیناً نئی چیز ہے جس کا راقم الحروف گنہگار ہے۔ شعری فنکاری میں زیادہ تر وہی چیز غالب رہتی ہے جو آرٹ کو ـــ cart of Escape کے لطیف سرور آگیں پہلوؤں سے متعارف کراتی ہے۔ عورتوں کے جذبات کے سلسلہ میں اس وقت تک بیشتر نظمیں شائع ہو چکی ہیں مگر یہ بات نقادوں کے لیے شاید تعجب انگیز ہو کہ ان نظموں میں بولنے والی لڑکی خود مختار صدیقی ہے۔ میرے ایک مہربان پروفیسر نے ان کے لیے انگریزی کا ایک بڑا چست فقرہ بطور عنوان کہا ہے "The woman speaks in me" میری شاعری پر بالعموم ایک ایسی متشائم گھٹا ہے جو مادّی زندگی کی جملہ کامیابیوں اور جذباتی تعلقات میں قابلِ رشک "سرخروئی" بھی "کھلنے یا برسنے" پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ تمام غنائی اور جذباتی نظمیں جو اصل میں میری شاعری کا تار و پود ہیں اپنی جملہ "کیفیات وصال" اور تمام "عالم سرخوشی" کے انمول نغموں کو دبا نہ سکیں، شاید اس لئے کہ میری فطرت ہی اصل میں غمگین ہے حالانکہ "فریاد و ماتم" کیلئے میرے اشعار میں اصولاً کوئی جگہ نہیں کیونکہ انتہائی طور پر تشائم پسند ہونے کے باوجود بھی شکوہ شکایت کر کے جینے بھوڑنا میں نے نہیں سیکھا مگر جب پانی سر سے گذر جائے تو بقول اصغر گونڈوی ؎

"حسب حال پرسی ہو تو کیا کیا نہ چاہیئے"

کچھ جلی کٹی باتیں منہ سے نکل ہی جاتی ہیں کیونکہ میں پھر بھی انسان ہوں۔ تاہم میری یہ فطرت ثانیہ بن چکی ہے کہ آپ بے حد روتا ہوں اور رو سکتا ہوں مگر اشعار کے دامن کو "شکوہ جو دیا گلہ بیجا" سے حتی الوسع بچائے رکھتا ہوں۔[1]

اقتباس اگرچہ طویل ہو گیا ہے مگر یہ مختار صدیقی اور اس کی شاعری کو سمجھنے اور اس کے نقطۂ نظر کو پہچاننے میں مددگار ثابت ہوگا۔ یہاں مختار صدیقی نے اپنی فطرت کو ہی بے نقاب نہیں کیا ہے بلکہ اپنی شاعری کی دیوی کو بھی بے نقاب کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور احساس تھا اور اپنی قابلیت پر پورا اعتماد بھی۔ اگر انھوں نے اپنی عمر کے آخری ایام میں بستر مرگ پر ناقدریٔ زمانہ کی شکایت کی تو وہ کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی جیسا کہ مالک رام صاحب ایم اے کا بیان ہے کہ ـــ مختار صدیقی کو اپنی قابلیت اور صلاحیت کا شدید احساس تھا اور اس بات کا افسوس کہ زمانے نے ان کی کما حقہٗ قدر نہ کی۔ روایت ہے کہ موت سے چند روز قبل ایک دوست مزاج پرسی کو گئے تو ان کے حال پوچھنے پر میر کا یہ شعر پڑھا ؎

ایک محروم ہمیں میر پھرے دنیا سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ[2]

مختار صدیقی نے شعر و شاعری کے علاوہ بھی اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا ہے۔ نثر میں بھی بکثرت مضامین لکھے ہیں جن میں تراجم، تمثیلاتی افسانے تنقیدی و تحقیقی مقالات اور فلسفہ و تاریخ پر سیر حاصل تبصرے سبھی شامل ہیں۔ ان کی ایسی ہی ایک کتاب "جینے کی اہمیت" کے نام سے چھپ چکی ہے جو چینی الاصل مصنف "لن یوتانگ" کی مشہور انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ مختار صدیقی کی ایسی تمام تر تصانیف و تالیفات اور تراجم غالباً تشنۂ اشاعت ہیں جن کے منظر عام پر آئے بغیر ان کا صحیح ادبی و شعری مقام متعین نہیں کیا جا سکتا اس لئے ضرورت ہے کہ ان کی اشاعت کا بندوبست کیا جائے۔ بحیثیت شاعر وہ اپنی بے مثال اور منفرد نظموں ہی سے مشہور

● میرے شاگرد (تنی)، سہ ماہی "تحریر" جنوری مارچ ۱۹۶۸ء شمارہ نمبر ۱ صفحہ

مقبول ہوئے اور نظم نگار شعراء میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا ان کی ایسی ہی نظموں میں سے یہاں ایک نظم درج کی جاتی ہے جو " میری بہترین نظم " نامی کتاب سے ماخوذ ہے اور جسے غالباً میراجی نے مرتب کیا تھا۔ نظم کا عنوان ہے

رات کی بات

چوڑیاں بجتی ہیں چھاگل کی صدا آتی ہے
فرط بیتابی سے اٹھ اٹھ کے نظر بیٹھ گئی
تھام کر آس ہر آہٹ پہ جگر، بیٹھ گئی
میرا غم خانہ عبارت رہا تاریکی سے
موج مہتاب کہاں خاک بسر، بیٹھ گئی؟
شبنم آلود ہوا جاتا ہے شب کا دامان
تارے چمکے ہیں کہ اب گرد سفر، بیٹھ گئی
بھیگتی رات بنا کر مرے اشک خوں میں
جانے کو اٹھی ہی تھی، اٹھ کے مگر بیٹھ گئی

اُس نے دیکھا کہ مری رات لجاتی آئی
آنکھیں ملتی ہوئی فتنوں کو جگاتی آئی

سر سے ڈھلکا ہوا آنچل، شکن آلود لباس
چڑھی آنکھوں میں مچلتی ہوئی نیندوں کی جھلک
سو گئی تھی ذرا، خود سب کو سلا کے۔ شاید
نیند کچی تھی کہ دی وعدے نے دل پر دستک
چونک کر اٹھی تو دیکھا کہ ستارے بن کر
اوج افلاک پہ ہے مانگ کی افشاں کی جھلک
شیشۂ ماہ سے چھلک کر مئے تندرو بے درد
اس کے ماتھے سے چرا لیتی ہے سونے کی ڈلک
چوڑیاں ہاتھوں میں تھامے چلی ہولے ہولے
کردے غمازی مبادا کہیں چھاگل کی چھنک
سرخ ٹیکے کی جبیں پر کہیں پھیلی پھیلی،
جس طرح جام سے کچھ تھوڑی سی مئے جائے چھلک

زلفیں یوں چہرے پہ بکھری ہوئی ناگنیں جیسے
جس طرح ایک کنول پہ ہوں بیٹھیں، دو بالک،

(سودا)

میرے غم خانے پہ پہنچی تو پھر آیا جو خیال ــــ
چوڑیاں چھوڑ دیں، چھاگل بھی ہنسی چھنا چھنک
شکر ہے آئی تو ہے نیند کی گو ماتی ہے
چوڑیاں بجتی ہیں، چھاگل کی صدا آتی ہے

مندرجۂ بالا نظم غنائی و جذباتی شاعری کی بہترین مثال ہے اس کا خاص جمالیاتی رنگ جو تأثر دل پر پیدا کرتا ہے وہ دیرپا اور دل پذیر ہے۔ یہاں نظم پر کوئی تبصرہ مقصود نہیں ہے تاہم اس میں شک نہیں کہ مختار صدیقی کے بیان کے مطابق اس نظم میں بولنے والی لڑکی خود مختار صدیقی ہے یا ان کے ایک مہربان پروفیسر نے جو انگریزی فقرہ بطور عنوان کہا تھا کہ ---------
"The woman in me speaks" مختار صدیقی کی نظم پر حرف بحرف صحیح اور درست معلوم ہوتا ہے۔ مذکورہ نظم اور اسی قسم کی ان کی دوسری نظموں سے یہ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ ان کی نظم میں جوش کا انقلابی آہنگ تلاش کرنا تحصیل حاصل ہوگا۔ مختار صدیقی کی نظموں کا رنگ و آہنگ ایسی شاعری سے قطعاً مختلف اور نیا ہے جو زیادہ تر اختر شیرانی کی رومانی شاعری سے ہم آہنگ معلوم ہوتے ہوئے بھی اپنے ندرت بیان اور دلکش بلند پروازی تخیل لطیف جذبات کے نرم اور کومل الفاظ، پاکیزہ اور دلنشین تشبیہات سے معمور ہے۔ ملائمت و مٹھاس کے علاوہ انداز بیان کی حلاوت کانوں میں رس گھولتی ہے جس سے ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ترقی پسند شعراء کی صف میں بھی ممتاز مقام پر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کا خاص وصف ان کی نظموں کا سحرکارانہ حسن بھی جس میں شیریں نغمگی بھی ہے اور ایک ایسی شدید قسم کی داخلیت جو ان کی ذات ہی کا حصہ معلوم ہوتی ہے یہی ان کا طرۂ امتیاز بھی ہے اس کا ایک سبب غالباً ان کا موسیقی سے قلبی لگاؤ بھی ہے جیسا کہ

مالک رام صاحب کا خیال ہے کہ:

"...... مختار صدیقی کو کلاسیکی موسیقی میں اچھی دستگاہ تھی چنانچہ ان کی شاعری میں بھی اس کے آثار نمایاں ہیں۔ ان کا مختصر مجموعۂ کلام جو کہ "منزل شب" کے نام سے ۱۹۵۵ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا ان کے آہنگ کا نمائندہ ہے اس میں بیشتر نظمیں نغمگی کی فضا اور تاثر کی حامل ہیں" [1]

مختار صدیقی کا نام ان کے کارناموں اور فنکارانہ تجربوں کی وجہ سے زندہ ہے اور آئندہ بھی ترقی پسند شعراء کے ساتھ تاریخ میں محفوظ رہے گا۔ ان کا نام ممتاز ترقی پسند شعراء کے ساتھ (جو اس تحریک کے امام تسلیم کئے جاتے ہیں مثلاً میراجی ن م راشد یوسف ظفر وغیرہ) لیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ مالک رام کا یہ بیان صداقت پر مبنی ہے کہ:

"...... مختار صدیقی نے ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب و نقاد تھے۔ انھوں نے میراجی کے ساتھ حلقۂ ارباب ذوق لاہور میں نئے نئے تجربے کئے جو اگرچہ سب کے سب کامیاب ہوئے اور نہ انھیں پسند عام کی سند ملی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان ہی تجربوں کی بدولت اردو شاعری میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا" [2]

یہ تحریک اردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کے نام سے معروف ہے۔ اس تحریک کو آگے بڑھانے میں بعد کے ترقی پسند شعراء نے دلچسپی شعری تخلیقات کے نت نئے تجربوں سے جو مواد اور ہیئت دونوں اعتبار سے کئے گئے، عام کیا جس سے اردو شعر و ادب کو فائدہ ہی پہنچا۔ نظموں کی طرح غزلوں میں بھی مختار صدیقی نے اپنی انفرادیت قائم رکھی اور عام متغزلانہ روش اور رنگ و آہنگ سے ہٹ کر فکر و خیال کے نئے پیکر تراشے۔ غزلیں اگرچہ انھوں نے کم کہیں مگر یہاں بھی ان کا رنگ انفرادیت لئے ہوئے ہے اور روش عام سے ہٹ کر ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن سے ان کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ویسے وہ ایک نظم گو شاعر ہی ہیں۔

کونین بداماں دامن ہے آنکھوں ہی میں رک رک جاتے ہیں
لو خیز ہیں آنسو بیچارے منزل ہے کڑی، گھبراتے ہیں

کچھ نہ کچھ تو ان کٹھن تنہائیوں کو دو فریب
ہاتھ پھیلاؤ، دعا مانگو، مناجاتیں کرو

غم کی اس بیزار یکسانی کا کچھ تو ہو علاج
ہم نہیں کہتے کہ ان سے ہی ملاقاتیں کرو

تھی تو سہی پر آج سے پہلے ایسی حقیر فقیر نہ تھی
دل کی شرافت، ذہن کی جودت اتنی بڑی تقصیر نہ تھی

اب جو اچاٹ ہوئی ہے طبیعت شاید اب ہم رخصت میں
بن کارن بن بات وگرنہ ایسی کبھی دلگیر نہ تھی

موت کو زیست ترستی ہے یہاں
موت ہی کونسی سستی ہے یہاں!

سب خرابے ہیں تمناؤں کے
کون بستی ہے جو بستی ہے یہاں!

صاف ظاہر ہے کہ شاعر روایتی اور رسمی شاعری سے گریزاں، زندگی اور اس کے مسائل سے متاثر نظر آتا ہے، گل و بلبل کی شاعری کا معتاد نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کا نقیب ہے۔ اس کے حساس آئینۂ دل پر زندگی کی تصویریں جلوہ کناں ہیں شاعر زندگی کے غموں کا مداوا ـــ اور سکون کا متلاشی ہے زندگی سے فرار نہیں چاہتا، اس

---

[1] سہ ماہی "تحریر" جنوری مارچ ۱۹۷۳ء شمارہ ۱ صفحہ ۹۰

[2] سہ ماہی "تحریر" دہلی جنوری مارچ ۷۳ء شمارہ ۱ صفحہ ۹۰

کا قرینہ اور سلیقہ چاہتا ہے۔

یوں تو مختار صدیقی نے پابند نظموں کے علاوہ آزاد نظمیں بھی میراجی اور ن۔م۔ راشد وغیرہ کی طرح کہی ہیں مگر ان کے اصلی جوہر پابند نظموں ہی میں کھلتے ہیں۔ مواد و ہیئت دونوں کے حق میں انھوں نے مختلف تجربے کئے ہیں۔ ان کی پابند نظموں میں ایک خاص خوبی ان کے الفاظ کا چناؤ ہے اُن کے ہاں جہاں "امیجری" کے نادر نمونے ملتے ہیں وہیں الفاظ کا رکھ رکھاؤ اور انتخاب کی بھی جلوہ گری ہے اور یہی چیز ان کو اپنے ہمعصروں میں ممتاز کرتی ہے جو ان کی شدید داخلیت کے امتزاج سے اپنا ایک الگ پیٹرن رکھتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی آواز صاف طور پر پہچانی جاتی ہے۔ اور اپنا جادو بھی جگاتی ہے۔

افسوس کہ ڈیڑھ سال قبل ہی وہ ہم سے جدا ہو گئے اور پاکستان میں جہاں تقسیم ملک کے بعد وہ چلے گئے وہیں دفن ہوئے

"پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا"

انھیں قلب کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا، جس پر انھیں فوجی اسپتال لاہور پہنچا دیا گیا تھا۔ آٹھ دن وہاں رہے افاقے کے کچھ آثار نظر آنے لگے تھے کہ ۱۸ ستمبر ۱۹۷۲ء کو پھر شدید حملہ ہوا اور اسی دن شام کو ساڑھے آٹھ بجے ان کا انتقال ہو گیا۔ جنازہ اگلے دن ۱۹ ستمبر ۱۹۷۲ء کو اٹھا، اور انھیں قبرستان اچھرہ لاہور میں سپرد خاک کیا گیا۔ سات کے تعمیے سے تاریخ ہوئی ہے

از سر زخم دلم تاریخ وصلش شد رقم

چوں (من ۹)، شنیدم راہی ملک عدم مختار شد

(۷-۴-۱۹۰۵ء — ۱۹۷۲ء)

"اپنے پیچھے جسمانی یادگار دو لڑکے اور دو لڑکیاں چھوڑیں۔"[۱]

"اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے"

اردو شاعری اپنے ایک جیالے فنکار سے محروم ہو گئی ——

مختار صدیقی کا کلام یکجائی طور پر کتابی صورت میں خاطر خواہ پوری طرح سامنے نہیں آیا ہے بیشتر حصہ اس کا غیر مطبوعہ اور بکھرا پڑا ہے اس کی شیرازہ بندی ضروری ہے ان کی نظموں اور غزلوں، گیتوں کے علاوہ نثر میں بھی جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ بھی کتابی صورت میں چھپ جانا چاہیئے۔ اس منفرد شاعر کی نگارشات بلاشبہ اردو ادب و شعر کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔

بقیہ مضمون صفحہ ۱۲۱ کا

اردو شاعری کی طرح اشاروں کنایوں پر زیادہ زور دینے لگی ہے۔ مطلب یہ کہ بات کو صاف سیدھے طور پر نہ کہہ کر اشاروں، نیز فصیح تلمیحوں کے ذریعہ بیان کیا جانے لگا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس شاعری کی بنیادی آواز وہ اسلامی تہذیب ہے، جس سے ہندوستانی پنجاب کے لوگ بے بہرہ ہو چلے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کے سیاسی حالات نے جو اثر پنجابی شاعری پر چھوڑا ہے وہ ہمارے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔

ان اختلافات کے باوجود بھی ہم پاکستانی پنجابی شاعری کو بیگانگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شاید ابھی تک ہندوستانی پنجاب کے لوگوں نے ذہنی طور پر تقسیم وطن کو تسلیم نہیں کیا ہے اور وہ ابھی تک مغربی پنجاب کی سرزمین سے وابستگی محسوس کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو "شرنارتھی" بن کر آئے تھے آج بھی اپنے آبائی شہروں کی محبت میں بندھے ہوئے ہیں۔ پاکستانی پنجابی شاعری میں انھیں اپنی دھرتی کی، اپنے گلی محلوں کی، اپنے بچپن کی بوباس دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے یہ کہ بارڈر کے اس پار یا اُس پار رہنے والے پنجابیوں میں پنجابیت کا جو جذبہ ہے اس کی بنیاد پانچ دریاؤں کی غیر منقسم دھرتی ہے، ہندوستان یا پاکستان نہیں۔

---

[۱] سہ ماہی "تحریر" دہلی جنوری مارچ ۱۹۷۳ء شمارہ ۱۳ (صفحہ ...)

ساتویں قسط

سہیل صفدر حسین عابدی

سوانح حیات مانؔی جائسی

جناب مانؔی کے کلام میں وطن اور اہل وطن کی طرف سے ایک نوع کی بیزاری کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے وطن سے اس حد تک بیزار اور متنفر ہیں کہ انھیں وطن کی خاک تلے دفن ہونا بھی پسند نہیں۔ انھیں کسی ریگ بیاباں کے تلے دب رہنا قبول ہے مگر یاران وطن کے ہاتھوں مٹی پانا ہرگز منظور نہیں۔ چنانچہ ایک موقع پر عرض کرتے ہیں

دست یاران وطن سے نہیں مٹی درکار
دب رہوں گا میں کسی ریگ بیاباں کے تلے

وطن اور اہالیان وطن کی طرف سے اس حد تک متنفر بغیر کسی مخصوص سبب کے ممکن ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مانؔی کو اپنی زندگی کے طویل ترین دور میں ایسے بے شمار تجربے ہوئے ہیں جس سے اُن کے آبگینۂ دل کو ٹھیس لگی۔ سہ

مانؔی رہ حیات میں کھائے ہیں وہ فریب
اب راہ زن سمجھتا ہوں ہر راہبر کو میں

عمر بھر کھایا فریب دوستی لیکن یہ دل
رسم و راہِ اہل عالم سے ہے بیگانہ ہنوز

ان اشعار سے یہ اندازہ کرنا قدرے آسان ہے کہ ان کے عزیزوں اور دوستوں نے اُن کے دل کو خوب خوب چرکے لگائے ہیں۔ چنانچہ اس خیال کی تصدیق یوں بھی ہوتی ہے کہ ایک مقام پر انھوں نے اپنے دوستوں کے لئے احباب منافق کے کلمات استعمال کئے ہیں۔ جہاں تک اعزا اور اہالیان وطن کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں مرزا غالبؔ کی ایک غزل پہ تضمین کا آخری بند نقل کر دینا کافی ہوگا۔

واقعی بے وطنی بھی ہے مصیبت غالبؔ
پوچھو مانؔی سے مگر اس کی حقیقت غالبؔ
لاکھ زحمت ہو سفر پھر ہے غنیمت غالبؔ
کرتے کس منھ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریٔ یاران وطن یاد نہیں

ذرا یہ شعر بھی ملاحظہ ہوں۔

چمن والے مرے شیون سے عاجز تھے چمن چھوٹا
مبارک خانہ زاد ردائے غربت وطن چھوٹا

میری غربت سے نہیں اہل وطن خوش کہ ابھی
برق ٹوٹی نہیں اجڑے ہوئے کاشانے پر

بیسویں صدی کی گذشتہ چھ دہائیاں ایک لحاظ سے بڑی ہی خلاق ثابت ہوئی ہیں۔ اس دور کو اردو شعر و ادب کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے ادب کو حقیقی معنوں میں زندگی کا ترجمان اسی عہد میں بنایا گیا۔ اس کی افادیت و مقصدیت کو اسی زمانے میں تسلیم کیا گیا۔ اسی زمانے میں اس کے اندر چند نئے اضافے بھی ہوئے۔ تنقید، افسانہ، ناول، ڈرامہ، نظم جدید جیسی بیشتر اصناف ادب کو اسی دور میں پھولنے پھلنے کا موقع ملا۔ اسی عہد میں بعض ایسی مایۂ ناز ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے اپنی جاندار

تخلیقات کے ذریعے اردو ادب کو دنیا کے ترقی یافتہ ادب کے بالمقابل لا کھڑا کیا۔

اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی دور میں اردو ادب نے بہت کچھ کھویا بھی مثنوی، مرثیہ جیسی اہم اصناف سخن مردہ ہو چلیں۔ اگرچہ کچھ لوگوں نے ان کے تن بے جان میں جان ڈال لینے کی ناتمام و ناکام کوشش کی لیکن پہلے کی سی آب و تاب، شان و شوکت اور توانائی نہ پیدا ہو سکی۔ یقیناً یہی صورت قصیدہ کی بھی ہوئی۔ اس عہد تک پہونچتے پہونچتے اس میں بھی وہ قوت اور توانائی باقی نہ رہ گئی جو اب سے صرف ایک صدی قبل تک موجود تھی۔ اب کوئی سودا، کوئی ذوق، کوئی غالب اور کوئی میر نہیں پیدا ہو رہا ہے۔ البتہ مذہبی بزرگوں اور روحانی پیشواؤں سے والہانہ عقیدت نے اس فن کے جادو کو کسی حد تک جگائے رکھا۔ عزیز لکھنوی اور حالی جائسی کی کوششیں اسی ضمن میں آتی ہیں۔ اس موقع پر حالی جائسی کی قصیدہ نگاری پر اجمالی نظر ڈالنا مقصود ہے۔

اردو غزل کی تاریخ تو خیر حالی کو شاید ہی نظر انداز کر سکے لیکن اردو قصیدہ نگاری کی تاریخ بھی حالی کو یقیناً فراموش نہ کر سکے گی۔ حالی کے قصائد ان کے پاک و صاف اور رچے ہوئے ادبی ذوق کے غماز ہیں۔

علمائے معانی نے قصیدے کے فن کو چار حصوں میں منقسم کیا ہے۔ تشبیب، گریز، مدح اور دعا۔ اور ہر حصہ کی انھوں نے الگ الگ فنی خوبیاں بیان کی ہیں۔ قصیدہ کا سب سے اہم حصہ تشبیب کا ہوتا ہے۔ اگر شاعر نے تشبیب کے تحت کہے گئے اشعار میں فنکارانہ چابکدستی سے کام لیا ہے تو یقیناً قصیدہ کامیاب ہوگا۔ تشبیب کے موضوع بیان میں شعراء نے انتہائی وسعت پیدا کر دی ہے۔ اس کے اندر مختلف النوع مضامین نظم کئے ہیں۔ کہیں پر مناظر قدرت کے دلکش و دل نشین بیان سے اس کی بزم آرائی کی گئی ہے، تو کہیں قلبی واردات کے بیان، حسن و عشق کے تذکرہ سے۔ کہیں پر زمانہ کی ناسازگاری کا شکوہ کیا گیا ہے تو کہیں اپنی بدقسمتی پر آٹھ آٹھ آنسو بہائے گئے ہیں۔ اردو قصیدہ نگاروں میں سودا کو اس سلسلہ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

حالی کے قصائد میں بھی تشبیب کا وجود بے حد پر لطف ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کے مخصوص نظریات حسن و عشق لئے اپنے چہرے پر عقیدت و محبت اور الفت کی نقاب ڈالکر جگہ جگہ اپنی جلوہ سامانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان قصائد کی تشبیب کے ذریعہ ہم تھوڑی دیر کے لئے سب کچھ بھول کر حالی کی بزم غم اور بزم یاس میں پہونچ جاتے ہیں۔

عام طور سے جو تشبیب غزل کے رنگ میں ہوتی ہے اُسے بے حد پسند کیا جاتا ہے اس وجہ یہ ہے کہ قصیدہ کی پوری فضا میں صرف یہی وہ موقع ہوتا ہے جہاں شاعر کو صحیح معنوں میں خود اپنے احساسات کی ترجمانی کا موقع ملتا ہے اس کے اپنے خیالات و محسوسات جن پر اس کے مخصوص نظریۂ حیات کی چھاپ لگی ہوتی ہے اگر کہیں ظاہر ہو سکتے ہیں تو وہ اسی مقام پر۔ حالی جائسی کے یہاں بھی یہی چیز نظر آتی ہے۔ اُن کے قصائد کی تشبیب عام طور پر غزل کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔ درحقیقت غزل کے پردے میں وہ اپنے نظریات حسن و عشق اور دکھے دل چوٹ کھائے ہوئے برباد دل کی داستان دہراتے ہیں۔ حالی کے مشہور "آج قصیدہ" کی تشبیب کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ اُن کی زندگی کا وہ دردناک پہلو کس قدر ابھر کر سامنے آ جاتا ہے جس نے ان کو تمام عمر تڑپایا ہے۔

خاکستر دل بھی نہیں لے باد فنا آج
آثار وفا تک نہ رہے کیسی وفا آج

غارت ہوا سرمایۂ اعزاز محبت
تاراج ہوا خلعت تشریف وفا آج

دکھ ہوتا ہے اب نام وفا لیتے ہوئے بھی
کیا نقش تھا جو صفحۂ ہستی سے مٹا آج

برباد زمانے نے کیا حق محبت
کل جس پہ بھروسہ تھا اُسے دیکھو کیا آج

مسحورۂ صد جلوۂ اخلاص احبا

افسوس! وہ کاشانۂ دل ٹوٹ گیا آج

قصیدہ کی تشبیب میں اکثر شعراء نے مناظر فطرت کی عکاسی بھی کی ہے۔ ماتی کے چند قصائد میں بھی مناظر فطرت کی تصویر کشی موجود ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی شعوری طور پر وہ اس طرف زیادہ توجہ نہیں کرتے بلکہ اُن کا مخصوص رنگ ہر موقع پر ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ پھر بھی انھوں نے مناظر فطرت پر جو خامہ فرسائی کی ہے وہ پرکیف بھی ہے اور پر لطف بھی ہے

سماں سحر کا ہے کیسی سحر کہ صبح بہار
خزاں بھی ظلمتِ عالم کے ساتھ ہے سفری
طلوع مہر سلیماں کے تخت کی پرواز
سحر ہوئی کہ اڑی قاف سے سفید پری
یہ آفتاب کا ہے انعکاس پانی پر
کہ جوئبار میں سیم گداختہ ہے بھری
شعاع شمس نے چمکا دیا ہے عالم کو
یہ گل ہے صفحۂ گلشن پہ یا نقوش زری
چمک ہے پھولوں میں یا باغ میں چراغاں ہے
کہ تارے چھٹکے ہیں بالائے چرخ نیلوفری
کہ سبزہ رنگ حسیں کی جبیں پہ ہے افشاں
کہ ہے یہ زیور الماس پہنے سبز پری

مذکورہ بالا اشعار میں حسین و نازک تشبیہات نے ایک عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ "سحر ہوئی کہ اڑی قاف سے سفید پری"، "کہ جوئبار میں سیم گداختہ ہے بھری"، "کہ ہے یہ زیور الماس پہنے سبز پری" جیسی ترکیبیں کس قدر حسین ہیں۔ تشبیہات کی ندرت نے ایک سماں سا باندھ دیا ہے جس سے پڑھنے والے کے دل پر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

تشبیب کے بعد سب سے نازک اور فنکارانہ چابکدستی کا حامل مقام "گریز" کا ہوتا ہے۔ تشبیب میں تو خیر شاعر کے واردات قلبیہ، قادر الکلامی اور الفاظ کا حسن استعمال آڑے آجاتا ہے اور اس کے فن کو نکھارنے میں قدرے مدد بھی دیتا ہے لیکن گریز کا محل بڑا ہی وقت طلب، سخت اور نازک ہوتا ہے۔ اس موقع پر شاعر بڑی ہی فنکارانہ مہارت سے کام لیکر قاری کا ذہن چپکے سے اپنے ممدوح کی طرف موڑ دیتا ہے اور مدح کا پہلو نکال لیتا ہے۔ چنانچہ اگر اس موقع پر بے مثال مہارت فن سے کام نہیں لیا گیا ہے تو گویا قصیدہ کا تار تار بکھر کر رہ جائے گا۔ تشبیب سے اس کا رشتہ بہر صورت ٹوٹ جائے گا۔ گویا گریز تشبیب اور مدح کے درمیان ایک ایسا غیر محسوس سلسلہ ہے جو دونوں کو باہم ایک دوسرے سے منسلک کئے رہتا ہے۔

ماتی کے قصائد کی اہم ترین صفت یہ ہے کہ گریز میں فنکارانہ دقت نظر کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اُن کی قادر الکلامی اور فطرت انسانی کی رمز شناسی نے اُن کے اس فن کو بڑی حد تک سہارا دیا ہے۔ گریز کی اصلیت اور حقیقت کو سمجھنے کے لیے کسی قصیدے کی پوری تشبیب اور مدح کے کچھ حصے کا پڑھنا نہایت ضروری ہے ورنہ اس بات کا اندازہ کرنا سخت مشکل ہے کہ شاعر نے اپنے فن کا مظاہرہ کس مقام پر اور کس طور سے کیا ہے۔ ماتی کے مجموعۂ قصائد وادی ایمن کے قصیدہ نمبر ۶ کی تشبیب کے چند اشعار کے بعد گریز کا شعر ملاحظہ ہو:

تو اب یہ کہئے فنائے دل پر ہے منحصر آرزو کا مٹنا
مگر اسے کون مانتا ہے کہ دل کا انجام بھی فنا ہے
زمیں ٹلے آسماں ہٹے، آفتاب شق ہو، نجوم نوش
فنا ہو یہ کائنات لیکن نہ دل مٹے گا نہ دل مٹا ہے
بیاض صبح ازل بھی تھا دل، پھر لۂ شام ابد بھی ہے دل
وہ نور ہے دل، وجود کی جس کے ابتداء ہے نہ انتہا ہے
تجلی طور عارضی اور مستقل جلوہ گاہ دل ہے
محال عقلی ہے دل کا مٹنا دل بشر خانۂ خدا ہے
گریز۔ غلط نہیں ہے اگر ہے کعبہ سے دل کو دعویٰ برابری کا
مگر فضیلت ہے اس کو اتنی کہ مولد پاک مرتضیٰ ہے

ماتی کے ممدوح آئمۂ معصومین تھے اس طرح کے قصائد کی اساس تاریخی واقعات اور احادیث پر ہوتی ہے لیکن عام طور شعراء جستہ جستہ واقعات نظم کر کے قصیدوں میں غزل کا سا ماحول

کرتے ہیں۔ حالیؔ کے ہاں بھی قصائد پر عام طور سے یہی فضا مستولی رہتی ہے لیکن انھوں نے اکثر و بیشتر مسلسل تاریخی واقعات بھی نظم کئے ہیں۔ مثلاً۔ جنگ خیبر"، "واقعہ مباہلہ" وغیرہ۔

حالیؔ کے قصائد کی نمایاں خصوصیت اُن کی قادرالکلامی ہے۔ قصائد میں اُن کا زور بیان، اُن کے دل کی تڑپ اور اس کی شدت کی غماز ہے۔ حالیؔ کو زبان و بیان کے مختلف اسالیب پر بھی پوری قدرت حاصل ہے۔ وہ الفاظ کے مناسب اور برمحل استعمال سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے قصائد پرشکوہ الفاظ، نادر تشبیہات واستعارات اور مناسب ترکیبات سے بھرے پڑے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ان کی تخیل کی بلند پروازیوں کی داد دینا پڑتی ہے۔

حضرت علیؑ کی شان میں اُن کا ایک قصیدہ ہے۔ پرشکوہ الفاظ کی مثال میں چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:۔

حبیر فقر پہ مولا ہیں صدر بزم عرفانی
سر پہ سلطنت پہ عزت تاج جہاں بانی
محاذ جنگ پہ ہیں یکہ تاز بے بدل حیدرؑ
حریم معرفت میں کاشف اسرار پنہانی
لباس فقر میں ہیں مطمئن فرش توکل پر
قبائے زہد میں ہیں مرتعش اعضائے جسمانی
صف دانندگان حق میں اک شان خداوندی
رہ جویندۂ ایزد میں ہادی خدا دانی

ایک قصیدہ میں نادر تشبیہات ملاحظہ ہوں:۔

طلوع مہر سلیماں کے تخت کی پرواز
سحر ہوئی کہ اڑی قاف سے سفید پری
یہ آفتاب کا ہے انعکاس پانی میں
کہ جو ئبار میں سیم گداختہ ہے بھری
چمک رہے پھولوں میں یا باغ میں چراغاں ہے
کہ تارے چھٹکے ہیں بالائے چرخ نیلوفری

ندازبیان :۔

وہ فضا میں گردش انگشت حیدرؑ دیکھئے
وہ فلک پہ مہر کے رستے میں چکر دیکھئے
یوں لڑتے نہیں جی کھول کے اور کھیل کے جی پر
جس طرح سے حیدرؑ نے جہاد آج کیا آج

قصیدہ میں جہاں پرشکوہ الفاظ، نادر تشبیہات، زور بیان تخیل کی بلند پروازی سے قادرالکلامی اور فنی مہارت کی مثال پیش کی جاتی ہے وہاں اس میں مبالغہ آمیز تعریف کے ذریعہ بھی زور بیان اور تخیل کی جولانی کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔ اردو قصائد میں مبالغہ آمیز بیانات بھرے پڑے ہیں۔ ہمارے شعراء اس طرح کے انداز بیان کو اپنے لئے افتخار کا باعث سمجھتے رہے ہیں۔ مبالغہ آمیز بیانات سے چاہے تخیل کی بلند پروازی اور قادرالکلامی کے کتنے ہی جوہر نظر کے سامنے آئیں لیکن حق یہ ہے کہ کلام میں صداقت اور اثر آفرینی باقی نہیں رہ جاتی۔ حالیؔ کے قصائد کی نمایاں خصوصیت اُن کا معتدل انداز بیان ہے اس میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ نہیں پایا جاتا بلکہ وہ اپنے ممدوح کی تعریف واقعات کی روشنی میں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیان میں ایک نوع کی صداقت، انداز بیان میں عجیب سی شان اور انوکھا وقار پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر امام حسینؑ کی مدح کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

تو وہ کہ جادۂ حق سے تجھے نہ پھیر سکے
تمام دولت باطل کے گوہر و زر و سیم
تو وہ کہ جس کا ثبات ایک درس گاہ وفا
ہر ابتلا میں رہا منزل رضا میں مقیم
وہ مطمئن کہ نہ میدان امتحاں سے ہٹا
تو وہ کہ جس کی روش ایک جادۂ تسلیم

مختصر یہ کہ جناب حالیؔ قصیدہ نگاری کے میدان میں مخصوص انفرادیت کے حامل ہیں اور ایسے دور میں جبکہ قصیدہ کا فن مردہ ہو چکا تھا انھوں نے اس کے تن بے جان میں تازہ روح پھونکنے کی کامیاب کوشش کی۔

ایس. ایم. عباس رضوی

گنبد کی آواز

رات ایکدم تاریک ہے۔ ایکدم اداس

لگتا ہے' جیسے دل کی ساری شمعیں ایک ایک کر کے بجھ گئی ہوں

چاند کی روشنی، تاروں کی چمک بھی ماند پڑ گئی ہو۔

چاند کا چہرہ سوگوار سوگوار ہے غمگین غمگین'

چاندنی جیسے آنسوؤں کا دریا رواں ہو۔ ہر طرف ویرانی ہے ہر سمت سناٹا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کائنات تھمی تھمی سی ہو۔

ندیم! سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مجھے کیا ہو گیا ہے۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں آخر تم اس طرح چپکے سے کیوں چلے گئے اور میں خاموشی سے اُن کا منہ دیکھتی رہ جاتی ہوں۔ اور جب جی زیادہ بھاری ہو جاتا ہے تو تنہائی میں جا کر رو لیتی ہوں۔

'ندیم! میرے ندیم! تم کو میری باتوں کا یقین کیسے ہو گیا؟ پگلے کہیں کے۔ کہیں ایسی باتیں بھی کسی سے کہی جاتی ہیں'

پھول تو رنگ و نکہت حسن و پاکیزگی کی نشانی ہے۔ رنگ و نکہت جس سے زندگی کو نیا عزم' نیا شعور ملتا ہے۔ حسن و پاکیزگی جو حیات کو سنوارتی و نکھارتی ہے۔ نیا رنگ و آہنگ عطا کرتی ہے۔

لیکن ندیم! آج جب سارے کام ختم کر کے کمرہ میں داخل ہوئی تو تمھارے اس پھول کی پنکھڑیاں سارے کمرہ میں بکھری پڑی تھیں۔ میں نے انھیں بڑی احتیاط سے چُن لیا مگر نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا جیسے یہ پھول کی پنکھڑیاں نہ ہوں بلکہ شیشے کی کرچیاں ہوں جو یکلخت میرے دل میں پیوست ہو گئی ہوں اور میرا پورا وجود لہولہان ہو گیا ہو۔

اُف وہ باتیں جیسے کل کی ہی تو ہوں۔

ندیم! جب تم میرے یہاں ٹریننگ کے سلسلے میں آئے تھے۔

تمھارا لانبا قد، چوڑا چکلا سینہ متناسب جسم، گول چہرہ، اونچی پیشانی ریشم کے سے ملائم، چمکدار سیاہ بال، موتیوں کے سے شفاف دانت، اس ہر پان کی انار کے دانوں کی سی سُرخی، روشن آنکھیں، آنکھوں میں خوبصورت سے نازک فریم کی عینک، مترنم آواز، بالوں کا وہ انداز جیسے پھول جھڑتے ہوں۔ سرمئی رنگ کا سوٹ اور اسی سے میچ کرتی ہوئی ٹائی، پہلی ہی نظر میں تم میری نگاہوں میں ایسا کھپ گئے لگا جیسے وجود میں کوئی چیز دھیرے سے اتر گئی ہو۔ دل کے نہاں خانہ میں کوئی تصویر آہستہ سے آویزاں ہو گئی ہو۔

اُف ندیم! تمھاری آنکھوں کی وہ چمک

تمھاری مسکراہٹ کی وہ دلآویزی۔

تمھارے بات کرنے کا وہ انداز

تمھارے وجود کی وہ کشش۔ وہ جذب و کیف

میرا جی چاہتا، تمھارے پاس بیٹھ کر بس تمھاری آنکھوں میں جھانکتی رہوں۔ تمھارے تبسم کی کلیوں کو اپنے آنچل میں سمیٹتی رہوں تمھارے وجود کے خول میں ڈوب جاؤں۔ تمھارے قریب بیٹھ کر چپکے چپکے، آہستہ آہستہ بس فضول کی باتیں کرتی رہوں اور یہ سلسلہ لامتناہی بن جائے۔

کبھی کبھی سوچتی آخر یہ کیسا سحر ہے۔ جو میرے سر پر چڑھ گیا ہے۔

یہ کیسی کشش ہے جو مجھے بے اختیار کھینچے لئے جاتی ہے۔

یہ کیسی تمنا ہے جو ہر وقت مچلتی ہی رہتی ہے۔

یہ کیسی کسک ہے جسے قرار نہیں
یہ کیسی چبھن ہے دھیمی دھیمی۔ مدھم مدھم!

جب تم اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتے رہتے۔ جب تم ہنسی کی کلیاں لٹاتے رہتے۔ مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتے ہوئے جب میرے قہقہے میرے کانوں میں نقرئی جام کی آواز کی طرح ٹکراتے تو نہ جانے کیوں میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں میرے قدم بوجھل ہو جاتے اور پورے وجود میں ایک عجیب سی کسک اٹھنے لگتی۔ جب میں تمھیں ہری بھری کیاریوں کے نزدیک چہل قدمی کرتے دیکھتی۔ جب میں تنہائی میں پھولوں سے لدی ہوئی کسی ڈالی سے تمھیں کھیلتے ہوئے دیکھتی۔ ہاتھوں میں تازہ گلاب لئے تم کو اپنی دھن میں نہ جانے کیا گنگناتے پاتی تو اس وقت میرا جی بے اختیار چاہتا کہ دبے پاؤں تمھارے پاس پہونچ جاؤں۔ میں اپنے کو لاکھ سنبھالتی لیکن ایسا لگتا جیسے کوئی طاقت مجھ کو تمھارے پاس کھینچے لئے جاتی ہو۔

لیکن ندیم! تمھیں میری آگ کی جیسے خبر ہی نہ ہو۔

تنہائی میں۔ اکیلے میں تم کو نہ جانے کونسا سایہ گھیر لیتا۔ پتہ نہیں کون سی فکر، کون سی سوچ تمھیں گھیرے رہتی۔ اکیلے کمرہ میں کرسی کے ہاتھ پر سر ٹکائے، میز پر پیر پھیلائے، آنکھیں بند کئے تم نہ جانے کتنی دیر تک بیٹھے رہ جاتے۔ ایسا لگتا جیسے کوئی جانا مانا اپنی تپسیا میں مصروف ہو۔ کون آرہا ہے۔ کون جارہا ہے کون تمھارے قریب سے گذر رہا ہے۔ تمھیں کسی بات کی خبر نہ ہوتی ایسی حالت میں اکثر میں تمھارے قریب سے گذرتی۔ میرے قدموں کی چاپ تیز ہو جاتی۔ کبھی میں آہستہ سے کھنکارتی لیکن تمھاری آنکھیں یوں ہی بند رہ جاتیں۔ پہلے تو میں نے تمھاری اس بات کا کوئی Notice نہیں لیا لیکن کچھ دنوں بعد مجھے محسوس ہونے لگا جیسے تم جان بوجھ کر مجھے Avoid کرتے ہو۔

تم اشرف و نسیم کے ساتھ باتیں کرتے رہتے۔ مسکراتے رہتے۔ قہقہے بکھیرتے رہتے لیکن جوں ہی میں تم لوگوں کی بزم میں قدم رکھتی تم خاموش ہو جاتے تمھاری مسکراہٹ کہیں غائب ہو جاتی۔ تمھارے قہقہوں پر جیسے اوس سی پڑ جاتی۔ اگر تم کوئی لطیفہ سناتے رہتے کسی فلم پر Comment کرتے رہتے مگر جوں ہی میں وہاں آجاتی تم خاموش ہو جاتے۔ کبھی تنہائی میں کسی بہانہ سے میں کمرہ میں داخل ہو جاتی اور تم جیسے گھبرا اٹھتے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے پھر آہستہ سے اٹھ کر وہاں سے چلے جاتے۔ یہی نہیں۔ اکثر ہمت کر کے میں تمھیں مخاطب کرتی لیکن تم یوں ٹال جاتے جیسے سُنا ہی نہ ہو۔ یا میری بات کا کوئی مطلب ہی نہ ہو۔ کوئی جواب ہی نہ ہو۔ کبھی تم دوسرے سے مخاطب ہو جاتے کبھی چپ سے کہیں سرک جاتے اور تمھاری اس "ادائے بے نیازی" پر میری طبیعت جھنجھلا سی جاتی۔ مجھے عجیب سی کوفت محسوس ہوتی اور میرا جی چاہتا کہ تمھارا کبھی سامنا نہ کروں۔

مگر میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا ندیم! کہ جو کچھ بھی ہو۔

"میں بھی تسلیم کی خو ڈالوں گی" تمھارا ہر ظلم سہہ لوں گی لیکن تمھارے اس رویہ کو بدل کر ہی دم لوں گی۔

"فلاسفر صاحب! افلاطون کب مرا؟"
"مسٹر! کیا سقراط واقعی پاگل تھا؟"
"کینٹ اور ہیگل؟"
"زندگی کی حقیقت؟"

چاہے تم مجھ سے بولو یا نہ بولو میں خوامخواہ کے لئے ایسے الٹے پلٹے، الجھے اور بے تکے سوال تم سے اکثر کر بیٹھی اور تم بور ہو کر رہ جاتے۔ اور تمھاری اس وقتی پریشانی، بوریت سے مجھے عجیب سی تسکین، عجیب سا لطف محسوس ہوتا۔ لیکن اس دن میں دنگ رہ گئی، جب تم "عورت کی عظمت" پر بے لاگ بولتے چلے گئے۔

"عورت کی عظمت کو دنیا کی بڑی بڑی ہستیوں نے تسلیم کیا ہے دنیا کے عظیم ترین لوگوں نے اس صنف نازک کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیکے ہیں۔ یہ عورت کی ہی عظمت تھی جس نے تاج محل تعمیر کرا دیا۔۔۔ یہ عورت کی ہی بلندی تھی جس نے "نور جہاں" لقب پایا۔ شیکسپیر ایسی عظیم المرتبت شخصیت نے کہا ہے "عورت، خوشبو، نغمہ، رقص

و روشنی کا مجموعہ ہے" دنیا سے الگ ہو کر اگر اپنے یہاں دیکھا جائے تو عورت کی عظمت مسلم الثبوت ہے" وجود زن" سے ہے "تصویر کائنات" میں رنگ" ہے۔ سچ مچ اگر یہ "رنگ" نہ ہوتا تو آج یہ "تصویر" بالکل سادہ، ایکدم بے کار و بے مصرف معلوم ہوتی ہوا تھی۔ خوشبو و نغمہ، رنگ و نور نکال دیا جائے تو پھر یہاں باقی بھی کیا رہ جائے گا۔ پھر تو شاید یہاں آدمی کا دم گھٹ جائے گا۔ ایک سانس بھی دشوار ہو جائے گی"

یقین کرو ندیم! تمھاری یہ باتیں سن کر مجھے اتنی خوشی ہوئی جیسے بہت بڑی نعمت مل گئی ہو۔ میرا جی چاہا بڑھ کر تمھارا منھ چوم لوں، تمھیں اپنے کلیجہ سے لگا لوں اور تمھارے اوپر سے اپنی جان قربان کر دوں۔

اور شاید اُسی شام کو۔

ہلکی ہلکی ہوا در و دیوار کو چھیڑ رہی تھی۔ ہلکی سی پھوار پڑی تھی، فضا میں ہلکی سی خنکی۔ ہلکی سی سوندھی سوندھی خوشبو رچ بس گئی تھی۔ چودھویں کا چاند اپنی تمام تر رعنائیاں سمیٹ کر سرِ شام اُبھر آیا تھا۔ ہر شے میں حسین چاندنی کا نور گھل گیا تھا۔ تم پھولوں کی کیاریوں کے پاس کھڑے کوئی نغمہ گنگنا رہے تھے۔ میرے قدموں کی آہٹ ہوئی اور تم جیسے چونک پڑے۔

"شبنم! جانتی ہو حسن کیا ہے؟" اور یکایک میرے قدم من من بھر کے ہو گئے، میری نگاہ ایکدم جھک گئی۔

"حسن قدرت کا ایک عظیم عطیہ۔ عظیم فیضان ہے۔ کیٹس نے کہا ہے۔ "حسن مسرت و شادمانی کا ایک ابدی چشمہ ہے۔ جس کی لطافت و پاکیزگی ہمیشہ بڑھتی ہی رہتی ہے اور کبھی زوال پذیر نہیں ہوتی"۔"

"یہ دیکھو"

تم نے جلدی سے میرے چہرے کو چاند کے سمت موڑ دیا۔

تمھاری گرم گرم سانس میرے چہرہ سے ٹکرائی اور مجھے لگا جیسے میں چاندنی میں نہیں، تیز دھوپ میں کھڑی ہوں۔

"ایک رات میں دو دو چاند........" تم نے ہولے سے

میری ٹھوڑی میں چٹکی لی اور میں پسینہ پسینہ ہو گئی۔

پھر چند روز بعد

میں مسہری پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ تم آہستہ سے کمرہ میں داخل ہو گئے۔

"شبنم! تم نے اس دن وہ چاند دیکھا تھا نا؟"

"آج پھر تمھیں ایک چاند دکھاؤں؟"

میں کچھ سمجھ نہ سکی اور پھر تم نے بڑے ہی ڈرامائی انداز میں میرا چہرہ آئینہ کے سامنے کر دیا اور میرے پورے وجود میں عجیب سی لہر دوڑ گئی میں بری طرح سمٹ کر رہ گئی "پگلی چاند میں تو داغ ہوتا ہے لیکن کچھ چاند........" میں اس کے آگے کچھ نہ سن سکی۔ ایسا لگا جیسے میں بہت سارے شعلوں کی لپک میں گھر گئی ہوں وجود میں نہ جانے کتنی آندھیوں کا شور برپا ہو گیا ہو اور میں اپنا چہرہ چھپا کر وہاں سے بھاگ آئی۔

بڑھتے ہوئے وقت کے ساتھ تمھارے قدم میری جانب تیزی سے بڑھنے لگے۔ کبھی تم میری آنکھوں میں جھانک کر یوں مسکرا دیتے کہ پیار کا سارا امرت مجھ پر چھلک پڑتا۔

کبھی تم میری ٹھوڑی میں ہلکی سی چٹکی لے لیتے اور میرے اندر چنگاری سی بکھر جاتی۔

کبھی تم آہستہ آہستہ میری زلفیں سہلا دیتے اور میری نگاہوں میں کہکشاں رقص کرنے لگتی۔

کبھی تمھارے ہونٹ میری مرمریں باہنوں تک بڑھ جاتے اور میں گھبرا کر پیچھے سرک جاتی۔

کبھی تم آہستہ سے ایسے جملے بول جاتے جس سے میرا پورا وجود جھنجھوڑ جھنجھوڑ اٹھتا۔ دیر تک ایک ٹیس سی محسوس ہوتی رہتی۔

لیکن اُن ہی رنگیں دنوں اور سہانی راتوں میں کچھ دنوں بعد مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میں کسی دوراہے پر کھڑی ہو گئی ہوں ایک طرف چاہت کے تڑپتے مچلتے ارمان، دوسری جانب گھر والوں کا خوف، دوسرے لوگوں کا لحاظ و پاس۔

"اگر کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو؟"
"اگر کسی کو علم ہو گیا تو؟"
"اگر کسی کو بھنک بھی لگ گئی تو؟"

گھر والے۔ باہر والے۔ اعزا۔ احباب!
میں اکثر ایسی الجھن میں غلطاں و پیچاں رہتی۔

لیکن ندیم! تم کو جیسے کسی بات کی پروا ہی نہ ہو۔ تم جیسے ہر وقت میرے ہی تاک میں لگے رہتے۔ کمرہ میں، باورچی خانہ میں، لان میں یا چھت پر جہاں بھی میں ذرا تنہا ہوتی تم فوراً میرے پاس پہنچ جاتے۔

"اونہہ۔ ہٹیے۔"
"کوئی آ رہا ہے۔"
"کوئی دیکھ لے گا۔"
"ارے مجھے جلدی ہے۔"
"چھوڑو بھی۔"

اور کبھی کبھی تمھیں ڈرانے کے لیے میں کہہ دیتی۔
"ابھی چلا دوں گی۔ کہہ دوں گی۔"

لیکن تم جیسے ہر بات سے بے نیاز.... کسی کا ڈر ہی نہ خوف ایک منٹ کے لیے سنجیدہ ہو جاتے۔

"ارے نہیں نہیں خدا کے لیے" تم فوراً ہاتھ جوڑ دیتے۔ دوسرے ہی لمحہ عجیب مسکراہٹ کے ساتھ کہتے۔

"اچھا کیا کہو گی؟"

اور میرے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔

اُف اس دن والی بات، ایسا لگتا ہے دل کے کسی گوشہ میں اٹک کر رہ گئی ہو۔ دل کی ہر دھڑکن بن گئی ہو۔

میں باتھ روم سے ابھی نکلی تھی اور آئینہ کے سامنے بال سنوار رہی تھی کہ تم کمرہ میں دبے پاؤں گھس آئے۔ دو چشم بد دور، تم نے میرے کانوں کے نزدیک بال الجھتے گئے۔ پھر تم نے مجھے بھرپور آئینہ کے سامنے لیا۔ سرخ پھولدار غرارہ، ویسا ہی چست جمپر، جمپر کے کھلے ہوئے بٹن۔ بکھرے بکھرے بال۔ اُبھرے اُبھرے خدوخال میں نے ایک نظر آئینہ پر ڈالی پھر گھبرا کر آنکھیں موند لیں۔ تم نے جلدی سے بالوں میں تازہ گلاب سجا دیا اور ہینگر پر پڑا ہوا امیر امرخ دوپٹہ اس انداز سے اوڑھا دیا کہ میں مسلم اس میں ڈھک گئی پھر دوسرے ہی لمحہ تم نے میرا گھونگھٹ سرکا کر میرا چہرہ ذرا اوپر اٹھا کر ٹھوڑی میں ایک ایسی چٹکی لی کہ میرا پورا وجود بُری طرح کسمسا کر رہ گیا اور میں اپنا ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ ٹھیک اسی وقت دروازہ پر آہٹ ہوئی اور تم جلدی سے مجھے چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

ندیم! میرا جی چاہتا تھا کہ یہ ساعت کبھی ختم نہ ہو۔ یہ ڈرامہ یوں ہی چلتا رہے لیکن مجبوراً جلدی سے میں نے وہ پھول چھپا لیا۔ کپڑوں کی شکن کو ٹھیک کر لیا اور اس کے قبل کہ تم کمرہ سے نکلو میں خفگی کے انداز میں بولی۔ "اب بات حد سے آگے بڑھ چکی ہے۔ اب مجھے کہنا ہی پڑے گا۔ آج امی سے ضرور..." اتنے میں بڑی پھپھی کمرہ میں داخل ہوئیں تم نے آرام کرسی پر پھیل کر یوں آنکھیں بند کر لیں جیسے دیر سے سو رہے ہو اور میں بھی ایسی گم سم بیٹھ گئی جیسے مجھے سانپ سونگھ گیا ہو۔ پھر ذرا سی دیر میں تم نے پھپھی کے قدموں کی آہٹ سے چونکنے کی ایکٹنگ کی اور اٹھ کر باہر چلے گئے اور تمہاری یہ ادائیں دیکھ کر میں دل ہی دل میں مسکرا پڑی۔

"آج تم کس قدر پریشان ہو گئے۔ ڈر کے مارے تمہاری حالت خراب ہو گی۔ کتنے خدشے، کتنے وسواس تمھیں گھیرے ہوں گے۔ لوگوں کے سامنے تم نگاہیں نہ ملا سکو گے۔" میں سوچتی رہی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی رہی۔ لیکن یکایک میرے سارے خیالات بالو کی دیوار کی طرح ڈھیر ہو گئے۔

"ندیم! کہیں چلے گئے۔"

شام کے کھانے پر کسی نے بتایا اور مجھے لگا جیسے دل پر بجلی سی گر پڑی ہو۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیل گیا ہو۔

ندیم! تمھیں گئے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا لیکن نہ جانے کیوں ایسا لگتا ہے جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ گھر کی ہر چیز جیسے مجھے ڈسنے جاتی ہے۔ ہر طرف عجیب سی اداسی، عجیب سی ویرانی

بقیہ صفحہ ۴۳

نجمہ اخلاق

راہ فرار

میجر ودیا ساگر ایک خوشحال زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ویسے ان کا آبائی مشترکہ عالی شان مکان تو تھا ہی مگر دوران ملازمت ان کا زیادہ تر انگریز افسران سے سابقہ رہا۔ اس وجہ سے انکی وضع، قطع لباس و طعام سب پر انگریزیت کی اس درجہ چھاپ لگ چکی تھی کہ پرانی وضع کے مکان میں رہنا انھیں پسند نہ آیا چنانچہ آبادی سے قدرے دور ایک پُرفضا مقام پر طرز جدید کی ایک خوبصورت کوٹھی "ودیا بھون" بنوا کر وہ فوجی ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد اپنے اہل و عیال کے ساتھ اس میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

اس شب ان کی بڑی لڑکی سردھا کی سالگرہ کے موقع پر ودیا بھون میں مہمانوں کا ہجوم تھا۔ کوٹھی کے اندر اور باہر خوب چہل پہل تھی۔ یوں تو پوری کوٹھی سجی بنی دلہن بنی ہوئی تھی۔ مگر وسطی ہال کو خصوصیت کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ بجلی کے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگی قمقمے منقش جھالریں بیلیں، پھول اور مختلف رنگوں کے راڈ سے ساری کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔

اتفاق کہئے کہ دو گھڑی رات گزرنے پر موسم یکایک تبدیل ہو گیا۔ ہوا کے تیز جھونکے چلنے لگے۔ ذرا دیر بعد بڑے بڑے اولے گرنے لگے۔ اولے تھمے تو موسلا دھار بارش ہونے لگی جس کا سلسلہ بہت دیر تک قائم رہا۔ ماحول یکایک یخ بستہ ہو گیا جس نے مہمانوں میں بدمزگی پیدا ہو گئی۔

تقریباً گیارہ بجے ہوں گے میجر ودیا ساگر بڑے کمرے میں صدر دروازہ سے ملحق آتش دان کے قریب بیٹھے اپنے چند پرانے دوستوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھے وقفہ وقفہ سے موسم کی ناخوشگواری کا بھی گلہ کرتے جاتے تھے۔ کافی کا دور چل رہا تھا کہ کھٹ کھٹ کی آواز انھیں سنائی دی۔ انھوں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ تیس بتیس سال کے ایک صاحب جن کے کپڑے پانی میں تربتر تھے کھڑے سردی سے کانپ رہے تھے اس سے قبل کہ آنے والا کچھ کہے انھوں نے انسانیت کے تقاضے سے مجبور ہو کر اس شخص کو کمرے میں تقریباً کھینچ لیا اور آتش دان کے قریب پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھنے کو کہا پھر خود ہی گرم کافی کی ایک پیالی اسے پیش کی نو وارد نے تشکر آمیز نظروں سے میجر صاحب کو دیکھتے ہوئے کافی کی پیالی لے لی اور آتش دان کے اس گوشہ میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا جہاں نسبتاً کم روشنی تھی۔

ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی اس کے کپڑے تقریباً سوکھ چلے تھے اور وہ اپنے حواس مجتمع کر چکا تھا۔ کہ دروازہ کی کال بل بجی اس بار پھر میجر ودیا ساگر ہی نے دروازہ کھولا ایک شخص جس کا لباس موسم کی ناخوشگواری کی شہادت دے رہا تھا۔ وہ تقریباً چالیس سال کا گٹھے ہوئے جسم، طویل قامت خونخوار آنکھوں والا خاکی وردی میں ملبوس، طرے دار پگڑی باندھے ایسا شخص تھا جس کے محض دیکھ کر انھیں اپنی فوج کا وہ بکر قصاب یاد آ گیا جو ٹھیکیدار کی طرف سے فوجی افسران کے کچن کے لئے گوشت سپلائی کرنے پر مامور تھا۔ اس نے تن کر فل بوٹ ٹھوکر کاتے ہوئے انھیں فوجی سلام دیا جواب سلام دیتے ہوئے انھوں نے اسے بھی بادل ناخواستہ پناہ

دیدی۔ اس نے میجر صاحب سے عرض کیا کہ وہ خاص سرکاری کام کی انجام دہی میں منزل جیل جا رہا تھا۔ اثنائے راہ میں موسم کی یکایک تبدیلی کے باعث وہ پناہ لینے پر مجبور ہوا اور اس بے محل تکلیف دہی کے لئے وہ معذرت خواہ ہے۔ اسے بہرحال صبح ہونے سے پہلے جیل پہنچ جانا چاہیے۔

وہ شخص بڑا باتونی نکلا ان لوگوں کے ساتھ جو اس تقریب میں شریک تھے وہ کچھ بے جوڑ سا لگ رہا تھا۔ یہاں بیٹھنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس کے لطیفے اور چٹکلے جو شروع ہوئے تو ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتے تھے جن سے بہرحال پچھلے نو وارد کا وقت اچھا خاصا کٹ رہا تھا۔ آتشدان کی گرمی سردی اور ٹھٹھرن کی شدت سے اسے نجات دلا دی تھی اس کے کپڑے بالکل سوکھ چکے تھے۔ فوجی کے لطیفوں سے خاصا لطف اندوز ہو کر وہ قہقہے لگا رہا تھا۔

ان تمام لطائف اور چٹکلوں اور دیگر باتوں میں تقریباً دو گھنٹے گزر گئے۔ دیوار پر لگے ہوئے کلاک نے بارہ بجائے ساتھ ہی دروازہ کی کال بیل کی آواز نے سبھوں کو ادھر متوجہ کر دیا بار بار کی خلل اندازی سے کبیدہ خاطر ہو کر میجر دتیا ساگر کی زبان سے چند غیر پارلیمانی الفاظ نکل گئے۔ پھر بھی انھوں نے اکتاہٹ کے باوجود دروازہ کھول ہی دیا .... ایک نوجوان بارش سے شرابور، کپڑوں میں کھڑا رحم طلب نظروں سے انھیں تک رہا تھا۔ انسانیت اور شرافت کے تقاضے سے مجبور وہ اسے بھی پناہ دینے پر مجبور ہو گئے۔ گو وہ آؤ بھگت رخصت ہو چکی تھی جو پہلے نو وارد کی آمد کے موقع پر انھوں نے کی تھی۔

سب سے آخر میں آنے والے نوجوان کی نظروں نے وہاں بیٹھے ہوئے تمام آدمیوں کا فرداً فرداً جائزہ لیا۔ آخر کار اس کی نگاہیں پہلے نو وارد کی نظروں سے ٹکرا کر ٹھٹھک سی گئیں جو آتش دان کے اس گوشہ میں بیٹھا تھا جو نسبتاً کم روشن تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ پھر نہ جانے اس کا رنگ کیوں متغیر ہونے لگا۔ یہ سب ہو ہی رہا تھا کہ سائرن کی بلند صدا نے ہر فرد کو اپنے مقام پر چونکا دیا۔ یہ جیل کا سائرن تھا۔

بارش کم ہو چلی تھی۔ لیکن ہوا بہت تیز چل رہی تھی تند ہوا کے دوش پر تیرنے والے سائرن کی بعدی آواز اس امر کا اعلان کر رہی تھی کہ جیل سے کوئی قیدی فرار ہو گیا ہے۔ آخر میں آنے والا شخص گرم اور بند مقام پر رہتے ہوئے بھی کپکپا رہا تھا۔ جیسے اس پر بدحواسی طاری ہو۔ سائرن بجتے رہنے کے درمیان ہی پہلا وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا کہ بارش ختم ہو چکی ہے۔ اب چلنا چاہیے۔ بہت بہت شکریہ۔

لطیفہ ناتمام چھوڑ کر گل مچھوں والا شخص "مفرور" "مفرور" کہتا ہوا دروازہ کی طرف لپکا۔ اس افراتفری میں مہمانوں اور گھر والوں میں سنسنی سی پھیل گئی۔ میجر صاحب بھی لپک کر باہر چلے تو گل مچھوں والا شخص ان سے مخاطب ہوا۔

"دیکھیے حضور! میں سرکاری ملازم ہوں اور آپ بھی فوجی افسر رہ چکے ہیں۔ قانون عدالت کی نزاکتوں کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ اس لئے مفرور کی تلاش میں جو بھی امکانی مدد ہو سکے اس سے دریغ نہ کیجئے۔"

"ہاں، ہاں بھئی میں جانتا ہوں مفرور مدد کے لئے ہر طرح سے تیار ہوں"

"مجھے شبہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ مفرور وہی نوجوان ہے جو تھوڑی ہی دیر پہلے ہم سبھوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔"

چنانچہ میجر صاحب کے ملازموں اور ان لوگوں پر مشتمل ایک دستہ جو ان کے فارم پر کام کرتے تھے لاٹھیوں، بلموں، بندوقوں، اور ٹارچوں سے لیس ہو کر گل مچھ شخص کی سرکردگی میں اس نوجوان کی تلاش میں نکلا ان سب پر میجر صاحب کی تاکید کے پیش نظر ان کے اور دو خاص آدمی معین کئے گئے۔ بڑی تلاش کے بعد بھی کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ آخر کار میجر صاحب کے فارم کے چند خاص کارکنان جو گرد و نواح کے جغرافیہ سے پوری طرح واقف تھے انھوں نے دستہ میں شامل ہو کر تلاش شروع کی اور گل مچھ کی شناخت پر اس نوجوان کو سرکنڈے والے نالے سے پکڑ کر اپنی گرفت میں لے لیا۔ جہاں وہ چھپا بیٹھا سردی سے کپکپا رہا تھا۔

جب تلاش پر جانے والی پارٹی بغیر مفرور کے دو آدمیوں
واپس لوٹی تو حالات کا انکشاف دوسرے طور پر ہوا۔ رسیوں میں
جکڑے ہوئے نوجوان نے میجر صاحب کی دہائی دیتے ہوئے کہا کہ
وہ قیدی نہیں ہے نہ ہی وہ جیل سے فرار ہوا ہے۔ میجر صاحب کے
سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے مزید کہا کہ میرے فوری خوف
کا سبب سائرن کی آواز نہیں تھی بلکہ اپنے بڑے بھائی کا مطمئن
چہرہ دیکھ کر اضطرابی کیفیت پیدا ہوئی تھی جسے سنٹرل جیل
میں علی الصباح پھانسی دی جانے والی تھی، اور جو جیل کی چہار
دیواری کے اندر اپنی تاریک کوٹھری کے بجائے آتش دان کے
نسبتاً کم گوشہ میں … سے بچا لطیفوں سے محظوظ ہو کر خوش
گپیوں میں حصہ لے رہا تھا۔ میں اس کی لاش لیجانے کے واسطے قبل
از وقت سنٹرل جیل پہونچ جانا چاہتا تھا لیکن بارش کی وجہ
سے ......" اس مقام پر وہ ٹھہر گیا۔ اور حواس مجتمع
کرنے کے بعد پھر گویا ہوا ...... میرے چہرے کی بدلتی
ہوئی رنگت، تھرتھراتا ہوا جسم اور زبان کی لکنت ممکن
تھا کہ اس راز کو فاش کرنے کا سبب بنتی ...... میرا بھائی جو
آزادی کی فضا میں آزاد انسانوں کی طرح محفوظ مقام پر بیٹھا
تھا۔ لوہے کی سلاخوں کے درمیان آہنی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں
پہنے دوبارہ نظر آتا۔ اس لئے جہاں تک ممکن تھا میں اس مقام
سے جلد از جلد دور ہو جانے کی کوشش کی جہاں میرا اکھڑ وجود اس
کی آزادی میں رخنہ انداز ہونے پر آمادہ تھا۔ "یہ تو تم واقعات کی
کڑیاں جوڑ کر بڑی چابکدستی سے اپنی صفائی کی راہ نکال رہے
ہو۔ یہ کوئی ٹھوس ثبوت نہیں،" گل مچھوں والا شخص بولا۔
"اسے اپنے بیانات ختم کر لینے دو،" میجر دریا ساگر بولتے "ہاں
تم اپنا بیان جاری رکھو" اس نے سلسلہ کلام جاری کیا۔ "جی ہاں،
تو اس وحشت سائرن کی آواز سے ہی یقین کی حد تک پہونچ گیا
کہ وہ میرا بھائی ہی ہے۔ اور میں موقع پا کر فوراً کھسک گیا۔ اب اگر آپ کو
میری باتوں کا یقین آئے تو ٹھیک ہے ورنہ میں سنٹرل جیل چلنے کو تیار
ہوں جہاں میری شناخت ہو سکتی ہے،"

میجر اور خاکی وردی والے گل مچھوں کی نگاہیں مثلاً اس کرسی
پر پڑیں جو آتش دان کے گوشہ میں تھی جس پر پہلا نو وارد آ کر بیٹھا تھا
اب یہ تفتیش ہونے لگی کہ کب اور کس طرح وہ آدمی یہاں سے چل
دیا۔ میجر صاحب کا خاص ملازم جو بار بار وہاں ضرورت سے آ جا رہا
تھا اس نے اس بات کی تصدیق کی کہ تلاش پارٹی کے ساتھ کوٹھی
سے نکلتے ہوئے اس آدمی کو خود اس نے ہاتھ میں بلم لیکر سب کے
ساتھ دیکھا تھا۔ بعد میں وہ کس جگہ اور کب دستے سے علاحدہ ہو کر
کہاں چلا گیا، کسی کو کچھ نہیں معلوم۔

مشتبہ نوجوان کو ایک کمرے میں مقفل کر کے دو مضبوط
آدمیوں کو پہرے پر بٹھا دیا گیا۔ اور پارٹی دوبارہ اصل قیدی
کی تلاش میں تقریباً رات بھر سرگرداں رہی۔ مگر تلاش بسیار کے بعد بھی
اس کا کوئی سراغ نہ لگ سکا۔ علی الصباح میجر صاحب، نوجوان
اور گل مچھے کو موٹر میں بٹھا کر سنٹرل جیل لے گئے۔ افسران سے
مل کر رات کا پورا واقعہ تفصیل سنایا اور اسے ان کے روبرو پیش
کیا گیا۔ خاکی وردی والا جلاد نکلا۔ نوجوان کے سلسلہ میں جیل کی
مہیا کی ہوئی تصویر اور رجسٹر شناخت میں درج شدہ حلیہ کے
تقابل کے بعد نوجوان آدمی مفرور قیدی نہیں ثابت ہو سکا۔
سبھوں کا خیال اس پر مرکوز ہو گیا کہ ہو نہ ہو وہی پہلا نو وارد
قیدی ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی ہمت اور استقلال قابل داد تھی
کہ اس نے سبھوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کے اپنی راہ فرار
کو کتنا آسان بنا لیا۔

بقیہ صفحہ ۱۲ کا

معلوم ہوتی ہے۔ کبھی کبھی شام کے دھندلکوں میں، شمع کی مدھم روشنی
میں، چاند کی سیمابی چادر میں، پھولوں سے لدی ڈالیوں میں مجھے تمہارا
عکس اتنا صاف نظر آ جاتا ہے کہ میں بیقرار ہو جاتی ہوں۔ میری نگاہیں
تمہیں یوں ڈھونڈنے لگتی ہیں جیسے تم یہیں کہیں چھپے ہوئے ہو۔

رات ایکدم تاریک ہے، ایکدم اداس!
ایسا لگتا ہے جیسے دل کی ساری شمعیں ایک ایک کر کے بجھ گئی

لیلیٰ لکھنوی

زندگی کا درد

اب تو اُسے دکھ سے شکوہ تھا نہ شکایت تھی اُس کا دل ہر درد ہر آرزو ہر تمنا سے بے نیاز اور بے گانہ سا ہو چکا تھا جیسے تڑپ تڑپ روتے روتے محرومیوں اور غموں کا عادی ہو گیا تھا۔ . .

کیسی بے کسی تھی!

کیسی مجبوری! اُس نے حسرت بھری ڈبڈبائی نگاہوں سے پلنگ پہ لیٹے لیٹے باہر کھڑکی کی طرف دیکھا ہر طرف خاموشی اور اندھیرا چھایا ہوا تھا دور آسمان پر ایک تنہا تارہ چمک رہا تھا شاید کسی کا منتظر تھا۔

اُس کے ذہن کے قرطاس پر چند یادیں ابھریں. . . . اُس کی زندگی کا مختصر سفر جس میں بہت سی موڑ آئے . . . میں کچھ خوشیاں بھی تھیں، مسکراہٹیں بھی، قہقہے بھی اور پیار کے لمحے بھی، اور پھر اُس کی زندگی میں کس قدر دُکھ آئے، غموں کی آندھیاں چلیں اور اس کا سفینۂ حیات اِدھر سے اُدھر تھپیڑے کھاتا ساحل کے لئے ترستا پھرا کیسی بے چارگی کا عالم تھا!! آج . . . چمکنے والا تارا اُبھر چکا اُس کی نگاہ کا زاویہ بدل گیا دبے پاؤں چپکے چپکے وہ یادوں کے ویرانے میں پہنچ گئی. . اُس کی نگاہوں کے سامنے ماضی کی دھندلی دھندلی پرچھائیاں. . . . . بکھرنے لگیں۔

اُس کا اپنا پیارا سا خوبصورت گھر جس میں اُس نے جنم لیا تھا آنکھیں کھولی تھیں۔

والدین کی لامحدود محبت اور شفقت میں بچپن گزرا تھا جوانی کی بہاریں دیکھی تھیں پھر شہنائیوں کے نغموں کے ساتھ جب وہ بابل کا گھر چھوڑ کر پیا کے گھر آئی تو رخصتی کے وقت اُس کی ماں نے اُسے گلے لگا کر رندھے ہوئے گلے اور گلوگیر آواز سے کہا تھا "فریدہ آج تک تم ہماری تھیں یہ گھر تمہارا تھا۔ مگر اب تم فاروق کی ہو۔ اُسی کے قدموں کے نیچے تمہاری جنت ہے اُسی کا گھر تمہارا گھر ہے اور اُسی کی خوشی تمہاری زندگی میری بات نبھانا" اور وہ روتی ہوئی اپنے گھر سے ہزاروں میل دور فاروق کے گھر آئی تھی اس کا گھر آباد کرنے۔

اپنی دنیا بسانے۔ ایک نئی زندگی کی ابتدا کرنے۔

جس دن وہ سرخ سنہرے ستاروں والا جھلملاتا ہوا شادی کا جوڑا پہنے، مانگ

غزل

قیصر جہاں مرحومہ

یہ عجب بات ہے جب ہم نے تیرا نام لیا
درد کچھ ایسا اُٹھا ہم نے جگر تھام لیا

درو دیوار سے سر پھوڑ کے مر جاؤں گی
تو نے گر ترچھی نگاہوں سے یونہی کام لیا

ٹھوکریں کھائیں تو پہنچے در میخانہ تک
خون دل بن گیا ہم نے جو کوئی جام لیا

اے فلک یاد رہا اُن کی نگاہوں کا اثر
درد دل سے تو زمانے میں نہ آرام لیا

حسن اس بت کو ملا اور جفا ساتھ ملی
میری قسمت نے آخر دل ناکام لیا

کیوں مسیحا نہ کہوں میرے جلانے والے
ہاتھ نے تیرے تڑپتا ہوا دل تھام لیا

(عطیہ لیلیٰ لکھنوی)

میں ہتھیلی انفعال لگائے، مہکتے پھولوں اور موتیوں سے لدی ہوئی ہزاروں معصوم ارمان اور تمنائیں لیے فاروق کے گھر آئی تھی تو پھولوں اور موتیوں کی لڑیوں کے نیچے دبا ہوا اس کا دل ہر ذرا سی آہٹ پر چونک جاتا بلیوں اچھلنے لگتا۔ جب وہ آہستہ قدم کمرے میں داخل ہوا تو وہ اور سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ ماتھے پر بے شمار پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے اس نے سہم کر اپنی سیاہ پلکوں کی چلمن کے پردے گرا دیے۔

فاروق نے سرخ جھلملاتے ہوئے شعلہ جوالا پہ ایک نگاہ ڈالی۔ قریب آ کے چہرے پر سے دوپٹہ سرکایا ... سانولی سلونی، خوابیدہ غلافی آنکھوں والی، دبلی پتلی، سرو قد لڑکی نے اس کے ہوش اڑا دیے وہ اس کے دل و دماغ اور احساسات کی دنیا پر چھا گئی۔ اس کی رگ و پے میں سما گئی کتنے پیارے تھے زندگی کے وہ حسین لمحات۔ اس گھر کا کونہ کونہ اس کے قہقہوں سے گونج اٹھا تھا بارسنگار کے درخت کے گہرے نارنجی مہکتے ہوئے پھولوں کے تلے اس کی زندگی کے کتنے لمحات گزرے تھے ـــ پھر اس کی زندگی میں ایک ننھا سا گلاب کا جیسا پھول کھلا تھا... جو فاروق کی محبت کی نشانی تھا... وہ دن کتنے پیارے تھے کتنے حسین لیکن کچھ عرصہ بعد...

اس کے اور فاروق کے درمیان ایک دیوار سی پڑ گئی جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے بڑھتے خلیج بن گئی ..

یہاں تک کہ وہ اس کے سائے سے بھاگنے لگا اس کی صورت دیکھ کر اس کا موڈ خراب ہو جاتا... بات بات پر وہ جھلا اٹھتا....

وہ خاموش بغیر کسی گلہ یا شکایت کے اندر ہی اندر کڑھتی... سلگتی رہتی...

اس بڑھتی ہوئی کشیدگی کی ذمہ دار نزہت بھابی تھیں۔ جس دن وہ پہلی بار اس کے گھر آئیں تھیں اس دن نزہت بھابی کے سوگوار سفید لباس، اشکبار سرخ آنکھوں، خستگی ماندگی نے فریدہ کو بے حد متاثر کیا تھا۔ ان کے غم کو اس نے اپنا غم سمجھا تھا۔ ان کے ساتھ بیٹھی روتی رہی تھی اپنے آنچل سے ان کی آنکھیں خشک کرتی رہی تھی۔ مگر کچھ عرصے کے بعد ان کی قسمت کا ستارہ گردش میں آ گیا۔ اس کی کائنات ظلمتوں میں گھر گئی، گھر کا سارا انتظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔

اس کی آرزو اور خوشیوں کے نشیمن کو جس کو اس نے بڑے چاؤ اور حسرتوں سے ایک ایک تنکا چن کر تعمیر کیا تھا اس پر نزہت بھابی بجلی بن کر گریں اور ایک آن میں اس کو جلا کر خاکستر کر دیا اس کی چاہت کے چمن کے ایک ایک غنچے کو اپنے قدموں سے روند ڈالا اور اس کی جنت جو فاروق کے قدموں کے نیچے آباد تھی اس کو جہنم بنا دیا۔

کہاں گئی اس کی جنت؟ وہ آرزوؤں کا چمن... اس کی خوشیوں کا نشیمن؟ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا اس کا ایک ایک نقش مٹ کر رہ گیا۔ سوائے راکھ کے ڈھیر کے... جس کے نیچے اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا جنازہ دفن تھا جس پر غموں کے گھنگھور سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اور اس کا وجود ویرانیوں اور تنہائیوں میں اکیلا بھٹک رہا تھا۔

نزہت بھابی فاروق کے دور کے رشتہ کے بھائی کی بیوہ تھیں۔ اور فاروق نے ان کو سہارا دیا تھا ـــــ رفتہ رفتہ وہ سہارے کے علاوہ کچھ اور بھی چاہنے لگیں ان کی سوئی ہوئی جوانی انگڑائیاں لینے لگی

راتیں جاگتے... گزرنے لگیں دیکھتے ہی دیکھتے ان کی چال ڈھال رہن سہن کے طریقے بدلنے لگے، بات چیت، ہنسی مذاق کے انداز بدل گئے اور برسوں کے بعد ایک بار پھر ان کے جسم کے اندر بیٹھی ہوئی عورت جاگ اٹھی۔ ان کا دوپٹہ سر سے سرک کر سینے سے نیچے آ گیا اور ان کا ڈھکا چھپا حسن نگاہوں کو از خود رفتہ کر گیا۔ ان کی اشکبار نگاہیں مسکرا اٹھیں جیسے کوئی کھوئی ہوئی خوشی انھیں مل گئی ہو۔ ان کے لبوں کی آہیں نغموں میں بدل گئیں وہ جس طرف سے گزرتیں جدھر جاتیں وہ جگہیں مہک اٹھتیں ان کے سفید کپڑوں کا رنگ بدلنے لگا۔ ایک بار پھر انھیں رنگوں سے عشق ہو گیا۔ گلابی، نارنجی، کاسنی، آبی سبھی رنگ انھیں بھا گئے اور ہر رنگ میں ان

کی جوانی کے رنگ اُبھر آئے اُن کا حُسن نکھر آیا۔ فاروق کو نزہت بھابی میں ایک عجوبہ انگڑائی لیتی نظر آنے لگی جو ہر وقت غنچۂ دل کھلا دینے والی سحر انگیز دلربا مسکراہٹ سے مسکراتی رہتی تھی وہ سوچنے لگا اُن کی جوانی سوگ منانے کے لئے نہیں بلکہ زندگی کی بہاریں دیکھنے کے لئے تھی۔ وہ فاروق کی راہ میں بچھ گئیں اور دل و جان سے اپنا سب کچھ نچھاور کر بیٹھیں۔۔۔ وہ پتھر کے بت کی طرح خاموش سب کچھ دیکھتی رہی اُس کے اپنے گھر میں اس کو اپنا وجود اجنبی سا محسوس ہونے لگا جیسے وہ زبردستی اُن کی زندگی اور خوشیوں میں مخل ہو رہی تھی۔ جیسے وہ ایک کانٹا تھی جو راہ میں پڑی ہوئی تھی۔

اُس کے سارے شکوک و شبہات اُس رات یقین میں بدل گئے جب رات گئے نزہت بھابی چوروں کی طرح دبے پاؤں اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی اپنے بستر سے اُٹھیں اور فاروق کے کمرے میں گھس گئیں۔ وہ بھی کچھ لمحے بعد ہمت کر کے اُن کے پیچھے پیچھے گئی اور کھڑکی کے شیشے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ پھولوں کی لچکتی ہوئی ڈال کی طرح فاروق کی آغوش میں گر گئیں فاروق کی جذبات سے بوجھل سی آواز آئی " اُف۔ کب سے تڑپ رہا ہوں کتنی دیر سے انتظار کر رہا ہوں آج تو تم نے میری جان لے لی!"

" کیسے آتی۔۔۔ فریدہ جاگ رہی تھی" وہ بولیں۔

" فریدہ فریدہ تم کب تک اُس سے ڈرتی رہو گی؟ وہ تو ہماری راہوں میں ایک کانٹا بن گئی ہے۔ میں کب تک روزانہ یونہی انتظار کی گھڑیاں گنتا رہوں گا؟"

" وہ تمہاری بیوی ہے اور مجھے اپنی بدنامی کا ڈر ہے"

" میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔ کیا اب بھی تمہیں میری محبت کا یقین نہیں۔۔۔ بولو؟"

" کیا بولوں؟"

" اپنی وفاؤں کا صلہ چاہتا ہوں"

" سب کچھ تو تمہیں نذر کر دیا اب اور میرے پاس دینے کے لئے کیا باقی بچا ہے؟۔ کہو تو جان بھی دے دوں؟"

" تمہاری جان تو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے تم نے تو میری زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی ہے مجھے میری منزل تک پہنچا دیا ہے"

اور فریدہ۔ اُلٹے قدم دیوار کا سہارا لئے لوٹ آئی اُس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا سا چھا گیا نسیں کھنچنے لگیں۔ جیسے جسم کے اندر کوئی شے ٹوٹ گئی اور شیشۂ دل کے ٹکڑے اس کی رگ رگ میں پیوست ہو گئے اُس نے اپنی سوتی ہوئی بچی کو سینے سے چمٹا لیا۔۔۔ نہیں اب یہ ہی اس کا سرمایۂ حیات تھا باقی تو سب کچھ اُس سے نزہت بھابی نے چھین لیا تھا۔۔۔ اُس کا جی چاہا وہ خوب چیخیں مار مار کر روئے مگر وہ چیخ نہ سکی جیسے اُس کی قوت گویائی سلب ہو گئی تھی اور اس واقعہ کے بعد سے وہ بجھی بجھی، کھوئی کھوئی ویران سی رہنے لگی اُس کے لبوں پر مہر خاموشی لگ گئی یہ تو اپنا اپنا نصیب تھا۔۔۔ تقدیر تھی۔۔۔ آن کی آن میں اُس کی زندگی کی خوشیوں اور تمناؤں کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا اب کسی سے کوئی گلہ نہ تھا، کوئی شکایت نہ تھی۔ کسی کا دامن خوشیوں سے بھر جاتا ہو کوئی ہمیشہ کے لئے محروم تمنا ہو جاتا اور در بدر بھٹکتا پھرتا ہے ٹھکراتا رہتا ہے۔

اُسی صبح نزہت بھابی نے غسل کر کے اپنے گیلے بالوں میں پھولوں کا ایک گجرا بنا کر لپٹا تھا وہ جدھر سے گزرتیں تھیں وہ راہیں خوشبوؤں سے مہک اٹھتی تھیں۔ انھوں نے مسکرا کر فاروق سے کہا تھا۔

" نجانے کیوں مجھے پھولوں سے اسقدر پیار ہے جب بھی میں پھول دیکھتی ہوں انھیں اپنے گلے کا ہار بنا لیتی ہوں"

فاروق کی آواز آئی تھی" پھول اسی لئے تو کھلتے ہیں کہ کوئی انھیں اپنے گلے کا ہار بنائے"

اور اُس کو اپنے گلے میں صلیب سی لگتے محسوس ہوئی تھی جیسے فاروق اور نزہت بھابی دونوں نے مل کر اُس کا گلا گھونٹ دیا ہو اور اُس کے لہو سے اپنے ہاتھوں کو

رنگ لیا ہو اُس دن سے اُسے پھولوں سے بھی نفرت سی ہو گئی جب بھی اُس کی نگاہ پھولوں سے لدی کیاریوں پر جاتی اُس کو نزہت بھابی کے بالوں کا مہکتا ہو گجرا یاد آجاتا! اُن کی مسکراہٹیں اُن کے قہقہے، ناز و انداز پرچھائیوں کی طرح اُس کا تعاقب کرتے۔ اُس کی گھٹن بڑھتی گئی غم بڑھتے گئے یہاں تک کہ چپکے چپکے سسکتے وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔

مگر فاروق کی سرد مہری اور بے نیازی بدستور قائم رہی وہ کونسی خطائیں تھیں، کون سے ایسے سنگین گناہ تھے جن کا کفارہ وہ اِس بے کسی اور بے بسی کے عالم میں تڑپ تڑپ کرادا کر رہی تھی؟ جن کی کوئی حد نہ تھی، کوئی اختتام نہ تھا، کوئی انتہا نہ تھی۔! اب فاروق اور نزہت بھابی اُس کی پرچھائیں سے دور بھاگتے تھے۔ کیوں کہ ٹی بی کے مریض سے دور رہا جاتا ہے اور اسی لئے فوزیہ کو بورڈنگ میں داخل کر دیا تھا اور اُس کو میکے بھیج دیا گیا تھا جب اُس نے آخری بار اپنی بچی سے خدا حافظ کہا تھا۔ تو باوجود بے انتہا ضبط کے اُس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں تھیں اُس نے گھٹتی ہوئی آواز سے کہا تھا — فوزیہ اگر زندگی نے وفا کی تو پھر ملیں گے خدا تمھاری حفاظت کرے" اور اُس نے روتے ہوئے اپنا ننھا سا ہاتھ ہلا کر ماں کو الوداع کہی تھی اُس کا ننھا سا دل و دماغ یہ سوچنے سے قاصر تھا کہ اُس کی ماں کیوں رو رہی ہے وہ خود تو اس لئے رو رہی تھی کہ ڈیڈی اُس کو بورڈنگ میں رکھنے پر بضد تھے اور وہ اپنے ماں و باپ سے دور ڈارجیلنگ کے کانوینٹ میں داخل کی جارہی تھی — اُس کے جانے کے بعد زندگی میں پہلی بار فریدہ چیخ کر روئی تھی اور جی بھر کر روئی تھی اور جب فاروق نے اُس کو اُس کے میکے بھیج دیا —

تو اُس نے سر جھکا کر اس کا یہ بھی فیصلہ اور حکم تسلیم کر لیا اس کی زندگی کے جام میں جو زہر گھل چکا تھا اس کا اثر تو ہو چکا تھا اب وہاں رکھا ہی کیا تھا... ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا تھا وہ کسی آن بھی ہوا کے ایک جھونکے سے زمین پر آجاتا...

آج سے سات سال قبل وہ انھیں راہوں پر سے فاروق کے ساتھ ساتھ شانہ بشانہ دوش بدوش اپنے دھڑکتے ہوئے دل میں ارمانوں کی ہزاروں شمعیں روشن کئے گزری تھی انھیں راہوں نے اُسے اُس کی منزل تک پہنچایا تھا — شہنائی کے نغموں کی گونج اُس کے کانوں میں آنے لگی وہ رلا دینے والی بابل کی دھن جس کو سنکر وہ خود بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ بلک بلک کر روئی تھی — اور آج وہ خالی ہاتھ فاروق کے حکم پر اپنے دل کے آبلوں اور زخموں کو چھپائے آنکھوں میں محرومیوں کا بیکراں سمندر لئے واپس میکے جارہی تھی وہ جانی پہچانی راہیں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں، اور بار بار سوال کرتی تھیں کہ کیا یہ وہی دلہن ہے جو سُرخ جھلملاتے لباس میں اپنے ہمسفر کے ساتھ اِدھر سے کبھی گزری تھی؟ جس کے جسم اور سہرے کی لڑیوں کی مہک سے فضائیں بوجھل ہو گئی تھیں۔

کیا یہ وہی دلہن ہے جس کو لوگ آج اپنے کندھوں پر اٹھائے لا رہے ہیں یہ کس جوان کی لاش ہے؟ کیا اسی انداز سے دلہنیں اپنے میکے آتی ہیں؟.....

دفعتاً اُس کی آنکھوں کے نیچے بلا کا اندھیرا چھا گیا پسینے سے سارا جسم بھیگ گیا یادیں دم توڑنے لگیں دور سے اُس کے باپ کی ہوئی ضعیف آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی "فریدہ میری بچی میں تمہارے ساتھ ہوں ہم سب تمہارے ساتھ ہیں گھبراؤ نہیں اب تو تم اپنے گھر آگئی ہو" جواب میں وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اُس کی آواز نے اس کا ساتھ نہ دیا۔

اب اُسے اس جہان سے نہ کچھ لینا تھا نہ دینا تھا ہر چیز پر دھند چھا گئی اور بغیر کسی کرب و اذیت اور بے چینی کے ایک بچے کی طرح اُس نے آنکھیں بند کر لیں.....

ایک لمحے کے اندر اُس کا چہرہ بدل گیا — اُس کے خشک لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ رقصاں تھی اور چہرے پر فرشتوں کی سی پاکیزگی چھا گئی۔

دور صبح کا تارا ڈوب رہا تھا۔ پاس ہی کی کسی مسجد سے اللہ اکبر کی دلنشین آواز فضا میں گونج اُٹھی — اور آسمان پر فرشتوں نے جنت کے دروازے کھول دیئے تھے۔

نعیم عثمانی

بے وقت کی بات

ہم میں نے دل میں مچلتے ہوئے جذبات لئے اپنے سہاگ رات کے خواب اسی دن سے دیکھنے شروع کر دیئے تھے جب سے میری شادی طے ہوئی تھی۔ ایک متوسط گھرانے کی لڑکی ہونے کے ناطے ہوش سنبھالتے ہی میں نے پردہ میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ گھر کا ماحول بڑا ہی خشک تھا اور گھر والے پرانے خیالات کے لوگ۔ یہی وجہ ہے کہ گھر میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں نے کبھی کالج کی شکل نہیں دیکھی حالانکہ میرے والد خود بھی کافی پڑھے لکھے ہیں۔ پھر بھی جانے کیوں وہ لڑکیوں کی تعلیم کے سخت خلاف ہیں۔ بہرحال میں اس طرح کے ماحول میں جوان ہوئی اور آج تک کسی جوان ہاتھوں کے لمس سے آشنا ہونا تو کجا کبھی کسی ہم عمر لڑکے سے تنہائی میں باتیں بھی نہ کیں تھی، اس لئے شادی کی بات سنتے ہی دل کے سوئے ہوئے تار جھنجھنا اٹھے اور میرے مچلتے ہوئے جذبات نے انگڑائی لیکر اس گھر میں قدم رکھا جسے لوگ سسرال کہتے ہیں۔ اور مجھے اس گھر کے در و دیوار کچھ جانے پہچانے سے محسوس ہونے، پھر میرا ذہن ماضی کی وادیوں میں بھٹکنے لگا۔ ابھی میں اچھی طرح سوچ بھی نہ پائی تھی کہ مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا، کہ اسی درمیان میرے خاوند بہت ہی آہستگی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے میری طرف نظر بھی اٹھا کر نہیں دیکھا بس خاموشی کے ساتھ پلنگ کے ایک کنارے بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ جانے کن خیالوں میں کافی دیر تک اسی حالت میں بیٹھے رہے۔ اس دوران میں نے اپنے چہرے کو کھول رکھا تھا۔ اچانک انھوں نے آنکھیں کھول دیں اور ان کی گہری نظروں سے میں اس قدر گھبرا گئی کہ پھر میں اپنے چہرے کو ڈھانپ نہ سکی۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھے جا رہے تھے، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اچانک انھوں نے کہا ——— شاید آپکا گھر میں پکارنے کا نام ببو ہے۔ کیوں؟ ان کا جواب دینے کے بجائے میں نے خود ہی ان سے سوال کیا...... کیا آپکے گھر والے آپ کو ننھے میاں کہہ کر پکارتے ہیں؟

ہم دونوں نے کسی کا جواب نہیں دیا اس کے باوجود ہم دونوں کو جواب مل گیا۔ اور پھر مجھے یاد آیا کہ یہ گھر اور اس گھر کے لوگ مجھے کیوں جانے پہچانے سے لگ رہے ہیں۔ آج سے تقریباً ۱۲ سال پہلے ہم لوگ اسی شہر کے اسی محلے میں رہتے تھے۔ اس وقت میری عمر چھ سال کی تھی اور ننھے میاں تقریباً چودہ سال کے رہے ہوں گے لیکن جسم کی ساخت کے اعتبار سے اٹھارہ کے لگ بھگ معلوم ہوتے تھے۔ اس وقت یہ حضرت ایک عدد عشق بھی فرماتے تھے۔ انھوں نے کئی بار اپنی محبوبہ کے پاس مجھ سے ہی خط بھجوائے تھے۔ اور ہر بار بطور معاوضہ دو عدد ٹافی دی لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ جناب ننھے میاں کا اصلی نام ریاض ہے جن سے میری نسبت طے پائی ہے۔ شاید اسی دوران ریاض صاحب کو بھی یہ واقعہ یاد آ گیا اور اسی وقت سے ان کے چہرے پر ندامت اور گھبراہٹ کے ملے جلے آثار صاف محسوس کئے جا سکتے تھے۔ میں نے بھی ساری شرم بالائے طاق رکھ کر محض انھیں چھیڑنے کیلئے ایک ایسا سوال کر دیا جس سے انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ مجھے بھی ابتک وہ سب کچھ یاد ہے۔

میرے سوال کے جواب میں وہ مسکرائے اور کہنے لگے۔ وہ سب کچھ بچپن کی حماقت تھی اور انھیں یاد رکھنا اس سے بڑی حماقت

ہو گی۔ بھول جاؤ ان باتوں کو۔ ورنہ یہ بچپن کا چھوٹا سا حادثہ آئندہ زندگی میں تلخیاں پیدا کرنے کیلئے کافی ہوگا۔ تم مجھے ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھو گی۔ اور سوچتی رہو گی کہ شاید میں اب بھی اس قسم کی حرکتیں کرتا رہتا ہوں۔

یہ سنکر وہ خاموشی سے مجھے بغور دیکھنے لگے مجھے ایک مذاق سوجھا اور میں نے برجستہ کہا۔ آپ سمجھ لیں کہ میں بھول گئی لیکن اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ کچھ عرصہ قبل میں نے بھی ایک لڑکے سے خط و کتابت کرکے اسی طرح کی حماقت کا ارتکاب کیا تھا۔ تو کیا آپ بھی اسے بچپن کی لغزش سمجھ کر نظرانداز کردینگے۔ اور آئندہ کبھی اس واقعہ کا تصور بھی نہ کریں گے۔

انھوں نے بڑے تحمل سے سب کچھ سنا۔ مگر تھوڑی دیر بعد ان کے چہرے کا رنگ قدرے متغیر ہوا جیسے میری بات پر کبیدہ خاطر ہوگئے ہوں پھر بڑی دیر تک آنکھیں بند کرکے کچھ سوچتے رہے۔ میں نے ان کے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ لگایا کہ وہ کسی فیصلے پر نہیں پہونچ پا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر سکوت طاری رہا مگر پھر اچانک بغیر کچھ کہے سنے انھوں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر چلے گئے۔

بقیہ مضمون صفحہ ۱۴ کا

کو لینے کا عندات دکھائے۔ اس نے ولیم فریزر کے فیصلے کی توثیق کی۔ اور لوہارو کا پرگنہ نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں کے سپرد کردیا۔

جب نواب شمس الدین احمد خاں کو اس فیصلہ کی اطلاع ملی تو وہ نہایت برہم ہوئے۔ اور ولیم فریزر کے قتل کی سازش کی۔ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو ولیم فریزر دریا گنج میں راجا کشن گدھر کے یہاں دعوت میں گئے تھے۔ وہ ڈنر کے بعد رات کے گیارہ بجے اپنی قیام گاہ پر واپس آ رہے تھے۔ اسی وقت نواب شمس الدین احمد خاں کے ملازم کریم خاں نے ان کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔ ولیم فریزر کے قتل کی خبر دہلی میں چاروں طرف پھیل گئی اور دہلی کے سارے دروازے بند کردیئے گئے۔ اس لئے کریم خاں فرار نہ ہوسکا۔ بالآخر وہ گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے بعد نواب شمس الدین احمد خاں کو بھی گرفتار کیا گیا۔ پہلے کریم خاں کو ۲۶ اگست ۱۸۳۵ء کو پھانسی دی گئی۔ اس کے بعد ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو نواب شمس الدین احمد خاں کو بھی کشمیری دروازے کے باہر پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ اور ان کی جائداد فیروزپور جھرکہ کو انگریزی حکومت نے ضبط کرلیا۔ بہر حال ولیم فریزر کے قتل اور نواب شمس الدین احمد خاں کی پھانسی کا سال ۱۸۳۵ء ہے۔ یہ واقعہ ۱۸۵۷ء کے آشوب کے بعد نہیں پیش آیا جیسا کہ محمد عثمان غنی صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔

ڈاکٹر خلیق اللہ خاں

حکیم برہم کا فتنہ و عطر فتنہ

ریاض خیرآبادی کے گلشن کدہ ریاض، ریاض الاخبار، صبح کل اور فتنہ و عطر فتنہ یہ سب ایک ہی تصویر کے رنگ و روپ ہیں جو انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ابھر ابھر کر مٹتے رہے غدر کے بعد جس قسم کی سوسائٹی نے جنم لیا اس میں صحت مند ظرافت کی گنجائش ہی نہیں تھی، اس زمانے کے خاص اخبارات سرسید کا تہذیب الاخلاق انتخاب اودھ پنچ اور زمیندار کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ اپریل فول ہی انیسویں صدی کے اختتام تک مزاحیہ اخبارات کی تعداد ہندوستان میں پچاس سے اوپر تھی ان میں گھٹیا قسم کے ظریفانہ اخبارات شیخ چلی، ملا دو پیازہ، جعفر زٹلی، پاسے خاں وغیرہ شامل تھے جو نہایت فحش مضامین چھاپا کرتے تھے جن کی نہ کوئی پالیسی تھی نہ پروگرام۔

فتنہ کے پس منظر میں وہ چھیڑ خانیاں ہیں جو دلّی اور لکھنؤ کے لوگوں نے بزم آرائیوں میں رزم آرائیاں پیدا کرنا شروع کر دی تھیں اس رزم آرائی میں اس وقت اودھ پنچ اکیلا حصہ لے رہا تھا۔ ریاض اخبار صرف سنجیدہ صحافت ہی میں حصہ لیتا۔ اس لئے ریاض الاخبار کے ضمیمے کے طور پر فتنہ جاری کیا گیا۔

فتنہ کی نوعیت و اجراء کے بارے میں نادم سیتاپوری کے بیان سے کافی روشنی پڑتی ہے۔

• فتنہ گورکھپور۔ محلہ خاص، ہفتہ وار۔ آٹھ ورق خورد، سالانہ ایک روپیہ آٹھ آنے۔ مہتمم منشی نظام احمد اندانہ رئیس خیرآباد پرنٹر لال اسٹیلا بخش۔ کاتب رام بخش از مطبع ریاض الاخبار اجرائے ۸ رجولائی ۱۸۸۲ء (انتخاب فتنہ میں ۲۸۳)

یکم جنوری ۱۸۸۵ء سے سولہ صفحات عطر فتنہ کے نام سے اور بڑھا دیئے گئے۔ عطر فتنہ اصل میں ایک گلدستۂ شعر و سخن تھا۔ جس میں اس دور کے مشہور گلدستوں کا انتخاب شامل ہوتا۔ اس کے سر ورق پر یہ شعر لکھا ہوتا۔ ؎

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی
پسلی پھڑک اٹھی نظرِ انتخاب کی

عطر فتنہ کے سولہ صفحات کے اضافہ ہونے کے بعد فتنہ اور عطر فتنہ ایک چیز ہو گئے۔ یہ ریاض کا وہی فتنہ تھا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا۔

فتنہ کو پوچھتا ہے کوئی اس ادا کے ساتھ
چھوٹا سا وہ ریاض کا اخبار کیا ہوا

فتنہ کا پہلا دور ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۵ء تک ریاض سے مکمل طور سے متعلق ہے حکیم برہم ۱۹۰۲ء میں گورکھپور آ گئے تھے فتنہ و عطر فتنہ حضرت ریاض نے انھیں دے دیا تھا۔ فتنہ کا دوسرا دور ۱۹۰۲ء سے ۱۹۱۲ء تک حکیم برہم سے وابستہ ہے ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۷ء تک کے فتنہ اور عطر فتنہ کی ادبی سرگرمیوں کی ذمہ داری کافی حد تک ریاض ہی پر ہے۔ ۱۹۰۷ء کے بعد سے فتنہ اور عطر فتنہ کی سرگرمیوں کا سہرا صرف حکیم برہم کے سر ہے۔ لگتا ہے کہ ریاض کی نظم و نثر کے بارے میں نکل جاتا تھا ۱۹۱۲ء کے بعد جب فتنہ بند ہو گیا تو اس کے بعد حکیم برہم نے رجسٹریشن ریویو کے نام سے ایک قانونی رسالہ اور جاری کیا تھا جس میں زیادہ تر رجسٹریشن وغیرہ کے متعلق مضامین ہوا کرتے تھے۔

اب ذرا فتنہ کے بارے میں ذیل کا اعلان ملاحظہ ہو۔

• ہر بدھ کو فتنہ عطر فتنہ شائع ہوتا ہے قیمت بغیر محصول عہ مع محصول ۱۲

سالانہ پیشگی قیمت آنے پر روانہ ہوگا۔ ولایتی ساخت کی جلد فتنہ عطر فتنہ حسب ذیل ہے۔

۱۹۰۳ء	۱۹۰۴ء	۱۹۰۵ء
عـ۸ر	۱۲ر	۱۲ر

جملہ خط و کتابت و تفصیل زر حکیم برہم ہمدرد پرالٹرد پرنسٹر کے نام ہونا چاہیئے۔

ریاض الاخبار پریس گورکھپور میں چھپا (فتنہ و عطر فتنہ نمبر ۱ جلد ۱۳ ۲۴ر فروری ۱۹۰۸ء) اس اعلان سے سالانہ چندہ وغیرہ کی نشان دہی ہوتی ہے، اور پتا چلتا ہے کہ اخبار بدھ کو شائع ہوتا تھا۔ اب ہم ۱۹۱۱ء کے فتنہ کا آخری صفحہ کا بیان پیش کرتے ہیں۔

مہینے میں چار بار فتنہ عطر فتنہ رنگین کاغذ پر شائع ہوتا ہے قیمت پیشگی باہر والوں سے دو روپیہ شہر والوں سے عہ سالانہ بعد ۱۹۰۹ء - ۱۹۱۱ء کی بند ہوئی ہر سال کی الگ الگ جلدیں تیار ہیں قیمت فی جلد عہ روپیہ۔ حکیم برہم (فتنہ و عطر فتنہ ۱۹۱۱ء)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ فتنہ کا اپنا ہر طرح کا معیار آخر وقت تک حکیم برہم کی سرپرستی میں قائم تھا۔ اس دور کے فتنہ و عطر فتنہ کو طنز و مزاح کی بنا پر کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس دور کے مجموعوں میں جہت سی ادبی قدروں کی مثالیں ملتی ہیں۔ جیسے دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم پر بہت کیچڑ اچھالا گیا۔ فتنہ نمبر ۱۰ جلد نمبر ۴ مطبوعہ ۸ر مارچ ۱۹۰۵ء میں زیر عنوان "گلزار نسیم اب چھپی ہے"۔ نسیم پر نعروں کی بھرمار کی گئی ہے اسی طرح چکبست پر۔ دوسرا تبصرہ مسٹر چکبست کے زیر عنوان ملاحظہ ہو۔

• جناب چکبست پر دے کی تو تو نے جو ہرزہ سرائی کیا کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت چھوٹے دل کے آدمی ہیں چار سطر میں لکھتے ہیں۔ سو ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں سرشار کی طرح تک بندی بھی نہیں آتی۔

(فتنہ ۴ر اکتوبر ۱۹۰۵ء)

اس دور کے چند امتیازی لطیفے درج کئے جارہے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ طنز و مزاح میں یہ اخبار اپنا معیار قائم کئے ہوئے تھا۔

۱۔ خرچ برابر | جان۔ مجھے رشک آتا ہے کہ اب بھی تم اپنی بیوی سے اظہار الفت کرتے ہوئے سرگرم معلوم ہوتے ہو۔

والس۔ بے شک۔ مگر تمہارا خیال ہے۔

جان! ادھر تو یہ حالت ہے کہ تمام سرمایۂ محبت فضول خرچی کیساتھ کورٹ شپ میں ختم ہوگیا۔ اب وہ میرا منھ دیکھتی ہیں اور میں آنکھ۔

(فتنہ عطر فتنہ ۵ر جولائی ۱۹۰۶ء)

۲۔ مثال۔ استاد۔ بتاؤ کہ بے دانت کا جانور کون ہے۔

چھوٹا لڑکا۔ جناب وہ میرے یہاں موجود ہے۔

استاد۔ کون؟

چھوٹا لڑکا۔ جی وہ میری نانی ہے۔

(فتنہ ۲۵ر جولائی ۱۹۰۶ء)

۳۔ شاعر۔ تو کیا جواب کیلئے لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجنا ضروری ہے۔

ایڈیٹر۔ صرف ضروری نہیں بلکہ اشد ضروری ہے جتنی کے نظم کو لفافے میں بند کرنے سے زیادہ ضروری۔ (فتنہ ۱۴ر جنوری ۱۹۰۷ء)

لڑکی۔ اماں میں نے ایک فرضی نام سے اشتہار دیا تھا کہ نوجوان جنٹلمین سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔

والدہ۔ تم نے غضب کیا آخر اس کا نتیجہ کیا ہوا۔

لڑکی۔ نتیجہ کیا تھا جواب میں صرف ایک درخواست وصول ہوئی جو اباجان کی طرف سے تھی (فتنہ ۴ر ستمبر ۱۹۰۸ء)

اس دور کے فتنہ و عطر فتنہ میں کچھ فحش بیان کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کو ہم شوخیٔ بیان کی انتہا کے نام سے بھی پکار سکتے ہیں ایسا ایک نمونہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

مس گلبرٹ کا بیان ہوا ہو ترا کی ہوستا کی کے علاوہ مقدمہ گلبرٹ کی گل افشانی سن کر آپ تو کھلکھلا کر ہنس پڑیں گے۔ غنچہ دہن گلبرٹ ترا کی آغوش میں تنگ آرہی ہیں اور وہ ناشگفتہ کلی کو پھول بنا رہا ہے۔ حضرت ریاض

یا اندر ہوئے شب وصل وہ آ بیٹھے ہیں
جانتے ہیں کہ بچائے گی نزاکت میری

گھبرا کے کہتی ہیں میری عمر چودہ سال کی ہے۔ سہ

باقی نہ دل میں ایک بھی یارب ہوس رہے
چودہ برس کی عمر یہ لاکھوں برس رہے

سات مرتبہ اس کے پاس گئی چار مرتبہ اس سے موقع حاصل کیا، ہر موقعہ پر ایک ہی مرتبہ اس کی تسلی ہوئی تھی۔ شاید پہلے دن اس نے زیادہ ہوشیاری سے کام لیا ہو۔ اس کم بخت دن کا واقعہ مجھے یاد نہیں ہے اس لئے کہ میں بے ہوش تھی۔ کھانے کے قبل کوئی چیز ملا دی تھی۔

اس وقت مجھے مسٹر ا کا حمل ہے.... میں کبھی کسی اور مرد کے پاس نہیں گئی۔ مسٹر انے اخفا کی بڑی کوشش کی کئی دوائیں دیں لیکن یہ بھی کہا کہ اس کا حمل نہیں گرتا ہے، حالانکہ اس سے کئی لڑکیوں کا حمل گرا چکا ہوں وہ کہا کرتا تھا کہ اور لڑکیاں اور یہاں کے افسروں کی بیویاں کبھی ٹال مٹول نہیں کرتیں۔ تم بہت کس مس کرتی ہو۔ ...... (فتنہ وعطر فتنہ جلد ۱۵)

اس دور کے فتنہ وعطر فتنہ میں بلند پائے کے شعراء کی غزلیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ یہاں ہر چند نامور شعراء کی غزلوں کے چند منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

پروفیسر اقبال

اُجالا جب ہوا رخصت جبینِ شب کی افشاں کا
نسیم زندگی پیغام لائی صبحِ خنداں کا

پوری غزل فتنہ وعطر فتنہ ۲۳ر دسمبر ۱۹۰۳ء

اکبر آبادی۔ ا۔

مجھے اس انقلابِ دہر سے کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے
(۲۳ر ستمبر سنہ ۱۹ء)

ا۔ کیونکر کہوں طریق عمل ان کا ایک ہے
جب عید میں بجائے سویّوں کے کیک ہے

مجبور ہوں مگر نہ ملوں ان سے کس طرح
اب تک وہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ ایک ہے

اس دور میں فتنہ وعطر فتنہ میں اکبر الہ آبادی کے کلام کے نمونے بہت زیادہ نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کا کلام مزاحیہ اور انگریزی تہذیب پر طنز کرتا ہے۔ اور یہی اخبار کی پالیسی بھی تھی مضطر خیر آبادی کی بھی غزلیں اس میں شائع ہوا کرتی تھیں کبھی کبھی تاریخی قطعات سے متعلق بھی مضامین اس اخبار میں نکلا کرتے تھے۔ جیسے تاریخ کہنا بہت مشکل ہے کے زیر عنوان جناب وسیم خیر آبادی کی تحریر میں ۲۹ر جنوری سنہ ۱۹ء کے فتنہ میں شائع ہوا ہے۔ اس دور کے لکھنے والوں میں خاص طور سے میاں رمضانی محبت نگار وغیرہ ہیں۔

حکیم برہم نے اپنی ذکاوت اور صحافتی صلاحیت سے اس اخبار کو چمکا دیا تھا۔ فتنہ وعطر فتنہ طنز ومزاح کا جیتا جاگتا مرقع تھا۔ اس کا مذاق نہایت شائستہ اور ذاتی عناد سے مبرّا تھا۔ اس اخبار نے گورکھپور کی ہر کوچہ وگلی کو گلستان بنا دیا تھا۔ اور عوام وخاص میں ایک ادبی ذوق پیدا کر دیا تھا۔ طنز ومزاح کی آخری حد ہے۔ جو کہ پرخاش میں بدل جاتی ہے۔ اس کا پتہ فتنہ میں کہیں نہیں چلتا ہے۔ اور ذاتی اغراض اور ہنگاموں اور فسادات سے کافی دور تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ فتنہ اور عطر فتنہ اپنی گل کاریوں سے عوام کے دلوں کو مسرت اور اعلیٰ قسم کا طنزیہ ادب بخشتا رہا۔

آوارہ

منشی جی

(ایک وکیل کا آفس روم۔ دروازے پر کسی نے دستک دی)

وکیل۔ "ایک دو ہو چکے۔ یہ تیسرے صاحب ہیں۔ (آواز سے) آئیے"

نو وارد۔ (آتے ہوئے)۔ "منشی چھیدو شنکر شرما کورنش عرض کرتا ہوں"

وکیل۔ "تشریف رکھئے"

شرما۔ "شکریہ۔ ناچیز شاعر بھی ہے۔ شورش تخلص۔ جناب تشویش کا شاگرد رشید"

وکیل۔ "اچھا تو منشی چھیدو شنکر شرما شورش۔ علمی لیاقت، تنخواہ وغیرہ؟"

شرما۔ "گزارش یہ ہے کہ سوال ترمیم چاہتا ہے۔ تھوڑا سا لفظی الٹ پھیر۔ یعنی "تنخواہ" اور "وغیرہ" پہلے۔ "علمی لیاقت" بعد میں"

وکیل۔ "یہ کیوں"؟

شرما۔ "اس میں ایک نکتہ ہے"

وکیل۔ "میں اس تک نہیں پہنچا"

شرما۔ "ملاحظہ فرمائیے۔ "تنخواہ اور وغیرہ" کا فیصلہ تو دو باتوں میں ہو سکتا ہے۔ مثلاً آپ نے فرمایا "بیس روپے مہینہ"۔ فدوی نے عرض کیا "بسر و چشم"۔ اب آپ نے روشنی ڈالی "وغیرہ" پر۔ مگر علمی لیاقت بتدریج کھلے گی۔ بے ادبی معاف۔ آدمی جانے بسے اور سونا جانے کسے"

وکیل۔ "بات واجبی ہے منشی جی۔ اور جی خوش ہوا منشی جی کہ اس میں آپ کی شرافت کی خوشبو آتی ہے"

شرما۔ "شکریہ۔ میں کس لائق ہوں"

وکیل۔ "مجھے تو آپ جانتے ہی ہیں، شیخ شوکت شاہ خاں وکیل"

شرما۔ "اس میں کیا شک۔ اشتہار میں دیکھا۔ تختی پر لکھا۔ واقعے کے دو دو شاہد موجود۔ شبہے کی گنجائش نہیں"

وکیل۔ (ہنس کر)۔ "ماشاء اللہ۔ منشی جی یہ تو آپ نے عدالتی زبان بول ڈالی"

شرما۔ "عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں"

وکیل۔ "خوب خوب! حاصل کلام یہ کہ آپ سے میرا کام چل جائے گا"

شرما۔ "پھر وہی کہوں گا کہ برتنے پر کھلے گا"

وکیل۔ "بس تو منشی جی آپ آ گئے اور رکھ لئے گئے"

شرما۔ "شکریہ در شکریہ۔ اب گزارش ہے کہ لگے ہاتھوں "وغیرہ" کا مسئلہ بھی طے فرما دیا جاتا"

وکیل۔ "آہو! ارے بھئی موکلوں سے جو لے بھاگے اس کا شمار "وغیرہ" میں۔ اور کہئے؟"

شرما۔ "کام لیجئے"

وکیل۔ "دو ایک ضروری باتیں اور سن لیجئے۔ میں دیوانی کرتا ہوں فوجداری نہیں لڑتا۔ دیوانی میں بھی صرف عرضی دعوے کا بادشاہ ہوں۔ ابتدائی سے اپیل تک مجال ہے کہ ایک شوشہ تو کوئی گھٹا بڑھا سکے"

شرما۔ "یہی تو ہے۔ الفاظ کی نشست ہی میں مقدمے کی جان ہوتی ہے دو نکتے رکھ دئے۔ دعویٰ پنپ گیا"

وکیل۔ "جی سنئے جائیے۔ انہی دو نکتوں کے لئے منشی جی قانون کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگانا پڑتے ہیں۔ اسی میں ڈھونڈتا ہوں"

تو کچھ نہیں پاتا۔ اور لکھنے بیٹھتا ہوں تو سوچ نہیں سکتا۔

شررما۔ قدرتی بات ہے جناب والا۔

وکیل۔ اسی لئے مدت سے ایک منشی کی تلاش تھی کہ میں موتی نکالتا جاؤں اور وہ پروتا جائے۔

شررما۔ مختصر یہ کہ آپ بولتے جائیں اور میں لکھتا جاؤں۔

وکیل۔ جی اور کیا۔ اسی لئے اشتہار دیا۔ منشی آئے مسودے کئے املا ٹھیک نہ انشا درست۔ سینکڑوں روپے کے اسٹامپ پھاڑ گئے کتنے ہی موکل ٹوٹے۔ اب آپ تشریف لائے ہیں تو حسن لیجئے کہ میں آرام کرسی پر پیچواں لگائے آنکھیں نیچے پڑا رہوں اور آپ قلم دوات لئے چوکس بیٹھے ہوں۔ میں فر فر بولتا جاؤں آپ سر سر لکھتے جائیں۔ نقطہ نقطہ صحیح، شوشہ شوشہ درست۔ کہئے منظور؟

شررما۔ بسر و چشم۔ منظور ہی نہیں پتھر کی لکیر تقدیر کا نوشتہ۔

وکیل۔ بس جو بولوں حرف بحرف وہی لکھا جائے۔ مطلب یہ کہ انشا میری املا کے ذمہ دار آپ۔ آپ کا خط تو اچھا ہے نا؟

شررما۔ جی اور تو نہیں اتنا جانتا ہوں کہ میر پنجہ کش کے گھر کا شاگرد ہوں۔ لوگ کہتے ہیں نستعلیق نہیں لکھتا کاغذ پر نگینے جڑتا ہوں تحریر دلہن کی پیشانی پہ جیسے افشاں یا آسمان پر کہکشاں۔ خداداد نعمت ہے بس دیکھ ہی کر لیجئے گا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟

وکیل۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے منشی جی۔

شررما۔ خیر۔ دیدہ خواہد شد۔ مطلب یہ کہ دیکھا جائے گا۔ نائی رے نائی سر پہ بال کتنے؟ بولا ججمان مونڈھے سامنے آئیں گے۔

وکیل۔ اس لئے اور بھی رکھنا پڑا کہ تیرہ کا عدد ہے مجھ پہ بھاری شرہو۔

شررما۔ نشاط خاطر رہے۔ صحیح ہی بات ہے سے کالا کو اتروا چکا ہوں۔ توڑ بھی تو کوئی شے ہے۔

وکیل۔ بس تو بسم اللہ۔ (کنجیوں کا گچھا پھینک کر) یہ اب آپ کی امانت ہے۔ الماری کھولئے لکھنے پڑھنے کا سامان نکالئے اور دیکھئے یہ قالین اور یہ ڈیسک آپ کا ہے۔ گھر سے پیکدان اور منگوا لیجئے الماری میں کانچ کا گلاس ہوگا کہار موجود ہے۔ اپنے لئے کوری صراحی بھروا لیجئے۔ کھانا تو شاید میرے ہاں کا نہ کھائیں گے ورنہ۔۔

شررما۔ (بات کاٹ کر) پرورش ہے آپ کی۔ میں سویرے ہی اشنان کر کے ناشتہ کر لیتا ہوں تو پھر شام کو۔ ویسے میرا گھر ہے۔

وکیل۔ بہر حال آپ میرے ہاں بھوکے پیاسے رہے تو آپ جانیں منشی جی۔ چلئے تیاری کیجئے۔ مجھے ایک بہت بڑا عرضی دعویٰ لکھانا ہے۔

(منشی جی الماری کا قفل کھولنا چاہتے ہیں)

شررما۔ نہیں کھلتا۔

وکیل۔ (کرسی سے اٹھ کر) ٹھہرئیے میں آیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ منشی جی یہ تو آپ غلط چابی ٹھونسے کھڑے ہیں۔ قانون میں اسے اشتمال بے جا کہتے ہیں۔ (کنجی چھین کے) لیجئے یہ ہے الماری کی کنجی۔ پٹ ذرا سنبھال کے کھولئے گا۔

شررما۔ انشاء اللہ۔ (پٹ جھنجوڑ کے کھولتے ہیں۔ کانچ کا گلاس فرش پر گر کے ٹوٹ جاتا ہے)۔ اُف!

وکیل۔ مبارک! توڑ دیا نا گلاس! کیا آفت آئی؟

شررما۔ اُفوہ! کتنے بڑے کھن کھورے کا شبہ ہوا۔

وکیل۔ توبہ توبہ۔ منشی جی! تھا بھی تو کون سا تحفہ تھا۔ جائے وہ تو اپنے رستے گیا آپ اپنا کام کیجئے۔

شررما۔ جی میں حاضر ہوں۔

وکیل۔ (بلند آواز سے) شبراتن۔ حقہ دے جا۔ (منشی سے) منشی جی میں بھی تیار ہوں۔ ہاں اتنا اور کہدوں۔ بیچ میں ان ضرور کستے جائیے گا ورنہ میں مضمون سے ہٹ جاؤں گا اور آپ کو دوبارہ بتانے میں سارے نکتے ہوا ہو جائیں گے۔ اسلام کا حاشیہ موڑ لیا ہے؟

شرما ۔ "جی مڑا ہوا ہے"

وکیل ۔ (آہٹ سن کر) "کون شبراتن؟ حقہ لائی؟ ادھر رکھ دے اور سٹک مجھے دے دے؟" (حقہ گڑگڑاتے ہیں) شروع کیجئے منشی جی۔ "بعدالت صاحب سول جج بہادر" (حقہ گڑگڑا کے زیر لب) بدتمیز نے پانی تک نہیں بدلا۔ "دعویٰ دیوانی؛ پگلی نے کچے کوئلے بھر دیئے۔ مالیتی، لفظوں اور ہندسوں دونوں میں "پینسٹھ ہزار تین سو ننانوے روپے۔ زر اصل؛ (حقہ گڑگڑا کے) "فریقین۔ نہابت خاں ولد نوبت خاں، قوم پٹھان، مدعی، بنام نہال خاں ولد جھنگو خاں قوم ایضاً۔ ہر دو ساکنان وغیرہ۔ منشی جی نوٹ بک میں دیکھ کے لکھ لیجئے گا (کسی کی آہٹ پر) کیا ہے شبراتن"!

شبراتن۔ "دیر ہوتی ہے سرکار، بیگم صاحب خرچ کے روپیوں کو کہتی ہیں"

وکیل ۔ "ہاں منشی جی لکھئے: (شبراتن سے) "دونوں اندھے ہیں دکھائی نہیں دیتا" منشی جی۔ "دعویٰ واسطے دلا پانے قرضہ دستاویزی مبلغ مذکورہ۔ زر اصل (شبراتن سے)۔ "ذرا ٹھہر، ہمارے پاس نہیں اس وقت؛ ہاں منشی جی۔ مدعی عرض پرداز ہے کہ (۱) مدعا علیہ نے دستاویز مذکورہ بتاریخ ___ بتاریخ ___ ماہ ___ سن ___ منشی جی، یہ بھی نوٹ بک سے لیجئے۔ اور آگے چلئے۔ "بحق من مدعی تحریر کی اور باضابطہ رجسٹری کرادی۔ (۲) "شبراتن سے۔ "یعنی تو گئی نہیں ابھی تک ہیجڑی۔ لاحول ولا قوۃ۔ سارا مضمون جاتا رہا، منشی جی ذرا شروع سے پڑھ تو جائیے"۔

شرما۔ (کھنکھار کے) "بعدالت صاحب سول جج بہادر۔ پھر حقے کا کش لے کر فرمایا۔ بدتمیز نے پانی تک نہیں بدلا دعویٰ دیوانی، پگلی نے کچے کوئلے بھر دیئے۔ مالیتی پینسٹھ ہزار تین سو ننانوے روپے، پھر حقہ۔ زر اصل۔ فریقین، نہابت خاں ولد نوبت خاں قوم پٹھان مدعی۔ بنام نہال خاں ولد جھنگو خاں قوم ایضاً ہر دو ساکنان وغیرہ

یہاں مجھے نوٹ بک دیکھنے کا حکم ہوا۔ اور شبراتن آئی اس نے گھر کے خرچ کے لئے روپے طلب کئے، جس پر اسے جھاڑ پڑی اور فرمایا کہ دونوں اندھے ہیں ..."

وکیل۔ (آگ ہو کر) "ایں ایں منشی جی، یہ آپ ہوش میں تو ہیں؟ یہ کیا لکھ مارا !"

شرما ۔ "جی واقعات"۔

وکیل ۔ "کیسے واقعات؟"

شرما ۔ "جو عرضی دعویٰ لکھانے میں ہوئے"

وکیل ۔ "ارے جاہل کندۂ ناتراش، یہ سیکڑوں روپے کا اسٹامپ غارت گیا"

شرما ۔ "جناب کی نوکری جناب کو مبارک۔ میری پندرہ منٹ کی تنخواہ بحساب بیس روپے ماہانہ دلائی جائے۔ رسید حاضر ہے۔ ایک نقطہ بھی اپنی طرف سے لگایا ہو تو میں منشی شیو شنکر شرما خورشی نہیں"

بقیہ صفحہ [illegible] کا

گے اور سوچنے لگے کہ افسانہ چھپتے ہی ہمارے پاس بہت سارے خط نا ئیں گے جن میں افسانہ کو سراہا گیا ہوگا۔

افسانہ پڑھ کر ایک آدھ لڑکی ہم پر عاشق بھی ہو جائے گی اور اپنے عشق کا اظہار خط لکھ کر کرے گی۔

اسی طرح ایک عرصہ گزر گیا مگر ہمیں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ ہم نے کئی چکر اپنے دوست کے گھر کے بھی لگائے۔ لیکن وہ ملا ہی نہیں۔ پھر ہم نے سمجھ لیا کہ ہمارا افسانہ کہیں چھپ نہیں سکا۔ ہم مایوسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگے۔

ہم سوچتے کہ ادب کے ٹھیکیدار نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے نہیں بس ادب میں جمود کے نعرے لگایا کرتے ہیں۔ مگر اب بھی ہمارے دل کے ایک گوشے میں انتظار کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔

اسی دوران ہم اپنے ایک واقف کار سے ایک رسالہ پڑھنے کو لائے۔ گھر آکر جب وہ رسالہ ہم نے دیکھا تو غم و غصہ کی ایک سخت لہر سے ہم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ہمارا افسانہ اس میں

مزاحیہ

ہم نے افسانہ لکھا

شین قاف

ہم نے ایک افسانہ لکھا۔ اور لکھنے کے بعد اسے تقریباً سبھی دوستوں کو سنایا تو جناب! تعریف تو کم نے کی تنقیص زیادہ نے لیکن تنقید کسی نے نہیں۔ تعریف سن سن کر تو ہم پھولے نہیں سمائے لیکن تنقیص ہمیں ایک آنکھ نہیں بھائی۔

جس نے بھی ہمارے افسانہ میں کوئی نقص نکالا ہم نے سمجھ لیا کہ وہ جانتا ہی نہیں افسانہ کہتے کسے ہیں؟

لیکن دوست تھے کہ نقص نکالنے سے باز نہیں آ رہے تھے اور اپنے آپ کو کرشن چندر سے کم سمجھنے پر کسی حالت سے بھی تیار نہیں تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم بات اور آگے بڑھائیں آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ کیا یک یہ افسانہ نگاری ہم پر کیوں سوار ہوگئی؟

اب آپ سے کیا چھپائیں؟ بات اصل میں یوں ہے کہ ہمیں بچپن میں کہانیاں پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ جنگل کی شہزادی گمبیٹ کی الف لیلیٰ شاہی جیسی کہانیاں بہت پڑھا کرتے تھے۔ کلیاں، پھلواری اور کھلونا جیسے رسالے پڑھتے تھے۔ پھر جب کچھ بڑے ہوئے تو ان کی جگہ جاسوسی ناولوں اور فلمی رسالوں نے لے لی جنھوں نے دل پر اپنی ادبیت کا سکہ جما لیا۔ پھر اسے اتفاق کہیے یا بدپرہیزی کہ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی وغیرہ کے دو ایک افسانوی مجموعے بھی پڑھ ڈالے مگر خرید کر نہیں! خریدتے تو صرف فلمی رسالے تھے۔

انھیں دنوں ہمارا ایک خط ایک فلمی رسالے میں چھپ گیا اسی خط کا چھپنا ہماری ادبی زندگی کا آغاز تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچا کہ ہم نے اتنا کچھ تو پڑھ لیا ہے۔ چنانچہ اب ہمیں افسانہ لکھنا چاہیے۔ سوچنے کی دیر تھی کہ ایک عدد افسانہ تیار ہوگیا۔ تو ہماری افسانہ نگاری کے محرکات اب آپ پر روشن ہو گئے ہوں گے۔ بہرحال جب ہم نے گھوم گھوم کر اور چائے پلا پلا کر اپنا افسانہ سب دوستوں کو سنا دیا تو سوچا کہ اب اسے کہیں چھپوایا جائے۔ لہٰذا ہم اسے ایک مشہور ادیب کے پاس لے گئے جو ایک رسالہ بھی نکالتے ہیں۔

افسانہ پڑھنے کے بعد انھوں نے ہم سے ایک نہایت بے تعلق سا سوال کیا۔ "آپ نے کن کن افسانہ نگاروں کو پڑھا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "بس کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی کے دو، ایک مجموعے پڑھے ہیں"

"لیکن ان میں سے تو کسی کا بھی اثر نہیں ہے آپ کے افسانہ پر"

ہم سمجھ نہیں پائے کہ کسی کے اثر کا نہ ہونا عیب ہے یا خوبی۔ لہٰذا خاموش رہے اور ہونقوں کی طرح ان کا منہ دیکھنے لگے۔ انھوں نے جب ہمیں ہونقوں کی طرح گھورتے دیکھا تو افسانہ کے انجام میں فوراً ایک غلطی نکال دی۔ ہم نے سوچا ایک مشہور ادیب غلطی نکال رہا ہے اسے تو ماننا ہی پڑے گا۔ پھر انھوں نے کہا۔ "آپ اگر یہ خامی دور بھی کر دیں تب بھی آپ کا افسانہ اچھا کہلانے کا مستحق نہ ہو سکے گا کیونکہ اس میں آپ نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔ اس موضوع پر تو بہت سے افسانے لکھے جا چکے ہیں"

پھر انھوں نے زبان کی کچھ غلطیاں نکالیں۔ ہم نے انھیں بھی تسلیم کر لیا۔

انھوں نے کہا۔ "ایک تھرڈ کلاس کہانی لکھنے سے کہیں

بہتر ہے کہ ایک فرسٹ کلاس ناول پڑھ ڈالیے۔ اس سے آپ گمراہ نہیں ہوں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ لکھنے پر توجہ نہ دیجئے بلکہ پڑھیئے، بہت پڑھیئے، بے تحاشا پڑھیئے" اور پڑھتے پڑھتے بوڑھے ہو جائیے۔ ہم نے دل میں سوچا۔

"اُردو میں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، بیدی اور عصمت چغتائی غیر ملکی لکھنے والوں میں موپاساں، چیخوف اور میکسم گورکی کو پڑھ ڈالیے اور سمجھیے کہ افسانہ کی فضا کیسے بنتی ہے۔ ! کوئی موضوع ذہن میں آئے تو اس پر ابھی مت لکھیئے۔ اسے ذہن میں پکنے دیجئے۔ خوب پکنے دیجئے۔ ایک لمبے عرصہ بعد اس پر لکھیئے۔ لکھنے کے بعد اسے ڈال دیجئے تین مہینے بعد اسے اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو خود اس میں خامیاں نظر آ جائیں گی۔ اگر اس وقت کہانی اچھی لگے تو چھپوائیے ورنہ پھاڑ کر پھینک دیجئے"

ہم نے سوچا، اسے پھر ڈال دیا جائے اور تین مہینے بعد دیکھا جائے تو یقیناً اس میں پھر خامیاں نظر آئیں گی۔ ان خامیوں کو درست کرنے کے بعد اسے پھر تین مہینے کے لئے ڈال دیا جائے۔ خامیاں درست کر کے پھر ڈال دیا جائے۔ اس طرح کے متواتر عمل ہی سے کہانی کا وجود ختم ہو جائے گا پھاڑ کر پھینکنے کی کیا ضرورت؟

پھر انھوں نے کہا "آپ کی کہانی کسی بھی رسالے میں چھپ سکتی ہے۔ لیکن اس سے فائدہ کیا ہوگا! آپ کچھ عرصہ بعد اسے دیکھیں گے تو آپ کو خود شرمندگی ہوگی کہ یہ کہانی میں نے لکھی تھی!"

اس پر ہم بہت مردہ سی آواز میں بولے "نہیں جناب! چھپوانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن مطالعہ کے ساتھ نہ چھپوانے کی غرض سے نہیں بلکہ مشق کے لئے لکھتے بھی رہیں تو کوئی حرج ہے؟"

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس سے بھی۔ اُردو میں اتنے شاعر اور ادیب ہیں کہ شمار مشکل ہے۔ اور سب برابر لکھتے رہتے ہیں اور نہ جانے کب سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن کیا ان تمام شاعروں اور ادیبوں سے ادب کو کچھ ملا بھی! ادب میں ان کی کوئی جگہ بھی بنی! لکھتے رہنے ... اور رسالوں میں چھپ جانے ہی سے ادب میں جگہ نہیں بن جایا کرتی! آپ بنیادی حیثیت پڑھنے کو دیجئے۔ لکھنے کا خیال فی الحال ذہن سے نکال دیجئے۔ بس پڑھیئے اور خوب پڑھیئے!"

اس کے بعد ہم اپنا افسانہ لیکر وہاں سے چلے آئے۔ اتنا بے آبرو ہو کر آنے کے بعد بھی ہم نے ان کے لیکچر کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دینے کے بجائے اس کا ایک ایک لفظ اپنے ذہن میں اُتار لیا اور طے کیا کہ اب صرف مطالعہ کریں گے۔ لیکن بھلا ہو ہمارے ایک دوست کا۔ ہم نے جب اسے بتایا کہ فی الحال ہم لکھنے لکھانے کے چکر سے دور رہیں گے اور صرف مطالعہ پر زور دیں گے" تو اس نے کہا "کیا بکتے ہو! لکھنا جاری رکھو اور چھپواتے بھی رہو"

"لیکن ہم جو کہانی ابھی لکھیں گے۔ وہ اچھی نہیں کہلائے گی اس لئے کیا فائدہ؟"

"تم احساس کمتری کا شکار ہو۔ بھئی! ابتدا تو سب کی اسی طرح ہوتی ہے!"

"یار! بات تو تم کچھ ٹھیک ہی کہتے ہو" ہم نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

وہ بولا "اپنی کہانی کہیں چھپنے کے لئے بھیج دو" لیکن ہم نے سن رکھا تھا کہ رسالوں کے ایڈیٹر صاحبان نئے لکھنے والوں کو ذرا کم ہی چانس دیتے ہیں۔ اس لئے ہم سوچنے لگے کہ کہاں بھیجیں کیسے چھپوائیں!

ہمارے دوست نے گویا ہمارے چہرہ کے تاثرات پڑھ لئے۔ وہ بولا "اسے فیئر کر کے مجھے دے دو۔ میں چھپوا دوں گا"

یہ سنکر ہم نے خوشی سے اچھل پڑنے کا ارادہ کیا مگر پھر ملتوی کر دیا کیونکہ ہم اپنی خوشی ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔

دوسرے دن وہ افسانہ ہم نے اسے دے دیا۔ اور نہایت بے چینی اور بے قراری سے اس کے چھپنے کا انتظار کرنے

بقیہ ...

اخلاق حسین عارف

چمن جاگے ــــــ شعری مجموعہ

مصنف ــــــ نقوی مصطفیٰ آبادی

صفحات ۱۹۲ قیمت مجلد دس روپے

ملنے کے پتے :- ۱۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ۔ دانش محل لکھنؤ

"چمن جاگے" نقوی مصطفیٰ آبادی کی فکر بلیغ کا ایک خوشنما گلدستہ ہے اس کی تقریظ مولانا امتیاز علی خاں عرشی ڈائرکٹر رضا لائبریری رام پور نے قلم بند فرمائی ہے جو ہند و پاک کے علاوہ بیرون ملک بھی محقق و ماہر غالبیات اور نقاد اور ادیب تسلیم کئے جا چکے ہیں اور تعارف ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ ہر دو حضرات نے مصنف کا بہت قریبی مطالعہ کیا ہے اور بہت سی ایسی نشستوں میں ان کو سنا ہے جہاں فکر و فن پر موشگافیاں اور باریکیوں پر تبادلۂ خیال ہوا کرتا ہے یہ حضرات ان کے وسعت مطالعہ، فنی محاسن، گہرائی، ادبی نکات و رموز پر ان کی مضبوط گرفت اور شعریت سے بھرپور ان کے جملوں کے اپنے اپنے طور پر معترف نظر آتے ہیں اور بقول ڈاکٹر صاحب مصنف نے اپنی کاوش میں غزل کے مقام و مرتبے کو قائم رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ نقوی صاحب کا عمیق مطالعہ اور ستھرا ذوق غزل کو پوری فنی صلاحیتوں کے ساتھ معرض وجود میں لانے کا باعث ہوا ہے۔

نقوی صاحب کو سخن سنجی ورثہ میں ملی ہے پھر ان کا ستھرا ذوق اس کے علاوہ وہ مستند اور کہنہ مشق نثر نگار ہیں اور موصوف کے رشحات فکر ملک کے چوٹی کے رسائل و جرائد میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں مگر اس کتاب میں انھوں نے اپنے اصلی نام کو کماحقہٗ نہیں لکھا بقول مولانا عرشی ..... البتہ کسی مصلحت سے اپنے آپ کو اس فن سے متہم کرنا پسند نہیں فرماتے۔ پیر مرد بڑا فرض ہے کہ میں یہ راز کا رمیں یہ حکشت کر دوں کہ موصوف ہیں۔ سید نجم الدین نقوی پروفیسر و صدر شعبۂ اردو رضا پوسٹ گریجویٹ کالج رام پور۔ آپ ہر قسم کی ستائش سے بے نیاز ہیں اور اپنے ذوق کی تسکین کے لئے فکر سخن کرتے رہتے ہیں۔ ان کا ذوق سخن سنجی و سخن فہمی بہت پاکیزہ اور ارفع ہے۔ ان کے دل پر جو واردات گذرتی ہے وہ داخلی اور خارجی تأثرات کا آئینہ دار ہوتی ہے اس کی تصویر کشی شعری پیکر میں ڈھل کر صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہو جاتی ہے ظاہر ہے کہ یہ اشعار ان سچی تصویروں کا عکس ہیں اور انکی سچی عکاسی ہی شاعر کا کمال ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے تعارف کراتے ہوئے آخر میں ان کے مجموعۂ کلام سے چیدہ چیدہ اشعار درج کر دئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے مقابلہ میں راقم السطور مہندی کی حیثیت رکھتا ہے اسی لئے یہ چند سطریں لکھ رہا ہے اور اشعار دہرانے سے گریز کرتے ہوئے یہ ناچیز مشورہ دیتا ہے کہ آپ ایک نسخہ خرید کر ان کے پورے کلام بلاغت نظام کا مطالعہ فرما کر اس سے لطف اندوز اور مستفیض ہوں۔

بقیہ صفحہ ۳۳ کا

ہوں۔ چاند کی روشنی، تاروں کی چمک بھی ماند پڑ گئی ہو۔ چاند کا چہرہ بالکل سوگوار ہے۔ ایکدم غمگیں۔ چاندنی، جیسے آنسوؤں کا دریا رواں ہو۔ ہر طرف ویرانی ہے۔ سناٹا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کائنات تھمی تھمی سی ہو۔

ندیم! لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں تم اس طرح چپکے سے کیوں چلے گئے اور میں بس خاموشی سے منہ دیکھتی رہ جاتی ہوں اور جب جی زیادہ بھاری ہو جاتا ہے تو تنہائی میں جا کر رو لیتی ہوں۔

ندیم! میں اکثر سوچتی ہوں۔ تمہیں میری باتوں کا یقین کیسے ہو گیا۔ پہلے کہیں سے کہیں ایسی باتیں بھی کسی سے کہی جاتی ہیں بھلا!

Phone : 29250

THE TARANNUM MONTHLY

Regd. No.
L.W/N.P-71

Registrar of Newspaper Govt. of India Registration No. R. N. 23380/72